چونکا دینے والی کہانیاں

ماہنامہ

ڈائجسٹ

کراچی

اگست 2012

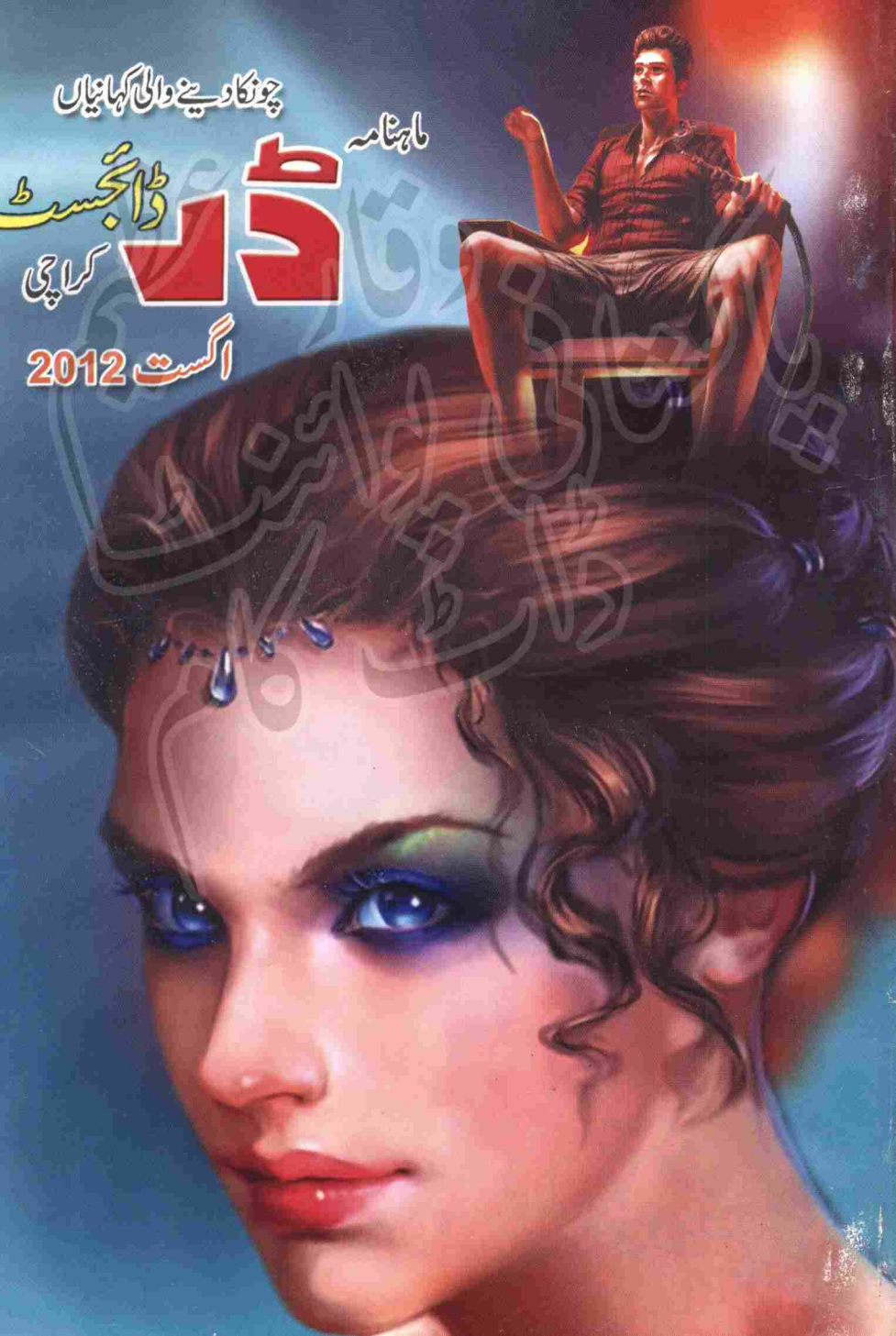

عنوان	مصنف	تعارف	صفحہ
پاگل خانہ	عمران قریشی	لفظ لفظ اور سطر سطر دل و دماغ پر دہشت طاری کرتی اپنی نوعیت کی دہشت ناک کہانی	16
ٹپکتا خون	ساجدہ راجا	تجسس کے پالنا میں جھولتی ہوئی نادیدہ قوتوں کی لرزا دینے والی ایک اچھوتی کہانی	37
انوکھا شکاری	ڈاکٹر اختر ہاشمی	ایک عجیب وغریب طریقہ شکار جسے اس سے پہلے دنیا میں کسی نے بھی نہیں آزمایا تھا	47
رولوکا	اے وحید	وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی	54
مردہ پریڈ	احسان سحر	ایک عجیب وغریب پراسرایت سے لبریز کہانی جو پڑھنے والوں کو دہشت زدہ کردے گی	77
سرکش روح	افشاں رمضان	رگوں میں لہو منجمد کرتی اور اچنبھے میں ڈالتی اور دل کو لرزہ براندام کرتی ڈراؤنی کہانی	81
ملعون	ایس حبیب خان	احساس ذمہ داری سے بیگانہ ایک شخص کی عبرتناک اور کربناک لرزیدہ لرزیدہ کہانی	93
خوفناک وکٹوریہ	ایس امتیاز احمد	پراسراریت کے لبادے میں لپٹا ہوا ایک عجیب وغریب اور دہشت ناک شاخسانہ	103
سنہری تابوت	ایم اے راحت	شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اچنبھے میں ڈالتی حیرت انگیز اور تحیر انگیز کہانی	112
خونی گڑیا	اقصیٰ رباب	اچانک ایک خونی واقعہ رونما ہوا، وہ واقعہ کیا تھا یہ تو کہانی پڑھ کر ہی پتہ چلے گا	133
سرسراہٹ	صبا رمضان	خوف وہراس کے گرداب میں غوطہ زن اپنی نوعیت کی انوکھی لرزہ طاری کرتی کہانی	137
تیسری انگلی	عامر ملک	خوف وہراس سے رگوں میں لہو منجمد کرتی ڈراؤنی...... خوفناک اور پرہیبت کہانی	151
بلیک ٹائیگر	ایم الیاس	تجسس اور سسپنس سے بھرپور واقعات جو پڑھنے والوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیں گے	156
بھول بھلیاں	ناصر محمود فرہاد	ضد اور ہٹ دھرمی پر قائم رہنے والے اکثر مصیبت کھڑی کردیتے ہیں یہ کہانی پڑھ کر دیکھئے	183
نحوست گزیدہ	ذوالقرنین خان	عقل کو حیران کرتا نادیدہ قوتوں کا عجیب و پراسرار شاخسانہ جو کہ ناقابل فراموش ہے	194
قوس قزح	ادارہ	قارئین کے بھیجے گئے اشعار جنہیں قارئین بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں......	210
پیشگوئی	عابد علی	کیا یہ حقیقت ہے کہ انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے، جس کا ثبوت کہانی میں موجود ہے	216
ساحر	ذیشان اقبال عظمی	عقل کو دنگ کرتی انسانی سوچ کے افق پر جھلمل کرتی منفرد، لاجواب اور شاہکار کہانی	240

ایڈیٹر وپبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کتاب مارکیٹ نیوار دو بازار کراچی: 32744391

☆ مومنو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے (لوگوں کے) گھروں میں گھر والوں سے اجازت لئے اور ان کو سلام کئے بغیر داخل نہ ہوا کرو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اور ہم یہ نصیحت اس لئے کرتے ہیں کہ شاید تم یاد رکھو۔ (سورۃ نور۔24 آیت 27)

☆ ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کئے ہیں ان کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے؟ اچھا اگر ان کے آباؤ اجداد نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ انہی کی پیروی کئے چلے جائیں گے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 170 سے 171)

☆ پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو تو جس طرح پہلے اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کرتے تھے اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 200)

☆ اور جب کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طرح دیکھا ہے اور اللہ نے بھی ہم کو یہی حکم دیا ہے کہہ دو کہ اللہ بے حیائی کے کام کرنے کا ہرگز حکم نہیں دیتا۔ (سورۃ اعراف 7 آیت 28)

☆ اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تمہارے ماں باپ اور بہن بھائی ایمان پر کفر کو ترجیح دیں تو ان سے دوستی نہ رکھو۔ (سورۃ توبہ 9 آیت 23)

☆ انہوں نے (فرعون کے سرداروں نے) جواب میں کہا "کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہمیں اس راہ سے پھیر دو جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے اور زمین میں تم دونوں (موسیٰ و ہارون) ہی کی سرداری ہو جائے اور ہم تمہاری بات ماننے والے نہیں ہیں۔ (سورۃ یونس 10 آیت 78)

☆ انہوں نے کہا "اے صالح، اس سے پہلے تو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں کیا تو ہمیں ان معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ تو جس طریقے کی طرف ہمیں بلا رہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال رکھا ہے۔ (سورۃ ھود 11 آیت 62)

☆ انہوں نے جواب دیا "اے شعیب کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں، جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ (سورۃ ھود آیت 87)

☆ پس اے نبیؐ تو ان معبودوں کی طرف سے کسی شک میں نہ رہ جن کی یہ لوگ پرستش کر رہے ہیں یہ تو (بس لکیر کے فقیر بنے ہوئے) اسی طرح پوجا پاٹ کئے جا رہے ہیں جس طرح پہلے ان کے باپ دادا کرتے تھے۔ اور ہم ان کا حصہ انہیں بھرپور دیں گے، بغیر اس کے کہ اس میں کچھ کاٹ کسر ہو۔ (سورۃ ھود 11 آیت 109)

☆ جن چیزوں کی اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو، وہ صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں۔ (سورۃ یوسف 12 آیت 40)

☆ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی نذیر بھیجا اس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہر نبیؐ نے ان سے پوچھا کیا تم اسی ڈگر پر چلے جاؤ گے خواہ میں تمہیں اس راستے سے زیادہ صحیح راستہ بتاؤں، جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ انہوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ جس دین کی طرف بلانے کے لئے تم بھیجے گئے ہو ہم اس کے کافر ہیں آخر کار ہم نے ان کی خبر لے ڈالی، اور دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔ (سورۃ حج 22 آیت 24)

☆ یہ کافر لوگ کہتے ہیں کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادا مٹی ہو چکے ہوں گے تو ہمیں واقعی قبروں سے نکالا جائے گا؟ یہ خبریں ہم کو بھی بہت دی گئی ہیں اور پہلے ہمارے آباؤ اجداد کو بھی دی جاتی رہی ہیں۔ مگر یہ بس افسانے ہی افسانے ہیں جو اگلے وقتوں سے سنتے چلے آ رہے ہیں۔ (سورۃ نمل 27 آیت 67 سے 68)

☆ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے کہ کیا یہ انہی کی پیروی کریں گے، خواہ شیطان ان کو بھڑکتی ہوئی آگ ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا رہا ہو۔ (سورۃ لقمان۔31 آیت 21)

☆ اور یہ دن ہیں کہ ہم ان لوگوں میں بدلتے رہتے ہیں۔ اور اس سے یہ بھی مقصود تھا کہ اللہ ایمان والوں کو ممیز کر دے اور تم میں سے گواہ بنائے اور اللہ بے انصافوں کو پسند نہیں کرتا اور یہ بھی مقصود تھا کہ اللہ ایمان والوں کو خالص مومن بنا دے اور کافروں کو نابود کر دے۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 140 سے 141)

☆ اللہ اس نعمت کو جو کسی قوم کو حاصل ہے نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت کو نہ بدلے۔ اور جب اللہ کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو پھر وہ پھر نہیں سکتی۔ اور اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ (سورۃ رعد 13 آیت 11)

☆ تمام بادشاہت اللہ ہی کی ہے آسمانوں کی بھی اور زمین کی بھی وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جسے چاہتا ہے بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹے بخشتا ہے یا ان کو بیٹے اور بیٹیاں دونوں عنایت فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے۔ وہ جاننے والا قدرت والا ہے۔ (سورۃ شوریٰ 42 آیت 49 سے 50)

☆ بھلا کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور کس نے تمہارے لئے آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اس سے سرسبز باغ اگائے۔ تمہارا کام نہ تھا کہ تم ان کے درختوں کو اگاتے تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی معبود ہے ہرگز نہیں بلکہ یہ لوگ رستے سے الگ ہو رہے ہیں۔ (سورۃ نمل 27 آیت 60)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

ساجدہ راجا ہندواں سرگودھا سے، میری طرف سے تمام پڑھنے والوں کو سلام، مصروفیت کی وجہ سے کچھ عرصہ ڈر کی خطوط کی محفل میں شرکت نہ کرسکی، لیکن ڈر سے دور نہیں رہی۔ چاہے جتنی مصروفیت ہو ڈر سے تعلق برقرار رہتا ہے۔ ہر ماہ جب تک ڈر ہاتھ میں نہ آجائے بہت انتظار رہتا ہے۔ ڈر پڑھے بغیر مہینہ گزرتا ہی نہیں۔ ڈر تو میرا پسندیدہ ترین رسالہ ہے مجھے ہر طرح کا موضوع پسند ہے لیکن ہارر آزمائی موسٹ فیورٹ، سو ڈر میری تمام توقعات کو بخوبی پورا کرتا ہے۔ تمام رائٹرز بہت خوب لکھتے ہیں اور حمیر اغلام حسین کیریو صاحبہ میری طرف سے آپ کو شادی بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ آپ کو بہت خوشیاں دے اور آپ اپنے ہمسفر کے ہمراہ بہت پرسکون زندگی گزاریں..... صبار مضان کی رائے سے میں بھی اتفاق کروں گی کہ ہر ماہ ٹاپ تھری اسٹوریز کا انتخاب ہو اس کے علاوہ آپ نے رائٹرز کے انٹرویو کا سلسلہ بھی شروع کرنا تھا ہمیں بڑے رائٹرز کے بارے میں جاننے کی بہت جستجو ہے پتہ نہیں کب شروع ہوگا؟

☆☆ ساجدہ صاحبہ: بہت بہت شکریہ کہ وقت ملتے ہی آپ نے ڈر کی محفل میں شرکت کی، صبار مضان کی خواہش اور آپ کی پسند پر عنقریب عمل ہوگا۔ امید ہے آپ ہر ماہ خطوط کی محفل میں شرکت فرما کر شکریہ کا موقع دیں گی۔

شائستہ سحر راولپنڈی سے، السلام علیکم، امید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ چند ماہ تک مصروفیات کی وجہ سے کوئی تحریر ارسال نہ کرسکی۔ اب فرصت ملتے ہی حاضر ہوئی ہوں۔ اپنی نئی تحریر انشاء اللہ بہت جلد ارسال کروں گی، مگر اس خط کے ہمراہ کوئی کہانی ارسال نہ کرسکی، کیونکہ ان دنوں میرے فائنل ایگزامز ہو رہے ہیں۔ بہت مصروف ہوں۔ میں نے بہتر سمجھا کہ بتادوں، 12 جولائی آخری پیپر سے فارغ ہوتے ہی نئی تحریر لکھ کر بھیج دوں گی۔ پھر ملاقات ہوگی۔ اجازت دیں۔ خدا حافظ۔

☆☆ شائستہ صاحبہ: بہت بہت شکریہ کہ وقت ملتے ہی آپ نے ڈر ڈائجسٹ کو یاد کیا، ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو فائنل ایگزام میں کامیاب و کامران کرے۔ نئی تحریر کا شدت سے انتظار ہے۔ Thanks۔

افشاں رمضان سرگودھا سے، ڈر میرا موسٹ فیورٹ رسالہ ہے۔ اس کی زیادہ تر کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جیسے آنکھوں کے سامنے واقعات چل رہے ہوں۔ اس ماہ بھی کہانیاں ہمیشہ کی طرح سپر تھیں۔ ایم اے راحت کی سنہری تابوت ٹھیک ہے! عثمان علی بھی بہت محنت سے لکھتے ہیں۔ زوہیب حسن سے گزارش ہے کہ کہانیاں زیادہ لکھا کریں تاکہ ہر ماہ ان کی تحریر پڑھنے کو ملے۔ میں یہ جو کہانی ''روح'' بھیج رہی ہوں یہ سو فیصد حقیقت ہے۔ امید ہے پسند آئے گی اور ڈر میں کوئی مقام پاسکے گی۔ بشرط کہ تعاون حاصل ہو۔ ڈر ڈائجسٹ کی ترقی کے لئے دعا گو اور آخر میں سب کو سلام۔

☆☆ افشاں صاحبہ: خوش ہو جایئے آپ کی سرکش روح جلوہ گر ہو رہی ہے، ہمارا تعاون ہمیشہ حاصل رہے گا، اگر کہانی کا موضوع منفرد ہو تب، آئندہ بھی آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

کشور نازو وہاڑی کرم پور سے، دل میں ہے یاد تیری آنکھوں میں خواب تیرا ہے، دور کے رہنے والوں تم کو سلام میرا..... یہ بتادوں کہ میں خیریت سے ہوں اور ڈر کے پورے اسٹاف کی خیریت چاہتی ہوں۔ اس ماہ کا شمارہ ملا تو پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کیوں کہ اس ماہ کا شمارہ بھی ہر ماہ کی طرح بہت اچھا تھا۔ میں ڈر کی خطوط کی محفل میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ میرے خط کا جواب مثبت طریقے سے دیا جائے گا۔ میری طرف سے تمام رائٹرز اور پڑھنے والے قارئین کو خلوص بھرا اسلام قبول ہو۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈر ڈائجسٹ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا کرے۔ اگلے ماہ تک کے لئے خدا حافظ۔

☆☆ کشور صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، خط لکھنے کے لئے بہت بہت شکریہ اور امید ہے کہ آپ بھی ہر ماہ خط ارسال کر کے شکریہ کا موقع ضرور دیں گی۔

ایس حبیب خان کراچی سے، امید ہے سب خیریت سے ہوں گے، سب سے پہلے میری طرف سے، مینجنگ ایڈیٹر خالد علی، چیف ایڈیٹر آصف حسن، ایڈیٹر شاہد علی، ڈر ڈائجسٹ کے پورے محنتی اسٹاف اور ڈر ڈائجسٹ کے تمام رائٹرز اور پڑھنے والوں کو رمضان کریم کی بہت بہت مبارکباد قبول ہو۔ رمضان کے مقدس اور بابرکت مہینے کے آغاز پر میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس

برکتوں اور رحمتوں کے مہینے سے فیض یاب ہونے کی سعادت نصیب کرے اور میرے ارض پاک پر آئی آفات کو دور کردے۔ (آمین) بات ہو جائے۔ جولائی 2012ء کے شمارے کی، کہانیوں میں ''لیٹر پیڈ'' ایک مختصر مگر بہت منفرد کہانی تھی؟ ''آسیبی حویلی'' بھی کافی پسند آئی، ''قاتل مردہ'' کافی پراسرار اور سنسنی خیز تحریر تھی۔ جس نے آخر تک اپنی گرفت قائم رکھی۔ ''اماوس کا غلام'' اس ماہ کی بہترین تحریر رہی، کہانی اپنے موضوع اور طرز تحریر کی وجہ سے اچھوتی رہی، اس ماہ کی تحریروں میں اس سے بہترین سبق آموز کہانی اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی، رائٹر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ قسط وار سلسلوں میں ''بلیک ٹائیگر'' کی پہلی قسط غیر متاثر کن تھی۔ دیکھتے ہیں کہانی شاید آگے جا کر اچھی لگے، ''سنہری تابوت'' کی دوسری قسط شاندار رہی، ہر سطر سنسنی خیز ثابت ہوئی، پوری قسط ایک ہی نشست میں ختم کردی اب اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ ڈر ڈائجسٹ کی کامیابی کے لئے ہمیشہ دعا گو۔

☆☆ ایس صاحبہ: خلوص نامہ ارسال کرنے اور کہانیوں کی پسندیدگی کے لئے شکریہ، ہر ماہ آپ جس خلوص سے ڈر ڈائجسٹ کو یاد رکھتے ہوئے کہانی ارسال کرتی ہیں اس کے لئے دیری دیری تھینکس۔

شفق شھکی سیالکوٹ سے، السلام علیکم، جولائی 2012ء کا ڈر ڈائجسٹ پڑھ کر دل بہت خوش ہوا، اس رسالے کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، میری نظر میں یہ ایک معیاری اور اعلیٰ درجے کا رسالہ ہے جو کہ اپنی منفرد انفرادیت کی وجہ سے تمام رسالوں میں اول ہے۔ ہر ماہ اتنی ساری ہارر کہانیوں کا معیار برقرار رکھنا بہت دل گردے کا کام ہے۔ میں ڈر کی پرانی قاری ہوں مگر ڈر کی محفل میں پہلی مرتبہ شرکت کر رہی ہوں۔ میں کالج کی طالبہ ہوں اور اپنے شوق کی خاطر ایک کہانی ''گندم والی مائی'' لکھ کر ارسال کر رہی ہوں۔ یہ میری پہلی کاوش ہے، تعاون کے لئے استدعا ہے، نیک دعاؤں کے ساتھ اللہ حافظ۔

☆☆ شفق صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم آپ کی ارسال کردہ کہانی بہت اصلاح طلب ہے آپ کوئی اور کہانی ڈر کے موضوع پر لکھ کر ارسال کریں، کوشش کیجئے گا کہ کہانی میں تسلسل برقرار رہے، لکھتے لکھتے آدمی لکھاری بن جاتا ہے، آئندہ ماہ بھی آپ کے خلوص نامہ کا انتظار رہے گا۔

صبا رمضان پنڈ دادنخان سے، ڈر ڈائجسٹ کا تازہ شمارہ اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے، تمام کی تمام کہانیاں بہت خوب ہیں، عثمان علی کی کہانی بہت پسند آئی، ویسے تمام رائٹرز بہت خوب اور محنت سے لکھ رہے ہیں، ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، جادوئی گڑیا مجھے بچکانہ کہانی لگی۔ ہر ماہ ڈر میں شائع ہونے والی کہانیاں اعلیٰ معیار کی ہوتی ہیں۔ میں اپنی کہانی اس امید پر بھیج رہی ہوں کہ حوصلہ افزائی ہوگی، اگر کوئی کمی نظر آئے تو پلیز! اسے سنوار لیجئے گا۔ لکھتے لکھتے ہی آدمی لکھاری بنتا ہے، میری کہانی ساتواں جنم شائع کرنے پر دل کی گہرائی سے شکریہ ادا کرتی ہوں، اس دعا کے ساتھ اب اجازت چاہوں گی۔ اللہ تعالیٰ ڈر ڈائجسٹ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا کرے۔

☆☆ صبا صاحبہ: خوش ہو جایئے نئی کہانی ''سرسراہٹ'' بھی جلوہ گر ہو رہی ہے۔ کبھی کبھار جادوئی طرز کی کہانیاں بھی ڈر میں شائع ہو جاتی ہیں۔ کم عمر والے بھی ڈر پڑھتے ہیں۔ خیر آئندہ ماہ بھی آپ کے خلوص بھرے خط کا انتظار رہے گا۔

عائشہ ماھین جہلم سے، السلام علیکم، ڈر ڈائجسٹ کو میں نے چند ماہ سے ہی پڑھنا شروع کیا ہے اور مجھے ان چند ماہ میں یہ ڈائجسٹ اتنا اچھا لگا ہے کہ اب میں ہر ماہ ڈر خریدتی ہوں۔ جون کے شمارے میں مجھے ناگ نقش، قصل موت اور خوف کہانیاں بہت اچھی لگیں۔

☆☆ عائشہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، مزاحیہ کہانی رائٹرز لکھتے نہیں کیونکہ ڈر کا موضوع صرف ہارر ہے۔ امید ہے آئندہ بھی آپ نوازش نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گی۔

فاریہ تبسم قصور سے، جولائی 2012ء کا ڈر ڈائجسٹ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔ آپ سے ایک شکایت ہے کہ آپ نے میرا نام تبسم کی جگہ تسلیم لکھا ہوا تھا۔ میرا خط غزل اور شعر شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ، امید ہے کہ اس بار بھی ڈر کے تمام قارئین کرام بخیریت ہوں گے۔ ڈائجسٹ ملتے ہی سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں۔ ایمان تازہ ہوگیا۔ اس کے بعد کہانیوں کی وادی میں چھلانگ لگائی تو سب سے پہلے بھیانک انجام رگ و پے میں اتر گئی۔ اس کے بعد موبائل کی روح، قاتل مردہ، آسیبی حویلی، دھوکا، ترکیب اور روح کا انتقام بڑی زبردست تھیں۔ سنہری تابوت، خونی کتے، رولو کا اور شمیر کا اس بار سب سے زیادہ قابل داد تھیں۔ واقعی پڑھ کر مزہ آیا۔ اس کے بعد میں اشعار کی دنیا میں گئی تو اپنے فیورٹ شاعر غلام نبی نوری کی شاعری پڑھ کر خوشی ہوئی۔

☆☆فاریہ صاحبہ: اب آپ کو تبسم ہی لکھا جائے گا تسلیم لکھنے پر معذرت، کہانیوں کی پسندیدگی اور آئندہ بھی ڈرڈائجسٹ کو یاد رکھنے کے لئے شکریہ قبول کیجئے، آئندہ ماہ بھی آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

ماہا خان کراچی سے، امید کرتی ہوں ڈر کا اسٹاف، خیر و عافیت سے ہوگا، میں ڈرڈائجسٹ کافی عرصے سے پڑھ رہی ہوں، بہت ہی اعلیٰ اور معیاری کہانیاں چھپتی ہیں، لیکن جس کہانی نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کر دیا وہ ہے ثاقب بشیر کی کہانی ''شیطانی کھیل''اس سے قبل یہ کبھی ڈرڈائجسٹ میں نظر نہیں آئے گویا یہ ان کی پہلی کہانی ہے ان کی لکھی ہوئی کہانی مجھے بے حد پسند آئی رائٹر صاحب کو میری طرف سے بہت بہت مبارکباد، ان کی کہانیوں کا آگے بھی انتظار رہے گا۔ ڈر کی سب ہی کہانیاں میں شوق سے پڑھتی آ رہی ہوں۔ قرآن کی باتیں پڑھ کر بہت سکون ملتا ہے۔ آئندہ خط باقاعدگی سے لکھنے کی پوری کوشش کروں گی۔ ڈر کے لئے بے شمار دعاؤں کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔ اللہ حافظ۔

☆☆ماہا صاحبہ: ڈر کی محفل میں ویلکم کہانی کی پسندیدگی کے لئے شکریہ، امید ہے ثاقب صاحب اپنے پڑھنے والوں کا خیال رکھتے ہوئے مزید کہانیاں ارسال کریں گے، آئندہ ماہ بھی آپ کے خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

منیر احمد ساغر میاں چنوں سے، السلام علیکم! امید ہے کہ ڈرڈائجسٹ کا تمام اسٹاف بخیریت ہوگا۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سمیت کراچی کے تمام لوگوں پر اپنی خصوصی رحمت نازل فرمائے۔ کراچی کے حالات پڑھ کر دلی طور پر بہت افسوس اور دکھ ہوتا ہے۔ نجانے یہ انسانی خون کی ہولی کب ختم ہوگی۔ نجانے یہ سب کچھ کرنے والے لوگ کیا چاہتے ہیں۔ کاش ان کے دل خوف خدا سے ڈر جائیں ہم سب روز دعائیں کرتے ہیں کہ کراچی کے خون ریز حالات درست ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری دعائیں قبول فرمائے۔ (آمین) اس ماہ کا شمارہ مارکیٹ سے بہت لیٹ موصول ہوا اور گھر آتے وقت اچانک بارش کی آمد سے شمارہ بری طرح سے بھیگ چکا ہے۔ اس لئے شمارے کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا۔ مگر پہلے کی طرح قوی امید ہے کہ شمارہ ہر بار کی طرح دلچسپ اور بہت بہت اچھا ہوگا۔ خط اس لئے لکھ رہا ہوں کہ خطوط کی محفل میں غیر حاضری نہ لگ جائے۔ پچھلے ماہ جون کا شمارہ مکمل طور پر پڑھ لیا ہے۔ جن میں ہمیشہ کی طرح رولو کا کی قسط نمبر 85 زبردست رہی۔ اس کے بعد خوف، رقص موت، شمیکا، پیاسی دوستی، قتل موذی، دولہا دلہن، جادوئی گڑیا، ناگ نقش، شکاری پڑھیں۔ تمام کہانیاں نہایت عمدہ اور دلچسپ تھیں۔ آخر میں آپ سب کے لئے دعا گو۔

☆☆منیر صاحب: قلمی لگاؤ سے لکھا ہوا خلوص نامہ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے پورے ملک پر اپنا فضل و کرم کرے اور بری نیت و مطلب پرستوں کو کیفر کردار تک پہنچائے، آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا دلی طور پر انتظار رہے گا۔ Thanks۔

قدیر رانا راولپنڈی سے، آداب عرض، غزلوں کی اشاعت پر شکریہ قبول فرمائیں امید ہے کہ تعاون کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ آپ کی خیریت اور پرچے کی کامیابی کے لئے ہر وقت سجدہ ریز رہتا ہوں اب اجازت دیں۔ اللہ حافظ۔

☆☆قدیر صاحب: آپ جیسے تمام قارئین کرام کا خلوص شامل حال رہا تو انشاء اللہ ڈرڈائجسٹ رواں دواں رہے گا۔ اگلے ماہ تک کے لئے اللہ حافظ۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈو الہ یار سے، انتظار ختم ہوا اور جولائی کا ڈرڈائجسٹ ہاتھوں میں آیا، دلی خوشی ہوئی، بلیک ٹائیگر کے لئے پیشگوئی ہے، کیا رولو کا کی طرح شہرت پائے گی۔ سنہری تابوت ہمارے خیال میں ناکام ہے۔ ہم لکھاری نہیں ہیں مگر صبا رمضان کے تبصرے سے اتفاق کرتے ہیں۔ حمیرا صاحبہ کو شادی مبارک ہم بھائیوں کی دعائیں زندگی میں خوشیاں لائے اور عمر دراز رہے۔ آمین..... غلام نبی نوری صاحب کا ایکسیڈنٹ کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا جلد صحت یابی کے لئے دعا گو ہیں۔ یاد رہے اسی سلسلے میں میری ایک آنکھ ضائع ہو چکی ہے اللہ کا کرم ہے چہرہ سلامت ہے کوئی شناخت نہیں کر سکتا کہ ایک آنکھ ضائع ہے ادارے کے شکر گزار ہیں ہمیں سالوں سال سے ہر ماہ رسالے میں جگہ دیتے ہیں بہت بہت شکریہ۔

☆☆شرف الدین صاحب: اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے اور آپ پر فضل و کرم رکھے۔ ہر ماہ آپ کا خلوص نامہ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی ہے کہ اتنی مصروفیات کے باوجود وقت نکال لیتے ہیں آئندہ ماہ بھی.....

اذان عزیز ٹنڈو آدم سے، السلام علیکم، تھکن زدہ ڈھلتی زرد شام جسم و جاں کو عجیب بے قراری میں ڈال جاتی ہے ستم بالائے ستم یہ کہ پڑھائی کروا ایسے موسم میں کوئی پڑھے تو کہاں تک پڑھے اور کیا پڑھے کورسز کی موٹی تازی کتابیں پڑھتے، امتحان کی تیاری کرتے

زندگی کٹھن لگنے تک کائنات کی رنگینیاں ماند پڑھنے لگیں تو ایسے میں یک لخت ڈرڈائجسٹ کا شمارہ تازہ ترین ہاتھ میں آتا ہے تو ساری پڑھائی کی تھکان اڑن چھو ہو جاتی ہیں ہاتھ میں آتے ہی سرورق دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے اور پھر قرآن کی باتیں پڑھ کر دین تازہ ہو گیا پھر عمران قریشی کی اذیت پسند پڑھ کر ہٹلر یاد آ گیا پھر عامر ملک کی کہانی قتل موذی پڑھ کر واقعی احساس ہوا کہ دین پر چلنے سے کتنی راحت ملتی ہے۔ پھر رولو کا ڈر کی جان پڑھ کر آنکھیں عش عش کر اٹھیں جب ریمش رویا، واقعی اس کا پیار سچا ہے ڈائجسٹ میں یہ میرا پہلا خط ہے میں دس سال سے ڈائجسٹ پڑھ رہا ہوں اللہ کرے آپ میرا خط شائع کر دیں مجھے حوصلہ ملے گا۔ اگر حوصلہ ملا تو اگلے ماہ بھی خط ضرور لکھوں گا اس ماہ میری برتھ ڈے ہے گفٹ سمجھ کر خط شائع کر دیجئے گا۔ مہربانی ہوگی۔

☆☆اذان صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید، برتھ ڈے مبارک ہو، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر جائز مقصد میں کامیابی و کامرانی دے۔ چلئے حوصلہ افزائی ہو گئی، آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا بہت شدت سے انتظار رہے گا۔

محمد بشیر احمد پرواز جنڈانوالہ سے، السلام علیکم! امید ہے ڈرڈائجسٹ کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا جولائی کا ڈر ڈائجسٹ 29 جون کو ملا تو دل باغ باغ ہو گیا۔ اپنا پیارا رسالہ دیکھ کر پھر گھر پہنچ کر سکون سے مطالعہ شروع کیا، سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھی۔ دلی سکون ملا پھر اپنے پیارے دوستوں کے اظہار خیالات پڑھے سب نے ہی ڈرڈائجسٹ کی تعریف کی تھی اور ان تمام دوستوں کا شکریہ، جنہوں نے میرے کلام کو پسند کیا۔ اس کے بعد ڈرڈائجسٹ کی کہانیوں کا مطالعہ شروع کیا تو سب سے پہلے ''رولو کا'' پڑھی جو ہمیشہ کی طرح جان دار تھی، اس کے بعد ''شمیکا'' کی آخری قسط پڑھی۔ ایم الیاس کی ''بلیک ٹائیگر'' اچھی کاوش ہے۔ اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ''ناصر محمود فرہاد'' کی والدہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

☆☆بشیر صاحب: پرخلوص خط لکھ کر آپ دل خوش کر دیتے ہیں کہانیوں کی تعریف اور قلمی لگاؤ کے لئے بہت بہت شکریہ قبول کریں۔

غلام نبی نوری کھڈیاں خاص سے، السلام علیکم، قوی امید ہے کہ ڈر کا پورا اسٹاف، تمام قارئین کرام بخیریت ہوں گے سب کو اللہ تعالیٰ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ الحمدللہ آپ سب کی دعاؤں اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے میں صحت یاب ہو گیا ہوں۔ جولائی 2012ء کا شمارہ بڑی کوششوں کے بعد ملا۔ ٹائٹل بڑا زبردست تھا جو اپنی نمایاں حیثیت ظاہر کر رہا تھا۔ اس کے بعد ورق گردانی کرتے ہوئے قرآن کی باتیں پڑھیں دل نور سے منور ہو گیا۔ خطوط کی محفل میں اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔

☆☆غلام نبی صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے Thanks، اپنی تحریر بھیجنے والا ہر آدمی حوصلہ افزائی کا متمنی ہوتا ہے اور ڈرڈائجسٹ اپنے قارئین کی تحریر ضائع نہیں کرتا۔ آئندہ ماہ تک کے لئے اللہ حافظ۔

راجہ باسط مظہر حامد جھنگی سے، میں ڈرڈائجسٹ کو تقریباً کافی عرصے سے پڑھ رہا ہوں، پر کبھی کوئی خط یا تحریر نہیں بھیجی، میں پہلی مرتبہ خط اور چند تحریریں بھیج رہا ہوں، Please ضرور شامل کیا جائے۔ ڈرڈائجسٹ اپنی مثال آپ ہے۔ مجھے تقریباً چھ، سات ماہ ہو گئے ہیں ڈرڈائجسٹ کو پڑھ رہا ہوں، ہر بار ایک سے بڑھ کر ایک ڈراؤنی کہانیاں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ اگر شاعری کی بات کی جائے تو وہ بھی ہر قسم کی پڑھنے کو ملتی ہے۔ ''آئی لو ڈرڈائجسٹ'' ڈرڈائجسٹ کی پوری ٹیم کو سلام۔ کچھ تحریریں بھیج رہا ہوں۔ ضرور شامل کرنا۔

☆☆باسط صاحب: ڈرڈائجسٹ میں ویلکم، ڈرڈائجسٹ اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، امید ہے آپ آئندہ ماہ بھی ڈر کو یاد رکھتے ہوئے خط ضرور ارسال کریں گے۔ Thanks۔

احسان سحر میانوالی سے، السلام علیکم، امید کرتا ہوں ڈر کا تمام اسٹاف خیریت سے ہوگا کافی عرصے کے مطالعہ کے بعد ڈر ڈائجسٹ کے لئے اپنی مختصر سی کاوش ارسال کر رہا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ آپ مایوس نہیں کریں گیا اور انشاء اللہ زندگی رہی تو وقفے وقفے سے تحریریں ارسال کرتا رہوں گا۔ آپ کی محبت اور خلوص کی وجہ سے ہم سب اکٹھے ہو کر ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور یہ سلسلہ چلتا رہنا چاہئے اللہ پاک ڈر کو ترقی کی کئی منزلیں عطا فرمائے آمین۔

☆☆احسان صاحب: خط لکھنے اور کہانی ارسال کرنے کے لئے شکریہ، مردہ پریڈ جلوہ گر ہو رہی ہے، امید ہے کہ آئندہ بھی اپنی کہانی ضرور ارسال کریں گے۔ شکریہ۔

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی کراچی سے، ماہنامہ ڈرڈائجسٹ کا اگست 2012ء کا شمارہ کالی کالی گھٹاؤں، دل دہلا دینے

والی آسمانی بجلیوں کی چمک دمک اور کڑک دار آوازوں کے ساتھ برسات کی رم جھم پھواروں اور بارشوں کے ساتھ ساتھ قارئین کے ہاتھوں کی زینت بن گیا ہے۔ خوفناک، ہولناک، دن رات کا چین اور نیندوں کو حرام کردینے والا شاہکار ڈراؤنے سرورق کو اجاگر کرتا ہوا لاجواب انوکھی کہانیوں دلچسپ لطائف، اعلیٰ معیاری غزلیات، نظموں، قسطوں اور دلچسپ اشعار کے ساتھ نگاہوں کو خیرہ کررہا ہے۔ ملک اور قوم کی آزادی کے دن کی یادگار عوام کے دلوں میں تروتازہ ہورہی ہے۔ باغوں، کھیتوں میں ہریالی ہی ہریالی نگاہوں میں دیدہ زیب ہے۔

☆☆ واجد صاحب: آپ کی غزل اور رائے پڑھ کر واقعی ایسا لگتا ہے کہ جیسے موسم خزاں میں اچانک بہار آجائے امید ہے میری خواہش کو آئندہ بھی مدنظر رکھیں گے اور مایوس نہیں کریں گے۔

محمد ولی ہمدرد کرم ایجنسی بکن سے، امید کرتا ہوں کہ ڈرڈائجسٹ کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ جون 2012ء کا ڈرڈائجسٹ پڑھ کر دل بہت خوش ہوا، خاص کر میری طرف سے ''شائستہ سحر صاحبہ کو دلی دعا وسلام، کیونکہ یہ میری پسندیدہ رائٹر ہیں ان کی کہانی بہت اچھی اور سبق آموز ہوتی ہے۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ ڈرڈائجسٹ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ویسے رسالے تو بہت سارے ہیں۔ لیکن ڈرڈائجسٹ جیسا رسالہ نہیں۔ کیونکہ یہ بہت اعلیٰ معیار کا حامل ہے۔ میں ڈرڈائجسٹ چھ سالوں سے پڑھ رہا ہوں، یہ عمدہ اور اعلیٰ رسالہ ہے۔ اس کی ساری کہانیاں بہت عمدہ، اچھی اور سبق آموز ہوتی ہیں۔

☆☆ محمد ولی صاحب: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ کا خط پڑھ کر خوشی ہوئی، کہانیاں پسند کرنے اور آئندہ بھی خط لکھنے کے لئے بہت بہت شکریہ۔

رانا ظفر اقبال جنڈانوالہ سے، السلام علیکم، امید کرتا ہوں کہ ڈرڈائجسٹ کی پوری ٹیم اور پیارے دوست سب خیریت سے ہوں گے، اس بار تو ڈرڈائجسٹ کا اپنا ہی الگ رنگ تھا۔ سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھ کر آغاز کیا تو دلی سکون ملا اور دل میں خوف خدا آیا۔ اس کے بعد تمام دوستوں کے خطوط پڑھے۔ سب نے بہت اچھے خیالات ظاہر کئے۔ ڈرڈائجسٹ کے بارے میں۔ ناصر محمود کا خط پڑھ کر افسوس ہوا کہ خدا کا ایک بہترین تحفہ ان سے بچھڑ گیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ناصر بھائی کی والدہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ ماں جیسی دنیا میں کوئی ہستی نہیں بڑوں نے سچ کہا ہے۔ ''ماؤں ٹھنڈیاں چھاؤں'' اللہ تعالیٰ ہر کسی کی ماں کا سایہ ان کے سر پر قائم رکھے۔ آمین۔ اس کے بعد ایک خط پڑھ کر خوشی بھی ہوئی جس میں ہماری پیاری رائٹر ''حمیرا غلام حسین کیریو'' کی شادی کی اطلاع تھی جو کہ بتائے بغیر پیا کے دیس چلی گئی۔ خیر دعا ہے کہ ہماری دوست سدا اپنے پیا کے گھر خوش اور آباد رہے۔ آمین۔ اگلے ماہ تک اجازت ڈرڈائجسٹ کے لئے نیک تمناؤں کے ساتھ اللہ حافظ۔

☆☆ رانا صاحب: یہ حقیقت ہے کہ ماں باپ کا کوئی بدل نہیں وہ لوگ خوش نصیب ہیں جن کے سروں پر والدین کا سایہ موجود ہے۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی قلمی لگاؤ سے بھرپور نوازش نامہ ارسال کریں گے۔

عمران احمد خانیوال سے، آپ سب کی خیریت کا طالب ہوں، میں ڈرڈائجسٹ کو بہت پسند کرتا ہوں، بہت عرصہ سے اس کا مسلسل مطالعہ کررہا ہوں، تمام کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ تمام رائٹرز بہت اچھا لکھتے ہیں۔ غزلیں بھی بہت اچھی ہوتی ہیں۔ یہ میرا پہلا خط ہے میں ڈرڈائجسٹ سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ اس لئے میں بھی ایک کہانی جوش بھیج رہا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ آپ میری کہانی شائع کرکے حوصلہ افزائی کریں گے تاکہ میں اور بھی کہانیاں لکھ پاؤں۔ اپنی رائے ضرور دیجئے گا۔ میں ڈرڈائجسٹ کے لئے دعا گو ہوں۔ خدا حافظ

☆☆ عرفان صاحب: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ کی کہانی جوش ٹھیک نہیں کوئی اور کہانی ارسال کریں، آئندہ ماہ بھی آپ کے خط کا شدت سے انتظار رہے گا۔

شہزادہ چاند زیب کراچی سے، السلام علیکم، امید ہے مزاج بخیر ہوں گے جولائی کا ڈرڈائجسٹ شاندار ریبلیک ٹائیگر، رولوکا، شمیکا، موبائل کی روح اچھی کہانیاں تھیں۔ اپنی تحریر خونی کتے کی اشاعت پر ڈرڈائجسٹ کا مشکور ہوں، مزید دو کہانیوں کے ہمراہ حاضر خدمت ہوں یہ کہانیاں بھی ڈر اور خوف کے موضوع پر ہیں۔ حوصلہ افزائی کا منتظر ہوں۔

☆☆ چاند زیب صاحب: آپ کی دونوں کہانیاں موزوں نہیں۔ ''شاکال اور شاہین'' جذبات سے ہٹ کر کہانی لکھیں۔ امید ہے کوئی اور اچھی کہانی ارسال کریں گے۔

آصف شہزاد الہ آباد قصور سے، امید ہے کہ ڈرڈائجسٹ کی پوری ٹیم بخیریت ہوگی۔ کچھ ضروری مصروفیت کی وجہ سے خطوط کی محفل میں حاضر نہ ہوسکا۔ جس کے لئے معذرت۔ پہلے تو یقین نہ تھا کہ آپ ڈر کے قارئین کی پرانی چیزیں بھی شائع کرتے ہیں لیکن جب میری غزلیں جو آپ کے پاس موجود تھیں آپ نے شائع کیں تو یقین کرنا پڑا کہ ڈر اپنے قارئین کی کوئی تحریر ضائع نہیں کرتا بشرط تحریر وہ معیاری ہو۔ اور یہ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ مصروفیت کے باوجود ڈر کا مطالعہ جاری رہا۔ میری تحاریر شائع کرنے کا شکریہ۔

☆☆ آصف صاحب: یہ حقیقت ہے کہ ادارہ ڈرڈائجسٹ کسی کی بھی کوئی معیاری چیز ضائع نہیں کرتا۔ آئندہ آپ ہر تحریر الگ الگ کاغذ پر لکھ کر بھیجا کیجئے گا۔ ورنہ صرف کوئی بھی ایک تحریر شائع ہوگی۔

رانا حبیب الرحمن گوجرہ سے، السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ ڈرماہنامہ کا پورا اسٹاف بخیریت ہوگا، جولائی 2012ء کا رسالہ بروقت 27 جون کو مل گیا تھا، جناب ایڈیٹر صاحب میں نے پچھلے ماہ ایک عدد خط کے ساتھ کچھ تحریریں اور غزلیں بھیجی تھیں جو شائع نہیں ہوئیں میں سینٹرل جیل لاہور میں قید جیل رہا ہوں اور جیلوں میں اکثر کاغذ اور قلم یا خط لفافہ نہیں ملتا جس کی وجہ سے ہم کچھ بھی لکھنے سے قاصر ہیں۔ بس پھر بھی ہم کوشش کرنے سے کاغذ قلم حاصل کرلیتے ہیں اور میں تمام ڈائجسٹوں میں خط یا تحریریں بھیجتا ہوں۔ سوائے ڈر کے اور اب میں نے بھی آپ کے ماہنامہ ڈر میں شامل ہونے کا ارادہ کرلیا ہے آخر میں اجازت چاہوں گا۔ اللہ حافظ۔

☆☆ رانا حبیب الرحمن صاحب: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید، اس سے پہلے آپ کا خط موصول نہیں ہوا، ہمارے دفتر میں ردی کی ٹوکری موجود نہیں ہے۔ آئندہ بھی آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔ Thanks۔

عبدالحمید ساگر کندیاں سے، السلام علیکم، امید ہے کہ مزاج اچھے ہوں گے، آپ کا بھیجا ہوا ڈر گھر والوں کو موصول ہوا، اور انہوں نے ہی اس کی اطلاع دی۔ کہانی کا سن کر بہت خوشی ہوئی، امید ہے آئندہ بھی کہانیوں کو قریبی شمارے میں جگہ دیں گے۔ دو نئی کہانیاں شدید مصروفیت کے باوجود زیر قلم ہیں۔ انشاء اللہ جلد ارسال کردوں گا۔ گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے ڈر کا مطالعہ کرنے سے قاصر ہوں لیکن امید ہے کہ تمام دوستوں نے اپنے اپنے قلم کا بھرپور جادو چلایا ہوگا۔ ڈرڈائجسٹ کی معرفت عمران قریشی کو سلام پہنچے، عمران قریشی صاحب سے درخواست ہے کہ مجھ سے رابطہ کریں میں بھی آج کل کوئٹہ میں ہوں۔ اب اجازت، اللہ نے چاہا تو پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ دے حوالے۔

☆☆ حمید صاحب: بہت بہت شکریہ کہ آپ نے بہت زیادہ مصروفیات کے باوجود ڈرڈائجسٹ کے لئے وقت نکالا اور رابطہ کیا، اچھے لوگ دنیا میں بغیر مطلب بھی اچھے سلوک کا مظاہرہ کرتے ہیں، آئندہ ملاقات تک کے لئے اللہ حافظ۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم، آپ خیریت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں شدید گرمی کی حالت میں شہر گیا وہاں بک اسٹال پر ماہ جولائی کا تازہ پرچہ دیکھ کر میرا دل بہت خوش ہوا۔ اس بار سرورق پہلے کی نسبت بہت اچھا تھا اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ ایک معیاری ڈائجسٹ ہے۔ ڈرڈائجسٹ کی تمام تحریریں اچھی ہیں اپنی اپنی جگہ پر۔ آپ جس پیار اور خلوص سے ہمیں یاد کرتے ہیں یہی جذبہ آپ کو خط تحریر کرنے پر مائل کرتا ہے۔ پرچے کا ہر عنوان انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ ہے۔ مثلاً قرآن کی باتیں، خطوط، کہانیاں، قوس قزح اور غزلیں۔ خطوط میں یادآوری اور غزل شائع کرنے پر میں آپ کا بے حد مشکور ہوں۔ اگر آپ پرچے میں کچھ تبدیلیاں کریں تو بہتر ہے جس سے پرچے کو چار چاند لگ سکتے ہیں۔ جن کہانیوں نے مجھے متاثر کیا مثلاً نفرت، دھوکا، معاوضہ، ہاتھ کی لکیریں، لیٹر پیڈ، آسیبی حویلی، خونی کتے، ساتواں جنم وغیرہ ان تمام قلمکاروں کو اچھی کہانیاں تخلیق کرنے پر میری طرف سے دلی مبارک ہو۔

☆☆ اسلم صاحب: آپ کی تحریر پڑھ کر واقعی دل بہت خوش ہوتا ہے، ہر ماہ آپ کے خط کا شدت سے انتظار رہتا ہے، امید ہے آئندہ بھی شکریہ کا موقع دیتے رہیں گے۔

☆☆☆

نوٹ: رائٹر حضرات متوجہ ہوں اکتوبر 2012ء کا ڈرڈائجسٹ سالگرہ نمبر ہوگا، لہٰذا سالگرہ نمبر کے لئے اپنی خاص کہانی اور دیگر تحریریں جلد از جلد ارسال کریں، تحریر پر سالگرہ نمبر ضرور لکھئے گا شکریہ۔ ہر تحریر الگ الگ کاغذ پر، Cell No اور مکمل ایڈریس کے ہمراہ لکھا کریں

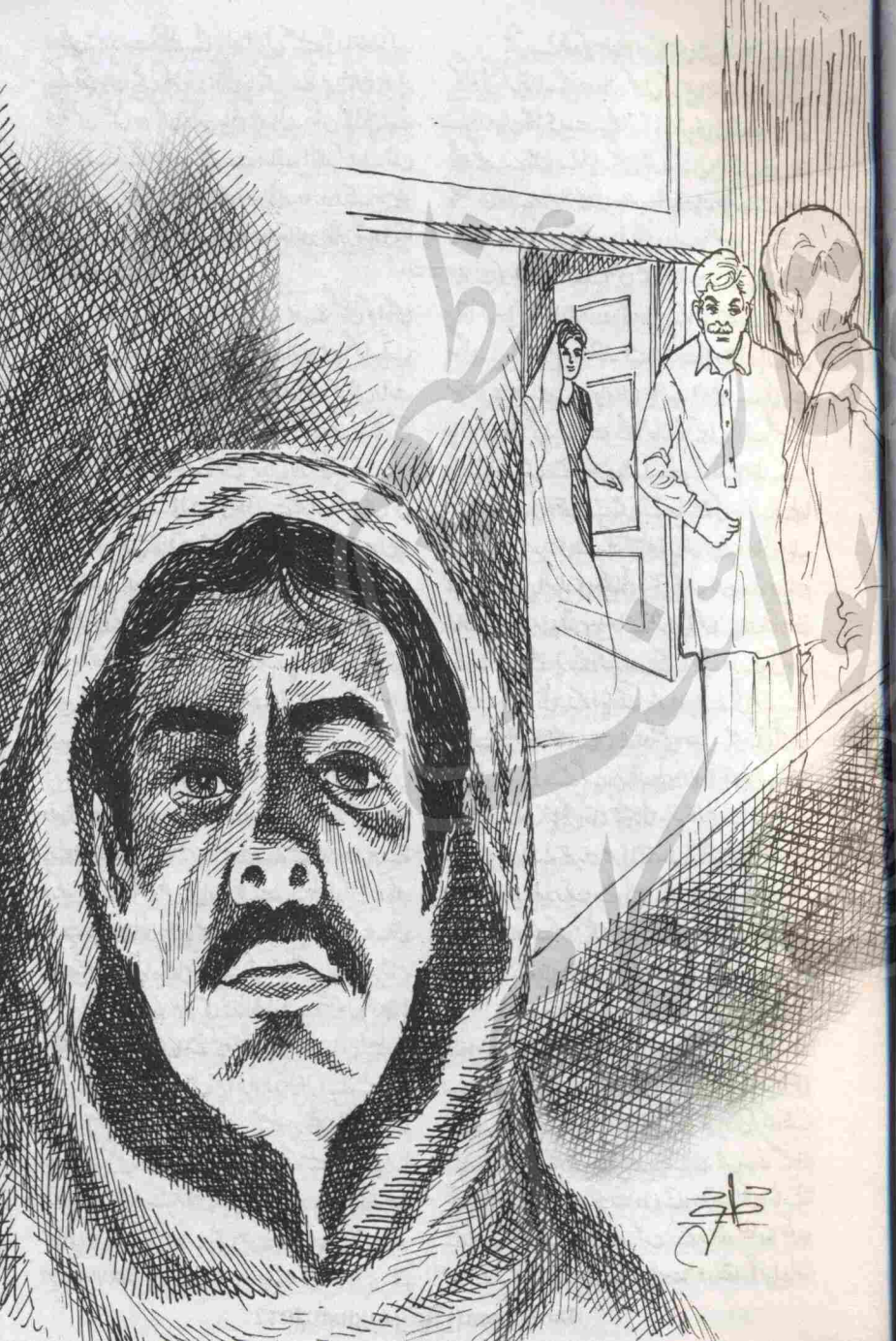

پاگل خانہ

عمران قریشی-کوئٹہ

پوری رات اور پھر صبح سویرے تک وہ نوجوان موت کے نرغے میں پھنسا رہا، اس کی تمام تر کوششیں اور ترکیبیں دم توڑ گئیں، موت اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھی رہی لیکن پھر آخر کار وہ بچ نکلا مگر کیسے؟.....

لفظ لفظ اور سطر سطر دل و دماغ پر دہشت طاری کرتی اپنی نوعیت کی دہشت ناک کہانی

میں ایک سفری سیلز مین ہوں۔ قصبہ قصبہ گھومنا میرا ذریعہ معاش ہے۔ اس لحاظ سے میرا واسطہ عجیب و غریب واقعات سے پڑتا رہتا ہے۔ ان واقعات کا مجموعہ میری عنقریب شائع ہونے والی کتاب "پاگل خانہ" میں آپ پڑھ سکتے ہیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اچھا ذریعہ معاش ہے۔ سفری مصنوعات بیچنا.....اور دوران سفر پیش آنے والے واقعات کو کتابی صورت دے کر مزید ذریعہ معاش پیدا کر لینا۔ آپ کی سوچ یقیناً درست ہے۔ لیکن واقعات حاصل کرنے کے لئے مجھے جو پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ ان سے آشنائی میں ہی رکھتا ہوں۔ اب میری موجودہ تحریر کو ہی لے لیجئے تحریر میں پیش آنے والے واقعات کے دوران، میں تابوت میں دفن ہوتے ہوتے بچا۔

یقیناً آپ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہوں گے۔ اگر نہیں.....تو تحریر کا مطالعہ شروع کیجئے۔ خود ہی کھڑے ہو جائیں گے۔ یہاں یہ بھی بتانا ضروری خیال کرتا ہوں کہ بیتے ہوئے واقعات کی مختصر کڑیاں جب میں نے دوستوں کے سامنے کھولنے کی کوششیں کیں۔ تب ان کا ہنس ہنس کر برا حال ہونے لگا۔ اور میں نے ہڑبڑا کر قصہ گوئی کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ حیرت کی بات ہے کہ جب میں ان واقعات کے متعلق سوچتا ہوں۔ تب میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ لیکن بیان کرنے پر لوگوں کا ردعمل مختلف ہوتا ہے۔ بہر حال رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں.....یا نہیں.....اس کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ تو تحریر کی جانب آیئے۔

میں گزشتہ سطور میں تحریر کر چکا ہوں کہ میرا ذریعہ معاش سفری مصنوعات کی خرید و فروخت ہے۔ بیوی بچے نہیں ہیں۔ اس لئے زیادہ تر آمدنی پس پشت کر کے میں نے ایک کھچاڑا سی فوکسی خرید لی۔ یہ گاڑیوں کے نام پر دھبہ ہونے کے باوجود میرے لئے تسکین کا باعث بنتی ہے اور میرے ذریعہ معاش میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے اور کچھ نہیں تو بعض اوقات شہر سے دور ہونے کی بدولت لوہے کی چھت ہی میسر آجاتی ہے۔ ہوٹل کے کرایوں سے بچنے کے لئے میں اکثر اوقات رات، فوکسی کے اندر گزارنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ جن اوقات کی میں بات چیت کر رہا ہوں۔ ان اوقات میں موسلا دھار بارش برس رہی تھی۔ میں نہایت اطمینان کے ساتھ سہانے موسم سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میرے سر پر لوہے کی چھت مجھے بارش سے محفوظ کئے ہوئے تھی۔ سردی کا خاطر خواہ انتظام بھی کمبل کی صورت میں موجود تھا۔ لطف اندوز ہونے کے یہ لمحات نہایت مختصر ثابت ہوئے۔ گاڑی نے

دو تین زبردست جھٹکے لئے۔ اور اڑیل بھینسے کی مانند سڑک کے درمیان میں کھڑی ہوگئی۔ میں نے پریشان ہو کر اگنیشن میں دو تین دفعہ چابی گھمائی۔ لیکن گاڑی نے کسمسانے کے علاوہ چلنے سے صاف انکار کردیا۔ میں نے گھبرا کر شیشے سے باہر نگاہ دوڑائی۔ دور دور تک سرسبز پہاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور بظاہر آبادی کا نام ونشان موجود نہیں تھا۔

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کمبل کو اچھی طرح جسم کے گرد لپیٹا۔ اور سیٹ پر دراز ہوتا چلا گیا۔ اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار موجود نہیں تھا۔ کہ میں رات اس پہاڑی علاقے میں گزارنے کی کوشش کروں۔ پھر صبح لفٹ لے کر نزدیکی قصبہ کا رخ کروں اور مکینک کو لے کر گاڑی تک آؤں۔ گاڑی میں کافی سے بھرا ہوا تھرموس بھی موجود تھا۔ جو چلتے وقت میں ہمیشہ ساتھ رکھ لیا کرتا ہوں۔ راستے میں تھکن دور کرنے کے لئے آزمودہ نسخہ ہے۔ میں نے گلاس کو لبالب اوپر تک بھرا..... پھر نہایت اطمینان کے ساتھ کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ کہ مجھے اطمینان بخش لمحات اڑچھو ہوتے محسوس ہوئے۔

میں نے ایک دفعہ پھر اطراف کا جائزہ لیا۔ اس دفعہ حیرت انگیز طور پر میں نے دور بہت دور پہاڑ کی سبز سبز چوٹیوں کے درمیان مختصر روشنیوں کے سلسلے کو نمودار ہوتے دیکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد پڑتا ہے۔ یہ سلسلہ گزشتہ کچھ لمحات کے دوران وہاں موجود نہیں تھا۔ نجانے اچانک ہی کیسے نمودار ہوگیا۔ پراسراریت کی انتہا تھی۔ یا پھر سرشام اندھیرا بڑھنے کے بعد کسی نے اچانک روشنیوں کو جلایا ہوگا۔ جو بھی تھا۔ میں نے کم وبیش پانچ منٹ اس فیصلے پر پہنچنے میں لگادیئے کہ اس پراسرار روشنیوں کے سلسلے کی جانب سفر کروں یا پھر نہیں..... فیصلے پر پہنچنا مشکل ہوتا جارہا تھا۔ لیکن مجبوراً مجھے سوچنے سمجھنے کے سلسلے کو منقطع کرنا پڑا۔ کیونکہ ضبط کے تمام بندھن ٹوٹنے والے تھے۔ اور طوفانی بارش کے قطروں میں مزید کچھ قطروں کا اضافہ ہونے والا تھا۔

میں نے خود کو سنبھالا اور گاڑی میں موجود چھتری کو ٹٹول کر تھاما۔ پھر دروازہ کھول کر چھاجوں برستی بارش کے درمیان گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ سردی کی شدید لہر نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔ لیکن میں نے پرواہ نہیں کی۔ اور چھتری تھامے پہاڑی کی جانب چل دیا۔ سڑک نے گھوم کر چکر کھایا۔ تب میں نے پہلی دفعہ روشنیوں کی مخرج عمارت کو سامنے دیکھا۔ ابھی میں عمارت سے کچھ فاصلے پر تھا کہ اچانک ہی عمارت نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہوگئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے عمارت کا وجود وہاں کبھی موجود نہ ہو۔ میرے چاروں جانب اندھیرے کی سیاہ چادر تن چکی تھی۔ یکلخت مجھے نجانے کیوں خوف محسوس ہونے لگا۔ میں نے واپس جانے کے لئے قدم موڑے۔

اب کی دفعہ جب میں نے سامنے کی جانب دیکھا تب مجھے پراسرار سی عمارت کا خفیف سا ہیولہ دکھائی دیا۔ عمارت کچھ پراسرار سی دکھائی دیتی تھی۔ میں نے دوبارہ عمارت کی جانب قدم بڑھانے شروع کردیئے۔ عمارت کے سامنے پہنچنے پر مجھے عمارت کے غائب ہونے کی وجہ معلوم ہوئی۔ بجلی کے اچانک بند ہوجانے کی وجہ سے عمارت یکلخت نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی تھی۔ بہرحال عمارت کے گیٹ پر بہت بڑا بورڈ آویزاں تھا۔ جس پر تحریر تھا۔ ”پاگل خانہ پنچ ٹاؤن“

میں نے حیرت بھری نگاہوں سے بورڈ کی تحریر کو پڑھا۔ الفاظ سفید رنگ سے لکھے گئے تھے۔ اس لئے مجھے پڑھنے میں دقت محسوس نہیں ہوئی۔ عمارت پاگل خانے کی تھی۔ اور پنچ ٹاؤن شاید قریبی ٹاؤن کا نام ہوگا۔

میں نے بارش میں بھیگتے ہوئے اپنے سراپے پر نگاہ دوڑائی۔ اور مسکراتے ہوئے سوچنے لگا۔ نادانستگی میں اپنے صحیح مقام تک آپہنچا ہوں۔ صدیوں پرانی چھتری میں سو کے قریب چھید تو موجود ہی تھے۔ جو بارش کو مجھ تک پہنچانے میں مددگار ثابت نہ ہورہے تھے۔ میں نے جھنجھلا کر چھتری کو بند کیا اور تیز قدموں کے ساتھ پاگل خانے کے گیٹ کی جانب چل دیا۔ گیٹ کے ساتھ گھنٹی کا بٹن موجود تھا۔ لیکن بجلی نا ہونے کی بدولت ناکارہ تھا۔ اس لئے

میں نے گیٹ کو مکمل قوت کے ساتھ دھڑ دھڑا دیا۔ کچھ دیر بعد بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ اور پھر جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ دروازہ کھولنے والا شخص مکمل نہیں تو زیادہ تر پاگل دکھائی دیتا تھا۔ اس کے جسم پر بنیان اور پینٹ کے علاوہ اور کپڑے موجود نہیں تھے۔ آنکھوں پر گول اور دبیز شیشوں والی عینک موجود تھی۔ اس نے معصومیت بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ پھر منمناتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”گڈ مارننگ سر.....“ میں نے حیرت بھری نگاہوں سے بادلوں بھرے آسمان کی جانب دیکھا۔ پھر اندھیرے کی دبیز چادر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اندھیری رات کو اچھی صبح سے تشبیہہ دے رہے ہو کیا۔ پاگل تو نہیں ہوگئے ہو.....؟“ اس نے میرے سوال کو مکمل طور پر نظر انداز کردیا۔ پھر ایک جانب ہٹتے ہوئے دوبارہ منمناتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اندر تشریف لے آیئے۔ کمانڈر کونڈور اپنے کمرے میں آپ کے منتظر ہیں۔“

”کمانڈر کونڈور.....“ میں زیرلب بڑبڑایا۔ عجیب بے تکا سا نام ہے۔ میں ایسے کسی بھی فرد کو نہیں جانتا تھا۔ پھر وہ میرا منتظر کیوں تھا۔ لیکن سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ اس مختصر وقت کے دوران میرے تمام کپڑے بمعہ جوتے پانی میں شرابور ہوگئے تھے۔ اس لئے میں نے خاموشی کے ساتھ اندر جانے میں عافیت جانی۔ گیٹ کے سامنے مختصر سرسبز لان بنایا گیا تھا۔ لان کے سامنے برآمدہ اور برآمدے کے سامنے شاید ہال کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں موجود تھیں۔ اس نے ہال کمرے کا رخ کیا۔ کمرے میں آتش دان روشن تھا۔ جس کی نرم گرم حدت مجھے اپنے جسم پر پھوار کی طرح گرتی محسوس ہوئی۔ اور میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ ہال کمرے میں بہت وسیع وعریض ڈائننگ ٹیبل بھی لگی ہوئی تھی۔ جس پر موم بتیوں کے اسٹینڈ آویزاں تھے۔ موم بتیوں کی زرد روشنی ماحول کو پراسرار بنائے دے رہی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل کے سامنے صوفہ سیٹوں کی قطار در قطار لگی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ لکڑیوں کی سیڑھیاں گھوم کر دوسری منزل کی جانب جارہی تھیں۔ پاگل کی منمناتی ہوئی آواز سے ہال کمرے کا ماحول گونجا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

”جناب..... آپ صوفے پر تشریف رکھئے۔ میں آپ کے لئے خشک کپڑوں کا بندوبست کرتا ہوں۔“ میں جواب دیئے بغیر خاموشی کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔

وہاں سے قریبی دیوار پر بہت بڑی قد آدم تصویر آویزاں تھی۔ تصویر میں تھری پیس سوٹ پہنے ایک بوڑھا اور باوقار شخص ہاتھ میں تمباکو والا پائپ تھامے کھڑا تھا۔ میرے خیال میں تصویر پاگل خانے کے ڈائریکٹر کی ہوسکتی تھی۔ لیکن میں نے فوراً ہی خیال کی نفی کردی۔ کیا کسی پاگل خانے کا ڈائریکٹر اتنا پروقار اور نفیس انسان ہوسکتا تھا۔

ناممکن..... وہ یقیناً پنچ ٹاؤن کا کوئی سرکردہ اور اہم سماجی کارکن رہا ہوگا۔ اور پنچ ٹاؤن کے افراد اعزاز کے طور پر اس کی تصویر کو گھروں میں آویزاں کرتے ہوں گے۔ لیکن پاگل خانے میں تصویر کی موجودگی میری سوچ سے بالاتر تھی۔

میں نے دوبارہ ہال نما کمرے کا تفصیلی جائزہ لیا۔ قد آدم تصویر کے ساتھ ایک چھوٹا دروازہ موجود تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے کھول دیا۔ وہ باتھ روم تھا۔ لیکن مسئلہ تھا کہ وہاں روشنی کا انتظام موجود نہیں تھا۔ میں نے جھنجھلا کر ڈائننگ ٹیبل پر موجود بتیوں کے اسٹینڈ پر سے ایک موم بتی اٹھائی۔ اور پھرتی کے ساتھ باتھ روم میں گھس کر دروازہ بند کردیا۔ باتھ روم میں کموڈ کے علاوہ باتھنگ ٹب بھی موجود تھا۔ جو اوپر تک پانی سے لبریز تھا۔ میں نے بتی کو باتھنگ ٹب کے اوپر رکھا۔ تب اچانک ہی میری نگاہ ٹب کے اندر موجود پانی پر پڑی۔ مجھے پاگل خانے کی زمین ہلتی محسوس ہوئی۔ پانی کا رنگ گہرا سرخ تھا۔ بالکل خون کی مانند..... میں نے حیرت کے عالم میں ہاتھ کو پانی میں ڈبویا۔ پھر ناک کے قریب لاکر سونگھا، پانی میں خون کی بو موجود تھی۔ یقیناً یہاں کسی انسان کو قتل کیا گیا تھا۔ اور قاتل پاگل خانے میں موجود تھا۔ ہوسکتا ہے دروازہ کھولنے والا پاگل ہی قاتل ہو۔ مجھے محتاط رہنا چاہئے تھا۔

اچانک باتھ روم میں بھونچال پیدا ہونے لگا۔ مجھے دروازہ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ باہر موجود افراد دروازے کو اس شدت سے دھڑ دھڑا رہے تھے۔ جیسے وہ دروازہ کھولنے کی نہیں بلکہ توڑنے کی کوشش کررہے ہوں۔ میں نے ہڑبڑا کر موم بتی کو باتھ ٹب کے کنارے ایڈجسٹ کیا۔ تب میری نگاہ اچانک ہی فرش پر پڑی۔ وہاں لاش کو گھسیٹنے کے نشانات موجود تھے۔ دروازہ اب گرنے کے قریب ہوچکا تھا۔ میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں چٹخنی نیچے گرا کر دروازہ کھول دیا۔

وہ سامنے موجود تھا۔ اس کے پیچھے دو مزید افراد بھی کھڑے تھے۔ جن کے چہرے ناکافی روشنی کی بدولت صاف دکھائی نہیں دیتے تھے۔ میں نے دروازہ کھلتے ہی پریشان لہجے میں ان تینوں کی جانب دیکھتے ہوئے احتجاج بھرے لہجے میں کہا۔

"مجھے سردی کی بدولت شدت سے حاجت محسوس ہورہی تھی۔ اس لئے اجازت لئے بغیر باتھ روم کی جانب کھینچتا چلا آیا۔ امید ہے آپ محسوس نہیں کریں گے۔" وہ نرم گرم لہجے میں بولا۔

"محسوس کرنے کی کیا بات ہے۔ تم حاجت سے فارغ ہوسکتے ہو۔ ہم باہر تمہارے منتظر ہیں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر دروازے کو جھٹکے کے ساتھ بند کردیا۔ اور کموڈ پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ یہ پاگل خانہ کم اور پراسرار حویلی زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ مجھے جلد از جلد یہاں سے واپس گاڑی کا رخ کرنا چاہئے۔ باہر موجود اشخاص کے تیور درست معلوم نہیں ہورہے تھے۔ کسی بھی حتمی فیصلے پر پہنچے بغیر میں کموڈ سے اٹھ گیا۔ کہیں وہ تینوں دوبارہ دروازہ توڑنے کی کوشش کرنے لگیں۔ دروازہ کھول کر جب میں باہر نکلا۔ تب میں نے ان تینوں کو اپنا منتظر پایا۔ اب باقی دونوں کا حلیہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ان میں سے ایک لمبا تڑنگا..... پتلا دبلا شخص تھا۔ اس کا چہرہ لمبوترا اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ کپڑوں پر سالن کے داغ لگے ہوئے تھے۔ دوسرا شخص کوتاہ قامت..... بال بکھرے ہوئے..... اور آنکھیں بھینگی تھیں۔ دروازہ کھولنے والے شخص کا نام اسٹنٹ بیری تھا۔ لمبے قد والے شخص کا نام ٹام..... کوتاہ قامت بال بکھرے ہوئے شخص کا نام سونی تھا۔ انہوں نے مجھے متبادل کپڑے فراہم کئے۔ میں نے ایک دفعہ پھر باتھ روم میں جا کر لباس تبدیل کیا۔ پھر ہال کمرے میں آبیٹھا۔ وہ تینوں بت بنے صوفوں پر براجمان تھے۔

سامنے موجود ٹیبل پر بھاپ اڑاتی کافی موجود تھی۔ میرے صوفے پر بیٹھتے ہی بھینگی آنکھوں والے سونی نے کافی کا کپ اٹھا کر میرے ہاتھوں میں تھمادیا۔ میں نے ناچاہتے ہوئے بھی کپ ہاتھوں میں تھام لیا۔

پھر ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں کمپنی کے کام سے ڈیلی ٹاؤن جارہا تھا۔ شوگر کی بیماری کی بدولت حاجت محسوس ہوئی۔ اس لئے مجبوراً یہاں چلا آیا۔ لیکن زیادہ دیر یہاں رک نہیں سکتا۔ اگر آپ تینوں ناراض نہ ہوں۔ تو مجھے اجازت دیجئے۔ میں جلد از جلد یہاں سے رخصت ہوکر ڈیلی ٹاؤن کی جانب روانہ ہونا چاہتا ہوں۔" وہ تینوں پتھر کے بت بنے میری جانب دیکھتے رہے۔ لیکن جواب کسی نے بھی نہیں دیا۔ تب میں دوبارہ گلا کنکھارتے ہوئے بولا۔

"شوگر کی بدولت میرے لئے کافی پینا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے معذرت کے ساتھ تکلیف دہی کی معافی چاہتے ہوئے اجازت چاہوں گا۔" میں بات کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ پتھر سے بنے ہوئے چہروں پر تغیر پیدا ہوا۔ پھر اسٹنٹ بیری سپاٹ لہجے میں منمنایا۔

"کمانڈر کونڈور کے آنے سے پہلے تم یہاں سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے یہ ان کا حکم ہے۔"

میں دوبارہ پریشان لہجے میں بولا۔ "لیکن میں یہاں زیادہ دیر..... بات درمیان میں رہ گئی۔ لمبا تڑنگا نام صوفے سے کھڑا ہوا۔ ابھی میں سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ اس کا فولادی مکا میرے چہرے پر لگا۔ میں کٹے ہوئے شہتیر کی مانند صوفے پر گر گیا۔ تمام کمرہ مجھے گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے سر کو جھٹکا..... پھر چہرے کو سہلاتے ہوئے بے بس نگاہوں کے ساتھ ان تینوں کی جانب دیکھنے لگا۔ لیکن مکا رسید کرنے کے بعد نام دوبارہ مشینی

روبوٹ کی مانند صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسٹنٹ بیری اور سونی بھی دوبارہ پتھر کے بت کی صورت اختیار کر گئے تھے۔

میں نے پریشان نگاہوں سے دروازے کی جانب دیکھا۔ اسے بند کر کے کنڈی لگادی گئی تھی۔ مجھے اس پراسرار ماحول میں وحشت محسوس ہونے لگی۔ لیکن یہاں سے فرار بھی اب ممکن نہیں رہا تھا۔ ہال کی سیڑھیوں پر قدموں کی آواز ابھری۔ پتھر کے بت بنے تینوں افراد کے جسموں میں حرکت پیدا ہوئی۔ اور وہ مشینی روبوٹ کی مانند اٹینشن کھڑے ہوگئے۔ ان تینوں کی نگاہیں زمین پر مرتکز تھیں۔ جبکہ میری نگاہیں سیڑھیوں کی جانب متوجہ تھیں۔ پھر سیاہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس ایک نوجوان سیڑھیوں پر نمودار ہوا۔ اس کے عورتوں کی مانند لمبے بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کوٹ کی آستینیں زبردستی اوپر کھنچی ہوئی تھیں، اور اس کے بازوؤں کی صحت مند مچھلیاں اترچڑھاؤ کی بدولت پھڑک رہی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ فلم کے کسی ہیرو سے کم دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سیڑھیاں اتر کر وہ میرے سامنے صوفے پر آبیٹھا۔ پھر نہایت مہذب لہجے میں بولا۔

"میں اپنے معزز مہمان کو پیچ ٹاؤن پاگل خانے میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ آپ کو ہماری میزبانی سے کسی بھی قسم کا گلا شکوہ محسوس نہیں ہوگا۔"

میں نے اپنے چہرے پر لگے ٹام کے زوردار مکے والی جگہ پر موجود گومڑ کو سہلانا شروع کردیا۔ میرے جسم میں موجود بے چینی کی لہر دم توڑ چکی تھی۔ اور اب میں اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر آزاد چھوڑنے کے بعد کسی حد تک مطمئن ہوچکا تھا۔ میرے خیال کے مطابق یہاں سے فرار ہونے کے لئے ان چاروں کو مطمئن رکھنا ضروری تھا۔

"آپ کی ذرہ نوازی کہ آپ نے مجھے پاگل خانے کا مہمان بننے کا شرف دینے کا اعزاز دیا۔ کیا میں پوچھنے کی جسارت کرسکتا ہوں کہ آپ تینوں کی پاگل خانے میں حیثیت کیا ہے؟" میں تیزی سے سوال تو کر بیٹھا۔ لیکن غلطی کا احساس ہونے کے فوراً بعد پچھتاتے ہوئے میں نے چاروں کے چہرے پر نگاہ دوڑائی۔ لیکن وہاں کسی بھی قسم کے تاثرات کو مفقود پایا۔ وہ دوبارہ پتھر کے بت کی صورت اختیار کرچکے تھے۔ سوائے تھری پیس سوٹ والے شخص کے..... اس کی نگاہیں میرے چہرے پر مرتکز تھیں۔ نجانے ان میں ایسا کیا تھا کہ مجھے اپنے جسم میں سردی کی لہر دوڑتی محسوس ہونے لگی۔ اس کی آنکھیں کبوتر کے خون کی مانند سرخ تھیں۔

وہ بولا۔ "معزز مہمان..... ہم چاروں کی حیثیت یہاں ایسے پاگلوں سے زیادہ نہیں ہے۔ جو علاج کی نیت سے یہاں آئے ہوں۔"

اس دفعہ مجھے زمین میں زلزلے جیسی کیفیت محسوس ہوئی۔ سینے میں سانس اٹکنے لگا۔ میں نے بمشکل تھوک کو نگلا۔ اور بے چارگی کے عالم میں چاروں پاگلوں کے پاگل وجود پر نگاہ دوڑائی۔ وہ کہتا چلا جارہا تھا۔

"میرا نام کمانڈر کونڈور ہے اور یہ میرا اسسٹنٹ..... بیری ہے۔ اس وقت وقتی طور پر پاگل خانے پر ہمارا اختیار ہے۔ پرنسپل ایبٹ سن اور پاگل خانے کا مختصر اسٹاف اوپر والے کمرے میں آرام کررہے ہیں۔" میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"کیا مطلب آرام کررہے ہیں۔ فرائض سے غفلت برتنے پر انہیں نوکریوں سے معطل بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہ اچھا اسٹاف ہے۔ مریض پاگل خانے میں دندناتے پھر رہے ہیں اور اسٹاف کمروں میں آرام کررہا ہے۔" میرا لہجہ آخری فقروں کے دوران تلخ ہونے لگا۔

کمانڈر کونڈور بولا۔ "ان تینوں کی طبیعت ناساز ہے۔ ہم نے انہیں نمک ملے گرم پانی سے غسل دینے کے بعد آرام کرنے میں منتقل کردیا ہے۔ یہ ایک آزمودہ نسخہ ہے۔ جسم کی درد ایسے رفاع ہوجاتی ہے۔ جیسے سورج رات کی تاریکی کو دور کردیتا ہے۔" اس دفعہ مجھے اپنے جسم پر چیونٹیاں رینگتی محسوس ہونے لگیں۔ اور مجھے باتھ روم میں موجود ٹب میں خون ملا پانی یاد آگیا۔

دور کہیں تڑاخ کی آواز کے ساتھ بجلی گری۔ لمحہ بھر کے لئے ماحول روشن ہوا۔ پھر دوبارہ موم بتیوں کی زرد

روشنی کا تسلط قائم ہوگیا۔ میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"وہ کب سے آرام کررہے ہیں۔"

کمانڈر بولا۔ "پرنسپل صاحب کل رات کو سوئے تھے۔ جبکہ اسٹاف آج صبح سے آرام کررہا ہے۔ اگر آپ پرنسپل صاحب سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں تو میں کرواسکتا ہوں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کمانڈر کونڈور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرکے اوپر جاتی سیڑھیوں کی جانب چل دیا۔ اسسٹنٹ بیری اور اس کے ساتھی صوفے پر ہی بیٹھے رہے۔ دوسری منزل کی راہداری میں تین کمروں کے دروازے موجود تھے۔ کمانڈر پہلے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ پھر ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔

"منہ سے آواز نکالنے کی کوشش مت کیجئے گا۔ اسٹاف کی تو خیر ہے۔ لیکن پرنسپل صاحب کی آنکھ کھل جائے۔ میں اسے برداشت نہیں کرسکتا ہوں۔" میں نے دوبارہ اثبات میں سر ہلادیا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اور کمرے میں داخل ہوگیا۔ میں نے بھی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کمرے میں قدم رکھ دیا۔ "کمرے میں ایک لائن میں تین بستر لگے ہوئے تھے۔ اور تین مرد گلے تک سفید چادریں اوڑھے لیٹے تھے۔ ان کے چہرے موت کی زردی کی بدولت سفید لٹھے کی مانند نچڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ پہلی نظر میں ہی میں جان گیا کہ وہ زندہ نہیں تھے۔

کمانڈر کونڈور پہلے پلنگ کے قریب پہنچ کر باآہستگی بولا۔

"یہ پرنسپل ایبٹ سن ہیں۔ ان کی طبیعت ناساز ہے۔ اس لئے انہیں جگانا مناسب نہیں ہوگا۔ آپ مختصر ملاقات کرسکتے ہیں۔ تفصیلی ملاقات صبح ہوگی۔"

میں نے آگے بڑھ کر پلنگ پر لیٹے ہوئے شخص کی لاش کا جائزہ لینا شروع کیا۔ لاش اسی باوقار شخص کی تھی۔ جس کی تصویر میں نیچے ہال کمرے میں آویزاں دیکھ چکا تھا۔ اس وقت وہ سونے کے کپڑوں میں ملبوس تھا۔ چہرے پر کسی بھی قسم کا کوئی زخم موجود نہیں تھا اور چادر کو اٹھانا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ لیکن سر کے نیچے موجود تکیہ خون سے مکمل طور پر لبریز تھا۔ میں نے باقی دونوں کا معائنہ کیا۔ ان کے تکیوں پر بھی خون موجود تھا۔ لیکن موت میرے اندازے کے مطابق دم گھٹنے کی بدولت واقع ہوئی تھی۔ کیونکہ دونوں کی آنکھیں حلقوں سے باہر تھیں اور شدت تکلیف کی بدولت زبان ہونٹوں سے باہر لٹک رہی تھی۔ چہرے پر آبلے بھی موجود تھے۔ میں خوف کی بدولت تھر تھر کانپنے لگا۔ میں زندگی میں پہلی دفعہ لاشوں کو اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے دو لاشوں پر کرب کے ایسے تاثرات ثبت تھے۔ جنہیں میں تمام زندگی فراموش نہیں کرسکوں گا۔

کمانڈر کونڈور میرے پہلو میں ہاتھ باندھے خاموش کھڑا تھا۔ میں نے اس کی جانب مڑتے ہوئے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں ہمیں نیچے چلنا چاہئے۔ میں ان کے آرام میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا ہوں۔" کمانڈر نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور نیچے ہال کمرے کی جانب چل دیا۔ ہال کمرہ سنسان پڑا تھا۔ باقی کے تینوں پاگل نجانے کہاں جاچکے تھے۔ صوفے پر بیٹھنے کے بعد میں نے کمانڈر کونڈور سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ محسوس نہ کریں تو میں اب اجازت چاہوں گا۔ میری گاڑی یہاں سے کچھ دور سڑک پر کھڑی ہے اور مجھے جلد از جلد ڈیلی ٹاؤن پہنچ کر کچھ نہایت ضروری کام نپٹانے ہیں۔" کمانڈر کونڈور نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ایسا اب ممکن نہیں..... سونی کھانا تیار کرنے کچن میں جاچکا ہے۔ اور میں آپ کو کھانا کھائے بغیر یہاں سے واپس نہیں جانے دوں گا۔"

"لیکن مجھے بھوک نہیں ہے۔" میں نے بات درمیان میں کاٹتے ہوئے کہا۔ "میرے لئے ڈیلی ٹاؤن جانا بے حد اہم ہے۔ اچھا میں وعدہ کرتا ہوں۔ ڈیلی ٹاؤن سے واپس آتے ہوئے یہاں ضرور آؤں گا۔ کھانا کھانے کے علاوہ پورا ایک دن یہاں بسر کروں گا۔"

"نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ سونی بہت اچھا کک ہے۔ اس کی نظر میں اس بات کی اہمیت زیادہ ہے کہ اس کے ہاتھوں سے پکے ہوئے کھانے کی تعریف کی جائے۔ اگر آپ کھانا کھائے بغیر یہاں سے واپس چلے گئے۔ تب وہ اسے نفرت کے معنوں میں شمار کرے گا۔" پھر وہ اچانک ہی کھسک کر میرے قریب آبیٹھا۔ میں نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی۔ لیکن جگہ کی کمی کی بدولت ناکام ہوگیا۔ وہ سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

"وہ تینوں پاگل ہیں۔ غصے کے عالم میں کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ مہربانی کرکے انہیں ناراض نہ کیجئے گا۔ ورنہ حالات کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔ پرنسپل کے ساتھ لیٹے ہوئے اسٹاف کے ممبروں نے بھی انکار کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ٹام اور سونی نے ان کی ایک بھی نا چلنے دی اور زبردستی انہیں نمک والے پانی کا غسل دیا۔"

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گے۔ کہ معاملہ کیا ہوا تھا؟ جب تک کھانا تیار نہیں ہوتا۔ تب تک وقت گزاری کے لئے مناسب ہوگا۔"

"ہاں کیوں نہیں..... میں خود بھی ایسا ہی چاہتا ہوں۔ کھانا تیار ہونے تک ہمارے پاس مزید کوئی کام بھی باقی نہیں بچا۔ اور آپ کو ایک پرائیویٹ بات بتاؤں۔ مجھے بچپن سے کہانیاں سنانے کا بہت شوق رہا ہے۔ یہ کہانی نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔ لیکن میں آپ کو کہانی کی طرز پر سناتا ہوں۔" پھر اس نے جو کہانی سنائی وہ میں قارئین کو اس کی زبانی سناتا ہوں۔

بیچ ٹاؤن کا یہ پاگل خانہ امیر و کبیر گھرانے کے پاگلوں کے لئے خصوصی طور پر تیار کیا گیا تھا۔ اسٹاف بھی نہایت مختصر اور منجھا ہوا ہونے کے علاوہ پڑھا لکھا بھی تھا۔ گزشتہ کچھ دنوں کے دوران کرسمس کی چھٹیوں پر جب اسٹاف خصوصی رخصت لے کر کرسمس منانے اپنے گھروں کی جانب چلا گیا، تب پاگل خانے میں سوائے پرنسپل ایبٹ سن اور چار پاگلوں کے علاوہ مزید کوئی باقی نہیں بچا۔ چاروں پاگل بے ضرر تھے۔ ایک دو مہینے بعد انہیں پاگل خانے سے رخصت ملنے والی تھی۔ شاید یہی سوچ کر پرنسپل نے اسٹاف کو چھٹی دے دی تھی۔ پاگل خانے کا علاج نہایت مہنگا ترین تھا۔ اس لئے عموماً پاگلوں کی تعداد کم ہی رہتی تھی۔ بہرحال چاروں پاگل اپنے شفیق اور محترم پرنسپل کا نہایت احترام اور اس سے پیار کرتے تھے۔ جس رات اسٹاف کرسمس کے لئے جاچکا، اس سے اگلی رات کی بات ہے۔

صبح سے برف باری کا سلسلہ جاری وساری تھا۔ بلکہ رات ہونے تک اس سلسلے نے طوفان کی صورت اختیار کرلی۔ سردی کی شدت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔ پرنسپل صاحب نے تمام کمروں کے آتش دان روشن کردیئے۔ چاروں پاگل کام کرنے میں ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ صبح کرسمس کی خوشی میں پرنسپل صاحب کچھ زیادہ ہی شراب حلق میں اتار چکے تھے۔ اس لئے اس وقت ان کا جسم شراب کے نشے میں ٹوٹ رہا تھا۔ نشہ تو تھوڑی سی حفاظتی تدابیر کی بدولت رفاہ ہوگیا۔ لیکن جسم کا درد شاید سردی کی شدت یا پھر برستی برف باری کے دوران کام کرنے کی بدولت مزید شدت اختیار کرتا چلا گیا۔ رات کو آتش دان کے قریب بیٹھتے ہوئے پرنسپل صاحب نے چاروں پاگلوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"میرے پیارے بچو.....! میرے جسم میں نہایت شدت کے ساتھ درد ہورہا ہے۔ جسکی بدولت میں آج تمہیں کہانی نہیں سنا سکتا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ تم چاروں ناراض نہیں ہوگے اور میری طبیعت کو مدنظر رکھتے ہوئے آج کی رات اپنے کمروں کا رخ کروگے۔" اپنے پرنسپل کی عاجزانہ التجا سننے کے بعد چاروں پاگلوں کے دل پسیج کر رہ گئے۔ وہ پرنسپل کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن سب کچھ ان چاروں کے بس سے باہر تھا۔ پھر بھی کمانڈر کونڈور ہمدردانہ لہجے میں بولا۔

"پرنسپل صاحب اگر آپ کہیں تو ہم چاروں آپ کا جسم دباسکتے ہیں اور اگر چاہیں تو ڈسپرین کی گولی میرے کمرے میں موجود ہے۔ میں پانی میں حل کرکے لے آتا ہوں۔" پرنسپل صاحب نے محبت بھرے لہجے میں کونڈور

کے سر پر دست شفقت پھیرا پھر بولا۔

"جیتے رہو میرے بچے..... لیکن مجھے ان چیزوں کی یکسر ضرورت نہیں ہے۔ اگر میرے لئے کچھ کرنا چاہتے ہو تو پھر ایسا کرو۔ نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر نہانے والے ٹب کو پانی سے بھر دو یہ ایک آزمودہ نسخہ ہے۔ میرے جسم میں جب کبھی درد ہوا میں نے نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر غسل کیا۔ درد سے فوراً نجات مل گئی۔"

کونڈور نے اثبات میں سر ہلایا اور فوراً اٹھ کر کچن کی جانب چل دیا۔ مزید تینوں پاگل بھی اس کے ہمراہ تھے۔ پرنسپل صاحب کے کہنے کے مطابق..... ان تینوں کی کمانڈ..... کونڈور کے ہاتھوں میں تھی۔ اس لئے پرنسپل صاحب اسے پیار سے کمانڈر کہا کرتے تھے۔ کچھ ہی دیر میں پانی گرم ہوگیا۔ پاگلوں نے پرنسپل کو بازوؤں سے تھاما اور ان کے احتجاج کرنے کے باوجود انہیں ٹب کے پاس لا کر کھڑا کر دیا۔ ٹب میں سے اٹھتی ہوئی بھاپ اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ پانی گرمی کی شدت سے کھول رہا ہے۔ انہوں نے گھبرا کر چاروں پاگلوں کی جانب دیکھا۔ پھر پریشان لہجے میں پوچھا۔

"تم نے اس میں ٹھنڈا پانی شامل نہیں کیا.....؟"

کونڈور نے معصومیت سے انکار میں سر ہلا دیا۔ پھر بولا۔

"آپ نے ایسا نہیں کہا تھا۔" پرنسپل قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ پھر انہوں نے ٹھنڈے پانی کی ٹونٹی کھول دی۔ اور پاگلوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔

"یقیناً تم چاروں نے میرے جسم کا باربی کیو بنانے کا مکمل انتظام کر دیا تھا۔ ہٹو آگے سے میں کپڑے اتاروں۔ تینوں پاگل ایک سائیڈ پر خاموشی کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ پرنسپل نے کپڑے اتارے اور انہیں احتیاط کے ساتھ دیوار کے ساتھ لگی کیل پر لٹکا دیا۔ پھر پانی کو چیک کرنے کے بعد احتیاط کے ساتھ ٹب کے اندر لیٹ گئے۔

پاگل ٹکٹکی باندھے ان کی ہر حرکت کا جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ ٹب میں لیٹتے ہی پرنسپل کو سردی کی شدت کا احساس ہوا۔ باتھ روم کے اکلوتے روشن دان سے طوفانی ہواؤں کا ریلہ باتھ روم میں داخل ہو کر اسے سرد خانے میں تبدیل کر رہا تھا۔ پرنسپل نے اس دفعہ سونی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ وہ پہلے کموڈ پر چڑھے پھر احتیاط کے ساتھ فلش ٹینک پر پاؤں رکھ کر روشن دان کو بند کر دے۔"

سونی نے اثبات میں سر ہلایا اور اوپر چڑھنے لگا۔ لیکن کموڈ پر چڑھ کر فلش ٹینک پر پاؤں رکھتے ہوئے وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا۔ اور بے اختیار ٹب میں لیٹے ہوئے پرنسپل کے اوپر آ گرا۔ پرنسپل صاحب کا سر پوری قوت کے ساتھ باتھنگ ٹب کی پچھلی دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ انہیں تمام پاگل خانہ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اور وہ چاروں شانے چت ٹب کے اندر لیٹتے چلے گئے۔ پاگلوں نے حیرت بھری نگاہوں سے ان کی لاش کا جائزہ لیا۔ پھر تفہیمی نگاہوں سے اپنے کمانڈر کی جانب دیکھنے لگے۔ کونڈور بولا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پرنسپل صاحب گہری نیند سو چکے ہیں۔ یقیناً ایسا دردوں سے نجات کی بدولت ہوا ہے۔ انہیں مزید آرام کی ضرورت ہے۔ پرنسپل صاحب کو احتیاط کے ساتھ اٹھاؤ۔ اور ان کے کمرے میں منتقل کر دو۔" پاگلوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور پرنسپل صاحب کو احتیاط کے ساتھ اٹھا کر ان کے کمرے میں موجود بستر پر لٹا کر اچھی طرح کمبل اوڑھ دیا۔ وہ تمام رات ان چاروں نے پرنسپل کے سرہانے بیٹھ کر گزاری۔

صبح اسٹاف کرسمس کی چھٹیاں گزارنے کے بعد واپس آ گیا۔ پاگل خانے کا اسٹاف صرف دو افراد پر مشتمل تھا۔ رچرڈسن کک..... جس کی عمر چالیس سے پینتالیس سال کے درمیان تھی۔ ڈاکٹر ڈین..... اس کی عمر پچاس سے پچپن کے درمیان تھی۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر مزید پاگل خانے کے اسٹاف میں شامل تھے۔ لیکن وہ چھٹیاں گزارنے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ دوسری صبح پاگل خانے میں پہلے داخل ہونے والے بدنصیب کا نام رچرڈسن تھا۔ پاگل خانے میں داخل ہوتے ہی اسے غیر معمولی حالات کا اندازہ ہوا۔ لیکن وہ معاملے کو جانچنے

میں یکسر ناکام ہوا۔

چاروں پاگل ہال کمرے کے صوفے پر بت بنے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھے۔ رچرڈسن کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ پرنسپل صاحب اپنے کمرے میں آرام کر رہے ہیں اور ان کی طبیعت ناساز ہے۔ رچرڈسن پرنسپل صاحب کی خیریت دریافت کرنے ان کے کمرے کی جانب چل دیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے حساس ناک نے مردہ وجود کی بو محسوس کر لی۔ پرنسپل صاحب سر سے لے کر پاؤں تک چادر اوڑھے ہوئے لیٹے تھے۔ چادر کو ہٹانے پر اس نے سردی سے اکڑی ہوئی لاش کو سامنے پایا۔

وہ چیختا چلاتا نیچے ہال کمرے کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ چاروں پاگلوں نے حیرت بھری نگاہوں سے رچرڈسن کی جانب دیکھا۔ پھر نگاہیں جھکا لیں۔ رچرڈسن پاگل خانے سے ملحقہ بیچ ٹاؤن کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے ٹاؤن کے سرکردہ افراد کو جمع کیا۔ اور پرنسپل صاحب کی تدفین کے لئے دوبارہ پاگل خانے چلا آیا۔ اتنی دیر میں ڈاکٹر ڈین بھی واپس آ چکا تھا۔ دونوں نے مل کر قصبے کے افراد کے ہمراہ پرنسپل صاحب کو غسل دیا۔ پھر تابوت میں بند کر کے بیچ ٹاؤن کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ رات کو دونوں ہال کمرے میں گم سم اور افسردہ بیٹھے تھے۔ ان کی گفتگو کا موضوع پرنسپل صاحب کی غیر معمولی موت تھی۔ ڈاکٹر ڈین ہمکلام تھا۔

"پرنسپل صاحب کو غسل دیتے وقت مجھے سر کے پچھلی جانب زخم دکھائی دیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق سر کو کسی بھاری چیز کے ساتھ کچل دیا گیا تھا۔" پاگل خانے میں تمہارے علاوہ صرف چاروں پاگل موجود تھے۔ پاگلوں سے اس کام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ رہ گئے تم..... تو مجھے پکا یقین ہے کہ تم با آسانی معاملے سے پردہ نہیں اٹھاؤ گے۔ میں کل صبح شہر میں موجود پاگل خانے کے ڈائریکٹر کے علاوہ شیرف تھامسن کو بھی فون کر دوں گا۔ وہ جانے اور ان کا کام جانے....." ڈاکٹر ڈین خاموش ہوگیا۔

کک رچرڈسن کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ پھر وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

"جناب..... میرا اس معاملے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور مجھے پرنسپل صاحب کو قتل کرنے سے کیا فائدہ ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ آپ پاگلوں سے پوچھ سکتے ہیں کہ میں آج صبح پاگل خانے واپس آیا ہوں۔ جبکہ پرنسپل صاحب کی اکڑی ہوئی لاش اس بات کی جانب گواہی دیتی ہے کہ انہیں مرے ہوئے کم از کم ایک دن بیت چکا ہے۔" ڈاکٹر ڈین قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ پھر استہزائیہ لہجے میں بولا۔

"ایسے بہت سے واقعات وقوع پذیر ہو چکے ہیں۔ جن میں قاتل ثبوت کی عدم ادائیگی کے لئے جائے وقوعہ سے باہر چلا جاتا ہے۔ پھر رات کے کسی پہر واپس آ کر مقتول کو قتل کرنے کے بعد دوبارہ جائے پناہ کا رخ کرتا ہے۔ شہادت کے لئے کسی ایسے دوست کو پیسے دے کر گواہی دینے پر مجبور کرتا ہے۔ جس کا کیس کے ساتھ کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہیں پایا جاتا۔" رچرڈسن بات کاٹ کر بولا۔

"یہ سب کچھ تو آپ بھی کر سکتے ہیں۔ میری طرح آپ بھی پاگل خانے سے باہر تعطیلات گزارنے گئے تھے۔ ڈاکٹر ڈین کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ لیکن وہ خاموش ہی رہا۔ رچرڈسن کہتا چلا جا رہا تھا۔" یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ شیرف تھامسن خود ہی آ کر معاملے کو سلجھائے گا۔ آپ یہ بتائیے کہ پاگلوں کو اب کیا کرنا ہے۔ انہیں پاگل خانے میں آزاد چھوڑ دینا مناسب نہیں ہوگا۔"

"تو پھر رات کو سونے سے پہلے ان کے کمروں کو باہر سے لاک کر دینا۔" ڈاکٹر ڈین بولا۔ اور اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔

"صبح دونوں منہ اندھیرے اٹھ گئے۔ پاگلوں کے کمرے باہر سے لاک تھے۔ لیکن پرنسپل کے کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ رچرڈسن کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے پاگلوں کے کمروں کو کنڈی لگانے کے بعد پرنسپل

کے کمرے کو بھی کنڈی لگادی تھی۔ لیکن اس وقت نا صرف کنڈی کھلی ہوئی تھی بلکہ دروازہ بھی چوپٹ کھلا تھا۔ اس نے کمرے کے اندر جھانکا۔ پلنگ پر کوئی منہ تک چادر اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ رچرڈسن نے پاگلوں کو زیر لب گالی دی۔ پھر جھنجلائے ہوئے قدموں سے آگے بڑھ کر چادر کو جھٹکے کے ساتھ کھینچ کر دور پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے چیخ برآمد ہوتے ہوتے رہ گئی۔

پلنگ پر پرنسپل کی لاش موجود تھی۔ رچرڈسن بوکھلائے ہوئے قدموں کے ساتھ پیچھے کی جانب مڑا۔ پھر چیختے چلاتے ہوئے باہر کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔

ڈاکٹر ڈین باہر لان میں ورزش کررہا تھا۔ اس نے جب رچرڈسن کو چیختے چلاتے ہوئے باہر نکلتے دیکھا۔ تب چلانے کی وجہ دریافت کی۔ رچرڈسن نے اوپر پرنسپل کے کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ ”کمرے میں پرنسپل کی لاش موجود ہے۔“

ڈاکٹر ڈین پریشان قدموں کے ساتھ اوپر پرنسپل کے کمرے کی جانب چل دیا۔ وہاں واقعی لاش موجود تھی۔ تھری پیس سوٹ پہنے اکڑی ہوئی لاش..... کمرے میں ایک جانب مٹی میں لتھڑا ہوا تابوت بھی پڑا تھا۔ ڈاکٹر ڈین کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہونے لگے۔ خوف کے بجائے غصے کے اثرات نمودار ہوئے۔ پھر وہ چلاتے ہوئے بولا۔

”چاروں پاگل کہاں ہیں.....؟ یہ سب ان کا کیا دھرا ہے۔“

رچرڈسن بولا۔ ”وہ اپنے کمرے میں موجود ہیں۔“ اور ان کے کمرے باہر سے لاک ہیں۔

”تو پھر انہیں کھول کر یہاں لاؤ۔ میرے خیال کے مطابق یہ سب شیطانی انہی کی ہے۔“ رچرڈسن نے اثبات میں سر ہلایا اور پاگلوں کے کمرے کی جانب چل دیا۔ کچھ ہی دیر بعد چاروں پاگل ڈاکٹر کے سامنے موجود تھے۔ ڈاکٹر نے تفصیلی نگاہوں سے چاروں کا جائزہ لینے کے بعد کمانڈر کونڈور سے پوچھا۔ ”پرنسپل صاحب کی لاش کو یہاں کون لایا ہے؟ جھوٹ مت بولنا۔ مجھے قبرستان کے چوکیدار کی بدولت معلوم ہو چکا ہے۔ کہ تم چاروں کو گزشتہ رات قبرستان میں دیکھا گیا ہے۔“ کمانڈر کونڈور نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بولا۔

”جناب..... ہمارے خیال کے مطابق پرنسپل صاحب کو آرام کی شدید ضرورت ہے۔ انہوں نے غسل سے پہلے ہمیں بتایا تھا کہ ان کے جسم میں سخت درد ہے۔ اس لئے وہ کہانی نہیں سنا پائیں گے۔ کیونکہ انہیں آرام کی ضرورت ہے۔ آپ دونوں نے نجانے کیوں پرنسپل صاحب کو قبرستان میں دفن کردیا۔ آرام کے لئے ان کا کمرہ کافی ہے۔“ ڈاکٹر ڈین کا چہرہ غصے کی بدولت سیاہ ہونے لگا۔ پھر وہ چلاتے ہوئے بولا۔

”اور میرے خیال کے مطابق اگر پرنسپل صاحب کو آرام کی ضرورت ہے۔ تو تم چاروں کو اس وقت سزا کی ضرورت ہے اور اگر تم چاروں کو سزا کے طور پر قبرستان میں کھدی ہوئی قبر میں دفن کردیا جائے کیونکہ وہ خالی پڑی اچھی دکھائی نہیں دیتی ہوگی۔ تو کیسا رہے گا۔ اور قبر میں زندہ دفن کردینے کے علاوہ اور کوئی بہترین سزا میرے دماغ میں موجود نہیں ہے۔“

کمانڈر کونڈور نے حیرت بھری نگاہوں سے اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا۔ پھر کچھ بولنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ڈاکٹر ڈین نے غصیلے لہجے میں رچرڈسن سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”رچرڈسن میرے ساتھ لاش کو اٹھاؤ۔ اور تابوت میں رکھو۔ ان چاروں سے میں بعد میں نپٹتا ہوں۔

رچرڈسن نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور آگے بڑھ کر پرنسپل کی لاش کو بغلوں میں ہاتھ دے کر سہارا دیا۔ ڈاکٹر نے لاش کو پاؤں کے پاس سے تھاما۔ کمانڈر کونڈور کے چہرے پر بے چینی کے تاثرات ابھرنے لگے۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ رچرڈسن نے جھٹکا دے کر لاش کو اوپر اٹھایا۔ اکڑی ہوئی لاش کافی بھاری ثابت ہوئی۔ لیکن پاؤں کی جانب سے شاید ہلکی تھی۔ اس لئے رچرڈسن لاش کو اوپر نہ اٹھا پایا۔ لیکن ڈاکٹر کی جانب سے لاش کے پاؤں آسمان کی جانب اٹھتے چلے گئے۔ اس مضحکہ خیز منظر کو دیکھ

کر کمانڈر کونڈور کے علاوہ تینوں پاگل قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ دوسری جانب یکلخت تمام بوجھ رچرڈسن کے ہاتھوں کی جانب منتقل ہونے کی وجہ سے وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا۔ اس لئے لاش کے ہمراہ چاروں شانے چت زمین پر گرتا چلا گیا۔

کمانڈر کونڈور سنجیدہ نگاہوں کے ساتھ تمام ڈرامہ دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات ابھرنے لگے۔ وہ اپنے پرنسپل کی تذلیل کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اسے اور تو کچھ سجھائی نہیں دیا۔ ڈاکٹر ڈین اس کی جانب پیٹھ کئے ہاتھ جھاڑنے میں مصروف تھا۔ کونڈور نے پوری طاقت کے ساتھ اس کے پچھواڑے پر لات رسید کردی۔ اتنی دیر میں رچرڈسن لاش کو ایک جانب کر کے کھڑا ہونے میں مصروف تھا۔

ڈاکٹر ڈین اچھل کر اس کے ساتھ جا ٹکرایا۔ اور وہ دونوں پرنسپل کی لاش کے اوپر جا گرے۔ ڈاکٹر چلاتے ہوئے کھڑا ہوا اور مکا تان کر کمانڈر کونڈور کی جانب بڑھا۔ کونڈور اس کے حملے کے لئے تیار تھا۔ وہ جھکائی دے کر صاف بچ نکلا۔ اس کے بعد کمرے میں گھمسان کی جنگ چھڑ گئی۔ تعداد میں زیادہ ہونے کی بدولت پاگلوں کا پلہ بھاری تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر ڈین اور رچرڈسن زمین پر پڑے کتوں کی مانند زبان باہر نکالے ہانپ رہے تھے۔ ان میں اتنی ہمت موجود نہیں تھی۔ کہ اپنے پاؤں پر بھی کھڑے ہو پاتے۔ کمانڈر کونڈور نے سرگوشیانہ لہجے میں ڈاکٹر ڈین سے پوچھا۔

”ڈاکٹر صاحب..... آپ کے مزاج کیسے ہیں؟“ ڈاکٹر آہ بھرتے ہوئے بولا۔

”تمام جسم درد کی بدولت ٹوٹ رہا ہے۔“ کونڈور چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔ ”اس کا آسان حل میرے پاس موجود ہے۔“ تینوں پاگل سر جھکائے کمانڈر کی جانب دیکھ رہے تھے۔ کونڈور تینوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”پانی گرم کرو۔ باتھنگ ٹب میں یاد سے نمک بھی ڈال دینا۔“ تینوں نے اثبات میں سر ہلایا اور حکم کی تعمیل کے لئے کچن کی جانب چل دیئے۔ تھوڑی دیر بعد کھولتا پانی ٹب میں موجود تھا۔ تینوں نے ٹب میں نمک کی پوری شیشی انڈیل دی۔ لیکن وہ اپنے دماغ کے مطابق ٹھنڈا پانی ڈالنا بھول گئے۔

کونڈور نے ڈاکٹر ڈین کو بازوؤں سے تھام کر کھڑا کیا۔ اور دھکیلتا ہوا باتھ روم کی جانب چل دیا۔ پھر پہلے اسے کپڑوں سے آزاد کیا گیا۔ اس کے بعد زبردستی کھولے ہوئے پانی میں لٹا دیا گیا۔ پاگل خانے کی عمارت ڈاکٹر کی دردبھری چیخوں سے گونج اٹھی۔ اس نے ٹب میں سے باہر نکلنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ لیکن چاروں پاگلوں نے اس کی ایک بھی نہ چلنے دی۔ وہ چیختا چلاتا رہا۔ پھر خاموش ہوگیا۔ اس کے منہ سے خون کی دھار نکل کر ٹب کے پانی کو رنگین کررہی تھی۔ کونڈور نے فخریہ نگاہوں سے اپنے تینوں ساتھیوں کی جانب دیکھا۔ پھر پریشان لہجے میں بولا۔

”میرے خیال کے مطابق اسے دردوں سے نجات مل گئی ہے۔ لیکن مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ اس میں اتنا چیخنے چلانے کی کیا بات تھی۔ پرنسپل صاحب تو خاموشی کے ساتھ ٹب کے درمیان لیٹ گئے تھے۔“ تینوں پاگلوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ٹام بولا۔

”مجھے بھی حیرت محسوس ہورہی ہے۔ ہماری اچھائی کے بدلے میں اسے اتنا واویلا نہیں مچانا چاہئے تھا۔ شاید ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ اور اس غلطی کا خمیازہ بیچارے ڈاکٹر کو بھگتنا پڑا ہے۔“

کمانڈر کونڈور نے سوچنے والے انداز میں باتھ روم کا جائزہ لینا شروع کیا۔ پھر اس کی نگاہ باتھنگ ٹب میں سے باہر نکلتے ہوئے دھوئیں پر مرکوز ہوئی۔ لیکن وہاں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ پھر دیواروں کے اوپر سے ہوتی ہوئی اس کی نگاہ روشندان پر ٹھہری۔ وہ چلاتے ہوئے بولا۔

”تم تینوں نے روشندان کو بند نہیں کیا۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ ڈاکٹر ڈین کے چیخنے چلانے کی وجہ یقیناً روشندان میں سے اندر داخل ہوتی ہوئی ٹھنڈی ہوا ہے۔ اسے سردی لگی ہے۔ پانی کو مزید گرم کرو۔ جب تک میں

رچرڈسن کو باتھ روم کی جانب لاتا ہوں۔ اور ٹام تم روشندان کو اچھی طرح بند کردو۔" تینوں پاگلوں نے اثبات میں سرہلایا۔ پھر کمانڈر کی ہدایت کے مطابق کام میں جت گئے۔

کونڈور باتھ روم سے باہر نکل کر پرنسپل کے کمرے کی جانب چل دیا۔ جہاں رچرڈسن موجود تھا۔ وہ غالباً ڈاکٹر ڈین کے چیخنے چلانے کی آوازیں سن چکا تھا۔ اس لئے بھاگنے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ لیکن کمانڈر کونڈور نے اسے جاگھیرا۔ پھر اسے ایسے گھسیٹتا ہوا باتھ روم کی جانب چلا، جیسے قصائی بکرے کو ذبح کرنے کے لئے مذبح خانے لے جاتا ہے۔ رچرڈسن نے چیخنا چلانا شروع کردیا۔ لیکن وہاں اس کی چیخیں سننے والا کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ باتھ روم میں داخل ہونے کے بعد کونڈور نے زبردستی رچرڈسن کے کپڑے اتارے۔ اس دوران تینوں پاگل گرم پانی ٹب میں ڈال چکے تھے۔ پھر چاروں نے مل کر شور مچاتے ہوئے رچرڈسن کو ہاتھوں اور پاؤں سے تھاما۔ اور زبردستی ٹب کے اندر لٹا دیا۔

پاگل خانے کا ماحول اس کی درد بھری چیخوں سے گونج اٹھا وہ لگاتار چیختا چلاتا رہا۔ لیکن پاگلوں کی مضبوط گرفت سے آزاد نہیں ہو پایا۔ پندرہ منٹ کے بعد اس کی چیخ وپکار دم توڑتی چلی گئی۔ اور پھر خاموشی طاری ہوگئی۔ کمانڈر کونڈور نے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کو ہاتھوں سے صاف کیا۔ اور طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔

"حیرت کی بات ہے، ڈاکٹر ڈین کی طرح رچرڈسن بھی کافی دیر تک چلاتا رہا ہے۔ میرے خیال میں تم تینوں نے پانی میں نمک کی مقدار زیادہ کردی ہے۔ ان دونوں کے علاوہ پرنسپل صاحب بغیر چیخے چلائے ..... آرام وسکون کے ساتھ سوگئے تھے۔ ہمیں مزید تجربے کی ضرورت ہے۔" رچرڈسن کے ناک اور منہ سے خون نکل کر پانی کو رنگین کررہا تھا۔ تینوں نے مل کر رچرڈسن کی لاش کو باہر نکالا اور اوپر کے کمرے میں پرنسپل اور ڈاکٹر کی لاشوں کے ہمراہ رکھ دیا۔

یہ وہ مختصر کہانی تھی۔ جو میں نے ان چاروں پاگلوں کی پاگل بیتی سے اخذ کی، اب کہانی سننے کے بعد اپنا مستقبل تاریک دکھائی دے رہا تھا۔ فرار ہونے کے تمام راستے مسدود تھے۔ لیکن پاگل خانے میں زیادہ دیر رہنا میرے لئے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ زور زبردستی بھی میرے حق میں خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔ اس لئے میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملانے کا فیصلہ کیا۔ ان چاروں کے سونے کے بعد میں باآسانی یہاں سے فرار ہوسکتا تھا۔ سونی اور ٹام سامنے موجود ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھا رہے تھے۔ کمانڈر کونڈور میرے سامنے بیٹھا خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ جبکہ اسسٹنٹ بیری بیرونی دروازے کے پاس ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ کھانا میز پر کھانے کے بعد تینوں پاگل اوپر کمروں کی جانب چل دیئے۔ اسسٹنٹ بیری ان کے ہمراہ نہیں تھا۔ اسے میری رکھوالی کے لئے نیچے ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔

موقع مناسب تھا۔ اگر میں تھوڑی ہمت سے کام لیتا، تو اسسٹنٹ بیری کو زیر کرکے پاگلوں کے نرغے سے فرار ہوسکتا تھا۔ لیکن تینوں پاگل نجانے اوپر والے کمروں میں کیا کرنے لگے تھے۔ وقت میں اندازے کی غلطی میرے لئے نقصان دہ بھی ثابت ہوسکتی تھی۔ میری سوچوں کا تسلسل ٹوٹتا چلا گیا۔ ہال کمرے کی سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر تینوں پاگل سیڑھیوں سے نیچے اترتے دکھائی دیئے، وہ اکیلے نہیں تھے۔ ان کے ہمراہ تین لاشیں بھی تھیں۔ جنہیں وہ تینوں کمر کی جانب سے تھامے ہوئے تھے۔ یقیناً لاشیں سردی کی بدولت اکڑ چکی تھیں۔ اس لئے نیچے زمین پر گرنے کے بجائے باآسانی پاگلوں کے ہمراہ گھسٹتی چلی آرہی تھی۔ سیڑھیوں سے نیچے اترنے کے بعد ان تینوں نے ڈائننگ ٹیبل کا رخ کیا۔ پھر کچھ دیر سانس درست کرنے کے بعد تینوں لاشوں کو کرسیوں پر بٹھا دیا۔ اب کمانڈر کونڈور نے میری جانب دیکھا۔ پھر بولا۔

"جناب کھانا تیار ہے۔ آپ ڈائننگ ٹیبل پر آجایئے۔ پرنسپل صاحب اور پاگل خانے کا اسٹاف کھانے پر آپ کے منتظر ہیں۔" میں چلاتے ہوئے بولا۔

"میں ان لاشوں کے ہمراہ کھانا کیسے کھاؤں۔" ایسا نہیں ہوسکتا۔

"کون سی لاشیں....." کمانڈر کونڈور حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ "کیا آپ پرنسپل صاحب اور پاگل خانے کے اسٹاف کو لاشیں کہہ رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں۔ ایسا کہنے کو ہم گناہ سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ اور گناہ کی سزا..... سزائے موت ہے۔" میں نے گھبرا کر چاروں پاگلوں کی جانب دیکھا۔ پھر بے چارگی کے عالم میں بولا۔

"شاید میں جذباتی ہوکر زیادہ بول گیا ہوں۔ مجھے معاف کرنا..... بھوک کی شدت کی بدولت میرے سوچنے سمجھنے کی حس مفقود ہوچکی ہے۔ اگر آپ چاروں کو اعتراض نہ ہو تو کھانا ..... کھانا شروع کیا جائے۔" ان چاروں نے اثبات میں سرہلایا۔ اور میں نے اطمینان کا طویل سانس لیتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل کا رخ کیا۔

کھانا بے حد لذیذ دکھائی دیتا تھا۔ گوشت کے روسٹ کئے ہوئے پارچے..... آلو کے قتلے..... انگور کی سرخ شراب اور سلاد..... لیکن آپ یقین کرسکتے ہیں کہ تین عدد لاشوں کے ہمراہ بیٹھ کر کھانا کھانا کتنا مشکل ثابت ہوتا ہے۔ میں اس تجربے سے گزر چکا ہوں میں نے جس طرح وہ لذیذ کھانا زہر مار کیا وہ میں ہی جانتا ہوں۔

بہرحال کمانڈر کونڈور نے سب کی پلیٹوں میں کھانا ڈالنے کے بعد ان تین لاشوں کے سامنے بھی گوشت اور آلو کے قتلوں سے بھری ہوئی پلیٹیں رکھ دیں سردیوں کے دن تھے۔ اس کے باوجود لاشوں کے گوشت گلنے کی خفیف سی بو سے ہال کمرے کی فضا متاثر ہونے لگی تھی۔ اس پر انتہا یہ لاشوں کو میرے ساتھ والی کرسی پر بٹھایا گیا تھا۔ کھانا نہایت خاموشی کے ساتھ کھایا گیا۔ باہر دوبارہ گرج چمک کے ساتھ بارش کا آغاز ہوگیا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے سرخ شراب کا گلاس لبالب بھرا۔ اور حلق میں انڈیلنے لگا۔ تب اچانک ہی کمانڈر کونڈور بولا۔

"جناب اگر آپ کو زحمت نہ ہو۔ تب ایک گلاس پرنسپل صاحب کے سامنے بھی بھر کر رکھ دیجئے۔" میں طنزیہ لہجے میں بولا۔

"پرنسپل صاحب کے سامنے گوشت اور آلو کے قتلوں کی پلیٹ بھری پڑی ہے۔ لیکن انہوں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ تمہارے خیال کے مطابق کیا وہ شراب کے گلاس کو تھام لیں گے۔" کمانڈر بولا۔

"پرنسپل صاحب کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔ شاید نمک والے پانی کا ان پر خاطر خواہ فائدہ نہیں ہو پایا۔ کھانے کے بعد ایک دفع پھر پرنسپل صاحب کو نمک والے پانی کا غسل دینا ہوگا۔ اس دفع نمک کی مقدار حسب ضرورت زیادہ کروں گا۔"

مجھے اپنا سانس حلق میں اٹکتا محسوس ہوا۔ لیکن میں نے کچھ بھی کہنا مناسب نہیں جانا۔ کھانا زہر مار کرنے کے بعد تین پاگلوں نے برتن سمیٹے۔ جبکہ کمانڈر کونڈور پانی گرم کرنے کے لئے کچن کی جانب چلا گیا۔ مختصر وقت کے لئے مجھے تنہائی نصیب ہوئی۔ میں نے موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے بیرونی دروازے کی جانب دوڑ لگادی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر میں نے جھٹکے کے ساتھ ہینڈل کو گھمایا۔ لیکن اسے لاک پایا۔ جھنجلائی ہوئی نگاہوں سے میں نے ہال کمرے کی بیرونی دیوار کا جائزہ لیا۔ وہاں دبیز پردوں کے پیچھے فرانسیسی طرز کی کھڑکی موجود تھی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ پردوں کو کھینچ کر ہٹایا۔ پھر دھڑکتے دل کے ساتھ کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا میرے جسم کو پرے دھکیلتا ہوا ہال کمرے میں داخل ہوا۔ دور کہیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر کڑاک کی آواز کے ساتھ بجلی گری۔ ماحول کچھ دیر کے لئے روشن ہوا۔ کھڑکی میں مضبوط سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ یکدم کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں بجلی کی مانند اچھل پڑا۔ پیچھے دیکھنے پر میں نے ٹام کو اپنے سر پر کھڑے پایا۔ اس کی آنکھوں میں کسی بھی قسم کا کوئی تاثر موجود نہیں تھا۔ آنکھیں برف کی سلوں کی مانند سرد اور سپاٹ تھیں۔ میں نے ہڑبڑاتے ہوئے لہجے میں اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"موسم کے تیور بگڑتے چلے جارہے ہیں۔ اب

مجھے ڈیلی ٹاؤن کی جانب سفر کا آغاز کردینا چاہئے۔ یہاں مزید رکنا میرے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔ اس نے کوئی بھی جواب دیئے بغیر مجھے بازو کے پاس سے تھاما۔ پھر تقریباً کھینچتا ہوا ڈائننگ ٹیبل کے پاس لے آیا۔ اور کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولا۔

"کمانڈر کے واپس آنے تک آپ یہاں سے ہل بھی نہیں سکتے۔" میں نے بے چارگی کے عالم میں اثبات میں سر ہلایا۔ پھر دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ لاشوں کو ڈائننگ ٹیبل کے پاس سے ہٹالیا گیا تھا اور پرنسپل کی لاش کو کھولتے ہوئے پانی سے غسل دیا جارہا تھا۔ مجھے فرار ہونے کا موقع میسر نہیں آرہا تھا اور میں پاگلوں کے درمیان زیادہ دیر رہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن زبردستی کا فرار بھی انہیں مشتعل کرسکتا تھا۔ اس لئے میں نے مناسب موقع محل دیکھنے کے بعد اگلے لائحہ عمل کے متعلق سوچنے کے لئے خاموشی اختیار کرلی۔

تقریباً بیس منٹ کے بعد باتھ روم کا دروازہ کھلا اور چاروں پاگل پرنسپل کی لاش کو دونوں بغلوں سے تھامے نمودار ہوئے۔ پرنسپل کی لاش تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھی۔ اور اکڑے ہوئے ہونے کی وجہ سے نہایت خوفناک دکھائی دیتی تھی۔ انہوں نے لاش کو کمرے میں منتقل کیا۔ پھر میرے پاس آبیٹھے میں نے موقع محل کی مناسبت سے..... کھنکھار کر گلہ صاف کیا۔ پھر کمانڈر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں آپ چاروں کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اب یہاں سے واپس جانے کی اجازت چاہوں گا۔ چاہتا تو تھا کہ مزید کل کا دن آپ چاروں کے ساتھ گزار پاتا۔ لیکن پہلے بتاچکا ہوں کہ مجھے بہت ضروری کام سے آج رات کو ڈیلی ٹاؤن پہنچنا ہے۔ کھانے کے دوران کافی دیر ہوچکی ہے اب مزید انتظار نہیں کرسکتا ہوں۔ مجھے اجازت دیجئے۔ خدا نے چاہا تو جلد از جلد دوبارہ ملاقات ہوگی۔" بات ختم کرنے کے بعد میں نے چاروں پاگلوں کی جانب کن انکھیوں کے ساتھ دیکھا۔ وہ چاروں ایک دوسرے کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ پھر کمانڈر کونڈورو نے اپنے جھکے ہوئے سر کو اوپر اٹھایا اور سرد نگاہوں سے میرے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"جناب آپ نے سونی کے کھانے کی تعریف نہیں کی۔ وہ بہت پریشان ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جلدی میں شاید وہ مناسب دعوت کا اہتمام نہیں کرپایا۔ اگر آپ مزید کل کا دن بھی پاگل خانے میں گزارنے کو تیار ہوں۔ تو وہ صبح انتہائی لذیذ ناشتے کا اہتمام کرسکتا ہے۔"

مجھے اپنا سانس حلق میں اٹکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مزید ایک رات پاگل خانے میں گزارنا میرے لئے ایسے تھا۔ جیسے تمام رات کانٹوں پر بسر کرنا۔ میں نے بے صبری کے عالم میں لگاتار انکار میں سر ہلانا شروع کردیا۔ پھر بے چین لہجے میں بولا۔

ایسی بات نہیں ہے مجھے کھانا بہت پسند آیا ہے۔ میں نے کھانے کی تعریف بھی کی تھی۔ لیکن پرنسپل صاحب کی خراب طبیعت کی بدولت شاید تم چاروں سن نہیں پائے۔ اگر سونی نے اسے محسوس کیا ہے تب میں معافی مانگنے کے بعد دوبارہ تعریف کئے دیتا ہوں۔ لیکن یہاں مزید رکنا اب میرے اختیار سے باہر ہے۔ مجھے بہرحال اب یہاں سے جانا ہی ہوگا۔" کمانڈر کونڈورو نے سونی کی جانب دیکھا۔ پھر دوبارہ کان میں کھسر پھسر شروع کردی۔

باتوں کے دوران نہ جانے ایسی کیا بات ہوئی کہ حیرت انگیز طور پر سونی نے زار و قطار رونا شروع کردیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ایسے بہہ رہے تھے جیسے پاگل خانے سے باہر بارش کے قطرے زمین کو بھگونے میں مصروف تھے۔ کمانڈر کونڈورو نے بے اختیار آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگالیا۔ پھر میری جانب دیکھتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔

"جناب آپ نے اس کا دل توڑ کر رکھ دیا ہے۔ کیا ہوتا اگر آج کی رات پاگل خانے میں ہی ٹھہر جاتے۔ نہ آسمان ٹوٹتا..... نہ زمین پھٹتی..... لیکن آپ اپنی ہٹ دھرمی کی بدولت یہاں سے فوراً واپس جانا

چاہتے ہیں۔"

میں نے پریشان لیکن نرم گرم لہجے میں سونی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "دیکھو سونی..... ہر انسان کی اپنی ایک فطرت ہوتی ہے اور ہر انسان اپنی فطرت کے مطابق چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کھانے کی تعریف کی بات لی جائے۔ تو بعض انسان منہ سے تعریف کردیتے ہیں۔ لیکن بعض ایسا نہیں کرتے۔ وہ اپنے فعل سے اپنے دل کی بات کو نمایاں کرتے ہیں۔ جیسے میں نے کی..... تم خود دیکھ سکتے ہو۔ کہ گوشت سے بھری ہوئی تمام پلیٹ کو میں نے صاف کرکے رکھ دیا تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مجھے کھانا پسند آیا تھا۔ اگر میں نے تعریف نہیں کی۔ تو اس میں میری فطرت کا زیادہ عمل دخل ہے۔" میری اس مختصر تقریر کا سونی پر رتی برابر بھی اثر نہ ہوسکا۔ اور سونی روتا ہوا میری جانب لپکا..... میں نے گھبرا کر پیچھے ہٹنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے کمال پھرتی کے ساتھ میرے بیٹھتے ہوئے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ پھر التجائیہ انداز میں بولا۔

"جناب..... آپ مجھے ایک موقع اور دے دیجئے۔ یقین مانیے اس دفعہ میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔" میں نے پریشان ہوکر ہاتھوں کو اس کی مضبوط گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہیں ہوسکا۔ جھنجھلا کر میں نے پوری قوت صرف کرتے ہوئے اپنے آپ کو پیچھے کی جانب دھکیلا۔ تو اس نے اچانک ہی میرے ہاتھوں کو چھوڑ دیا۔ میں آج بھی نہیں جان پایا کہ اس نے ایسا جان کر کیا تھا۔ یا پھر انجانے میں..... لیکن جو بھی تھا۔ ہاتھ آزاد ہوتے ہی میں اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پایا۔ اور کمر کے بل زمین پر جا گرا۔ یکلخت ہاتھ چھٹ جانے کی بدولت وہ بھی اپنے آپ کو سنبھال نہیں پایا۔ اور تینوں پاگلوں کے قدموں میں جا گرا۔ کمانڈر کونڈورو اور اس کے ہمراہ کھڑے ہوئے دونوں پاگلوں نے یہ سمجھا کہ میں نے پاگل کو دھکا دے کر زمین پر گرایا ہے۔ انہوں نے طیش میں آکر مجھ پر حملہ کردیا۔ ہاتھا پائی کا آغاز ہوا۔ لاتوں اور گھونسوں کی بارش میں یکلخت اضافہ ہونے لگا۔

آپ یقیناً اندازہ لگا چکے ہوں گے کہ لاتوں گھونسوں کی بارش کا ہدف میں تھا۔ اور ان کا پلہ اکثریت کی بدولت بھاری تھا۔ میں نے بہتری اسی میں جانی کہ ہاتھ پاؤں کو ڈھیلا چھوڑ کر بے ہوش ہونے کی ایکٹنگ کروں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ لیکن پاگلوں کو بھلا کون سمجھا سکتا ہے کہ جس بندے پر وہ تشدد کررہے ہیں۔ وہ بے ہوش ہوچکا ہے۔ انہوں نے ہاتھ پاؤں کو نہیں روکا۔ بالآخر میں حقیقی طور پر ہوش و حواس کی وادیوں کو خیرباد کہتے ہوئے بے ہوش ہوگیا۔

نہ جانے کتنی دیر کے بعد میری آنکھ کھلی۔ پہلا احساس مجھے یہ ہوا کہ میں نرم گرم بستر پر لیٹا ہوا ہوں۔ دوسرا احساس مجھے کروٹ بدلنے کے بعد محسوس ہوا کہ کوئی دوسرا وجود بھی میرے ہمراہ بستر میں موجود ہے۔ کمرے میں گہرا اندھیرا مسلط تھا۔ اور مجھے اپنا جسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ میں نے ہاتھوں کی مدد سے اپنے ساتھ موجود وجود کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ برف کی مانند یخ بستہ تھا۔

اچانک میرے دماغ میں پرنسپل صاحب کی لاش کا خیال ابھرا۔ میں نے جسم کے درد کو یکسر فراموش کیا اور چھلانگ لگا کر بستر سے باہر قالین پر آکھڑا ہوا۔ کمرے میں اندھیرا بدستور موجود تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دیوار کو ٹٹولنا شروع کیا۔ کمرے کی اکلوتی کھڑکی کا دبیز پردہ پلنگ کے مخالف جانب والی دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ میں نے جھٹکے کے ساتھ پردے کو کھینچ کر ہٹادیا۔ روشنی کا سیلاب امڈ کر دبیز پردوں کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ میں نے گھبرا کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ باہر چمکیلا دن نمودار ہوچکا تھا۔ چمکیلی دھوپ میں مجھے آزادی کا پہلو دکھائی دیا۔ اور میرے جسم میں خون کرنٹ کی مانند دوڑنے لگا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں تینوں لاشیں بستروں پر موجود تھیں۔ مجھے یہ سوچ کر چکر آنے لگے کہ میں نے تمام رات لاشوں کے ہمراہ

کمرے میں گزاری تھی۔

بہرحال سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ چاروں کسی بھی وقت کمرے میں داخل ہوسکتے تھے۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ وہ حسب توقع باہر سے بند تھا۔ کھڑکی میں سلاخیں نہیں لگی تھیں۔ لیکن پرنسپل کا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ اس لئے نیچے اترنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے نکاسی آب کے پائپ کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔ لیکن دیوار سپاٹ اور صاف تھی۔

پاگل خانے میں مزید رکنا اب میرے اختیار سے باہر تھا۔ اگر کچھ دن اور میں یہاں مقید رہتا۔ تب خود بھی پاگل ہوجاتا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ مجھے گزشتہ رات مار پیٹ کی بدولت جسم پر کوئی زخم نہیں آیا تھا۔ ورنہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ چاروں پاگل مجھے کھولتے ہوئے پانی کے ساتھ غسل دے کر سوکھنے کے لئے پرنسپل کے کمرے میں بستر پر ڈال دیتے۔ یہ سوچتے ہی مجھے اپنے جسم میں کپکپی اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اچانک کمرے کے باہر قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ آگے بڑھ کر دروازے کو کنڈی لگادی۔ اور کان دروازے کے ساتھ لگادیئے۔ مجھے کمانڈر کونڈور کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"پانی گرم ہوگیا ہے۔ تم تینوں نے پچھلی رات مہمان کی اچھی خاصی دھلائی کردی ہے۔ اب میرے خیال میں اسے گرم پانی کے غسل کی ضرورت ہے۔ دروازہ کھولو۔ اور اسے نہایت عزت اور احترام کے ساتھ باہر نکالو۔ لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سونی اور ٹام کو پیچ ٹاؤن بھیجا ہے۔ تاکہ وہ ناشتے کا بندوبست کرسکیں۔"

مزید کچھ سننا میرے اختیار سے باہر ہوتا۔ اس لئے میں نے چھلانگ لگائی۔ اور کھڑکی سے نیچے موجود سائبان پر آ کھڑا ہوا۔ یہ سائبان ساتھ والے کمرے کی کھڑکی تک چلا گیا تھا۔ یقیناً نیچے والے کمروں کی کھڑکی کے اوپر بنایا گیا تھا۔ بہرحال میں نے مضبوطی کے ساتھ دیوار کو تھاما اور کھسکتا ہوا ساتھ والی کھڑکی کی جانب چل دیا۔ کھڑکی کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ یقیناً پاگلوں نے بھی پرنسپل کی لاش کو قبرستان میں سے نکالنے کے لئے یہی راستہ اختیار کیا ہوگا۔ جب رچرڈسن اور ڈاکٹر ڈین نے پاگلوں کو کمرے میں مقید کیا تھا۔

سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لئے میں کمرے میں کود گیا۔ کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ اور باہر سے دونوں پاگلوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ انہوں نے شاید دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اندر سے بند ہونے کی وجہ سے وہ دونوں دروازے کو کھول نہیں پائے۔ اب اپنے انداز میں اظہار خیال میں مصروف تھے۔ کمانڈر کونڈور بول رہا تھا۔

"وہ یقیناً تم تینوں سے ناراض ہے۔ اس لئے باہر نکلنے سے گریز کررہا ہے۔ اس کے جسم میں کل والی لڑائی کے بعد درد بھی ہورہا ہوگا۔ اب اسے نمکین پانی کے ساتھ غسل کی ضرورت ہے۔"

اسسٹنٹ بیری کی آواز سنائی دی۔ "علاوہ ازیں میرے خیال میں اسے آرام کی مہلت بھی دینی چاہئے۔ شاید اس نے کنڈی اس وجہ سے لگا رکھی ہے کہ کل والی لڑائی کے بعد وہ تازہ دم ہوسکے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" کمانڈر کونڈور کی آواز سنائی دی۔ "اسے آرام کرنے کے لئے وقت کی ضرورت ہے۔ ہم نیچے چل کر ناشتے کا انتظام مکمل کرتے ہیں جب تک وہ تازہ دم ہوجائے گا۔"

پھر ان دونوں کے سیڑھیوں سے نیچے جانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ اور آگے بڑھ کر کوریڈور میں جھانکا۔ وہاں اب کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ میں نے احتیاط کے ساتھ ہال کمرے کا دروازہ کھولا۔ اور باہر نکل آیا۔ لان کے آگے پاگل خانے کا گیٹ موجود تھا۔ میری خوش قسمتی کہ وہ بھی کھلا ہوا تھا۔ میں نے گیٹ کو کھولا۔ اور باہر کی جانب دوڑ لگادی۔ مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا۔ جیسے میں عمر قید کی سزا گزارنے کے بعد اچانک ہی رہا کردیا گیا ہوں۔ میرے منہ سے بے اختیار خوشی کی بدولت چیخ نکل گئی اور میں پہاڑی

سے نیچے کی جانب بھاگتا چلا گیا۔ میری فوکسی کار سڑک کے کنارے ویسے ہی کھڑی تھی جیسی میں چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ لاک کردیا۔ پھر طویل سانس لیتے ہوئے اپنا سر اسٹیئرنگ پر ٹکانے کے بعد آنکھیں موندلیں۔ پندرہ منٹ یوں ہی گزر گئے۔ پھر میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں پاگل خانے میں داخل ہونے سے پہلے پاگلوں کو اپنی گاڑی کی خرابی کے متعلق بتاچکا تھا۔ حالانکہ وہ چاروں پاگل تھے۔ لیکن ان چاروں سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ مجھے تلاش کرتے ہوئے گاڑی کا سراغ باآسانی لگاسکتے تھے۔

مجھے جلد از جلد یہاں سے فرار ہوجانا چاہئے تھا۔ میں نے اگنیشن میں چابی گھومائی۔ گھور گھور کی آواز کے ساتھ گاڑی نے دو تین جھٹکے کھائے۔ اور خاموش ہوگئی۔ میں نے جھنجھلا کر گاڑی کے دروازے کو کھولا۔ اور باہر نکل کر پہاڑی کے دوسری جانب واقع پیچ ٹاؤن کی جانب چل دیا۔ اب اس کے علاوہ اور کوئی بھی تدبیر میرے دماغ میں باقی نہیں بچی تھی کہ میں پیچ ٹاؤن جاکر کسی فون بوتھ سے شیرف تھامسن کو فون کروں اور حالات سے آگاہی کے بعد مدد کی درخواست کروں۔ آسمان بھی مکمل طور پر صاف ہوگیا تھا۔ چمکیلی دھوپ بہت بھلی محسوس ہورہی تھی۔

مختصر پہاڑی کے اوپر موجود پگڈنڈی کو عبور کرکے جب میں پہاڑی کے اوپر پہنچا۔ تب سامنے پیچ ٹاؤن کو موجود پایا۔ پانچ منٹ کے بعد میں پیچ ٹاؤن کے مختصر بازار میں موجود تھا۔ لیکن وہاں ٹیلی فون بوتھ موجود نہیں تھا۔ مختصر تلاش کے بعد ایک جنرل اسٹور کے باہر مجھے پی سی او کا بورڈ آویزاں دکھائی دیا۔ میں نے اندر داخل ہوکر ایک سائیڈ پر رکھے ہوئے پی سی او سیٹ کا ریسیور اٹھایا۔ اور اردگرد نگاہ دوڑاتے ہوئے نمبر ڈائل کرنا شروع کردیا۔ خوش قسمتی سے دوسری جانب ریسیور شیرف تھامسن نے ہی اٹھایا۔ میں نے اسے جلدی جلدی حالات سے آگاہ کیا۔ پھر پیچ ٹاؤن کا ایڈریس لکھوانے کے بعد ریسیور جھٹکے کے ساتھ واپس رکھ دیا۔

بے اختیار میرے لبوں سے طویل سانس خارج ہوا۔ اور میں نے سامنے موجود اسٹور کے مالک کی جانب تشفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ جیب پرندے کے اس گھونسلے کی مانند خالی تھی۔ جس کے بچے بڑے ہوکر اڑ گئے ہوں۔ ان چاروں پاگلوں میں سے کسی ایک نے میرا پرس ہتھیالیا تھا۔ یا پھر مار کھانے کے دوران ڈائننگ روم میں ہی گرگیا ہوگا۔

میں نے مسکین شکل بنا کر سامنے موجود دکان کے مالک کی جانب دیکھا۔ پھر اسے بتانے لگا کہ میں ٹاؤن میں نووارد ہوں۔ اور میری جیب کٹ چکی ہے۔ مدد کی استدعاء ہے۔ جنرل اسٹور کے مالک کے چہرے کے دلکش تاثرات میں تبدیلی نمایاں ہونے لگی۔ پھر اس نے کچھ بولنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اچانک کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے بے اختیار پیچھے مڑکر دیکھا۔ تو مجھے اپنے ہاتھوں کے طوطے اڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔

وہاں سونی اور ٹام موجود تھے۔ حسب معمول ان کے چہرے سپاٹ تھے۔ اور ہاتھ میں شاپنگ بیگ تھامے ہوئے تھے۔ جن میں ناشتے کا سامان بھرا ہوا تھا۔ میں نے تھوک نگل کر مسکرانے کی کوشش کی۔ پھر ہکلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ضروری کام کی بدولت فون کرنے یہاں چلا آیا۔ معاف کرنا..... کمانڈر کونڈور کو بتانے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔" دونوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی کے ساتھ مجھے بغلوں کے پاس سے تھاما۔ اور لاچار مریض کی مانند گھسیٹتے ہوئے اسٹور سے باہر کی جانب چل دیئے۔

کچھ دیر بعد ایک دفعہ پھر پاگل خانہ تھا اور چاروں پاگلوں کے علاوہ میں تھا۔ وہ مجھے خونخوار نگاہوں سے دیکھنے میں مصروف تھے۔ لیکن مجھے اب خوف محسوس نہیں ہورہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق شیرف

تھامسن کو پاگل خانے تک پہنچنے میں ایک یا ڈیڑھ گھنٹے کا عرصہ درکار تھا۔ اتنے وقت کے لئے میں مزید پاگلوں کو جھیل سکتا تھا۔ ہم پانچوں اس وقت ڈائننگ روم میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ لائٹ آچکی تھی اس لئے ڈائننگ روم کا ماحول روشن تھا۔ کمانڈر کونڈور درمیان والی کرسی پر براجمان تھا اور اس کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں ابھری ہوئی تھیں۔ حالات سے آگاہی کے بعد سے اب تک اس کی کیفیت کچھ ایسی ہی رہی تھی۔ پھر جب وہ ہمکلام ہوا۔ تو لہجہ نہایت سرد تھا۔

''میرے خیال کے مطابق ہمارے مہمان نے فرار ہونے کے بعد اپنے آپ کو سزا کا مستحق قرار دے دیا ہے۔ اب تم تینوں نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اسے کیا سزا دی جائے۔'' یکدم تینوں پاگلوں کے ماتھوں پر بھی فکر انگیز لکیروں کا جال پھیلنے لگا۔ پھر سونی چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔

''اسے پنکھے کے ساتھ الٹا لٹکا کر پنکھے کو پوری رفتار کے ساتھ چلا دینا چاہئے۔'' کمانڈر نے فوراً انکار میں سر ہلایا دوبارہ خاموشی طاری ہوئی۔ پھر ٹام چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔

''اسے نمک والے پانی کے ساتھ غسل دے کر کپڑوں کے بغیر کمرے میں بند کر کے پنکھا مکمل رفتار سے چلا دینا چاہئے۔ سردی کی بدولت جلد ہی اکڑ جائے گا۔'' کمانڈر نے دوبارہ انکار میں سر ہلایا۔ پھر طویل سانس لیتے ہوئے تھکے آمیز لہجے میں بولا۔

''مجھے تم تینوں سے ایسی ہی توقعات کی امید تھی۔ بہرحال یہ بچکانہ سزائیں میں مسترد کرنے کے بعد اب اپنی سزا کے متعلق بتائے دیتا ہوں۔ اوپر پرنسپل صاحب کے کمرے میں تابوت موجود ہے۔ مہمان کو تابوت میں لٹا کر اسے ایک دن کے لئے قبر میں دفن کر دیتے ہیں۔ اگلے دن اسے قبر سے باہر نکالنے کے بعد نمک والے پانی کے ساتھ غسل دینے کے بعد پرنسپل صاحب کے ساتھ لٹا دیں۔ باہر کسی بھی فرد کو یہ معلوم نہیں ہو پائے کہ ہم نے اسے سزا دی ہے۔''

تینوں پاگلوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اب مجھے کچھ پریشانی محسوس ہونی شروع ہوئی۔ شیرف کے آنے میں کافی وقت باقی تھا اور یہاں میرے جان کے لالے پڑنے لگے تھے۔ اگر ایک دفع میں تابوت میں دفن ہو جاتا۔ تب ایک دن کے بعد لاش کی صورت میں ہی باہر نکالا جاتا۔ میں نے چلاتے ہوئے احتجاج کرنے کی کوشش کی۔ انہیں یقین دلایا کہ آئندہ میں فرار ہونے کی کوشش نہیں کروں گا۔ لیکن چاروں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ انہوں نے بیلچے اور کدالیں اٹھالیں۔ دونوں پاگلوں نے بیلچے اور کدالوں کو تابوت کے اندر رکھا۔ اور تابوت کو دونوں کونوں سے پکڑ کر اٹھالیا۔ پھر کمانڈر کونڈور اور اسسٹنٹ بیری نے مجھے بغلوں کے پاس سے تھاما اور دوبارہ گھسیٹتے ہوئے باہر کی جانب چل دیئے۔

میں نے ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی مانند ٹانگیں چلانے کی کوشش کی۔ لیکن ان دونوں پاگلوں کی گرفت مضبوط ہونے کے بعد ہاتھ پاؤں سیدھے چھوڑ کر خود کو خدا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ پاگل خانے کی عمارت سے کچھ دور اور بیچ ٹاؤن سے کافی ہٹ کر ٹاؤن کا سنسان پڑا قبرستان تھا۔ انہوں نے مجھے ایک کھدی ہوئی قبر کے پاس لا کر کھڑا کر دیا۔ یہ قبر پرنسپل صاحب کی تھی۔ انہیں نمکین پانی سے غسل دینے کے لئے یہاں سے نکالا گیا تھا۔

بہرحال تابوت کو زمین پر رکھا گیا۔ اس میں سے کدالوں اور بیلچوں کو باہر نکالا گیا۔ پھر مجھے دھکا دے کر زمین پر لٹانے کے بعد چاروں پاگلوں نے مل کر مجھے چار کونوں سے ایسے تھاما۔ جیسے رنگ ساز کپڑے کو رنگنے کے بعد چاروں کونوں سے تھام کر خشک کرنے کے لئے جھٹکے دیتا ہے۔ پھر مجھے اٹھا کر تابوت کے اندر گھسیڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں تابوت کے اندر با آسانی لیٹتا چلا گیا۔ لیکن جیسے ہی انہوں نے میرے ہاتھ کو چھوڑا۔ میں آکٹوپس کی مانند ان دونوں کے ساتھ چپکتا چلا گیا۔ ان دونوں پاگلوں نے گھبرا کر مجھے

اپنے جسم کے ساتھ سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس دفعہ موت قریب ہونے کے خوف کی وجہ سے میری گرفت زیادہ مضبوط تھی۔ وہ مجھے علیحدہ نہ کر سکے۔

میں نے گرفت میں موجود دونوں پاگلوں کی جانب دیکھا۔ وہ سونی اور ٹام تھے۔ کونڈور اور اسسٹنٹ بیری میری پشت کی جانب کھڑے شاید حیرت بھری نگاہوں سے پچویشن کا جائزہ لینے میں مصروف ہوں گے۔ کیونکہ میں انہیں دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

بہرحال مجھے کمانڈر کونڈور کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''بیری یہ بیلچہ تھاموا اور اس کے سر کے پیچھے حصے پر رسید کر دو، بے ہوش ہونے کے بعد آسانی سے تابوت میں لیٹ جائے گا۔''

میں یکدم ہوشیار ہو گیا۔ بے ہوش ہونا زندہ تابوت میں دفن ہونے کے مترادف تھا۔ بیری نے بیلچہ تھام لیا۔ دوسری جانب ٹام اور سونی اب مجھے جھٹکے دے کر اپنے جسم سے علیحدہ کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ میں نے گرفت مزید مضبوط کر دی۔ اور کن انکھیوں سے اپنی پشت پر موجود حالات کا جائزہ لینے لگا۔ اسسٹنٹ بیری نے بچلے کو سر سے بلند کیا۔ پھر پوری قوت کے ساتھ میرے سر پر مارنے کے لئے آگے بڑھا۔ میں نے یکلخت دونوں پاگلوں کو چھوڑ اور پھرتی کے ساتھ ایک جانب ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

بیلچہ پوری طاقت کے ساتھ ٹام کے سر پر لگا۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی مانند چاروں شانے چت زمین پر گرتا چلا گیا۔

سونی نے حیرت بھری نگاہوں سے اسسٹنٹ بیری کی جانب دیکھا۔ پھر غصیلے انداز میں اس کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کے خیال میں اسسٹنٹ بیری نے جان بوجھ کر ٹام کے سر پر بیلچہ مارا تھا۔

اچانک کمانڈر کونڈور کی غصیلی آواز سے ماحول گونج اٹھا۔ اور ان دونوں کے قدم زمین میں پیوست ہوتے چلے گئے۔

''الو کے پٹھوں اگر آپس میں لڑنے لگے۔ تب اسے تابوت میں کون لٹائے گا۔ چلو اسے پکڑو اور تابوت میں لٹاؤ۔'' ٹام مشینی انداز میں میری جانب بڑھا۔ میں نے اسے چکما دے دیا۔ اسسٹنٹ بیری نے بیلچے کو سر سے بلند کیا اور میرے سر پر مارنے کی کوشش کی۔ میں جھکائی دے گیا۔ وقتی طور پر اسسٹنٹ بیری کی پیٹھ میری جانب ہوئی۔ میں نے فوراً اسے دھکا دے دیا۔ وہ منہ کے بل کھدی ہوئی قبر کے اندر جا گرا۔ میں نے فاتحہ انداز میں مڑتے ہوئے سونی کی جانب دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ میرے سر پر کھڑا تھا۔ اس کا مکا پوری طاقت کے ساتھ میری کنپٹی پر لگا۔ مجھے اپنے اردگرد چنگاریاں اٹھتی محسوس ہوئیں۔ پھر ہر جانب اندھیرا پھیلتا چلا گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی۔ تب میں نے اپنے آپ کو ایک ایسے کمرے کے بستر پر لیٹے ہوئے پایا۔ جس کی دیواروں پر چند مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ اور میرے ہاتھ پاؤں کو پلنگ کے ساتھ نسلک پٹیوں سے باندھ دیا گیا تھا۔ چاروں پاگل کمرے میں موجود تھے۔ کمانڈر کونڈور میرے سر کی جانب کھڑا تھا۔ میرے سر پر ہیلمٹ چڑھا دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے..... یہ ہیلمٹ لوہے کا تھا۔ مجھے اپنے جسم میں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ مجھے کرنٹ لگانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ میں نے جھٹکے کے ساتھ اوپر اٹھنے کی کوشش کی لیکن جسم کو حرکت بھی نہیں دے سکا۔ صرف کسمسا کر رہ گیا۔ کمرے میں کمانڈر کونڈور کی آواز گونجی۔

''تو تمہیں ہوش آ گیا بہت اچھی بات ہے۔ تمہیں یہ جان کر خوشی محسوس ہوگی کہ ہم نے تمہاری سزا میں وقتی طور پر تخفیف کر دی ہے۔ پاگل خانے میں جب کوئی پاگل چیخنے چلانے یا پھر مار کٹائی کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ تب اسے اس کمرے میں لا کر کرنٹ لگایا جاتا تھا۔ ایک دو جھٹکوں کے بعد وہ سیدھا ہو جاتا تھا۔ تم نے قبرستان میں چیخنے چلانے اور لڑنے جھگڑنے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ ٹام بیچارے کا سر بھی پھاڑ دیا ہے۔''

میں نے پریشان نگاہوں سے ٹام کی جانب دیکھا۔ اس کے سر پر سفید رنگ کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"کمانڈر کہتا چلا جارہا تھا۔" اس لئے سزا کے طور پر تمہیں کرنٹ دینے کے بعد دوبارہ تابوت میں بند کر کے قبر میں لٹادیا جائے گا۔" میں نے گھگھیائے ہوئے لہجے میں اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"تم ایسا نہیں کرسکتے ہو میں شیرف تھامسن کو فون کرچکا ہوں۔ وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچنے والا ہے۔ پھر تم چاروں کی وہ درگت بنائے گا کہ تم تمام زندگی بھول نہیں پاؤ گے۔" میری اس دھمکی کا اس پر کچھ خاص اثر نہیں پڑا۔ اور وہ دیوار میں لگے سرخ رنگ کے بٹن کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

"تم یقین جانو..... میں ڈاکٹر ڈین کا اسسٹنٹ رہ چکا ہوں۔ جس مریض کو بھی کرنٹ لگانا ہوتا تھا۔ تب اکثر ڈاکٹر ڈین میری خدمات حاصل کرتا تھا۔ میں اس کام میں خاصی مہارت حاصل کرچکا ہوں۔ لیکن آج سے پہلے مجھے ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کرنا ہوتا تھا آج خود مختار ہوں۔ مجھے کسی کی بھی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے بٹن کو دبادیا۔ میں نے چلانے کی کوشش کی۔ تب اسسٹنٹ بیری نے آگے بڑھ کر گتے نما چیز کو میرے منہ میں ٹھونس دیا۔

اس کے فوراً بعد مجھے اپنے دماغ میں چنگاریاں پھوٹتی محسوس ہوئیں۔ میرا جسم بیلے ڈانس میں تھرکتی رقاصہ کی مانند بستر پر رقص کرنے لگا۔ تمام جسم میں کرنٹ خون کی مانند دوڑنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے جسم میں سے جان کو کھینچ کر باہر نکالا جارہا ہو۔ پھر میں بے سدھ ہوتا چلا گیا۔ میرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا لیکن محسوسات نمایاں تھے۔ شاید شعور سو گیا تھا۔ لیکن لاشعور جاگ رہا تھا اور اب مجھے محسوس ہورہا تھا۔ جیسے وہ مجھے اٹھا کر باہر لے جارہے ہوں۔ شاید قبرستان میں..... تابوت میں دفن کرنے کے لئے..... لیکن میں مجبور ولاچار تھا۔ اپنی مرضی کے مطابق حرکت نہیں کرسکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے دھکا دے کر فرش پر دھکیل دیا گیا۔ پھر گھپ اندھیرا چھاتا چلا گیا۔ اس کے بعد نہ جانے کتنی دیر بعد مجھے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے آکسیجن کم ہوتی چلی جارہی ہے۔ سانس سینے میں رکنے لگا۔ پھیپھڑے کے پھولنے اور پچکنے کی بدولت مجھے اپنے جسم میں انتہائی تکلیف دہ کھنچاؤ محسوس ہوا۔ اور میں نے جھٹکے کے ساتھ آنکھیں کھول دیں۔

شیرف تھامسن میرے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے چٹکی کی مدد سے میرے ناک کے دونوں نتھنوں کو بند کردیا تھا۔ شاید ایسے مجھے ہوش میں لانے کے لئے کیا گیا تھا۔ بہرحال میرے آنکھیں کھولتے ہی وہ ناک کو چھوڑ کر بستر کے قریب کھڑا ہوگیا۔ میں اسپتال کے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ اور میرے ارد گرد شیرف کے علاوہ ڈاکٹر اور نرسیں بھی موجود تھیں۔ میں نے شیرف کی جانب استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔ تب وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"چاروں پاگلوں کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ وہ تمہیں قبرستان میں دفن کرچکے تھے۔ میرے پاگل خانے پہنچنے پر میں نے انہیں پانی گرم کرتے ہوئے پایا۔ شاید تمہارے نمکین غسل کی آخری تیاریاں تھیں۔ بہرحال تھوڑے سے تشدد کے بعد انہوں نے مجھے تمہارے متعلق بتادیا۔ اور یوں میں نے تمہیں بروقت قبر میں سے صحیح سلامت باہر نکال لیا۔"

میں نے اطمینان کا طویل سانس لیا اور مطمئن انداز میں آنکھیں بند کرلیں۔

دوسرے دن مجھے اسپتال سے فارغ کردیا گیا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ میری دماغی حالت درست ہے اور یقین جانیے کہ مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوا۔

میری کتاب "پاگل خانہ" مارکیٹ میں آچکی ہے اور بہت پسند کی جارہی ہے۔ شاید کرنٹ کی بدولت میرے دماغ کی گل ہوتی ہوئی بتی دوبارہ روشن ہوئی ہے۔ کیونکہ بہت سے پبلشرز مجھ تک رسائی کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ لیکن میں بہتر سے بہترین لکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے پبلشروں کے انتخاب میں مصروف ہوں۔

ٹپکتا خون

ساجدہ راجا۔ ہندواں سرگودھا

وہ اپنے وقت کی حسین و جمیل بلکہ خوبصورتی میں یکتا تھی کہ ایک جادوگر نے جادو کے زور پر اسے بے حس و حرکت مانند مجسمہ بنا دیا اور شرط رکھی کہ جب یہ میری فرمانبرداری قبول کرے گی تو اپنی اصل حالت میں آجائے گی مگر پھر.....

تجسس کے پالنا میں جھولتی ہوئی نادیدہ قوتوں کی لرزا دینے والی ایک اچھوتی کہانی

"میں کہتا ہوں اسے میرے حوالے کردے ورنہ اچھا نہیں ہوگا....."

"میں ہرگز اپنے بچے کو تمہارے حوالے نہیں کروں گی..... تم جو کرنا چاہو کرلو....." اس نے اپنے شیر خوار بیٹے کو سینے سے چمٹاتے ہوئے کہا..... "دیکھ میری بات مان لے، اگر ہم نے اپنا بچہ اس کے حوالے کردیا تو وہ ہمیں دولت سے مالا مال کردے گا..... ہم عیش کریں گے۔ بچے کا کیا یہ تو بعد میں بھی پیدا ہوتے رہیں گے....." رحیم نے خباثت سے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

"کتنے سنگدل باپ ہو تم جو اپنی اولاد کو بیچ کر دولت سے عیش و آرام حاصل کرنا چاہتے ہو..... تمہارا ضمیر کہاں جاسویا ہے.....؟ کچھ تو خدا کا خوف کرو؟ کیا تمہیں ذرا بھی غیرت نہیں.....؟" مریم نے اسے

احساس دلانا چاہا لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ نشے کی کیفیت نے اسے حیوانوں سے بھی بدتر بنا دیا تھا۔ گھر کی ہر چیز کو وہ نشے کے لئے بیچ چکا تھا۔ اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا کہ وہ بیچ کر نشے کی ضرورت کو پورا کرتا۔

نشہ بیچنے والے نے اسے مفت میں دینے سے انکار کر دیا تو رحیم اس کے پیروں میں گر گیا اور رو رو کر فریاد کرنے لگا ''تھوڑا سا نشہ دے دو ورنہ میں مر جاؤں گا.....''

''تو مر جا کس نے منع کیا ہے.....؟ یہاں مفت کا مال نہیں ملتا ہم بھی پیسہ لگا کر اور پولیس کی نظروں سے بچ کر بڑی مشکل سے مال لاتے ہیں..... تم لوگ تو بس آرام سے پیسے دیتے ہو اور خرید کر چلے جاتے ہو.....'' استاد نے آنکھیں مٹکائیں۔

''دیکھو استاد! تجھے اللہ کا واسطہ آج مجھے تھوڑا سا دے دے کل میں پیسوں کا انتظام کرلوں گا.....'' رحیم نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''ہاں ایک راستہ ہے اگر تو مانے تو.....؟'' استاد نے رحیم کی طرف خباثت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے بتاؤ استاد میں ہر کام کرنے کے لئے تیار ہوں بس مجھے ایک پڑیا دے دے، اس کے بعد جو مرضی کروالینا.....'' رحیم نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''پہلے میری بات غور سے سن.....'' استاد نے رحیم کو مخاطب کیا..... ''اگر تو ایک کام کردے تو میں تجھے اتنی دولت دوں گا کہ تو نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی.....''

''بول استاد کون سا کام کرنا ہے، میں ہر وہ کام کروں گا جس میں مجھے دولت حاصل ہو.....'' رحیم نے ہوس بھرے لہجے میں کہا تو استاد نے گرم لوہے پر چوٹ لگائی..... ''تیری بیوی کوئی لفڑا نہ ڈالے مجھے اس کا ڈر ہے.....''

''نہیں استاد تو کام بتا، اس سالی کی اتنی ہمت نہیں کہ میرے آگے پر بھی مار سکے.....'' رحیم نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

''تجھے ایسا کرنا ہے کہ تیرا جو بچہ ہے اسے اپنی گھر والی کی نظروں سے چھپا کر میرے حوالے کردے۔ اس کے بعد تجھے اتنی دولت ملے گی کہ تو نشے کے سمندر میں غرق ہو جائے گا.....'' استاد نے اسے مزید لالچ دیا تو وہ فوراً تیار ہو گیا..... نشے نے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم کر دی تھی..... وہ بے غیرتی کی انتہا کو پہنچ گیا تھا.....

گھر آ کر وہ بچے کو اٹھا کر آہستہ سے باہر نکلنا چاہتا تھا کہ اس کی بیوی کی نظر اس پر پڑ گئی نتیجتاً ان میں تکرار جاری ہو گئی.....

''آج تو تو نے دیکھ لیا لیکن کل دیکھنا میں اسے کیسے لے جاتا ہوں تیرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی..... اور تو مجھے ایسا کرنے سے نہیں روک سکتی.....'' یہ کہہ کر رحیم گھر سے باہر نکلتا چلا گیا جبکہ مریم نے خوفزدہ ہو کر اپنے بیٹے کو سینے سے لگا لیا.....

☆.....☆.....☆

شہنشاہ جنات اس وقت بے چینی سے اپنی خواب گاہ میں ٹہل رہا تھا، اس کے چہرے پر فکرمندی اور غم کے تاثرات تھے۔ بات دراصل یہ تھی کہ اس کی اکلوتی بیٹی زرمانہ مسلسل سکتے کی حالت میں تھی۔ ایک جادوگر اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر اسے اپنے قبضے میں کرنا چاہتا تھا کہ اپنی نفسانی خواہش کی تکمیل کر سکے لیکن کسی صورت بھی زرمانہ اس سے راضی نہیں تھی..... جادوگر بہت بدخصلت اور شیطان کا پیروکار تھا، وہ شہزادی کو اپنے بس میں کر کے اس کے ذریعے اور بھی کالی طاقتیں حاصل کرنا چاہتا تھا چونکہ شہزادی شہنشاہ جنات کی بیٹی تھی اور شہنشاہ جنات کی وفات کے بعد اس کی ساری طاقتیں شہزادی کو منتقل ہو جاتیں اور شہزادی سے وہ طاقتیں جادوگر حاصل کر لیتا۔ اس کے بعد وہ شہزادی کو موت کے گھاٹ اتار دیتا اور جادوئی دنیا کا بے تاج بادشاہ بن جاتا۔

شہزادی نے جادوگر کی خواہش کو رد کر دیا تو وہ

جلال میں آ گیا اس نے ایک عمل پڑھ کے شہزادی کو ایک مجسمے کی مانند بے حس و حرکت کر دیا، کوئی بھی اسے دیکھ کر یقین نہیں کر سکتا تھا کہ شہزادی زندہ ہے.....!

جادوگر نے اس کو ٹھیک کرنے کی یہ شرط رکھی کہ جیسے ہی شہزادی دل میں میری فرماں برداری کے لئے رضامند ہو گی تو خود بخود ٹھیک ہو جائے گی شہنشاہ جنات نے سارے حربے آزما لئے سب کچھ کر لیا لیکن وہ سب بے کار ہوا کیونکہ شہزادی ٹھیک نہیں ہو سکی تھی۔

شہنشاہ جنات نے دربار کے نجومیوں کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا کہ ان سے اس مسئلے کا حل معلوم کیا جا سکے..... تھوڑی دیر میں سارے نجومی شاہ جنات کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آداب بجا لائے شاہ جنات نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا ان کے بیٹھنے کے بعد شاہ جنات نے فرمایا.....

''ہم نے آپ کو یہاں ایک خاص مسئلے کے حل کے لئے بلایا ہے..... آپ لوگ جانتے ہیں کہ ہماری بیٹی کو جادوگر نے ایک عمل کے ذریعے بے حس و حرکت کر دیا ہے..... ہماری ہر کوشش ناکام ہوئی ہے اس لئے ہم نے آپ کو زحمت دی کہ آپ اپنے عمل سے حساب لگا کر بتائیں کہ کیا اس مسئلے کا یعنی شہزادی کے ٹھیک ہونے کا کوئی حل ہے.....؟ اگر ہے تو وہ کیا ہے.....؟''

''جو حکم آپ کا شہنشاہ محترم.....!'' یہ کہہ کر نجومی اپنے حساب میں مصروف ہو گئے کچھ دیر بعد انہوں نے سر اٹھایا ان میں سے ایک عمر رسیدہ نجومی بولا.....

''شہنشاہ محترم! ہمارے حساب کے مطابق شہزادی صاحبہ کو ٹھیک کرنے کا ایک ہی راستہ ہے، اس کے لئے ایک ایسے انسانی بچے کی ضرورت ہو گی جو ابھی شیر خوار ہو اور اس کی ماں بخوشی اس کو آپ کے حوالے کرے، اگر ایسا ہو گیا تو ہر روز اس بچے کے خون کے چند قطرے شہزادی صاحبہ کے ماتھے پر ٹپکانے ہوں گے۔ یہ عمل دس دنوں کا ہو گا..... جونہی دسویں دن خون کے قطرے شہزادی کے ماتھے پر ٹپکائیں جائیں گے وہ اپنی اصلی حالت میں واپس آ جائیں گی۔'' نجومی نے شاہ جنات کو مکمل تفصیل سے آگاہ کیا۔

شاہ جنات یہ سن کر بہت پریشان ہو گیا اول تو کوئی ایسی ماں نہیں جو اپنے بچے کو بخوشی کسی اور کے حوالے کردے، چاہے چند دنوں کا ہی کیوں نہ ہو۔ اور دوسرا اگر ہر روز اس بچے سے خون نکالا جاتا رہا تو اس کے زندہ رہنے کے چانس نہیں تھے اور شاہ جنات ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ کسی معصوم کی جان چلی جائے چاہے وہ انسان ہی کیوں نہ ہو..... اس کی پریشانی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

شاہ جنات نے سارے بزرگ جنات کو طلب کر لیا اور اس مسئلے میں مشورہ طلب کیا..... سب نے اس رائے پر اتفاق کیا کہ شہزادی کی زندگی ہم سب کے لئے بھی بہت اہم ہے اس لئے انسانی دنیا میں جا کر کوشش کرنی چاہیے۔ ''ہو سکتا ہے کوئی امید نظر آ جائے.....''

شاہ جنات نے بھی اس بات کی تائید کی اور سب کو ہدایت کی کہ انسانی دنیا میں نظر رکھیں اور ہر بات سے ہمیں مطلع کرتے رہیں..... اس کے بعد سارے جنات دربار سے رخصت ہو گئے.....

☆.....☆.....☆

مریم بہت گھبراہٹ کا شکار تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو کہاں چھپائے.....؟ اسے کہاں رکھے جہاں اس کے ظالم شوہر کی نظر نہ پڑ سکے لیکن کوئی طریقہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا.....

اب ایک ہی راستہ رہ جاتا تھا کہ وہ رحیم کی غیر موجودگی میں اپنے بیٹے کو لے کر گھر سے نکل جائے..... وہ رحیم کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھی۔ کیونکہ نشے نے رحیم کو بالکل نکما کر دیا تھا۔ اس نے جو ٹھان لی تھی وہ کر کے چھوڑتا اس لئے اس کے فیصلے میں مزید پختگی آ گئی..... جونہی رحیم گھر سے نکلا

اس نے کچھ سامان پوٹلی میں باندھا اور بچے کو اٹھا کر چپکے سے گھر سے نکل گئی۔

وہ پہاڑی علاقہ تھا اس لئے اسے چھپنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی۔ وہ جلدی جلدی چلتی جارہی تھی ابھی اس نے کچھ سفر طے ہی کیا تھا کہ آسمان بادلوں سے بھرنے لگا۔ جب وہ گھر سے نکلی تھی تو اس وقت موسم بالکل صاف تھا اب اچانک بادلوں کا آنا مریم کی پریشانی کو بڑھا گیا وہ جانتی تھی کہ اگر بارش ہوگئی تو اس کے لئے بہت مشکل ہوجائے گی..... پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے پہاڑی نالے زور وشور سے بہنا شروع ہوجاتے تھے اس وجہ سے آمدورفت ناممکن ہوجاتی تھی۔ وہ بہت فکرمند تھی اس نے تیز تیز چلنا شروع کردیا۔ بادل گہرے ہوتے جارہے تھے اور اس کی پریشانی میں مسلسل اضافہ ہورہا تھا..... اتنے میں تیز ہوا چلنا شروع ہوگئی تو اس نے ایک پہاڑ کے دامن میں چٹان کے ساتھ پناہ لی۔ ہوا کے زور میں اضافہ ہونے لگا اور وہ بڑھتے بڑھتے اتنی تیز ہوگئی کہ پہاڑوں پر سے بڑے چھوٹے پتھر گرنا شروع ہوگئے۔

پتھر اس سے کچھ فاصلے پر گر رہے تھے۔ وہ دم سادھے ایک چٹان کے ساتھ سمٹی ہوئی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی ایک تو پہاڑی علاقہ اور اتنا خطرناک موسم اور دوسرا وہ اکیلی۔ ایک چند ماہ کا بچہ اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ تیز ہوائیں چنگھاڑتی ہوئی جب پہاڑوں سے ٹکرائیں تو اتنی خوفناک آواز پیدا ہوتی کہ مریم کو اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوتا، بچہ دم سادھے پڑا تھا۔ ماں کی گود ہی اس کی پناہ گاہ تھی وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی ماں پر کیا گزر رہی ہے..... مریم کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنا خوف دور کرنے کے لئے زور زور سے چیخے۔ کوئی نصف گھنٹے کے بعد ہوا کے زور میں کمی آئی تو پہاڑ پر سے پتھروں کی بارش بھی رک گئی۔ اس نے اپنی رکی ہوئی سانس خارج کی اور اوپر آسمان کی طرف نظر اٹھائی بادل بہت تیزی سے ادھر ادھر اڑتے پھر رہے تھے اور آندھی کے بعد بارش کا امکان بہت حد تک کم ہوگیا تھا..... اس نے سوچا یوں رکنے اور بارش کا انتظار کرنے سے تو بہتر ہے کہ اپنا سفر جاری رکھا جائے.....

اونچے نیچے پتھریلے راستوں سے گزرنے کے بعد وہ ایسی جگہ آگئی جہاں آگے سے جھیل راستہ روکے کھڑی تھی اور اس کو پار کئے بغیر وہ آگے نہیں بڑھ سکتی تھی..... اس نے ادھر ادھر دیکھا تو تھوڑی دیر میں اسے ایک کشتی نظر آئی تو وہ جلدی سے اس کی طرف بڑھی۔

کشتی میں ایک آدمی اس کی طرف پیٹھ کئے بیٹھا تھا اس نے اس آدمی کو پکارا..... ''بھائی صاحب..... ذرا بات سنیں۔ مجھے جلدی سے جھیل کے دوسرے کنارے پر پہنچادیں۔ آپ کی بڑی.....'' ابھی بات اس کے منہ میں ہی تھی کہ اس آدمی نے ایک جھٹکے سے گردن گھما کر دیکھا.....

''اوہ خدا!..... اتنی خوفناک آنکھیں جیسے خون میں لتھڑی ہوئیں..... اس کے چہرے سے درندگی اور سفاکی ٹپک رہی تھی۔ اور آنکھوں سے بے رحمی صاف جھلک رہی تھی..... مریم کو جھرجھری آگئی۔ اس آدمی نے سیدھے ہوکے کشتی کے چپو درست کئے..... مریم جو ابھی اسی سوچ میں تھی کہ جائے کہ نہ جائے.....؟ اس آدمی کی آنکھوں میں دیکھتے ہی اس کی ساری سوچیں مفلوج ہوگئیں..... وہ ایک بے جان گڑیا کی مانند اس کشتی میں سوار ہوگئی..... اس کے بیٹھتے ہی اس خوفناک آدمی نے بہت تیزی سے چپو چلانے شروع کردیئے جیسے اسے کسی چیز کا خوف ہو.....

اچانک ہی بچے نے زور زور سے رونا شروع کردیا، اسے شاید بھوک ستا رہی تھی..... اس نے دیکھا کہ جیسے ہی بچے نے رونا شروع کیا تو اس آدمی میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی..... وہ بار بار بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا..... مریم نے جلدی سے بچے کو دودھ پلانا چاہا کہ اچانک وہ آدمی اتنے زور سے بولا کہ مریم وہیں ساکت ہوگئی.....

''چپ کراؤ اس بچے کو..... میں کہتا ہوں چپ کراؤ اس کو ورنہ اچھا نہیں ہوگا.....'' مریم فوراً ہوش میں آئی اس نے جلدی سے بچے کو دودھ پلانا شروع کردیا۔ اب بچہ مطمئن ہوکے دودھ پی رہا تھا اور وہ آدمی بھی اب پہلے کی طرح سکون سے کشتی چلا رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کنارے تک پہنچتے۔ مریم نے دیکھا کہ کنارے پر بہت سے لوگ اچانک ہی آگئے تھے جیسے وہ اس کشتی کے ہی منتظر ہوں.....

☆.....☆.....☆

شاہ جنات اس وقت بھی بہت پریشان تھا کیونکہ جادوگر کی طرف سے بار بار ملنے والی دھمکیوں نے اسے بے چین کرڈالا تھا۔ اس وقت بھی سارے بزرگ جنات سر جوڑے اس مسئلے کے بارے میں گفتگو کررہے تھے جادوگر نے دھمکی دی تھی کہ اگر ایک ہفتہ میں شہزادی ٹھیک نہ ہوئی تو وہ خود اسے ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ لے جائے گا..... اور دنیا کی کوئی طاقت اسے ایسا کرنے سے نہیں روک سکے گی۔ اس کے لئے اس نے شاہ جنات کو بہت بزدل اور کمزور کہا تھا اور اس کی شان میں اور بھی بہت گستاخی کی تھی.....

سارے جنات بہت غصے میں تھے ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کمینے جادوگر کی ہڈیاں توڑ دیں..... وہ سب شہزادی کو دوبارہ اس کی اصلی حالت میں دیکھنا چاہتے تھے کیونکہ شہزادی بہت نیک دل اور اچھی تھی اس نے کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی تھی..... شاہ جنات کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی ہونے کا اس نے کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ وہ سب کے ساتھ اچھی تھی اور اس کا دل جتنا خوبصورت تھا وہ خود بھی اتنی ہی حسین تھی، جنات کی برادری بھی اس کے حسن کے گن گاتی تھی۔

شاہ جنات ابھی دربار میں ہی بیٹھا ہوا تھا کہ

اردو افسانوں کا معتبر راجندر سنگھ بیدی کے زندہ افسانے

راجندر سنگھ بیدی کے
شاہکار افسانے

قیمت =/150

انتخاب: ڈاکٹر اختر ہاشمی

سعادت حسن منٹو کے مشہور اور منفرد افسانوں کا دلآویز مجموعہ

منٹو کے
شاہکار افسانے

قیمت =/150

انتخاب: ڈاکٹر اختر ہاشمی

کامیاب بک ڈپو نوید اسکوئر اردو بازار کراچی

ایک خادم جن نے اندر آنے کی اجازت طلب کی..... اجازت ملنے پر وہ اندر آیا۔ شاہ جنات کے آگے آداب بجالایا اور ہاتھ جوڑ کر بولا.....

''شاہ محترم.....! اس خبیث کی روح نے اپنی برادری کے ساتھ دوبارہ گھناؤنا کھیل شروع کردیا ہے..... پہلے وہ اکیلا انسانوں کا شکار کرتا تھا۔ اب اپنی پوری برادری کے ساتھ مل کر یہ بھیانک کھیل، کھیل رہا ہے۔

اگر شاہ محترم نے اس کو نہ روکا تو وہ اپنی خباثتوں سے انسانوں کا جینا دوبھر کردیں گے..... شاہ محترم ابھی ایک جن نے اطلاع دی ہے کہ اس خبیث نے ایک عورت جس کے ساتھ ایک شیر خوار بچہ بھی ہے اس کو زبردستی اپنے علاقے میں لے گیا ہے..... اگر ابھی کوئی قدم نہ اٹھایا گیا تو وہ عورت اور اس کے بچے کو اپنی شیطانی خواہش کے بھینٹ چڑھادیں گے.....''

''تم اس کم بخت زرنال کی بات کررہے ہو.....'' شاہ جنات نے نہایت غصے سے خادم جن سے پوچھا.....

''جی ہاں شاہ محترم.....! میں اسی زرنال کی بات کررہا ہوں۔'' خادم جن نے فوراً تصدیق کی۔

''ہم ابھی اس خبیث کا کچھ کرتے ہیں۔ باز نہیں آیا اپنی حرکتوں سے.....؟ لگتا ہے پہلے والی سزا نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا.....؟ ہم اس کا وجود ہی ہمیشہ کے لئے ختم کردیں گے.....'' شاہ جنات نے تالی بجائی تو فوراً ایک جن حاضر ہوا.....

''سمسال.....تم فوراً جنات کی فوج لے کر اس خبیث زرنال کو صفحہ ہستی سے مٹادو..... جاؤ فوراً اور اس عورت اور بچے کو بحفاظت ہم تک لاؤ۔'' شاہ جنات نے اس جن کو حکم دیا تو وہ جن غائب ہوگیا جبکہ شاہ جنات کسی گہری سوچ میں گم ہوگیا.....

ادھر دریا کے کنارے جونہی اس آدمی اور مریم نے کشتی سے باہر قدم رکھا ان سب کے چہروں پر سفاک مسکراہٹ بکھر گئی..... مریم نے دیکھا کہ ان سب کے چہرے کشتی والے آدمی سے مختلف نہیں تھے وہ سب بھوکی نظروں سے مریم کی طرف دیکھ رہے تھے..... مریم کو فوراً کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا لیکن وہ اتنے آدمیوں کے بیچ کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ وہ سب اس کے چاروں طرف کھڑے ہوگئے۔

''تم لوگ کون ہو اور مجھے جانے کیوں نہیں دیتے.....؟''

مریم نے خوفزدہ نظروں سے ان سب کی طرف دیکھا لیکن وہ سب یوں خاموش کھڑے تھے جیسے انہیں کچھ سنائی ہی نہ دے رہا ہو۔

''آخر تم لوگ کچھ بولتے کیوں نہیں..... خدا کے لئے مجھے جانے دو، کیوں میرا راستہ روکے کھڑے ہو.....؟'' مریم اتنے زور سے چیخی کہ ان سب کے چہرے پر خوفناک ناگواری پھیل گئی۔ اور چشم زدن میں وہ سب اس کی آنکھوں کے سامنے سے غائب تھے..... مریم حیرانگی سے چاروں طرف دیکھنے لگی پتا نہیں وہ سب کہاں غائب ہوگئے تھے۔

مریم بلا سوچے سمجھے ایک طرف چل پڑی، آگے بھی پہاڑوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا..... وہ خوف زدہ سی آگے بڑھتی جارہی تھی۔ اور دل ہی دل میں خدا کو یاد کررہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ گھر سے نکلنے کے بعد اسے کیسی کیسی جان لیوا مشکلات پیش آئیں گی وہ اب تک صرف اپنے بچے کی وجہ سے پر ہمت تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے اب کس سمت میں سفر کرے وہ بس اندازے سے چلی جارہی تھی۔ پتھریلے راستے پر چلنے میں اسے بہت مشکل پیش آرہی تھی لیکن وہ چلتی جارہی تھی۔ اردگرد سے بے نیاز.....

کچھ دیر بعد اس نے جونہی نظر اوپر کی تو حیران رہ گئی اس وقت وہ ایک بہت بڑے غار میں موجود تھی۔ غار میں جگہ جگہ آگ کے بہت بڑے بڑے الاؤ روشن تھے اور اردگرد شدید ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے سہم کر اپنے بچے کو سینے سے لگالیا اور زور سے چیخی۔ جیسے اس کا بچہ اس سے کوئی چھین رہا

ہو، بچہ اس قرب سے گھبرا کر زور زور سے رونے لگا جیسے ہی اس کے رونے کی آواز بلند ہوئی۔ اردگرد پھیلے سناٹے میں انتشار برپا ہوگیا اور ایسی ایسی بھیانک آوازیں آنی شروع ہوگئیں جیسے وہاں موجود لوگ سخت بے چینی کا شکار ہوں جوں جوں بچے کی آواز بلند ہوتی گئی ان بھیانک آوازوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا..... مریم سہم کر ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور بچے کو دودھ پلانا شروع کردیا..... جونہی بچے نے رونا بند کیا تو بھیانک آوازیں بھی یوں معدوم ہوگئیں جیسے ان کا وجود ہی نہ ہو..... بچہ دودھ پیتے پیتے سو چکا تھا۔ مریم بھی تھک کر نڈھال ہوچکی تھی لیکن وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بس یہی سوچ رہی تھی کہ نہ جانے وہ کس چکر میں پھنس گئی ہے اور پتا نہیں یہاں سے زندہ سلامت نکل بھی سکے گی یا نہیں.....؟

یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی ابھی وہ جاگتی سوتی حالت میں تھی کہ اسے یوں محسوس ہوا کہ کچھ لوگ اس کے سامنے کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ یہ احساس اس قدر شدید تھا کہ اس کی نیند اڑن چھو ہوگئی..... اس نے پٹ سے آنکھیں کھولیں اور یہ دیکھ کر اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی کہ وہ آدمی جو اسے کشتی میں یہاں لایا تھا اس کے اوپر جھکا ہوا تھا اس کے دانت بہت لمبے ہورہے تھے اور اس کے چہرے اور آنکھوں سے درندگی جھلک رہی تھی اس کے پیچھے اور بھی اس کی طرح کے آدمی کھڑے تھے اور بار بار اپنی زبان ہونٹوں پر پھیر رہے تھے اور عجیب عجیب سی آوازیں نکال رہے تھے۔ مریم سمجھ گئی کہ اب اس کی موت قریب ہے۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے اور آنکھیں وحشت سے پھٹنے کے قریب ہوگئیں۔ اس آدمی کا چہرہ مزید اس کے چہرے کے قریب آتا جارہا تھا اور کسی بھی وقت اس کے دانت مریم کی نرم و نازک گردن میں پیوست ہوکر اسے ہمیشہ کے لئے سلا سکتے تھے۔

اس نے خوف سے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے بچے کو سینے سے لپٹالیا، بچہ ایک بار پھر رونے لگا۔

وہ خوفناک آدمی ایک جھٹکے سے پیچھے ہوگیا..... پتا نہیں کیوں جب بھی بچہ روتا تو اس آدمی کی بے چینی میں اضافہ ہوجاتا تھا اور وہ مریم سے دور ہوجاتا..... مریم کو اس کا بخوبی اندازہ ہوگیا۔ وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی اور پیچھے کی طرف ہٹنے لگی۔ اس نے بچے کو چپ کروانے کی کوشش نہیں کی وہ خوفناک آدمی اس جگہ کھڑے تھے اور اپنے سینوں کو اور سروں کو پیٹنے لگے اور ساتھ ساتھ عجیب وغریب آوازیں نکالنے لگے۔

مریم ان سے کافی دور آگئی تھی۔ بچے کے رونے کی وجہ سے وہ اس کے نزدیک آنے کی ہمت نہیں کرسکے تھے۔ اب مریم نے دوڑنا شروع کردیا تھا اور ان کی پہنچ سے کافی دور نکل آئی تھی بچہ اب بھی رو رہا تھا لیکن وہ خوف کی وجہ سے اسے چپ کروانے سے گریز کررہی تھی کہ اگر اس نے بچے کو چپ کروایا تو وہ آدمی یا روحیں پھر اس تک نہ پہنچ جائیں۔ وہ بھاگتی ہوئی جارہی تھی کہ اچانک ایک پتھر سے ٹھوکر لگنے کی وجہ سے وہ گرگئی اور اس کا سر زور سے ایک پتھر سے ٹکرایا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئی.....

ادھر شاہ جنات کا حکم پانے کے بعد سمسال جو جنات کی فوج کا کمانڈر تھا جنات کی فوج کو لے کر انسانی دنیا کی طرف روانہ ہوگیا جہاں زرنال اور اس کی ساتھی روحوں نے بے گناہ انسانوں کا جینا دوبھر کیا ہوا تھا جو بھی انسان ان کے چنگل میں پھنس جاتا تھا اس کا بچ نکلنا ناممکن ہوتا تھا۔ شاہ جنات نے پہلے بھی ایک دفعہ اسے سزا دی تھی..... جونہی اس کی سزا ختم ہوئی وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو لے کر پھر اس گھناؤنے کھیل میں مشغول ہوگیا۔ انسانی گوشت ان کی مرغوب غذا تھی..... مرنے سے پہلے بھی وہ بہت خبیث فطرت کا مالک تھا اور مرنے کے بعد بھی اسے چین نہیں آیا تھا..... جونہی سمسال انسانی دنیا میں پہنچا اس نے ایک عورت کو جو ایک بچہ اٹھائے ہوئے تھی بھاگتے دیکھا..... یقیناً یہ وہی عورت تھی جو ان بدروحوں کے

چنگل میں پھنس گئی تھی اور اب جان بچا کر بھاگ رہی تھی۔ اچانک سمسال نے دیکھا کہ وہ عورت ٹھوکر کھا کر گر گئی اور بچہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا.....

اس نے فوراً ایک جن کو اس طرف روانہ کیا کہ وہ اس عورت کو بچہ سمیت شاہ جنات کی خدمت میں حاضر کرے.....اور خود زرنال کو سبق سکھانے اس کی طرف روانہ ہوگیا.....

زرنال نے جیسے ہی سمسال اور اس کی فوج کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا.....اس نے ساتھیوں سمیت بھاگنے کی کوشش کی لیکن سمسال اور اس کی فوج پہلے ہی تیار تھی انہوں نے آگ کے گولے ان کی طرف پھینکنے شروع کردیئے وہ آگ جس جس سے ٹکراتی اسے آگ لگ جاتی اور ان کی بھیانک آوازوں سے پورا غار گونج اٹھا.....آخر کار ان سب خبیث روحوں کا زرنال سمیت خاتمہ ہوگیا اور سمسال اپنی فوج سمیت واپس اپنی دنیا کی طرف روانہ ہوگیا.....

ایک جن جو کہ مریم اور بچے کی حفاظت کے لئے آیا تھا اس نے مریم اور اس کے بچے کو فوراً شاہ جنات کی خدمت میں پہنچا دیا۔ ''شاہ محترم! یہ وہی عورت اور بچہ ہے جسے زرنال اور اس کے ساتھی روحوں نے اپنے مذموم مقاصد کے لئے اغوا کیا تھا لیکن یہ عورت وہاں سے کسی طرح بھاگ نکلی۔ اور بھاگتے ہوئے ٹھوکر کھا کر گری اور بے ہوش ہوگئی اور ہم عین وقت پر وہاں پہنچ گئے اور اسے اٹھا کر آپ کی خدمت میں پہنچا دیا۔''

اس جن نے ساری تفصیل شاہ جنات کی خدمت میں گوش گزار کردی۔ شاہ جنات نے غور سے جن کی ساری بات سنی اور کنیزوں کو حکم دیا کہ ''اس کا خاص خیال رکھا جائے اور جیسے ہی یہ ہوش میں آئے۔ ہمیں اطلاع کی جائے.....''

ابھی اس نے بات ختم ہی کی تھی کہ شاہ جنات کی خدمت میں سمسال حاضر ہوا اور بولا.....''شاہ محترم! ہم نے اس خبیث زرنال کا کام تمام کردیا ہے اب وہ لوگوں کو تنگ نہیں کرسکے گا.....''

''بہت خوب.....ہمیں بہت خوشی ہوئی یہ سن کر.....اب تم جاؤ ہمیں کچھ کام ہے.....'' شاہ جنات نے سمسال کی بات کے جواب میں کہا اور سمسال فوراً غائب ہوگیا۔

مریم کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک نہایت آرام دہ بستر پر پایا۔ وہ جس کمرے میں تھی وہ بہت عالی شان تھا اور روشنیوں سے جگمگ جگمگ کررہا تھا۔ وہ روشنیاں کہاں سے پھوٹ رہی تھیں اسے کچھ سمجھ نہ آئی۔

اچانک اسے بچے کا خیال آیا تو وہ فوراً اٹھ بیٹھی اور یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ بچہ اس کی مسہری کے پاس ہی پنگھوڑے میں میٹھی نیند سو رہا تھا، وہ سمجھ نہیں پارہی تھی کہ وہ اس وقت کہاں پر ہے.....؟

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور دو نہایت خوبصورت لڑکیاں اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے ہوئے تھے جن میں لذیذ اور خوشبودار کھانا رکھا ہوا تھا۔

کھانا دیکھ کر مریم کی بھوک چمک اٹھی.....

انہوں نے کھانا مریم کے آگے رکھا تو وہ ندیدوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی.....وہ لڑکیاں مسکراتے ہوئے اسے کھانا کھاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ کھانا ختم کرکے مریم نے ان کی طرف تشکرانہ انداز میں دیکھا اور بولی.....''کیا میں جان سکتی ہوں کہ میں اس وقت کہاں ہوں اور آپ کون ہیں.....؟''

''ہم آپ کو کچھ نہیں بتا سکتے.....کچھ دیر میں آپ کو خود ہی پتا چل جائے گا۔'' اتنا کہنے کے بعد وہ دونوں برتن اٹھا کر واپس چلی گئیں اور مریم فکرمند انداز میں لیٹ گئی.....

دروازہ کھلنے کی آواز پر مریم فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی.....شاہ جنات نے اندر داخل ہوکر مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اس کی طرف قدم بڑھائے۔ مریم نے

دیکھا ایک بہت ہی وجیہہ شخصیت، جس نے بادشاہوں کا سا لباس پہنا ہوا تھا اندر داخل ہوا اور مسہری کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا.....

''یہاں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی.....''

اس آدمی نے مریم سے نہایت نرم لہجے میں دریافت کیا.....

''نہیں.....! لیکن میں آپ سب کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔'' خیر مریم اتنا تو جان چکی تھی کہ وہ انسان لگتے تو تھے لیکن انسان تھے نہیں.....کیونکہ ان کی آنکھیں تمام انسانوں کی آنکھوں سے بہت بڑی تھیں اور کانوں کی جانب کھنچتی سی محسوس ہورہی تھیں۔

''ہم آپ کو سب کچھ بتاتے ہیں۔ دراصل ہم سب جنات کی قوم سے تعلق رکھتے ہیں ہم مسلمان ہیں اور میں جنات کا شہنشاہ ہوں.....''

مریم خوفزدہ سی شاہ جنات کی جانب دیکھ رہی تھی۔ شاہ جنات نے اس کی کیفیت کو بھانپ لیا اور بولا.....''ہم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم کسی کو بلا وجہ نقصان نہیں پہنچاتے۔ جن روحوں نے تمہیں مارنا چاہا تھا۔ ہم نے ان کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا ہے۔ ہم سب کی مشکل وقت میں مدد کرتے ہیں لیکن ابھی ہم خود ایک بڑی مشکل میں گرفتار ہیں۔ اور ہمیں سمجھ نہیں آرہی کہ ہم کیا کریں.....؟'' شاہ جنات نے بے یقینی لہجے میں کہا۔

''کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ وہ مشکل کیا ہے.....؟'' مریم نے نرم لہجے میں استفسار کیا.....

''ہاں ہم آپ کو ضرور بتائیں گے.....ہوسکتا ہے آپ ہماری مشکل کا سن کر ہماری مدد کے لئے تیار ہوجائیں۔'' یہ کہہ کر شاہ جنات نے مریم کو ساری تفصیل بتائی اور آخر میں بولا.....''ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں، کہ ہم آپ سے گزارش کرتے ہیں کہ آپ ہمیں اس بات کی اجازت دیں کہ ہم آپ کے بچے کے خون کے چند قطرے دس روز تک لے کر اپنی نیم مردہ بیٹی کو دوبارہ زندگی دے سکتے ہیں.....ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ آپ کے بیٹے کو کچھ نہیں ہوگا اور ہماری بیٹی کی زندگی بچ جائے گی۔ چونکہ یہ کام آپ کی رضامندی کے بغیر نہیں ہوسکے گا اس لئے ہم آپ کے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں کہ ہماری بیٹی کی جان ''آپ کے ہاتھ'' میں ہے.....ہم اپنی بیٹی کے بغیر نہیں رہ سکتے اگر وہ اسی حالت میں رہی تو ہم جی نہیں پائیں گے.....''

شاہ جنات نے سسکتے ہوئے مریم کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ مریم تڑپ گئی اس نے فوراً کہا۔

''شاہ محترم! آپ مجھے شرمندہ نہ کریں، اگر میرے بیٹے کے خون کے چند قطروں سے آپ کی بیٹی ٹھیک ہوتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جب چاہیں ایسا کرسکتے ہیں.....'' مریم نے رضامند ہوتے ہوئے کہا.....

یہ سن کر شاہ جنات کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ''ہم آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔ ہم آپ کو ہیرے جواہرات میں تول دیں گے.....'' شاہ جنات نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے جبکہ مریم کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی.....کسی کو خوشی دے کر کتنا سکون ملتا ہے، اسے آج معلوم ہوا تھا.....

شاہ جنات نے فوراً شاہی حکیم کو دربار میں بلایا اور اسے ساری صورتحال سمجھا کر ایک کنیز کو بھیج کر مریم کو بچہ سمیت بلوالیا۔ جب مریم بچے کو لئے ہوئے آئی تو کنیز نے بچے کو شاہی حکیم کے حوالے کردیا.....شاہی حکیم نے بچے کو مسہری پر لٹایا اور ایک مشروب بچے کے دودھ میں ملا کر بچے کو تھوڑا تھوڑا پلانے لگا اس کے بعد اس نے شاہ جنات سے شہزادی کے کمرے میں جانے کی اجازت طلب کی.....شاہ جنات نے فوراً اجازت دے دی۔ شاہی حکیم نے بچے کو اٹھایا اور شہزادی کے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

کمرے میں پہنچ کر مریم نے دیکھا کہ ایک خوبصورت مسہری پر ایک خوبصورت مجسمے کی مانند ایک

لڑکی لیٹی ہوئی ہے..... وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اس پر نظریں نہیں ٹھہر رہی تھیں ..... چار کنیزیں اس کے اردگرد موجود تھیں۔

"حکیم صاحب جلدی کریں میری بیٹی کو بچا لیں....." شاہ جنات نے شاہی حکیم کو مخاطب کیا۔

شاہی حکیم نے ایک باریک سوئی لی اور اسے بچے کی شہادت کی انگلی میں چبھو دیا..... مریم نے ضبط سے آنکھیں بند کرلیں۔ بچہ تکلیف سے رونے لگا۔ اس کی انگلی سے خون کے قطرے نکلنے لگے۔

حکیم بچے کو اٹھا کر شہزادی کے پاس لے کر کھڑا ہوگیا اور انگلی سے نکلنے والے خون کے قطرے شہزادی کے ماتھے پر ٹپکنے لگے..... جب کچھ قطرے شہزادی کے ماتھے پر گر گئے تو حکیم نے فوراً ایک مرہم بچے کی انگلی پر لگا دیا جس سے بہتا ہوا خون فوراً رک گیا تو مریم کی جان میں جان آئی.....

آج دسواں دن تھا اور آخری بھی.....

مریم کو کوئی پریشانی نہیں تھی کیونکہ اس کا بچہ پہلے کی طرح تندرست اور توانا تھا۔ خون نکلنے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا یہ اسی مشروب کا کمال تھا جو شاہی حکیم نے بچے کو دودھ میں ملا کر دیتا تھا۔

سب کے سب شہزادی کے کمرے میں جمع تھے اور پھر جیسے ہی شاہی حکیم نے بچے کے خون کے قطرے شہزادی کے ماتھے پر گرائے شہزادی کے جسم میں زندگی کی لہر دوڑ گئی، وہ آہستہ آہستہ کسمسانے لگی.....

خوشی سے شاہ جنات کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور آگے بڑھ کر شہزادی کو گلے سے لگا لیا۔

دوسری طرف شہزادی کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔ وہ منظر بہت جذباتی تھا جس نے مریم کو بھی آبدیدہ کر دیا.....

اچانک شاہ جنات مڑا اور مریم سے کہنے لگا.....

"ہم آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کریں کم ہے۔ اس ذات باری تعالیٰ کی مہربانی ہے جس نے آپ کو وسیلہ بنا کر بھیجا۔" پھر شہزادی سے بولا.....

"جان پدر..... آپ بھی اپنی اس محسنہ کا شکریہ ادا کریں ان کی وجہ سے آپ کو نئی زندگی ملی ہے....."

شہزادی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مریم کے پاس آئی اور مریم کے ہاتھ تھام کر بولی..... "ہم اپنی محسنہ کا شکریہ ادا کیسے کریں.....؟ جس نے اپنی اولاد کی زندگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کسی دوسرے کی جان بچائی ....." پھر شہزادی نے اپنے گلے سے ہیروں کا ہار اتار کر مریم کو پہناتے ہوئے کہا..... "یہ ہماری طرف سے حقیر سا نذرانہ قبول کیجئے.....! یہ ہار ہمیں اپنی جان سے بھی پیارا ہے لیکن آج سے یہ آپ کا ہے....."

مریم نے مسکرا کر شہزادی کی طرف دیکھا اور بولی..... "آپ جتنی حسین ہیں آپ کا دل اس سے بھی زیادہ حسین ہے آپ کے لئے مجھے اس سے بڑھ کر بھی کچھ کرنا پڑتا تو میں انکار نہ کرتی....."

"آپ ہماری محسنہ ہیں اگر آپ یہیں رہنا چاہتی ہیں تو ہمیں بہت خوشی ہوگی اور اگر واپس اپنی دنیا میں جانا چاہتی ہیں تو ہم آپ کو پورے شان وشوکت سے روانہ کریں گے....."

"میں واپس اپنی دنیا میں جانا چاہوں گی....." مریم نے جواب دیا.....

اچانک شاہ جنات نے تالی بجائی تو دو کنیزیں حاضر ہوئیں۔ "ہماری محسنہ کو عزت واحترام سے ان کی دنیا میں لے جاؤ اور ان کو کوئی پریشانی نہ ہو....." اس کے بعد مریم کو جھپکی آئی..... جب مریم نے آنکھ کھولی تو وہ ایک خوبصورت گھر میں موجود تھی اپنے بچے کے ساتھ۔ اتنے میں وہی دونوں کنیزیں حاضر ہوئیں اور بولیں..... "یہ آپ کا گھر ہے اس میں آرام سے رہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بآواز بلند دو مرتبہ یہ نام لے لیجئے گا، آپ کی ضرورت فوراً پوری ہوجائے گی....." یہ کہہ کر وہ غائب ہوگئیں.....

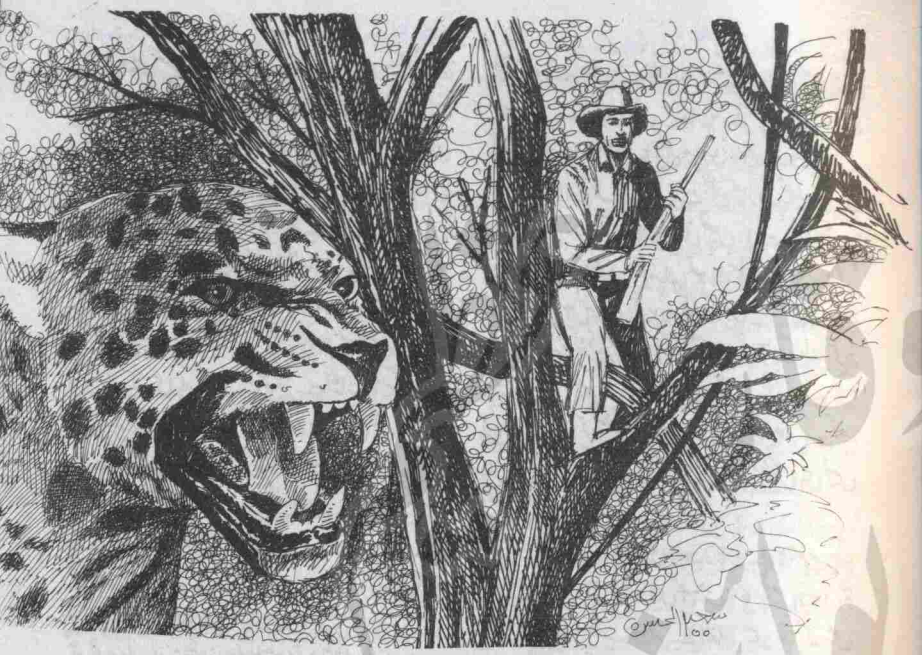

انوکھا شکاری

ترجمہ: ڈاکٹر اختر ہاشمی۔ کراچی

چشم زدن میں نوجوان کی ٹانگ گھٹنوں کے پاس سے کٹ کر الگ ہوگئی، ٹانگ کس نے اور کیسے کاٹی، کوئی پتہ نہ چلا، مگر ٹانگ کاٹنے والی عفریت جب سامنے آئی تو دیکھنے والے تھرا کر رہ گئے اور پھر.....

ایک عجیب وغریب طریقہ شکار جسے اس سے پہلے دنیا میں کسی نے بھی نہیں آزمایا تھا

عصر حاضر کا دائرہ اکیسویں صدی کے گرد رواں دواں ہے، جب کہ ہم یہاں جو شکار کا انوکھا اور حیرت انگیز واقعہ بیان کررہے ہیں اس کا تعلق بیسویں صدی سے ہے، یہ اس مشہور زمانہ شکاری کی زندگی کے واقعات میں سے ایک ہے، جسے بہت سے معاملات اور حوالے سے فوقیت حاصل رہی۔ جس نے اپنے حیران کن کارناموں سے ایک طویل عرصہ تک شکاری دنیا میں تہلکہ مچائے رکھا دوسرے شکاریوں پر فوقیت کی وجہ سے اس کا منفرد شکاری انداز تھا۔ وہ بڑے سے بڑا شکار فقط اپنے تیر کمان سے کرتا، شکاری زندگی کے دوران اس نے کبھی رائفل یا اسلحہ استعمال نہیں کیا، اس مشہور اور انوکھے شکاری کا نام "ہاورڈ ہل تھا اور اس کا تعلق شمالی امریکہ سے تھا۔"

ابھی اس کی عمر صرف چار سال کی تھی، جب اس

نے تیر کمان سنبھالا، اور چھوٹے بڑے پرندوں کے شکار سے اپنی شکاری زندگی کی ابتدا کی، سینکڑوں جانور ہلاک کئے۔ جن میں بارہ سنگھے، مگرمچھ، ریچھ، شمالی امریکہ میں پائے جانے والے پہاڑی شیر، ہاتھی اور شارک مچھلیاں شامل ہیں، یہ تمام جانور اور درندے اس نے تیر کمان سے مارے اور یہی اس کا کمال تھا، اس نے تیراندازی کے فن کی مشق میں اپنی تمام عمر گزار دی، پھر اس کی مہارت کا یہ عالم ہوگیا کہ پچاس گز کے فاصلے پر رکھی ہوئی باریک سی باریک شے کو تیر سے نشانہ بنا سکتا تھا۔ ایسے وقت میں جب رائفلیں اور بندوقیں بھی موجود ہوں دیگر جدید ترین اسلحہ بھی قابل حصول ہو تو ایک شخص محض تیر کمان کے سہارے جنگل میں بے دھڑک نکل جائے اور ایک دو دن نہیں عمر عزیز کے پچاس سال دنیا کے مختلف جنگلوں میں بسر کردے اور اس کی جان بھی بچی رہے، یہاں ہم اس مشہور زمانہ شکاری کی خودنوشت سوانح حیات سے ایک شکاری مہم کا خلاصہ پیش کررہے ہیں جسے لندن کے ایک پبلشر نے شائع کیا ہے، شکار کا یہ انوکھا واقعہ ''ہاورڈ ہل یعنی خود شکاری کی زبانی سنیے۔''

سب سے پہلے میں آپ کو اپنی شکاری مہم کی وہ داستان سنانا چاہتا ہوں، جسے تاریخ میں مجھ سے پہلے کسی شخص نے سر کرنے کی جرأت نہیں کی، اور اگر سچ پوچھیں تو یہ ایسی خطرناک اور جان جوکھوں میں ڈالنے والی مہم تھی کہ بعد میں، میں خود اپنی اس جرأت پر حیران ہوتا رہا، کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ کوئی شکاری تیر کمان لے کر سمندر میں اترا ہو، اور اس نے شارک مچھلیوں کو شکار کرنے کی کوشش کی ہو؟ مجھے یقین ہے کہ آپ نے کبھی نہ سنا ہوگا۔ چنانچہ جب میں نے بحراوقیانوس کے ایک خاص حصے میں جہاں بڑی بڑی شارک مچھلیاں پائی جاتی ہیں، اترنے کا ارادہ کیا تو میرے دوستوں اور رشتہ داروں میں دہشت کی لہر دوڑ گئی اور سب نے فیصلہ کرلیا کہ میرے دماغ میں خلل ہے، اور مجھے فوراً دماغی امراض کے ہسپتال بھجوا دینا چاہیے، دوسروں کی بات تو اپنی جگہ خود میری بیوی کو بھی میرے پاگل ہوجانے کا ایسا یقین ہوا کہ وہ مجھ سے دور دور رہنے لگی، اس میں شک نہیں کہ سمندر میں محض تیر کمان کے سہارے شارک مچھلیوں سے مقابلہ کرنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا، کیونکہ جس شخص نے بھی شارک مچھلیوں کے بارے میں لرزہ خیز کہانیاں سنی تھیں، اسے اچھی طرح معلوم ہوگا کہ شارک مچھلیاں موت کا کتنا خوف ناک روپ رکھتی ہیں، ان کے درمیان گھر جانے کے بعد کوئی ذی روح سلامت نہیں رہ سکتا، منٹوں کی تو بات ہی کیا، سیکنڈوں ہی میں یہ خونخوار مچھلیاں گوشت پوست بلکہ ہڈیاں تک چبا کر ہضم کرجاتی ہیں یہ سمندری عفریت سمجھی جاتی ہیں جن کے نرغے سے بچ نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔''

مجھ میں خود اعتمادی بہت زیادہ ہے تاہم ہر چند مجھے اپنے اوپر اعتماد تھا کہ اس مہم میں ناکام نہیں رہوں گا اور ناکامی کا مطلب دوسرے الفاظ میں تھا کہ میں شارک مچھلیوں کی غذا بن جاتا، تاہم میں نے اپنی حفاظت کی تدابیر اختیار کیں، کئی مرتبہ تجربے کے طور پر سمندر میں اترا اور بے ضرر مچھلیوں کو نشانہ بنانے میں کامیاب ہوگیا، اس سے میرے حوصلے بڑھ گئے، کیونکہ میں دیکھ چکا تھا کہ میرا نشانہ پانی کے اندر بھی صحیح ہے اور کوئی تیر خالی نہیں جاتا، البتہ میں نے ایک مشکل شدت سے محسوس کی تھی اور وہ یہ تھی کہ سمندر میں ہر وقت اٹھتی ہوئی لہریں مجھے ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتی تھیں، اور بعض اوقات یہ لہریں مجھے دھکیل کر کہیں سے کہیں لے جاتیں، پانی کے بہت زیادہ دباؤ کے باعث تیر کمان سنبھالنے اور نشانہ کے لئے بھی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اور اس میں خاصی دیر لگ جاتی تھی، یہ صورتحال سخت پریشان کن تھی، اس کے علاوہ پریشان کن مشکل یہ بھی تھی کہ لکڑی کے بنے ہوئے تیر بھی پانی میں پوری قوت سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے اور کمان کا ایک سرا تو ہمیشہ ترچھا ہوجاتا تھا اس سے نشانہ چوک جانے کا بھی خدشہ لاحق تھا، ان تمام خدشوں اور رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے ضروری تھا کہ میں سمندر کے اندر تیر چلانے کی مشق کافی دنوں تک جاری رکھوں اور اس کے لئے مجھے خصوصی سامان کی اشد ضرورت تھی جو مجھے حاصل کرنا تھا۔

''ابتداء میں میرا اندازہ یہ تھا کہ ایسی مشق کے لئے مجھے زیادہ سے زیادہ ایک سے ڈیڑھ ماہ صرف کرنا پڑے گا، لیکن ایک سال بیت جانے کے بعد میں اس قابل ہوسکا کہ سمندر کی لہروں میں اپنا توازن برقرار رکھ سکوں، اس جنون کو دیکھ کر میرے دوست اور احباب ہنستے تھے اور طرح طرح کی حوصلہ شکن باتیں بناتے تھے، مگر میں نے کسی کی پرواہ نہ کی، اور اپنے کام میں لگا رہا، میں نے لمبے لمبے تیر لکڑی کے ہی بنوائے، اور ان کے اوپر لوہے کے وزنی پھلے چڑھوا دیئے، تاکہ یہ زیادہ سے زیادہ بھاری ہوجائیں، کمان بھی پہلے سے زیادہ مضبوط اور بڑی بنوائی، جس کو کھینچنا بھی عام آدمی کے بس کی بات نہ تھی، اب میں اس نئے تیر کمان سے بپھری ہوئی موجوں کے اندر کھڑا ہوکر ساٹھ فٹ کے فاصلے تک تیر پھینک سکتا تھا، پانی اگر صاف ہو اور اس کے اندر سورج کی روشنی بھی پہنچتی ہو، تو اچھی نگاہ رکھنے والا شخص تیس فٹ تک بخوبی دیکھ سکتا ہے، لیکن میرا پھینکا ہوا تیر تو دوگنا فاصلہ طے کرتا تھا، اس لئے مجھے اپنی کامیابی کا یقین ہوتا گیا، مسلسل ہونے والے تجربوں نے بتایا کہ دو سو یا تین سو پونڈ وزنی مچھلی کو تیس فٹ تک نشانہ بنا کر اپنے تیر سے ہلاک کرسکتا ہوں، یہ تمام تجربے میں نے کیلی فورنیا کے ساحلی جزیرے سانٹا پر کئے تھے، اور جب میں ان تجربوں سے مطمئن ہوگیا تو میں اپنی مہم پر روانہ ہوگیا۔ شارک مچھلیوں کے لئے میں نے بحراوقیانوس کا وہ حصہ منتخب کیا تھا جو فلوریڈا کے شمالی جانب واقع تھا۔

یہ 1941ء کا زمانہ تھا، جنگ عظیم زور و شور سے شروع ہوچکی تھی، لیکن بحراوقیانوس کا یہ حصہ پرامن تھا اور یہاں فی الحال کسی گڑبڑ کا امکان نہ تھا، اس لئے میں نے اپنے پروگرام کو عملی صورت دینے کے انتظامات شروع کردیئے، مگر میں اپنی حماقت کے باعث چند مصیبتوں میں پھنس گیا، فلوریڈا میں ان دنوں ایک فلم کمپنی آئی ہوئی تھی، جو سمندر کے اندر پائی جانے والی مخلوق اور پودوں وغیرہ کی متحرک تصویریں اتارنا چاہتی تھی، کمپنی والوں نے اپنے طور پر اگرچہ غوطہ خوروں کا انتظام کیا تھا، مگر ان سے بہتر نتائج کی جو توقع تھی وہ پوری نہ ہوئی، یوں کمپنی کو ہزاروں ڈالرز کا نقصان ہوا، خدا جانے کس کم بخت شخص نے کمپنی کے ڈائریکٹر تک یہ بات پہنچادی کہ ہاورڈ ہل نامی ایک ماہر تیرانداز اور غوطہ خور فلوریڈا میں موجود ہے، جو اس کام کو بطریق احسن پایہ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے، وہ سمندر میں شارک مچھلیوں کا شکار تیر کمان کے ذریعے کرنا جانتا ہے۔

ڈائریکٹر صاحب یہ بات سن کر بے چین ہوگئے انہوں نے سوچا کہ اگر اس شکار کو فلمایا جائے تو یہ فلم ہٹ ثابت ہوگی، پس انہوں نے ہاورڈ ہل کی تلاش میں اپنے ہرکارے دوڑا دیئے کہ وہ جہاں بھی ملے اسے حاضر کیا جائے۔

ظاہر ہے اب میری ملاقات ڈائریکٹر صاحب سے لازماً ہونی تھی، وہ ہوئی، انہوں نے مجھے معقول رقم پیشگی ادا کرکے اس بات پر رضامند کرلیا کہ میں اس مہم کو فلمانے میں ان کی مدد کروں گا لیکن جب کیمرہ مین حضرات کو علم ہوا کہ مقابلہ شارک مچھلیوں سے ہے تو ان کی روح فنا ہوگئی اور وہ سخت حفاظتی اقدامات کے باوجود سمندر میں اترنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔

آخر ڈائریکٹر نے مجھ سے کہا کہ میں کوئی اور آدمی تلاش کروں جو کیمرہ لے کر سمندر میں میرے ساتھ اترنے کے لئے تیار ہو، چنانچہ میں نے اپنے ایک دوست جین پینڈر سے بات کی، کیونکہ وہ سمندر کے اس حصے سے جسے ''پائن کا مشرقی ساحل'' کہا جاتا ہے، اچھی طرح واقف تھا، اور اسے علم تھا کہ یہاں کون کون سے بحری جانور پائے جاتے ہیں، سمندر کا یہ حصہ بہت زیادہ گہرا نہ تھا، زیادہ سے زیادہ گہرائی ڈیڑھ سو فٹ اور کم سے کم پچاس فٹ تھی اور یہ ساحل سمندری چٹانوں سے اٹا پڑا تھا۔

جین پینڈر نے اس پروگرام کی تفصیلات سنتے

ہی کانوں کو ہاتھ لگایا اور کہا۔

"میں سمندر میں اترنے کے لئے ہرگز تیار نہیں، میرا سگا بھائی وہاں ایک مرتبہ شارک کا لقمہ بنتے بنتے بچا ہے وہ تو یوں کہو کہ اس کے اعصاب مضبوط تھے، اس نے چاقو سے شارک کا مقابلہ کیا، اس کی قسمت اچھی تھی کہ اتفاق سے اس وقت وہاں ایک ہی شارک مچھلی موجود تھی، اگر دو یا تین ہوتیں تو میرے بھائی کی لاش ہڑپ کرنے میں ایک منٹ سے زیادہ نہ لگتا۔ تمہارے لئے میرا یہی مشورہ ہے کہ جان کی خیر چاہتے ہو تو اپنا ارادہ ترک کردو، ورنہ کسی شارک کا لقمہ بن جاؤ گے۔"

جین پینڈر کی باتوں سے مایوس ہو کر میں نے چند اور غوطہ خوروں اور ملاحوں سے بات کی، مگر سب نے مجھے خونخوار نظروں سے گھورا اور کوئی جواب دیئے بغیر ادھر ادھر چل دیئے، ان کا خیال تھا کہ میرا دماغ چل گیا ہے یا پھر دماغ کا کوئی اسکرو ڈھیلا ہے، بھلا شارک مچھلیوں سے بھی کسی انسان نے سمندر کے اندر اتر کر مقابلہ کیا ہے۔

اتفاق کی بات کہ میری ملاقات بین ہڈ سے ہوگئی جو بندرگاہ پر قلی تھا اور سمندر میں غوطہ خوری بھی کیا کرتا تھا، اس کی عمر چوبیس پچیس سال کے قریب ہوگی، نہایت قد آور اور قوی ہیکل جوان تھا، اس سے باتوں باتوں میں جب میں نے اپنے ارادے کا ذکر کیا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی، جس کا مطلب تھا کہ وہ اس کام کے لئے رضامند ہوسکتا ہے بعد ازاں اس نے مجھے بتایا کہ "ہم لوگ شارک مچھلیوں سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا جیوفش سے ڈرتے ہیں کیونکہ یہ مچھلی شارک سے بھی زیادہ خطرناک اور چالاک ہوتی ہے اس کے قابو آیا ہوا انسان کبھی سلامت نہیں رہتا، اگرچہ یہ مچھلی سمندر کے اس حصے میں بہت کم پائی جاتی ہے تاہم اس کی موجودگی اور آمد کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔"

میں نے اس سے کہا۔ "ہم سمندر کے اس مقام پر اتریں گے جسے موز بینڈ کہا جاتا ہے اور میری معلومات کے مطابق یہاں کبھی بھی جیوفش نہیں پائی گئی، یہ سن کر وہ میرا ساتھ دینے کو راضی ہوگیا۔

شارک مچھلی کے بارے میں اس نے ایک بات بڑے کام کی بتائی کہ وہ ساکن شے پر کبھی حملہ نہیں کرتی اور معمولی سی حرکت کو بھی نظر انداز کردیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شے سمندر میں تیزی سے حرکت کرے تو وہ اس کا تعاقب کرتی ہے، اس سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ پانی کے اندر اپنے جسموں کو کم سے کم متحرک رکھیں اور زیادہ طرح ساکن رہ کر اطراف کا جائزہ لیں۔"

مجھے بین ہڈ سے مل کر صحیح معنوں میں خوشی ہوئی اور پھر میں نے اس کا ذکر فلم ڈائریکٹر سے کیا تو اس نے بین ہڈ کو پیشگی رقم ادا کردی۔

آخر کار ایک خوش گوار صبح کو ہم نے اپنا سامان تیار کیا، پشت پر باندھنے کے لئے آکسیجن کی ٹنکیاں اور چہرے پر گردن تک ڈھانپنے والی شیشے کی ٹوپی موٹر بوٹ میں رکھی، اور موز بینڈ کی جانب روانہ ہوگئے میرا دل اس وقت کسی نامعلوم خوف سے دھڑک رہا تھا، اور اعصاب خاصے کشیدہ تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ شارک کی دہشت میرے اعصاب پر ابھی سے اتنی اثر انداز ہو رہی ہے تو پانی کے اندر مجھ پر کیا بیتے گی۔

بین ہڈ نے میرے چہرے سے اندازہ کرلیا کہ میں فکرمند ہوں، اس نے میری پشت پر بہت زور سے ہاتھ مارا، اور قہقہہ لگا کر بولا۔

"یار کچھ فکر مت کرو، اگر قدرت نے ہماری موت شارک مچھلیوں کے ہاتھ لکھ دی ہے تو اسے کوئی ٹال نہیں سکتا اور اگر ایسا نہیں تو پھر ہزار شارک مچھلیاں ہوں وہ ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گی، بس میری نصیحت یاد رکھو کہ مچھلی کو اپنے سامنے دیکھتے ہی بے حس و حرکت ہوجانا اور جونہی وہ رخ پھیرے اس پر تیر چلا دینا، اس کے بعد بیڑا پار ہے۔"

اس کے یہ الفاظ سن کر مجھے کچھ تسلی ہوئی اور میں نے ہنس کر کہا۔ "ٹھیک ہے میں تمہاری ہدایت پر عمل کروں گا۔" کہنے کو تو میں نے یہ بات کہہ دی مگر دل اب

بھی ڈر رہا تھا کہ شارک سے مقابلہ ہے دیکھیں ہمارا کیا حشر ہوتا ہے، اس سے قبل میں نے صدہا جنگلی جانوروں اور درندوں کو جنگل میں عین ان کے سامنے کھڑے ہو کر شکار کیا تھا۔ اور مجھے کبھی ڈر نہ لگا تھا۔ لیکن اس مرتبہ نہ جانے کیوں مجھ پر دہشت طاری تھی۔

موٹر بوٹ سمندر کے سینے پر نارمل رفتار سے رواں دواں تھی۔ بالآخر ہم سمندر کے اس حصے میں پہنچ گئے جہاں دنیا کی خطرناک ترین اور جان لیوا مہم کا آغاز ہونا تھا، یہاں پہنچ کر ہم نے اپنی پشت پر آکسیجن کی ٹنکیاں بندھوائیں جن کے ساتھ لمبی اور مضبوط ڈوریاں بندھی ہوئی تھیں تاکہ جب ہم اشارہ کریں تو موٹر بوٹ میں بیٹھے ہوئے آدمی ہمیں فوراً اوپر کھینچ لیں۔ بین ہڈ نے واٹر پروف کیمرہ سنبھالا اور میں نے تیر کمان ہاتھ میں لیا اور سمندر کی گہرائی میں کودنے کے لئے تیار ہوگئے، آکسیجن کی ٹنکیاں ایک گھنٹے تک کام دے سکتی تھیں، ہمیں اس مختصر عرصے میں وہ سب کچھ کرنا تھا، جو ہم کرنا چاہتے تھے، ہم دونوں ہی سمندر میں اترنے کے لئے تیار تھے دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر سمندر کے پانی پر اپنی نظریں مرکوز کردیں۔

اس کے بعد دھیرے دھیرے چلتے ہوئے وہ پانی کے اندر اترنے لگے، پانی کے اندر تاریکی تھی اور کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی، سطح پر اگرچہ اونچی اونچی لہریں اٹھ رہی تھیں لیکن تیس چالیس فٹ اترنے کے بعد ان لہروں کی قوت ختم ہوتی جارہی تھی، ساٹھ فٹ کی گہرائی میں پہنچنے کے بعد ہمارے پیر روئی کے گالوں کی مانند نرم سمندری زمین سے ٹکرائے اور ہم ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے رک گئے ہمارے منہ پر لگے شیشے کے خول میں چھوٹی چھوٹی برقی ٹارچیں بھی فٹ کی گئیں تھیں ان کا بٹن باہر لگا ہوا تھا اس کے دباتے ہی ہمارے اطراف میں روشنی پھیل گئی، ہم پندرہ فٹ کے فاصلے تک پانی کے اندر دیکھنے کے قابل ہوگئے۔

بین ہڈ نے متحرک کیمرہ چالو کردیا کیونکہ یہ ایک عجیب و غریب جگہ تھی جس کی فلم کے ذریعے مکمل تصویر کھینچنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں حیرانگی سے اپنے اطراف دیکھ رہا تھا جیسے کسی انجانی دنیا میں آنکلا ہوں۔ وہاں طرح طرح کے پودے اور گھاس پھوس اگی ہوئی تھی جن کی شکلیں اور رنگ زمین پر پائے جانے والے پودوں سے قطعی مختلف تھے، پانی کی موجوں کے ساتھ جب یہ پودے حرکت کرتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے ان میں جان پڑ گئی ہو، ان کے علاوہ چھوٹی بڑی سینکڑوں مچھلیاں تھیں جو ہمارے چاروں طرف تیر رہی تھیں۔ وہ ڈر کے مارے ہمارے قریب نہ آتیں اور جب ہم ذرا آگے بڑھتے تو وہ پیچھے ہٹ جاتیں۔

اس روز ہم نے ایک گھنٹہ تک تصویریں اتاریں اور واپس موٹر بوٹ پر پہنچ گئے کوئی شارک مچھلی ہمیں نظر نہ آئی۔ ہم مسلسل چار روز تک سمندر میں اترتے رہے اور متحرک تصاویر بناتے رہے، شارک مچھلیوں کا وہ خوف جو میرے دل میں پہلے جاگزیں تھا اب دور ہوچکا تھا اور وہی خود اعتمادی مجھے واپس مل گئی تھی جس سے میں کھلے جنگل میں کام کیا کرتا تھا لیکن آئندہ جو کچھ ہونے والا تھا وہ میرے تصور میں بھی نہ تھا۔

سمندر کی دنیا میں وہ ہمارا پانچواں دن تھا۔ ہم کافی حد تک بے خوف اور لاپروا ہوگئے تھے ہماری آکسیجن کی ٹنکیاں خالی ہونے والی تھیں اور ہم اوپر جانے کی تیاری کررہے تھے، میں نے اپنی طرف سات آٹھ فٹ بھیانک شکل کی ایک مچھلی کو آتے دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے بدن میں خون جم گیا کیونکہ وہ اتنی تیزی سے حرکت کرتی آرہی تھی کہ میں ابھی چلے پر تیر چڑھانے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے مجھ پر حملہ کردیا خیریت یہ گزری کہ وہ اصل شارک نہ تھی بلکہ ناساؤ مچھلی تھی جو اگرچہ شارک کی ہی نسل سے تعلق رکھتی ہے مگر اتنی خونخوار نہیں ہوتی۔ مچھلی کی ٹکر لگنے سے میں نے پانی کے اندر ہی قلابازی لگائی اور کمان میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ اگر اتفاقیہ طور پر شیشے کے خول میں لگی ہوئی بتیاں نہ بجھتیں تو مچھلی نے مجھے یقیناً اپنا شکار بنالینا تھا، مجھے علم نہیں کہ بین ہڈ پر کیا گزری.....

دو تین منٹ کے بعد جب میرے حواس درست ہوئے تو میں نے بٹن دبا کر بتیاں جلائیں اور اپنی کمان تلاش کی جو ایک پودے کے اندر اٹکی ہوئی تھی۔ بین ہڈ مجھ سے بارہ پندرہ فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا اس نے کمال ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اپنے خول کی بتیاں بجھادی تھیں وہ میرے قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ ہنس رہا ہے اس نے گردن سے ایک جانب اشارہ کیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو پھر وہی مچھلی اوپر کی طرف تیرتی دکھائی دی، بین ہڈ اب اس کی تصویریں بنا رہا تھا۔ میں نے ایک جگہ بمشکل اپنے قدم جمائے اور تیر جوڑ کر پوری قوت سے مچھلی کی طرف پھینکا، تیر پانی کی دیوار توڑتا ہوا گیا اور مچھلی کے سر میں پیوست ہوگیا۔ وہ غضب ناک ہو کر پلٹی اتنے میں دوسرا تیر اس کی دائیں جانب گڑ چکا تھا بین ہڈ نے ٹنکیوں کی جانب اشارہ کیا اور ڈوری کھینچ لی۔ اسے فوراً ہی موٹر بوٹ والوں نے اوپر کھینچ لیا میری ٹنکی میں بھی آکسیجن ختم ہو چکی تھی مجبوراً مجھے بھی ڈوری کھینچ کر اوپر جانا۔ پڑا چند منٹ بعد جب ہم نے نئی آکسیجن لے کر سمندر کے اس حصے میں اترے تو ناساؤ مچھلی غائب ہو چکی تھی، ہم نے اسے دور دور تک تلاش کیا مگر اس کا کہیں پتہ نہ تھا ایسے شاندار شکار کے غائب ہونے پر محرومی کے احساس نے ہمیں سخت رنج پہنچایا مگر سوائے صبر کے اور ہم کر بھی کیا سکتے تھے مجبوراً ہم نے واپسی کا پروگرام بنایا اور موٹر بوٹ میں سوار ہوگئے۔

وہ اس مہم کا چھٹا دن تھا جب ہم اپنی موٹر بوٹ سمندر میں پہلے سے بھی چار میل آگے لے گئے ہمیں حیرت ہوئی کہ ابھی تک زخمی شارک مچھلی دکھائی نہیں دی۔ اس جگہ جب ہم گہرائی میں اترے تو یہاں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں لاکھوں کی تعداد میں تیر رہی تھیں جن میں زیادہ تعداد پیرٹ فش اور لیڈی فش کی تھی جو شمال سے مشرق کی طرف اور مغرب سے جنوب کی جانب تیزی سے گروہ در گروہ تیرتی چلی جارہی تھیں ہمیں دیکھ کر انہوں نے اپنا راستہ بدل دیا اور کسی قدر ہم سے دوری پر گزرنے لگیں، یہ منظر بہت ہی پر لطف اور حیرت انگیز تھا اور اس وقت میرے دل میں خدا کی ہیبت اور عظمت ایسی نقش ہوئی جسے میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا، اسی مقام پر ہم نے بے شمار بڑے بڑے کچھوے دیکھے جو بڑھ بڑھ کر ان مچھلیوں کو ہڑپ کررہے تھے۔ ہم نے یہ یادگار منظر بھی کیمرے میں محفوظ کرلیا۔

اچانک بین ہڈ نے مجھے ہوشیار ہوجانے کا خاص اشارہ کیا اور میں چوکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا، ہم جس مقام پر سمندر میں اترے تھے وہاں مشرقی حصے میں چٹانیں واقع تھیں جن کا سلسلہ ساحل تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ یہاں بہت چھوٹی چھوٹی مچھلیاں جن کی لمبائی بمشکل ڈھائی تین انچ سے زیادہ نہ ہوگی لاکھوں کی تعداد میں تیر رہی تھیں اور میں نے یکدم محسوس کیا کہ وہ فوراً ایک جانب کو جمع ہونے لگیں جیسے کسی بڑے بحری جانور سے خوف زدہ ہوگئی ہوں، میں چٹانی پتھروں کا سہارا لیتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا کیونکہ چٹان کے اندر بحری سانپ بھی پائے جاتے ہیں اس لئے مجھے گمان ہوا کہ مچھلیاں شاید انہی میں سے کسی بڑے بحری سانپ کو دیکھ کر ڈر گئی ہوں۔ بحری سانپ بہت ہی خطرناک جانوروں میں شمار ہوتا ہے اگرچہ اس میں زہر کی زیادہ مقدار نہیں ہوتی تاہم وہ قوی سے قوی جانور کو ہلاک کرڈالتا ہے حتیٰ کہ بڑی بڑی مچھلیاں جن میں شارک بھی شامل ہے اس کا مقابلہ کرتے ہوئے گھبراتی ہیں بحری سانپ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جب تک اسے چھیڑا نہ جائے وہ خود کبھی حملے میں پہل نہیں کرتا اس لئے مجھے اطمینان تھا کہ اگر یہ سانپ قریب ہی موجود ہے تو میں اس کا آسانی سے شکار کرسکوں گا۔

بین ہڈ میرے پیچھے ہی چلا آرہا تھا میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور آگے بڑھنے کا اشارہ کیا چھوٹی مچھلیاں آہستہ آہستہ ہم سے خاصے فاصلے پر چلی گئیں اور پھر دور ہوتی ہوئی غائب ہونے لگیں اور ہم نے محسوس کیا کہ مچھلیوں کے یکایک غائب ہوجانے سے سمندر کا وہ حصہ جیسے ویران اور ڈراؤنا ہوگیا۔ یہاں ہماری فنکیوں سے خارج ہوتی ہوئی گیس کے بلبلوں کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی عجیب وحشت ناک صورتحال پیدا ہوگئی تھی ہماری سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔

دفعتاً میرے قدم رک گئے۔ مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر ایک بارہ تیرہ فٹ لمبی شارک تہہ میں موجود تھی اس کا کھلا ہوا جبڑا حرکت کررہا تھا اور گول گول آنکھیں خوب چمک رہی تھیں اس کے جبڑے کے اندر لگے ہوئے انتہائی نوکیلے اور تیز دانت مجھے صاف نظر آرہے تھے جن کی تعداد میرے اندازے سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ شارک کو دیکھتے ہی میرے ہاتھ کمان پر جم گئے اور میں نے جلدی سے تیر نکال کر چلے پر چڑھالیا اور پلٹ کر بین ہڈ کو قریب آنے کا اشارہ کیا تو فوراً وہ میرے برابر پہنچ گیا اور شارک کو دیکھتے ہی اس نے متحرک کیمرہ اسٹارٹ کردیا تھا، کیمرہ تیزی سے متحرک تصاویر بنا رہا تھا۔

شارک کی آنکھیں میری جانب تھیں مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرا جسم پتھر کا ہوگیا ہے، اب شارک کی آنکھیں تیزی سے چمکنے لگی تھیں اور بھاری جبڑا تیزی سے حرکت پذیر تھا، شارک نہایت آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھی اور بالکل اس شیر کی مانند جو اپنے شکار پر جھپٹنے سے پہلے دبے پاؤں چلتا ہے میری جانب بڑھی، مجھے صرف اتنا احساس تھا کہ اگر میرا نشانہ خطا ہوگیا تو میں کبھی زندہ نہ بچوں گا، میں قطعی بے حس و حرکت کھڑا تھا، جب وہ مجھ سے دس فٹ کے فاصلے پر رہ گئی تو یکایک بین ہڈ کے قدم ڈگمگائے اور اس کا جسم ایک جانب جھک گیا۔

بجلی کی مانند شارک اس کی طرف جھپٹی اور میں صرف اتنا دیکھ سکا کہ بین ہڈ پشت کے بل پانی میں گرا ہے شارک نے اس کی ایک ٹانگ اس اثناء میں کاٹ کر اپنے منہ میں دبالی، پانی کے اندر ہل چل پیدا ہوئی، شارک نے بل کھایا اور میری جانب تیزی سے لپکی لیکن دوسرے ہی لمحے میری کمان سے تیر نکلا اور شارک کے کھلے ہوئے جبڑے میں پیوست ہوگیا، ابلتے ہوئے خون کا ایک فوارہ شارک کے منہ سے نکلا اور وہ پانی کے اندر تڑپتی بل کھاتی دور تک چلی گئی۔

میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، بین ہڈ پانی میں ابھی تک پشت کے بل پڑا تھا، اس صورتحال سے وقتی طور پر میرے حواس کھو گئے تھے لیکن میں نے جلد ہی خود کو سنبھالا کیونکہ کسی بھی وقت زخمی شارک پلٹ کر ہم پر حملہ کرسکتی تھی، آکسیجن کی ٹنکی اب بھی کام کررہی تھی اور بین ہڈ کے منہ پر لگی ہوئی نلکی میں سے بلبلے اٹھ رہے تھے جو اس بات کا ثبوت تھے کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ میں نے کمان گلے میں ڈالی۔ بین ہڈ کا ہاتھ تھاما اور ڈوری ہلادی موٹر بوٹ والوں نے فوراً ہی ہمیں اوپر کھینچ لیا بین ہڈ کی کٹی ہوئی ٹانگ دیکھ کر موٹر بوٹ والوں کے حلق سے چیخیں نکل گئیں، انہوں نے بین ہڈ کو سیدھا کیا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔

ٹانگ کٹ جانے اور بے تحاشا خون بہہ جانے کے باعث بین ہڈ ہوش میں نہ آیا اور تمام تر کوششوں کے باوجود اسی روز ختم ہوگیا، اسے ہوش میں لانے کی تمام تدبیریں ناکام ثابت ہوئیں۔

فلم کمپنی کے ڈائریکٹر کو اس افسوس ناک حادثے پر سخت رنج تھا، بین ہڈ کے بوڑھے والد کے سوا اس کا دنیا میں اور کوئی نہ تھا۔ ڈائریکٹر نے اسے دس ہزار ڈالرز کی رقم ادا کی اور ہر ماہ دو سو ڈالر تاحیات وظیفہ مقرر کردیا۔ اسی روز شام کے چار بجے تک ہم نے شارک کی لاش سمندر میں تیرتی ہوئی تلاش کرلی، تیر اب بھی اس کے حلق میں پیوست تھا۔ آج تک کسی نے تیر کمان سے شارک کا شکار نہ کیا تھا، شکاری دنیا میں یہ ایک انوکھا واقعہ تھا لیکن ہم ایسا کر گزرے تھے لیکن مجھے حقیقتاً اس مہم کو سر کرنے کی قابل ذکر خوشی نہ تھی، کیونکہ میرے بہادر اور عظیم دوست نے اپنی جان کی قربانی دے کر مجھے اس مہم میں کامیابی سے ہمکنار کرایا تھا، شاید میں زندگی میں کبھی بھی بین ہڈ اور اس کی عظیم قربانی کو نہ بھول سکوں۔

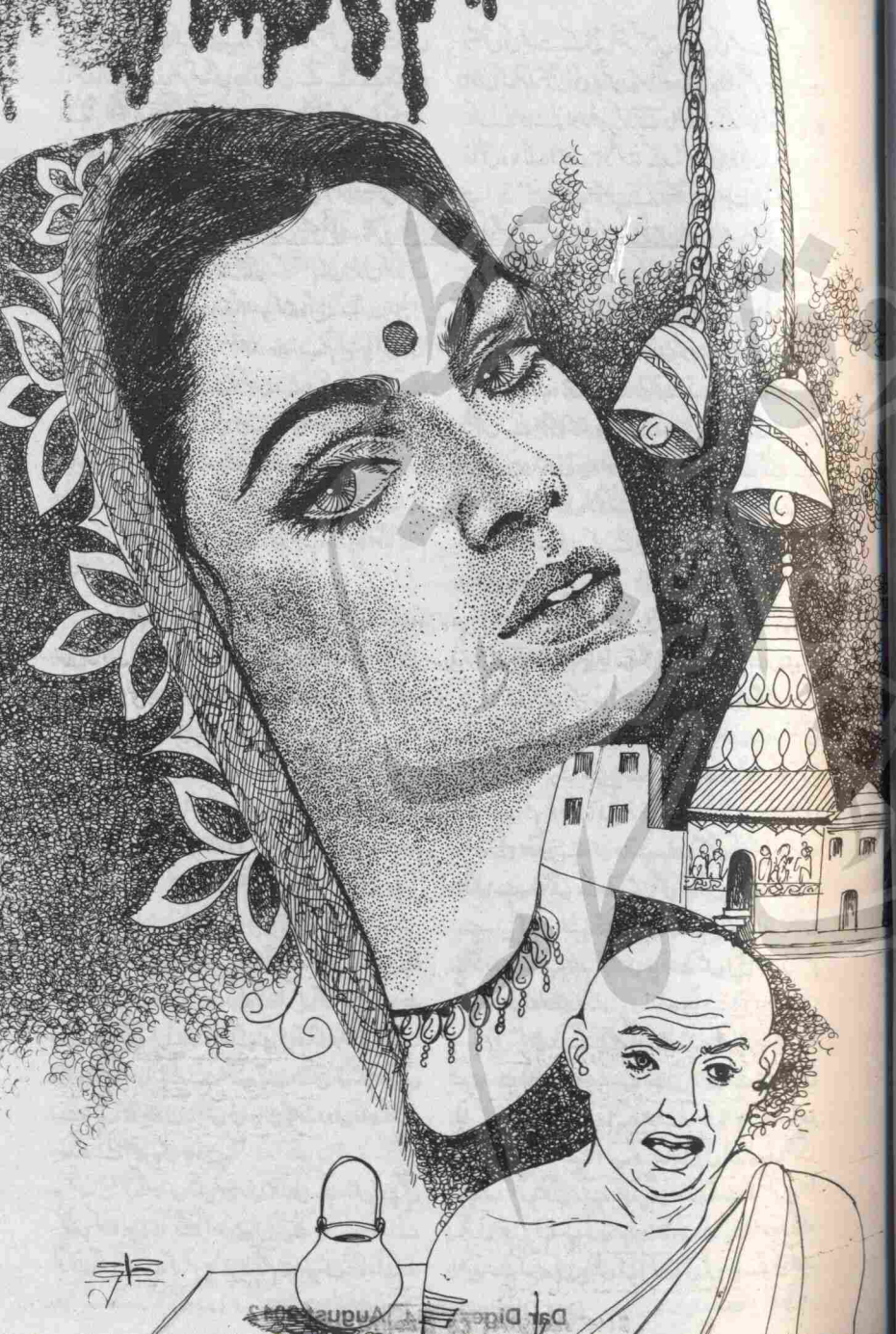

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر:87

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

مندر میں گونجتی ہوئی دیوی کی آواز سن کر گاؤں کے لوگ سکتے میں آ گئے تھے، لوگوں کی زبانیں گنگ تھیں، کالی ماتا کا بھرا ہوا انداز اس کی آواز سے پتہ لگ رہا تھا، گاؤں والوں، ان چاروں پاپیوں کا انت ہوگیا، انہوں نے گاؤں کی بہت سی نا ایوں کی عزت سے کھیلا، مجھے سب کچھ معلوم تھا مگر میں ٹالتی رہی کہ شاید وہ ٹھیک ہو جائیں مگر وہ آگے ہی آگے بڑھتے رہے، اب اس طرح اس گاؤں میں اور کوئی نہیں مرے گا۔ ان چاروں کے پاپ کا تم لوگوں کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا جس کی وجہ سے ان کی مرتیو ہوئی۔ اور پھر دیوی کی آواز آنا بند ہوگئی۔ چند دن بعد ایک رات نئے مندر کے قریب پیپل کے درخت کے پاس ایک زوردار دھماکہ ہوا، دھماکہ اتنا زوردار تھا کہ لوگوں کے دل دہل گئے ایسا لگا کہ جیسے کوئی وزنی بم گرا ہو، کوئی بھی باہر نہ نکلا کیونکہ ڈر کی وجہ سے لوگوں کا پتا پانی ہو رہا تھا۔ صبح سویرے لوگوں نے دیکھا کہ پیپل کے درخت کی جڑ کے قریب ایک بہت بڑی اور وزنی چمگادڑ مردہ پڑی تھیں۔ خیر اسے خاکستر کردیا گیا۔ ادھر رمیش کا دل بہت بیاکل رہنے لگا تھا۔ کسی صورت بھی اس کا دل کہیں بھی نہیں لگتا تھا۔ رات کی نیند اس سے کوسوں دور چلی گئی تھی۔ ایک دن رمیش صبح اندھیرے منہ اٹھا اور گاؤں کی آبادی سے دور سرسوں کے کھیت میں پہنچ گیا۔ وہ کسی انجانی طاقت کے زیر اثر کھیت میں پہنچا تھا۔ کھیت میں اسے ایک نسوانی سایہ نظر آیا جو کہ مالنی سے ملتا جلتا تھا۔ رمیش نے آواز دی۔ ”مالنی.....مالنی۔“ اور پھر وہ اس سایہ کی طرف بھاگا تو وہ سایہ اچانک غائب ہوگیا۔ بھاگتے بھاگتے رمیش کو ٹھوکر لگی اور وہ گر کر بے ہوش ہوگیا۔ ادھر سے گزرتے لوگوں کی جب اس پر نظر پڑی تو اسے اٹھا کر اس کے گھر لے آئے۔ رمیش کی حالت دن بدن بگڑ رہی تھی، جس کے پیش نظر گاؤں میں موجود حکیم نعیم رمیش کے پتا جی کو لے کر دلی حکیم وقار کے مطب میں آ گئے اور پھر ان کی ملاقات رولوکا سے ہوئی، حکیم صاحب نے ساری روداد رولوکا کے گوش گزار کردی، حالات کا سن کر رولوکا کو بھی بہت دکھ ہوا، اور پھر رولوکا حسب وعدہ رمیش کے گاؤں میں آ گیا۔ رمیش کی حالت بہت ابتر تھی۔ رولوکا نے رمیش کے گھر میں چند لوگوں کے سامنے پڑھائی شروع کردی۔ رمیش چارپائی پر لیٹا تھا اچانک چارپائی کے قریب ایک چادر سی تن گئی اور پھر اس جگہ جو منظر ابھرا، اسے دیکھ کر اس جگہ موجود سارے لوگ انگشت بدنداں ہوگئے۔ گاؤں میں جو چار نوجوان مرے تھے ان کے کرتوت سامنے آ گئے، مالنی کے ساتھ انہوں نے زیادتی کی، اس کے بعد انہوں نے مالنی کو گلا گھونٹ کر مار دیا۔

(اب آگے پڑھیں)

درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے سارے لوگ جیسے سکتے کی حالت میں تھے۔ جب مالنی مر چکی تو چاروں ہوس کے پجاری اسے گھسیٹ کر مندر کے پیچھے جھاڑیوں میں لے گئے اور ایک گڑھا کھود کر اسے اس گڑھے میں دبا دیا اور اس کے بیگ سے رقم بھی نکال لی۔

اس کے ایک ہفتہ بعد کا منظر ابھرا اور پھر یکے بعد دیگرے ان چاروں کی موت کا منظر لوگوں نے دیکھا۔ سارا منظر واضح تھا۔ موت سے پہلے مالنی کی آتما کالی ماتا کے مندر میں جاتی اور پھر اپنی کارروائی کے لئے نکل پڑتی اور پھر موت کے بعد وہ دوبارہ کالی ماتا کے مندر میں جاتی اس کے بعد وہاں سے نکل کر اس جگہ زمین میں سما جاتی جہاں اسے گڑھے میں دبا دیا گیا تھا۔

چاروں کی موت کے بعد اس نے اپنا رخ رمیش

کی طرف کیا کیونکہ وہ جب زندہ تھی تو رمیش کی محبت میں گرفتار تھی، اب مر کر بھی وہ رمیش کے لئے بے چین و بے قرار تھی۔ رمیش کی چاہت میں وہ بھٹکتی پھر رہی تھی۔

کل تک کے سارے منظر جب لوگوں کے سامنے آ گئے تو ایسا نظر آیا کہ اس کی آتما رمیش کے سامنے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ وہ خاموش بیٹھی تھی۔ پھر وہ اٹھی اور رمیش کے قریب آ کر رمیش کے جسم میں حلول کر گئی۔ رمیش کو ایک جھٹکا لگا اور وہ کسمسا کر رہ گیا۔

"اب تمہارا کیا مقصد ہے اب تم کیا چاہتی ہو؟ میں نے اور ان سارے لوگوں نے دیکھا کہ تمہارے ساتھ بہت ظلم وزیادتی کی گئی۔ اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے وہ کم ہے اور جو کچھ بھی تمہارے ساتھ ہوا، اس معاملے میں رمیش اور رمیش کے گھر والے انجان ہیں، ان لوگوں کا کوئی بھی قصور نہیں۔ لہٰذا اب یہ اچھا ہوگا کہ تم رمیش کی جان چھوڑ دو۔" رولو کا بولا۔

"مہاپرش! یہ نہیں ہوسکتا، میں رمیش کے بنا بیاکل ہوں، میں رمیش کے بنا ایک پل بھی نہیں رہ سکتی، میں رمیش کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔" رمیش کے منہ سے مالنی کی آواز نکلی۔

"دیکھو یہ ممکن نہیں اور نہ ہی کبھی ایسا ہوا ہے کہ مرنے والا اپنے ساتھ کسی زندہ کو لے جائے اپنا ساتھی بنانے کے لئے۔ میرا مشورہ ہے کہ رمیش کی چاہت اور محبت کو مدنظر رکھتے ہوئے تم اس کی جان چھوڑ دو۔" رولو کا نے کہا۔

"مہاپرش! میرے ساتھ جو انیائے ہوا ہے، اسے سامنے رکھتے ہوئے دیکھ کر بتائیں کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے ایک پل کے لئے بھی میری آتما کو شانتی نہیں۔ میں اپنے اس فیصلے سے الگ نہیں ہوسکتی کہ میں رمیش سے الگ ہو جاؤں۔ اس کی جان چھوڑ دوں، اور اسے ساتھ لئے بغیر چلی جاؤں۔"

"دیکھو اس میں تمہاری بھلائی ہے، میں تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا، مجھے اور یہاں بیٹھے ہوئے سارے لوگوں کو دکھ ہے کہ تم پر بہت ظلم ہوا۔ میں تمہاری اور رمیش کی محبت کے پیش نظر تمہیں رمیش کی محبت کی قسم دیتا ہوں کہ تم رمیش کی جان چھوڑ کر چلی جاؤ، ظلم برداشت کرنے والے اور صبر کرنے والوں کے ساتھ دنیا کا خالق و مالک اچھا برتاؤ کرتا ہے۔" رولو کا بولا۔

"مہاپرش! آپ نے رمیش کی محبت کی قسم دے کر مجھے مجبور کر دیا، ٹھیک ہے میں اس کی محبت میں یہ بھی برداشت کرلوں گی۔" مالنی کی آتما کی آواز سنائی دی۔

"تمہاری مثبت سوچ پر مجھے خوشی ہوئی اور یہ حقیقت ہے کہ صبر کرنے والوں کو دنیا کا خالق و مالک اچھا سمجھتا ہے، جو ہونا تھا وہ تو تمہارے ساتھ ہوگیا، لیکن رمیش نے ابھی زندہ رہنا ہے، اس نے آگے کا وقت دیکھنا ہے، شادی بیاہ اور پھر اس کی نسل آگے چلنی ہے، محبت کرنے والوں کو لوگ اچھے الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور پھر جو لوگ کسی کے لئے اپنی جان کی قربانی دیتے ہیں وہ امر ہو جاتے ہیں۔

اگر تمہاری کوئی خواہش ہے تو بتاؤ، تمہاری خواہش کا احترام کیا جائے گا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ رمیش بھی تمہیں مرتے دم تک ضرور یاد رکھے گا اور یہ کیا کم ہے کہ کوئی کسی کو اچھے الفاظ سے یاد کرے اور رمیش بھی تمہاری محبت میں وقت کے ساتھ ساتھ سنگ رہا ہے، اب تم خود بھی دیکھ رہی ہو کہ جب سے تمہاری گمشدگی ہوئی ہے اس وقت سے رمیش کی کیا حالت ہوگئی ہے۔ رمیش کے دل میں بھی تمہاری چاہت و محبت ہے۔ یہ بھی تم بنا بے چین رہنے لگا ہے، اس کا بس نہیں چلتا ورنہ یہ اب تک تمہاری چاہت میں اپنی زندگی ختم کرلیتا۔" رولو کا بولا۔

"مندر کے پیچھے گڑھے میں میرا ڈھانچہ پڑا ہے اسے نکال کر دھرم کے مطابق رسومات ادا کردی جائیں اور پھر اسے چتا کے حوالے کر دیا جائے۔ میں رمیش کے لئے اپنے آپ کو سمجھالوں گی اور میری خوشی ہے کہ رمیش خوش رہے، مہاپرش! میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے سیدھا راستہ دکھایا اور اب مجھے امید ہے کہ میری بیاکل آتما کو شانتی مل جائے گی اور میری آتما پرلوک میں چلی جائے گی، میں ساتھ ہی کالی ماتا کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے میری سہائتا کی اور میری آتما کو شکتی دی۔

ماتا کی دی ہوئی شکتی ہی سے میں نے اپنے دشمنوں کو نرک میں پہنچایا، اگر ماتا میری سہائتا نہ کرتی تو میں اپنے دشمنوں سے بدلہ نہ لے سکتی تھی۔

مہاپرش! میں رمیش کے جسم سے نکل رہی ہوں۔ اور میرے بتائے ہوئے کام کو آج ہی کر دیا جائے۔" مالنی کی آتما کی آواز سنائی دی۔

اور پھر اچانک رمیش کو ایک جھٹکا لگا، وہ کسمسا کر اپنی جگہ اٹھ بیٹھا اور اچنبھے کی حالت میں اس جگہ موجود سارے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ رمیش کو دیکھ کر سارے لوگ خوش ہوگئے۔

رولو کا رمیش کے بابو جی سے بولا۔ "آپ رمیش کو گرم گرم دودھ پلائیں، اب یہ بالکل ٹھیک ہے، آپ کی ہر بات مان لے گا، اب اس کے دماغ میں کوئی کسک باقی نہیں۔"

بہرحال چند گھنٹے میں ہی مندر کے پیچھے سے گڑھا کھود کر مالنی کے ڈھانچے کو نکال لیا گیا۔ رمیش کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی لگی تھی۔

مالنی کے ڈھانچے کو ہندو دھرم کے مطابق چتا کے حوالے کر دیا گیا۔ گاؤں کے سارے لوگ بہت دکھی تھے مگر وہ بے چارے کر بھی کیا سکتے تھے۔

مغرب کے وقت سے پہلے پہلے سارا کام مکمل ہوگیا، رولو کا نے ایک گلاس پانی منگوایا اور اس پانی پر نہ جانے کیا پڑھ کر دم کیا اور وہ پانی رمیش کو پلایا۔ پانی کے پیتے ہی رمیش ہشاش بشاش ہوگیا۔ اس کے بعد رولو کا نے تمام لوگوں سے مصافحہ کر کے دلی حکیم وقار کے مطلب میں آ گیا۔

اسی رات مالنی کی آتما رمیش کے کمرے میں آئی وہ ایک ہیولہ کی صورت میں تھی۔ سفید لباس میں ملبوس، جس لباس میں رمیش اسے سرسوں کے کھیت میں دیکھتا آیا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔

رمیش ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا، مالنی بھی اسے یک ٹک دیکھے جا رہی تھی کہ رمیش گویا ہوا۔ "مالنی کاش! کہ ہم دونوں پوری زندگی ساتھ رہتے، اب میرا جیون تم بنا ادھورا ہے میں کسی پل بھی تمہیں نہیں بھول پاؤں گا۔ ظالموں نے تمہارے ساتھ بہت ظلم کیا، بھگوان ان کی آتما کو کبھی بھی شانتی نہ دے۔ کاش! بھگوان مجھے بھی موت دے دیتا۔"

"رمیش تم یہ نہ بولو، تمہیں میری خوشی کے لئے آگے بڑھنا ہے، تمہیں خوشی خوشی زندگی گزارنی ہے۔ اگر تم مجھے خوش رکھنا چاہتے ہو تو تمہیں بھی پل پل خوش رہنا ہوگا۔ میرے لئے تم بالکل بھی غم نہیں کرو گے او رمیری یہ بھی خوشی ہے کہ تم جلد از جلد ویواہ کرلو۔" مالنی کی آتما بولی۔

"مالنی تم بنا میرا جیون بالکل بے کار ہے، تم بنا میں خوش نہیں رہ سکتا، آنے والی کو میں خوشیاں نہیں دے سکتا اور جب میں کسی کو خوشی نہیں دے سکتا تو بھلا اس کے ساتھ رہنے کا کیا فائدہ۔" رمیش بولا۔

"رمیش تمہیں زندہ رہنا ہے، اپنی نسل کو آگے بڑھانا ہے۔ مجھے امید ہے بلکہ میری خوشی کے لئے تم ضرور ویواہ کرو گے، اور اس کے لئے میرا مشورہ ہے کہ میرے چاچا رام پرشاد کی لڑکی رکمنی ہے، وہ بہت ہی سندر، سگھڑ، ہنس مکھ، دکھ سکھ میں ساتھ دینے والی، پتی سیوک ہوگی، تم اس سے ویواہ کرلینا، میرے کہنے اور میری خوشی کے لئے رشتہ ان کے گھر بھیجنا وہ لوگ تمہارا رشتہ قبول کرلیں گے، اس کے لئے میں بھگوان سے پرارتھنا کروں گی، رکمنی سے ویواہ کر کے تم سکھ شانتی میں رہو گے اور پھر میری آتما کو بھی شانتی ملے گی۔ ان لوگوں کو تمہارے رشتہ کے لئے کوئی بھی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں اس لئے اس رشتہ پر زور دے رہی ہوں کہ رکمنی کی ذات سے تمہیں زندگی میں بہت خوشیاں ملیں گی۔ ایک پتی کے لئے یہ بہت سکھ شانتی کی بات ہے کہ اس کی پتنی اپنے پتی کی سیوا کرے، اور اپنے پتی کا ہر طرح کا خیال رکھے، رمیش بس میری خوشی کے لئے تم یہ

قدم اٹھالو، اور ویسے بھی جب مجھے تمہارا خیال آئے گا تو میں تمہارے دیدار کے لئے پرلوک سے بھگوان کی مرضی سے کچھ پل کے لئے آجایا کروں گی۔ رمیش تم میری بات مانو گے ناں۔'' مالنی کی آتما پیار بھرے لہجے میں بولی اور یک ٹک رمیش کی طرف دیکھنے لگی!!

''مالنی تمہاری خوشی کے لئے یہ قدم بھی اٹھالوں گا۔ تمہاری خوشی مجھے بہت عزیز ہے، تم مجھ سے وعدہ کرو کہ مجھ سے ملنے آیا کروگی۔ رشتہ کے لئے اپنے بابو جی کو تمہارے چاچا کے پاس بھیج دوں گا۔''

''رمیش مجھے بھی تمہاری خوشی اور سکھ شانتی عزیز ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں اکثر تم سے ملنے کے لئے آیا کروں گی۔ مگر میری کسی بھی بات کا ذکر تم رکنی سے نہیں کرنا، یہ تم سے بنتی ہے اور نہ ہی رشتہ کے متعلق کوئی ذکر کرنا۔ اب تم سو جاؤ، میں چلتی ہوں، اب سے ختم ہورہا ہے اور میرے جانے کا سمے ہوگیا ہے۔'' یہ بول کر مالنی کی آتما مسکراتی ہوئی غائب ہوگئی۔

☆.....☆.....☆

سلامت علی اور کرامت علی اپنے والدین کے دو ہی بیٹے تھے۔ والد کا بہت بڑا کریانہ اسٹور تھا۔ گاؤں بھر کے لوگ نقد کے علاوہ ادھار بھی سودا سلف لیا کرتے تھے۔ ہول سیل پر بھی وہ چیزیں دیا کرتے تھے اس لئے پاس پڑوس کے گاؤں والے انہی سے سامان اٹھایا کرتے تھے۔ ان کا نام صداقت علی تھا۔ اپنے نام کے لحاظ سے وہ واقعی ایمانداری کا مظاہرہ سب کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ گاؤں اور گاؤں سے باہر کئی بنیا، نے کی کوشش کی کہ وہ ان کے کام پر اثر انداز ہوں مگر سب کے سب اس منصوبے میں ناکام رہے۔ جو بھی ادھر سے سودا سلف لیتا اس کے حساب میں ایک پائی کا بھی کبھی ہیر پھیر نہیں ہوتا تھا۔

یہی صداقت علی کی ایمانداری کا سب سے بڑا ثبوت تھا۔ سودا سلف کے علاوہ لوگ انہیں بہت عزت و احترام سے دیکھتے تھے۔ گاؤں میں کوئی بھی مسئلہ ہوتا ان کی شمولیت کے بغیر اس مسئلے کا انجام بخیر نہیں ہوتا تھا۔ لوگ اپنے مسئلہ مسائل کے معاملے میں بھی ان سے مشورہ کیا کرتے تھے اور ان کے بتائے ہوئے مشورے پر عمل کیا کرتے تھے۔

گاؤں کے لوگ شادی بیاہ کے لئے بھی ان سے ادھار سامان لیا کرتے تھے اور اپنے وقت کے حساب سے تھوڑا تھوڑا آکر کے ساری رقم اتار دیتے تھے۔ ادھار رقم کے معاملے میں وہ کبھی بھی کسی پر زیادہ دباؤ نہیں ڈالتے تھے اور لوگ بھی اپنے وعدے پر اپنی آسانی کے پیش نظر ادھار ادا کردیتے تھے۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ دونوں بچے سلامت اور کرامت جوانی کی دہلیز کی طرف بڑھتے رہے، سلامت پڑھائی کی غرض سے مصروف رہا کرتا تھا مگر کرامت پڑھائی سے اکثر جی چرایا کرتا تھا۔ سلامت کے شوق کو مد نظر رکھتے ہوئے صداقت علی کاروباری معاملے میں اسے دور ہی رکھا کرتے تھے۔ مگر کرامت کو وہ اسکول سے فراغت کے بعد اکثر دکان پر بیٹھا لیا کرتے تھے۔ ان کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ کرامت زیادہ پڑھائی نہیں کرسکے گا لہٰذا اسے وہ کام میں لگائے رہتے تھے اور پیار و محبت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے دکان کے کاموں میں دلچسپی لینے کا درس دیا کرتے تھے۔

کرامت کے دل میں یہ بات تھی کہ ابا مجھے اپنے ساتھ رکھتے ہیں اس لئے کہ میں زیادہ محنتی ہوں، کام کو سمجھتا ہوں اور پھر اس کا ثبوت یہ ہے کہ ابا مجھ سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور بھیا چونکہ کام میں دلچسپی نہیں لیتے اور نہ ہی کام کو سمجھتے ہیں اس لئے ابا ان پر کام کے لئے زور نہیں ڈالتے۔ دونوں بھائیوں کی عمروں میں صرف تین سال کا فرق تھا۔

صداقت علی نے اپنے دل میں اٹل فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ دونوں کی شادی ایک ساتھ کریں گے۔ دو بہو ایک ساتھ لائیں گے۔ اور جب وقت آیا تو انہوں نے اپنے دل کی بات کو عملی جامہ پہنانے کا اعلان کردیا کہ میں سلامت اور کرامت کی شادی ایک ساتھ کروں گا۔ دونوں لڑکیاں پہلے سے دیکھی بھالی تھیں، ایک بہو کے

لئے انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اپنے چھوٹے بھائی کی بیٹی لائیں گے اور دوسری کے لئے انہوں نے اپنی بیوی کی بہن کی لڑکی لانے کا سوچ لیا تھا۔

جب انہوں نے اپنا فیصلہ سنایا تو گھر کے علاوہ خاندان کے لوگ بھی بہت خوش ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ گاؤں کے لوگوں نے بھی ان کے فیصلے کو سراہا۔

اب وہ کاروباری سلسلے میں زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرتے تھے۔ چھوٹا بیٹا کرامت نے آہستہ آہستہ زیادہ تر ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ شہر سے سارا سامان وہ خود لاتا تھا۔ حساب کتاب میں بھی وہ بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ مگر سارا کچھ جانچ پڑتال، صداقت علی خود کیا کرتے تھے۔ کرامت باپ کے نقش قدم پر ٹھیک ٹھیک چل رہا تھا۔

بڑے بیٹے سلامت نے میٹرک کے بعد کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ BA سیکنڈ ایئر میں تھا۔ صداقت علی نے فیصلہ کرلیا کہ BA پاس کرتے ہی دونوں کی شادی کردیں گے۔

دونوں گھروں میں میاں بیوی رشتہ لے کر گئے تو دونوں گھرانوں نے انہیں بہت عزت دی اور خوشی خوشی رشتہ کو منظور کرلیا۔ انہوں نے بتادیا تھا کہ ''سلامت کا رزلٹ آتے ہی وہ شادی کردیں گے لہٰذا آپ لوگ اسی مناسبت سے اپنی اپنی تیاریاں کرلیں۔''

اس بات پر کسی نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا کیونکہ ابھی شادی میں آٹھ مہینے باقی تھے۔

سلامت کی شادی خالہ زاد سے ٹھہری تھی جبکہ کرامت کا رشتہ چچازاد سے طے ہوا تھا۔ دونوں لڑکیاں خوبصورتی اور ہرمندی میں اپنی مثال آپ تھیں اور دونوں بھائی جوانمردی، صحت مندی اور شرافت میں بے مثال تھے۔

سلامت کی مرضی تھی کہ BA کے بعد وہ MA میں داخلہ لے لگا۔ اس کی خوشی پر سب نے لبیک کہا تھا کہ ٹھیک ہے تمہاری مرضی جتنا چاہو آگے پڑھ سکتے ہو مگر صداقت علی جانتے تھے اور پھر دیگر تجربہ کار لوگوں کا بھی تجربہ تھا کہ شادی کے بعد کون اس کام کے لئے اتنا وقت نکال پاتا ہے۔

صداقت علی اکثر سلامت سے بولتے رہتے کہ ''بیٹا جب بھی وقت ملے یا پھر تھوڑا بہت وقت نکال کر دکان کا حساب کتاب چیک کرلیا کرو'' مگر وہ اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جواب دیتا۔ ''ابا جب ہر طرح کی ذمہ داری کو احسن طریقے سے کرامت نبھا رہا ہے اور پھر میں سمجھتا ہوں کہ جب سے اس نے کاروبار سنبھالا ہے حساب کتاب کے علاوہ کاروبار کو وسعت دینے میں آپ سے کہیں آگے نکل گیا ہے۔ میں ناتجربہ کار بھلا اس کام میں کیا دماغ خوری کروں گا۔ میری مرضی ہے کہ BA کے بعد MA کروں اور کسی جگہ بھی لیکچرار بن جاؤں۔''

ٹھیک ہے بیٹا جیسی تمہاری مرضی، اللہ تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب و کامران کرے، یہ جو کچھ بھی ہے تم دونوں بھائیوں کا ہی ہے۔

اکثر شادی کے بعد حالات میں تبدیلی آجاتی ہے، لوگوں کے خیالات بدل جاتے ہیں، رہن سہن اور سوچ میں دوسروں کی مرضی کا عمل دخل بھی ہونے لگتا ہے۔ بیٹا تمہیں یہ میرا حکم نہیں بلکہ میری التجا ہے کہ تم ہمیشہ چھوٹے بھائی کا خیال رکھنا، اسے کاروباری مشورے دیتے رہنا، اس کی ہمت کو بڑھاتے رہنا تاکہ وہ آگے بڑھتا رہے۔ باپ کے بعد بڑے بھائی کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے چھوٹوں پر شفقت کی نظر ڈالے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ کرامت دل و دماغ کا بہت اچھا ہے۔ وہ تمہیں شکایت کا موقع نہیں دے گا۔

بیٹا! میرا ذاتی تجربہ ہے کہ بھائی آپس میں شیر و شکر کی مانند ہوتے ہیں مگر دلوں میں بیویاں نفاق ڈال دیتی ہیں جو لوگ بیویوں کی باتوں میں آکر اپنے اخلاق کا دامن چھوڑ بیٹھتے ہیں وہ اپنی تو اپنی بلکہ غیروں اور خدا کی نظر میں بھی گر جاتے ہیں۔ عورت ناقص العقل ہوتی ہے شادی کے بعد اس کی سب سے اولین خواہش پورے گھر پر حکمرانی کی ہوتی ہے۔ وہ اکثر اس خیال

کے تانے بانے میں الجھی رہتی ہے کہ گھر کے سارے لوگ میرے تابع ہوں، کوئی میرے فیصلے پر نکتہ چینی نہ کرے، اچھا برا سب کچھ میری مرضی سے ہو، آنے والے وقت کے مطابق وہ نہیں سوچتی کبھی کبھار تو دلوں میں اس قدر نفرت ڈلوا دیتی ہے کہ بھائی ایک بھائی کے خون خرابے سے بھی نہیں چوکتا۔ سارے بھائی اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر الگ ہو جاتے ہیں۔

بیٹا! اگر بغور جائزہ لیا جائے تو جوائنٹ فیملی میں بڑے فائدے ہیں۔ ایک دوسرے کی عزت و احترام برقرار رہتا ہے۔ بڑے چھوٹوں کو تنبیہ کرتے ہیں اور بڑے ہمیشہ چھوٹوں پر نظر رکھتے ہیں اس لحاظ سے چھوٹے اپنے بڑوں کا کہا مانتے ہیں، چھوٹے کوئی غلط قدم اٹھاتے ہوئے خوف کھاتے ہیں۔ چھوٹوں کو ہمیشہ یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ میری غلط ہر حرکت اور غلط بات کا علم ہمارے بڑوں کو ہو جائے گا۔ چھوٹے اپنے بڑوں کو صراط مستقیم پر چلتے دیکھ کر ان کے اقدام کو سراہتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ وہ بھی سیدھی راہ پر چلیں۔

آپس کے اتحاد میں خیر و برکت ہے، تم ایسا کرو کہ دھاگے کی ایک ریل لے کر آؤ، میں تمہیں ایک اٹل مثال دکھاتا ہوں۔"

سلامت فوراً اٹھا اور اندر کمرے میں سے دھاگے کی ایک ریل لے آیا، تو اس کے ابا نے کہا۔ "تم اس ریل کے دھاگے کو کھینچو اور چند ٹکڑے کرو۔"

سلامت نے ایسا ہی کیا۔ اس نے دھاگہ کھینچا اور چھوٹے چھوٹے کئی ٹکڑے توڑ ڈالے۔ یہ دیکھ کہ اس کے ابا مسکرائے اور بولے۔ "اب یہ ریل مجھے دے دو۔" سلامت نے ریل ابا کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

اس کے ابا نے ریل میں سے دھاگہ کھینچ کھینچ کر تین تین بالشت کے کئی ٹکڑے توڑے اور پھر ان تمام ٹکڑوں کو آپس میں ملا دیا۔ پھر سلامت کے ہاتھ میں ان دھاگوں کو دے دیا اور بولے۔ "اب ایک ساتھ ان دھاگوں کو توڑ کر دکھاؤ۔"

سلامت نے سارے یکجا کیے ہوئے دھاگوں کو اپنے ہاتھ میں لیا اور توڑنے کے لئے زور لگانے لگا مگر کافی زور لگانے پر بھی وہ دھاگے نہیں ٹوٹے۔ "ابا یہ تو نہیں ٹوٹیں گے، اس لئے کہ آپ نے کئی ٹکڑوں کو آپس میں ملا دیا ہے۔"

سلامت علی مسکرانے لگے اور بولے۔ "بیٹا یہی مثال آپس کی ہے۔ جب چند لوگ، چند خاندان، چند بھائی آپس میں مل جل کر رہتے ہیں تو اس دھاگے کی مثال ہوتے ہیں۔ جس طرح کئی دھاگے آپس میں مل کر نہیں ٹوٹے اس طرح لوگوں کے میل جول کو بھی دوسرے نہیں ہلا سکتے۔ اور بیٹا! یہی مثال مذاہب و قوموں کے لئے بھی ہے۔ ایک مذہب کے لوگ جب آپس میں شیر و شکر ہوتے ہیں تو اس مذہب میں مضبوطی آتی ہے۔ وہ مذہب پھلتا اور پھولتا ہے۔ آپس میں اتفاق اور اتحاد کے لئے بھاگ دوڑ اور اچھل کود کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ صرف اور صرف احساس کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب ہر فرد یہ سوچ لے کہ میری ذات، میرے عمل اور میرے اقدام سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے، کسی کی دل شکنی نہ ہو، ہر ایک دوسرے کے دکھ درد کا خیال رکھے، جس طرح ایک فرد کسی پریشانی میں مبتلا ہو کر دوسروں کی مدد کا طلبگار ہوتا ہے اسی طرح ہر دوسرا شخص بھی مصیبت کے وقت دوسروں کی مدد کا طلبگار ہوتا ہے اور یہی مثال قوموں کے لئے بھی ہے۔

ایک قوم کے افراد، ایک ملک کے افراد، جب اپنی اپنی ذمہ داریوں کا احسن طریقے سے احساس کرتے ہیں تو اس معاشرہ میں خوشحالی ہوتی ہے، پیار محبت کی ہوائیں چلنے لگتی ہیں، اس ملک اور قوم سے پریشانیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے، لوگوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھتے ہیں، کوئی بھی ظلم و ستم کا شکار نہیں ہوتا، ہر مصیبت اور دکھ کا لوگ ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں، جب ایک فرد پریشانی کا شکار ہوتا ہے تو دوسرے فوراً اس کی مدد کو آ جاتے ہیں اور اس طرح مصیبت زدہ کو ڈھارس ہوتی ہے، اس میں حوصلہ پیدا ہوتا ہے اس کے جسم میں توانائی بھر جاتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ شخص مصیبتوں اور پریشانیوں سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ ایسے معاشرے میں لوگ چین اور سکھ کی زندگی گزارتے ہیں۔ لوگ ہر برائی کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں اور پھر وہ برائی بہت جلد معاشرہ سے ختم ہو جاتی ہے، لوگ ایک دوسرے کا حق نہیں مارتے، اپنی ضرورتوں اور اپنا گھر بھرنے کے لئے دوسروں کا حق نہیں مارتے، خدا کے دین پر صبر و شکر بجا لاتے ہیں، وہ زیادہ دھن دولت کے لئے دوسروں کا ناحق خون نہیں بہاتے۔

بیٹا! اچھے برے لوگ ہر ملک اور ہر معاشرہ میں ہوتے ہیں۔ جب برے لوگ برائی کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کے ساتھ آہنی ہاتھ کے ساتھ نمٹا جاتا ہے۔ قصور بس قصور ہوتا ہے، چھوٹے بڑے قصور کرنے والوں میں فرق نہیں رکھا جاتا۔ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا قصوروار کو سزا ضرور ملنی چاہئے۔

تو بیٹا! میرا مشورہ ہے کہ ہمیشہ آپس میں تم دونوں بھائی اتفاق اور اتحاد رکھنا، ایک دوسرے کی چھوٹی موٹی غلطیاں اور کوتاہیاں نظر انداز کرنا۔ اپنی اپنی بیویوں کو سمجھا بجھا کر رکھنا، ایسا کرو گے تو فلاح پاؤ گے، اور پھر یہی چیز تمہاری نسلوں میں بھی پائی جائے گی۔ بہر حال تم بڑا ہونے کا خیال رکھنا اور اپنی ذمہ داریوں کو نبھانا۔" یہ بول کر صداقت علی خاموش ہو گئے۔

سلامت بولا۔ "ابا آپ کی بات ہر وقت میرے دل دماغ میں رہے گی، اور میرا آپ سے یہ وعدہ ہے کہ میں کرامت کا ہمیشہ خیال رکھوں گا، آپس میں ہم دونوں بھائی شیر و شکر کی مانند رہیں گے تاکہ ہماری آنے والی نسلیں بھی ہمیں دیکھ کر سبق حاصل کریں۔" یہ سن کر صداقت علی مسکرانے لگے اور بولے۔ ..... مجھے تم سے یہی امید ہے۔

تم نے BA پاس کر لیا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی، گھر میں شادی ہونے والی ہے، تیاریوں میں مصروف ہو جاؤ، کرامت چونکہ کاروبار میں مصروف رہتا ہے اس لئے یہ ذمہ داری تمہارے کاندھوں پر ہے، جہاں میری ضرورت پڑے میں حاضر ہوں، اب جاؤ اور معمولات کے کام کرو۔"

"ابا آپ فکر نہ کریں، تمام کام آپ کے حسب منشا ہوگا اور آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ صرف آپ نے مجھے گائیڈ کرنا ہے۔" سلامت نے یہ کہا اور مسکراتے ہوئے باہر چلا گیا۔

وقت گزرتا رہا اور پھر شادی کی تاریخیں سر پر آ گئیں۔ سارے انتظامات مکمل تھے۔ اماں اور والد کے مشورے سے سلامت نے کوئی کثر اٹھا نہ رکھی تھی۔

گھر میں شادیانے بجنے لگے، پورے گاؤں میں رونق ہی رونق تھی۔ ایک ہفتہ پہلے ہی سے روزانہ ناچ گانے کے پروگرام ہونے لگے۔ یہ وہ وقت تھا جب ملک میں ریڈیو اور ٹی وی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ لاؤڈ اسپیکر بھی نہ تھے۔ شادی بیاہ میں لوگ ناچ گانے کے پروگرام کر کے خوش ہوتے تھے۔ تھیٹر کا زمانہ تھا۔ تھیٹر والے بڑے لوگوں کے بلانے پر گاؤں یا شہر میں آتے۔ اپنے طرح طرح کے پروگرام اسٹیج کرتے اپنا معاوضہ لیتے اور لوگوں کو تفریح فراہم کر کے چلے جاتے۔

بڑی دھوم دھام سے بارات گئی۔ بارات میں باجے والے دھوم دھڑاکا کرتے رہے، ایسی شادی آج تک اس گاؤں میں کسی اور کی نہیں ہوئی تھی۔ صداقت علی نے اس خوشی میں تجوری کے منہ کھول دیئے تھے۔ گاؤں میں موجود ہندو اور مسلمان دونوں برادری کے لئے الگ الگ رات میں کھانے تیار ہوتے تھے، ان دنوں آپس میں بہت پیار و محبت تھا۔

زیادہ تر ذات پات میں فرق نہ تھا۔ زیادہ سیاستدان نہیں تھے، خود غرضی نہیں تھی، لوگ اپنے مفاد میں ایک دوسرے کو لڑواتے نہیں تھے۔ ان دنوں جگہ جگہ بینک نہیں تھے، جگہ جگہ ریستوران اور تفریح گاہیں نہیں تھیں، گولی اور گولے کا زمانہ نہیں تھا۔ ہوائی جہاز نہیں تھے۔ مفاد پرستی اور نفرتیں نہیں تھیں۔

بہر حال دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔ دونوں بہوئیں دھوم مچاتی آ گئیں۔ گھر میں خوشیوں نے ڈیرہ

ڈال لیا۔ دلہنوں کی خوبصورتی دیکھ کر عورتیں جھوم اٹھیں۔ جو بھی عورت انہیں دیکھنے آتی تو بلائیں لیتی اور دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہو جاتی۔

وقت نے دھیرے دھیرے تیزی پکڑلی۔ سلامت کا پڑھائی سے دل اچاٹ ہو گیا۔ اس نے MA میں داخلہ لینے کا اپنا فیصلہ بدل ڈالا اور کرامت کے ساتھ کاروبار میں لگ گیا۔

سلامت اور کرامت کے والد صداقت علی اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر گھر میں بیٹھ گئے۔ ہفتے میں ایک آدھ دن دکان پر جاتے تھوڑی دیر بیٹھتے اور لوگوں سے علیک سلیک کر کے چلے آتے۔

وقت نے پلٹا کھایا۔ ایک سال بیت گیا۔ قدرت کا فضل و کرم ہوا کہ دونوں بھائیوں کے گھر دو دو جڑواں بچے ہوئے۔ اب تو پورے گاؤں میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ پکوان پر پکوان پکنے لگے۔ محتاجوں اور غریبوں کو خو... نوازا گیا۔ اللہ کے نام پر بہت کچھ لٹایا گیا۔ پورے گاؤں اور پھر ان گاؤں میں بھی جہاں کی دونوں دلہنیں تھیں مٹھائی بانٹی گئی۔ دادا دادی چار بچوں میں مگن رہنے لگے، خوشیاں ان کے گھر لونڈی بن گئی تھیں۔ گاؤں میں کوئی ایسا فرد نہیں تھا جو ان کے لئے دعائیں نہ کرتا ہو کیونکہ صداقت علی کے اخلاق اور ملنساری نے سب کو متاثر کیا ہوا تھا۔ ان کے دونوں بچے سلامت اور کرامت بھی اخلاق کا نمونہ تھے۔

صداقت علی اب طبیعت ناسازی کے بنا پر گھر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ دو سال کا عرصہ اور بیت گیا اللہ کی مہربانی دیکھیں کہ اس مرتبہ بھی دونوں بھائیوں کے گھر دو دو جڑواں بچے ہوئے۔ گاؤں والے اور دادا دادی خوشی سے جھومنے لگے۔

گھر کے کام کاج اور بچوں کی دیکھ بھال کے لئے گھر میں تین تین نوکرانیاں تھیں۔ ایک نوکرانی باورچی خانے کے لئے تھی اور دو نوکرانیاں صرف بچوں کی دیکھ بھال کے لئے۔ یعنی ایک نوکرانی چار بچوں کے لئے تو دوسری نوکرانی اور چار بچوں کے لئے ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔ دونوں بھائی کام میں دن رات لگے رہتے تھے۔ ہول سیل کا کام بہت زیادہ پھیل چکا تھا۔ ہر وقت کئی کئی گودام اجناس سے بھرے رہتے تھے۔ اگر چیزوں کے دام بڑھ جاتے تو وہ لوگ بے تحاشہ دام نہیں بڑھاتے تھے بلکہ کرایہ بھاڑا شامل کر کے معمولی اضافہ کر دیتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ پاس پڑوس کے سارے گاؤں والے انہی سے غلہ اور دیگر چیزیں اٹھاتے تھے۔

وقت سبک رفتاری سے گزرتا رہا۔ کہنے والے نے ٹھیک ہی کہا ہے۔

دنیا ہے سکھ سے خالی دکھ چار سو بھرا ہے
غم کے سوا یہاں پر سوچو تو کیا دھرا ہے

صداقت علی اپنے اور پرائے سب کو بلکتا اور سسکتا چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ گاؤں یا گاؤں سے باہر کوئی ایسی آنکھ نہ تھی جو صداقت علی کے غم میں اشکبار نہ تھی۔ لوگ ان کو دعائیں دیتے دیتے بھی نہیں تھکتے تھے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ اچھوں کو اچھے نام سے ہی یاد کیا جاتا ہے۔

صداقت علی کے بنا گھر میں ویرانی چھا گئی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ روٹی کا نوالہ حلق سے نیچے پیٹ میں اترتے ہی انسان آدھا غم بھول جاتا ہے اور پھر جس گھر میں آٹھ بچے ہوں، اس گھر میں بچوں کا رونا دھونا، چہکنا اور شور شرابہ بہت ہوتا ہے۔ تھوڑے دنوں بعد ہی گھر میں بچوں کی وجہ سے سوگواری نے اپنا منہ موڑ لیا۔

لیکن اس گھر میں تین افراد ایسے تھے جن کے چہروں سے غم جھلکتا تھا۔ غم زدہ والدہ اور دونوں بھائی سلامت و کرامت تھے جو افسردہ رہتے تھے۔ کاروبار کے سلسلے میں دونوں بھائی دن بھر باہر رہتے، کھانا نوکر کے ہاتھوں دکان پر ہی پہنچ جاتا، رات میں دونوں بھائی دکان بند کر کے ساتھ ہی گھر آیا کرتے تھے اور ساری رقم ماں کے دوپٹے میں ڈال دیا کرتے تھے۔ والد زندہ تھے تو رقم انہیں دیا کرتے تھے۔

ساری رقم والدہ کے پاس جمع رہتی اور حسب

ضرورت مال کے لئے دونوں بھائی رقم ماں سے لیتے تھے۔ گھر کا سارا خرچ یعنی سودا سلف دکان سے آتا۔ سالن کی چیزیں وہ دکان سے بھیج دیا کرتے تھے اور پھر دیگر ضروریات زندگی کے لئے دونوں بھائی دکان سے اپنا اپنا خرچ لے لیا کرتے تھے مگر ہر طرح کا خرچ ایک کھاتہ میں لکھتے ضرور تھے، اگر ایک روپیہ بھی کہیں خرچ ہوتا تو اس کا حساب بھی کھاتہ میں درج ہوتا۔

وقت کے حساب سے سلامت کی بیوی جمیلہ کا مزاج بدلنے لگا تھا۔ وہ اکثر رات میں سلامت سے دبے دبے الفاظ میں طرح طرح کی باتیں کرتی۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم پر کسی کی حکمرانی نہ ہو، ہم پر کوئی نظر رکھنے والا نہ ہو، ہمارے معاملات اور ہمارے کھانے پینے میں کوئی مداخلت نہ کرے، اب آپ یہی دیکھ لیں، گھر میں جو کچھ بھی پکتا ہے خالہ کی مرضی سے پکتا ہے، اگر میرا دل چٹنی کھانے کو چاہے تو میں ایسا نہیں کر سکتی، گھر تو وہ ہوتا ہے جس میں ہمارا جو دل چاہے ہم وہ پکائیں، ویسا کریں، ایسا کریں، نہ کریں وغیرہ وغیرہ۔

”جمیلہ یہ کس طرح کی باتیں کرنے لگی ہو، لگتا ہے تمہارے دماغ میں فتور آتا جا رہا ہے، کان کھول کر سن لو، اس گھر میں وہی ہوگا جو میری ماں چاہے گی، اگر تمہیں کوئی شکایت ہے یا اگر چٹ پٹ کا دل چاہے تو پکا لیا کرو، اگر کوئی روکے تو پھر بات کرو۔ سورج مشرق کے بجائے مغرب سے نکل سکتا ہے مگر ہم دونوں بھائیوں کے مزاج میں فرق نہیں آ سکتا اور آئندہ خبردار جو تمہارے منہ سے ایسی کوئی اور بات سنوں، ورنہ حالات کی ذمہ دار تم خود ہوگی اور یہ تم آئے دن میکے جانا بند کرو۔ کرامت کی بیوی ثمرین بھی تو ہے جو مہینوں میکے جانے کا نام تک نہیں لیتی۔“

شوہر کے منہ سے کھری کھری باتیں سن کر وہ سٹپٹا گئی۔ لیکن اس کا دماغ پیچ و تاب کھاتا رہا۔ اس نے دل میں سوچ لیا کہ ”اگر میں نے بھی اپنی من مانی نہیں کرلی تو میرا نام بھی جمیلہ نہیں۔“ ہر ماہ کی نوچندی جمعرات کو وہ اپنے میکے جاتی۔ حالانکہ سلامت کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بھائی کو بلا لیتی جس کے ساتھ چلی جاتی۔“

جمیلہ کی ماں کا کہنا تھا کہ ”ایک طویل عرصہ سے ہمارے گھر نوچندی جمعرات کے دن نیاز دلتی ہے اس وجہ سے میں جمیلہ کو بلا لیتی ہوں۔“

سلامت کی والدہ بھی بیٹے کو سمجھا لیتی تھیں کہ ”بیٹا کوئی بات نہیں، اس طرح جمیلہ کا تھوڑا بہت دل بھی بہل جاتا ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے دو دن رہ کر چلی آتی ہے۔“ مگر سلامت بیوی کی اس حرکت پر اکثر اعتراض کرتا۔

وقت نے ایک مرتبہ پھر پلٹا کھایا اور والدہ بھی سب کو سسکتا چھوڑ کر دنیا سدھار گئیں۔ گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ گھر میں اب کوئی بڑا بوڑھا رہا نہیں۔ دونوں بھائیوں کا دل مسوس کر رہ گیا۔ دونوں بھائیوں کی آنکھ سے آنسو خشک نہیں ہو کے دیتے تھے۔ بہرحال بڑی مشکل سے دونوں نے اپنے آپ کو سنبھالا کیونکہ کاروباری مسئلہ تھا۔ چار دن تک دکان بند رہی اور پھر پانچویں دن انہوں نے دکان کھول لی۔

وقت ایک مرتبہ پھر سبک رفتاری سے آگے کو بڑھنا شروع ہو گیا۔ دونوں بھائیوں نے باہم مشورہ سے ایک عمر رسیدہ خاتون جو کہ دور کی رشتہ دار تھیں انہیں گھر میں بطور نگراں کے رکھ لیا۔ ان کا کام اپنی تجربہ کار آنکھیں پورے گھر اور نوکر چاکر پر رکھنا تھیں۔

ماں کے انتقال کے بعد کرامت نے سلامت سے کہا۔ ”بھیا اب آپ روپے پیسے بھابی کے ہاتھ میں دیا کریں۔ میری خوشی کی خاطر۔“

سلامت نے انکار کر دیا اور بولا۔ ”کرامت میں اپنی بیوی کو اچھی طرح جانتا ہوں، مجھ سے بہتر اور کوئی نہیں جان سکتا، اس کے ہاتھ میں روپیہ نہ رکھنا ہی بہتر ہوگا۔ اب آئندہ جو بھی لین دین ہوگا اس کے لئے رقم دکان میں پڑی رہے گی اور جو رقم دکان سے الگ ہوگی وہ تم خاموشی سے اپنے کمرے میں رکھنا، ایک ٹھکانہ رقم کے لئے بنا لو، جو کہ خفیہ ہو اور اس جگہ تمہاری

بیوی کا ہاتھ نہ پہنچے۔ یہ میرا حکم ہے۔"

کرامت پہلے تو ٹالتا رہا مگر پھر بھائی کے حکم کے آگے خاموش ہوگیا۔

دونوں بھائیوں کے بچے اب بڑے ہوگئے تھے۔ سلامت کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ کرامت کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ دونوں کے بڑے بیٹے تقریباً گیارہ سال کے ہو چکے تھے۔

ساس کے انتقال کے بعد سلامت کی بیوی جمیلہ متواتر کئی مرتبہ دبے الفاظ میں بولی "اب خالہ تو رہیں نہیں، پاس پڑوس اور خاندان کی عورتیں بولتی ہیں کہ لین دین اور حکم چلانے کی مہارانی تو تم ہی ہو، میں انہیں کوئی معقول جواب نہیں دیتی اور خاموش ہوجاتی ہوں۔ آپ بتائیں میں کیا جواب دیا کروں۔"

"جمیلہ تم جواب دینا کہ مہارانی میں تو ہوں، ہماری ضرورت کی ساری چیزیں مہیا ہوجاتی ہیں اور وقت ضرورت معقول رقم بھی میرے پاس ہوتی ہے، اس رقم سے میرا جو دل چاہے میں کرتی ہوں۔

جمیلہ یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ امی کی بات اور تھی اور امی رہیں نہیں۔ گھر پر جتنا تمہارا حق ہے اتنا ہی حق کرامت کی بیوی ثمرین کا بھی ہے۔ سارا لین دین اور حساب کتاب میرے ہاتھ میں ہے اور میں ہی اپنی مرضی سے سارا نظام چلا رہا ہوں۔ میں تمہیں تمہارے خرچ کے لئے معقول رقم دیتا ہوں، تم میکے جاتی ہو، کیا خرچ کرتی ہو، کسے دیتی ہو، کبھی میں نے یا اماں نے پوچھا نہیں۔ جس طرح گھر کا نظام چل رہا ہے اسی طرح چلتا رہے گا، بس تم اپنے کام سے کام رکھا کرو۔ اور اب اماں نہیں رہیں لہٰذا اب تم کوشش کرو کہ میکے زیادہ نہ جانا ہو، اپنی اماں سے کہہ دینا کہ اب گھر کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں لہٰذا میرا زیادہ آنا جانا مشکل ہے۔"

جمیلہ شوہر کی باتیں سنتی رہی اور گردن ہلاتی رہی مگر اس کے دل میں کرامت کی طرف سے پھانس چبھ گیا تھا۔ اور اس نے سوچ لیا کہ اس قصہ کو میں بے باک ہی کرکے رکھ دوں گی۔" شوہر کو اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے جیسی آپ کی مرضی میں آپ کی خوشی میں خوش ہوں، اور اب میں جاؤں گی تو اماں سے بھی بول دوں گی اماں اب میں ہر نوچندی جمعرات کو نہیں آسکوں گی کیونکہ اب وقت نکالنا مشکل ہوگیا ہے۔ پہلے خالہ تھیں تو کسی بات کی فکر نہیں ہوتی تھی۔" یہ سن کر سلامت تو مطمئن ہوگیا مگر سلامت کو کیا پتہ تھا کہ عورت کا دوسرا روپ ناگن کا بھی ہوتا ہے۔ عورت سب کچھ برداشت کرسکتی ہے مگر شادی کے بعد اپنی حکمرانی کے لئے جیسے توے پر لوٹتی رہتی ہے وہ چاہتی ہے کہ جس گھر میں، میں بیاہ کر آئی ہوں اس گھر پر میری حکمرانی ہو۔

نوچندی جمعرات آئی اور وہ اپنی اماں کے گھر گئی۔ موقع اور تنہائی ملتے ہی اس نے رونا دھونا اور مچلنا شروع کردیا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر اماں حیران ہوگئیں۔ "ارے میری جان تجھے کیا ہوگیا، تجھے کسی نے کچھ بول دیا، ارے رو نہیں ورنہ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا، بتا تو سہی ہوا کیا۔"

"اماں کیا بتاؤں، اس گھر پر ثمرین حکمران بن کر بیٹھ گئی ہے اور یہی نہیں کرامت نے تو سلامت پر جادو ٹونا بھی کرادیا ہے۔ جس کی وجہ سے سلامت کی زبان دونوں میاں بیوی کے آگے بند ہوکر رہ گئی ہے۔ انہوں نے ہمیں پائی پائی کا محتاج بنا کر رکھ دیا ہے، میں عزت کی خاطر اب تک خاموش تھی، کہیں ایسا نہ ہو کہ کرامت ہم میاں بیوی اور بچوں کو گھر سے نکال دے، اماں تمہیں میری قسم کچھ کرو، نہیں تو میں برباد ہوجاؤں گی، ایسا نہ ہو کہ سلامت اس غم کے پہاڑ تلے دب کر....." اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اور پھر زار و قطار رونے لگی۔

"میری بچی نہ رو، میں تو اس منحوس کرامت کے ساتھ وہ سلوک کروں گی کہ کم بخت مر کر بھی چین نہیں پائے گا۔ اس نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ جمیلہ میری بھابی ہی نہیں بلکہ خالہ کی بیٹی بھی ہے۔ میں اس وقت مندر کے پنڈت جی کے پاس جاتی ہوں، ارے ان کا کاٹا پانی نہیں مانگتا، لیکن اس کام میں تھوڑا بہت خرچ بھی ہوگا، پنڈت بہت لالچی ہے بغیر رقم لئے کوئی کام نہیں کرتا۔ سفلی عمل کا ماہر ہے۔" اماں نے کہا۔

جمیلہ نے جھٹ اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے کئی کرارے کرارے نوٹ نکال کر اماں کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ نوٹوں کو دیکھ کر اماں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جمیلہ دل ہی دل میں بہت خوش تھی۔ بولی۔

"اماں تم کہنا کہ یہ کام ذرا جلدی کرنا ہے، ایسا کام ہونا چاہئے کہ وہ بھی کیا یاد کریں گے۔ پیسوں کی فکر پنڈت جی نہ کریں، میں کرامت، ثمرین اور اس کے بچوں کی موت دیکھنا چاہتی ہوں۔ اگر کام وقت پر ہوگیا تو میں پنڈت کو خوش کردوں گی، دوگنا رقم دے کر۔"

اماں نے برقع اٹھایا اور جھٹ گھر سے نکل گئیں۔ وہ پنڈت کے گھر پہنچ گئیں۔ پنڈت کے گھر میں جانے سے پہلے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی انہیں پنڈت کے گھر جاتا دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ پنڈت کے گھر میں داخل ہوتے ہی وہ بدحواس ہوگئیں، پنڈت کی بیوی انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی، انہیں ڈر تھا کہ انہیں کسی نے پنڈت کے گھر میں دیکھ لیا تو غضب ہوجائے گا۔ انہوں نے پنڈت کے ہاتھ پر بغیر گنے کئی کرارے نوٹ رکھ دیئے اور آنکھوں میں آنسو لا کر جلدی جلدی ساری روداد سنادی اور یہ بھی کہا کہ یہ کام فوراً ہونا چاہئے ورنہ میری بیٹی اور داماد کی جان چلی جائے گی اور کام ہونے پر میں دگنی رقم دوں گی۔

پنڈت جی آپ کے پاس میرے آنے کا کسی کو پتہ نہ چلے، یہ میری عزت کا سوال ہے۔ آپ اس کا خیال رکھئے گا۔ بیٹی کی عزت اور جان مال کا سوال ہے۔ اس لئے مجبور ہوکر میں آپ کے پاس آئی۔"

"ارے آپ بالکل بھی فکر نہ کریں، کسی کو اس کی بھنک بھی نہیں پڑے گی، آپ بے فکر ہوکر جائیں، تین دن گزرتے ہی تباہی و بربادی کا دھما کہ ہوگا، یہ کرامت بھی کیا خیال کرے گا کہ کس سے پالا پڑا ہے۔"

پنڈت کے دلاسہ دینے پر وہ دروازے سے باہر نکلیں اور ادھر ادھر دیکھا اور پھر ڈرے سہمے انداز میں اپنے گھر واپس آگئیں۔ ان کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی جمیلہ بولی۔ "اماں خیریت تو ہے، آپ کیوں گھبرا رہی ہیں اور کام کا کیا ہوا؟"

"ارے ذرا دم تو لے، بتاتی ہوں، تو تو ہتھیلی پر سرسوں جما رہی ہے۔" اماں بولیں۔ "میں بہت دیکھ بھال کر گئی تھی، وہ اپنے کام میں بہت ماہر ہے، میں ڈری سہمی گئی تھی کیونکہ کسی کی نظر پڑ جاتی تو غضب ہوجاتا کہ اس پنڈت کے گھر میرا کیا کام، ہر کام دیکھ بھال کر کرنا پڑتا ہے، اس نے بولا ہے کہ تین دن گزرتے ہی دکھ مصیبت پریشانی اور تباہی کا دھما کہ ہوگا، کرامت بھی کیا خیال کرے گا۔"

اماں کے گھر دو دن رہ کر جمیلہ اپنے گھر واپس آگئی اور بے چینی سے تین دن گزرنے کا انتظار کرنے لگی۔ ایک ایک پل گھر کے تمام افراد خاص طور پر کرامت اس کی بیوی اور بچوں پر نظر رکھنے لگی۔

تین دن گزر گئے چوتھی رات آئی۔ آدھی رات کے وقت اچانک کرامت کے بڑے بیٹے کو خون کی الٹیاں شروع ہوگئیں۔ کرامت کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اس کی بیوی ثمرین زار و قطار رونے لگی۔ سلامت بھی گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور اپنے کمرے سے باہر نکلا تو دیکھا کہ حالات بہت سنگین تھے۔

کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ اچانک کیا ہوگیا۔ اچھا بھلا بچہ رات میں کھا پی کر سویا تھا۔ کوئی طبیعت بھی خراب نہیں تھی۔

پھر اچانک ایک اور خون کی بڑی الٹی آئی اور بچہ بے سدھ ہوکر پڑ گیا۔ اس کی روح جسم چھوڑ چکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ موت سے ہمکنار ہوچکا تھا۔ آدھی رات کے وقت پورے گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ پورے گھر میں کہرام مچ گیا۔ شور شرابہ اور رونا دھونا سن کر پاس پڑوس کے سارے لوگ اٹھ گئے۔ ثمرین کی حالت دیدنی تھی۔ سب سے بڑا بیٹا، وہ چند منٹ ہوش میں آتی اور پھر پچھاڑ کھا کر بے ہوش ہوجاتی۔

پاس پڑوس اور گاؤں میں موجود سب کی

آنکھیں اشکبار تھیں، کسی کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ اچانک کیسے ہوگیا؟

صبح کے وقت لوگوں نے دیکھا کہ ان کے گھر کے باہر ایک مٹی کی ہانڈی ٹوٹی پڑی تھی۔ اس ہانڈی میں دو طرح کے پیلے پھول سیندور کی اچھی خاصی مقدار، لال کپڑے کا ایک ٹکڑا، پیلی سرسوں، سرسوں کا تیل، بکرے کا ایک چھوٹا سا دل، دل میں شگاف ڈالا گیا تھا۔ ایک چھوٹا سا چاقو اور کپڑے کا بنا ایک چھوٹا سا گڈا تھا۔

لوگوں نے فوراً اندازہ لگالیا بلکہ لوگوں کو پکا یقین ہوگیا کہ کسی دشمن نے بچے کی موت جس کا نام کمال تھا اسے مارنے کے لئے ہانڈی کا عمل کرایا تھا۔

ہانڈی کا عمل ایسا ہوتا ہے کہ عامل اپنے سامنے مٹی کی ہانڈی میں مطلوبہ چیزیں رکھ کر اس کے گرد ایک حصار کھینچتا ہے اور پھر جسے مارنا مقصود ہوتا ہے اس کا نام لے کر سفلی عمل پڑھنا شروع کردیتا ہے۔

عمل کی پڑھائی ختم ہوتے ہی ہانڈی میں سے۔

"گوں..... ں..... ں..... گوں..... ں..... ں....."

کی آوازیں نکلنے لگتی ہیں، آواز نکلنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عمل نے ٹھیک طرح سے اپنا کام شروع کردیا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہانڈی ہوا میں معلق ہوجاتی ہے اور اس سمت کو چلتی ہے جس طرف کے ایڈریس کے متعلق عامل پڑھ کر ہانڈی پر پھونک مار چکا ہوتا ہے۔ ہانڈی فضا میں معلق ہوکر ہلکی ہلکی گوں..... ں..... ں..... ں"

کی آواز نکالتی ہوئی مطلوبہ ایڈریس کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے اور مقررہ گھر کے مین دروازے کے سامنے اوپر سے زمین پر گر جاتی ہے اور پھر جس شخص کے نام کا عامل نے عمل پڑھا ہوتا ہے وہ شخص خون کی الٹیاں کرکے فوراً موت سے ہمکنار ہوجاتا ہے۔

روتے دھوتے اور آہوں سسکیوں کے ساتھ کمال کو دفن کردیا گیا۔ ثمرین کو ہوش آکے نہیں دے رہا تھا۔ پورا گاؤں غمزدہ تھا۔ لوگوں کے دل دھک دھک کررہے تھے۔ یہ معاملہ تو کھل کر سامنے آگیا تھا کہ جو کچھ بھی ہوا تھا کسی دشمن کا کیا دھرا تھا۔ مگر وہ دشمن کون تھا؟ اس کا کیا مقصد تھا؟ وہ اپنی کون سی دشمنی کے تحت ایسا کیا تھا جبکہ شرافت اور دیانت میں سلامت اور کرامت کا گھر مشہور تھا۔ ان لوگوں کی کسی سے بھی دشمنی نہیں تھی اور نہ ہی وہ لوگ کسی کے لفڑے میں پڑتے تھے، سب کے ساتھ بھائی بندی اور پیار محبت سے پیش آتے تھے، ایسے لوگوں کا اچانک یہ کون دشمن پیدا ہوگیا تھا، اور آناً فاناً جادوئی ہانڈی بھیج کر بچے کا خاتمہ کرادیا تھا۔

ہانڈی کا عمل ایسا ہوتا ہے کہ اگر عمل آگے بڑھ گیا تو اس کا کوئی توڑ نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی یہ عمل زیادہ وقت لیتا ہے۔ رات میں ہی ہانڈی اڑائی جاتی ہے اور ہانڈی چند منٹ میں مطلوبہ جگہ پہنچ کر نیچے گرتی ہے اور جو شخص ہدف ہوتا ہے وہ موت کا شکار ہوجاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ بڑا بیٹا باپ کا سہارا ہوتا ہے اور یہ ہے بھی حقیقت۔ کرامت غم سے نڈھال تھا۔ اس کے جسم کی ساری توانائی ختم ہوکر رہ گئی تھی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ غم نے اس کی کمر جھکادی تھی۔

پورے گاؤں میں سوگ کا عالم تھا، ہر طرف ایک عجیب سی ویرانی چھائی تھی، کسی کو بھی کھانا پینا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کیونکہ بیٹھے بٹھائے اچھا بھلا چنگا سا بچہ چٹ پٹ موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔ جو لوگ اس وقت حقیقت یعنی اس جادوئی ہانڈی کے متعلق جانتے تھے وہ بہت زیادہ خوفزدہ تھے اور انہیں معلوم تھا کہ دشمن اب بھی چین سے نہیں بیٹھے گا۔

تیسرے دن سوئم تھا، چوتھے دن دونوں بھائی سلامت اور کرامت نے دکان کھول دی۔ دکان پر جتنے بھی لوگ آتے سب کے سب افسوس کرتے رہے۔ تسلی اور دلاسہ دیتے رہے۔ کرامت کو بیٹھا کر سلامت مال لانے کے لئے شہر چلا گیا اور جاتے جاتے کرامت سے بولا۔ "کرامت تم گلے پر بیٹھے رہنا، یہ جو دونوں نوکر ہیں ان سے بھرپور کام لینا۔ میں کوشش کروں گا کہ جلدی سے آجاؤں۔

کرامت جو ہونا تھا ہوگیا، اللہ کی مرضی کے آگے کسی کی کیا چل سکتی ہے، جس دشمن نے بھی ایسا کیا ہے اس سے تو اللہ ہی نمٹے گا، اللہ کی رحمت پر نظر رکھو، اللہ اچھا کرے گا، اچھا اب میں چلتا ہوں۔" اور یہ بول کر سلامت بیل گاڑی پر بیٹھ کر شہر چلا گیا۔ شہر زیادہ دور نہیں تھا، وہ اکثر بیل گاڑی پر مال لایا کرتے تھے۔ کچھ آڑھتی ایسے بھی تھے، جو گلہ خود بخود اپنی گاڑی پر چھوڑ جایا کرتے تھے۔

گاؤں میں ایک عمر رسیدہ گردھاری لال تھے۔ وہ بہت شریف النفس اور ہمدرد تھے، وہ عامل تھے مگر چھوٹے عامل، اپنے جنتر منتر سے لوگوں کے مسائل حل کردیا کرتے تھے، وہ ہندو مسلمان میں کوئی فرق نہیں رکھتے تھے ہر کسی کے ساتھ پیار محبت سے پیش آتے تھے۔

وہ کرامت کے پاس آئے اور تسلی دیتے رہے۔

"کرامت بیٹا جو کچھ ہوا وہ بہت برا ہوا، بالکل بھی گھبرانا نہیں، میں اس کوشش میں ہوں کہ وہ بدذات دشمن ہے کون؟ اس نے ایسا ذلیل اور اوچھا کام کیوں کیا۔

کرامت بیٹا! میں زیادہ پہنچا ہوا تو نہیں ہوں، اگر مجھ سے پتہ نہیں لگ سکا تو میرے ایک جاننے والے ہیں۔ وہ اس معاملے میں بہت ماہر ہیں، میں نے اپنی زندگی میں آج تک ان سے بڑا پہنچا ہوا اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ بہت ہمدرد اور خیال کرنے والے ہیں جو بھی ان کے پاس گیا وہ کامیاب لوٹا۔ اتنے دل کے دھنی ہیں کہ کسی سے کوئی پائی پیسہ نہیں لیتے، اگر کچھ خرچ بھی ہوتا ہے تو اپنے پاس سے کرتے ہیں، دلی میں حکیم وقار کے مطب میں حکیم وقار کے بھائی ہیں حکیم کامل، روحانی علاج میں ماہر ہیں۔"

"گردھاری کاکا، ہماری تو کسی سے دشمنی بھی نہیں، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ہمارے ابا کی بھی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی، آپ بلکہ پورا گاؤں جانتا ہے کہ ہم لوگ کس مزاج کے ہیں، اب یہ کس نے اور کیوں کیا ہے اللہ بہتر جانتا ہے؟" کرامت نے کہا۔

"کرامت بیٹا! یہ بات تو اٹل ہے کہ یہ دشمن کا کیا دھرا ہے۔ دشمن بہت چالاک اور شاطر ہے۔ اس نے ایسا کام کرایا ہے کہ عقل دنگ رہ جائے۔ اگر کوئی کسی پر جادو کراتا ہے تو اس میں زیادہ وقت لگتا ہے مگر یہ ایسا عمل ہوتا ہے کہ فوراً اثر ہوتا ہے، اور دیکھتے ہی دیکھتے بندہ ختم ہوجاتا ہے۔ بھگوان بچائے ایسے عمل سے۔ بیٹا! میں کوشش کروں گا کہ دشمن کا پتہ چل جائے اور اگر نہیں ہوا تو میں تمہیں یا سلامت کو ساتھ لے کر دلی چلوں گا۔ حکیم کامل کے پاس۔

"اب میں چلتا ہوں، ذرا کھیت میں بھی جانا ہے، کھیت میں گنے کی بوائی ہورہی ہے۔" اور یہ بول کر گردھاری لال چلے گئے۔

کرامت گلے پر بیٹھا تھا مگر اس کے دماغ میں سوچوں کا طوفان برپا تھا۔ اس کے دماغ میں بار بار یہی آرہا تھا کہ "یا اللہ ہماری تو کسی سے بھی دشمنی نہیں، ہم نے تو کبھی بھی کسی کا برا نہیں چاہا، کبھی کسی کے معاملات میں دخل بھی نہیں دیا لیکن ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہوگیا، یہ کون ہے جو ہمارا دشمن بن گیا؟

اسی قسم کے خیالات نے اسے پریشان کررکھا تھا۔ بار بار کمال کی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتی۔ تو اس کا دل مچل اٹھتا اور آنکھوں میں آنسو

خوبصورت پھول

1- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ توبہ کرنے والے ہی عبادت گزار ہیں۔

2- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو مجھے یاد کرتا ہے میں اسے یاد کرتا ہوں اور جو مجھے بھلا دیتا ہے میں اسے بھلا دیتا ہوں۔

3- پھاہا رکھنے والا جھوٹ زخمی کرنے والے والے سچ سے بہتر ہے۔

4- جس کا ظاہر باطن کا آئینہ دار نہ ہو، اس کی محبت سے کنارہ کش رہو۔

5- مغرور اسے کہتے ہیں کہ جو دوسروں کو کم تر تصور کرے اور مغرور کو کبھی معرفت حاصل نہیں ہوتی۔

(راجہ باسط مظہر..... حامد جھنگی)

تیرنے لگتے، دکان میں بیٹھے بیٹھے تھوڑی دیر بعد وہ جیسے لرز جاتا، اس پر اچانک خوف سوار ہوجاتا اور پھر اسے ایسا بھی محسوس ہوتا کہ جیسے اس کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔ اور حقیقت میں ایسا ہی تھا۔ وقفے وقفے سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے اور ساتھ ہی اس کا جسم کپکپا جاتا۔

آج سے پہلے کبھی بھی اس کے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد ہوتا جارہا تھا۔ اور پھر دکان میں بیٹھے بیٹھے اسے بخار ہوگیا۔ کرسی پر بیٹھنا اس سے دوبھر ہورہا تھا مگر وہ مجبور تھا اور دکان میں بیٹھنا بھی ضروری تھا کیونکہ بڑا بھائی سلامت تھا نہیں اور پھر پوری دکان دونوں نوکروں پر چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

گھر سے کھانا دکان پر آگیا تھا مگر طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے آج اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔

خیر اللہ اللہ کرکے شام پانچ بجے سلامت بیل گاڑی پر مال لے کر آگیا اور مال اتروانے لگا۔

بیل گاڑی سے سارا مال اتروانے کے بعد کرامت کے سامنے کرسی پر بیٹھا اور پھر غور سے کرامت کی طرف دیکھا۔ ''کرامت کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟'' اور یہ بول کر جب اس نے کرامت کی کلائی پکڑی۔ ''کرامت تمہیں تو سخت بخار ہورہا ہے۔ صبح کے وقت تو بالکل ٹھیک تھے، یہ بخار کب چڑھا؟ دکان بند کرکے گھر چلے جاتے۔''

''بھیا! بس! چانک بخار چڑھ گیا۔ آپ آگئے تو میں گھر چلا جاتا ہوں۔'' کرامت بولا۔

تم فوراً گھر پہنچو! میں حکیم صاحب کے پاس خبر بھیجتا ہوں وہ آکر چیک کرلیں گے اور دوا بھی دے دیں گے۔'' سلامت بولا۔

سلامت نے اپنے نوکر فضلو کو آواز دی۔ ''اے فضلو، بھائی کی طبیعت ٹھیک نہیں، ان کے ساتھ گھر جاؤ، اور انہیں گھر چھوڑ کر فوراً حکیم صاحب کے پاس جانا اور انہیں بلا کر جلدی سے لے آؤ، حکیم صاحب سے کہنا کہ کرامت بھائی کو سخت بخار ہوگیا ہے، آپ چل کر دیکھ لیں اور دوا بھی دے دیں، سلامت بھائی نے فوراً آنے کا کہا ہے۔''

کرامت کو فضلو کے ساتھ گھر روانہ کردیا اور خود دکان میں رہ گیا۔ کرامت کی طبیعت اور حالت دیکھ کر سلامت بہت پریشان ہوگیا تھا۔

''یا اللہ اپنا فضل کر، کرامت کا بخار فوراً اتر جائے، یا اللہ ہم سارے گھر والوں پر رحم و کرم فرما۔'' سلامت نے کہا۔

کرامت کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی، چلنے میں اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ فضلو نے اسے سہارا دے کر گھر پہنچادیا، اور فوراً تیز قدموں سے چلتا ہوا حکیم ارشاد علی کے پاس پہنچا۔ ''حکیم صاحب کرامت بھائی کو سخت بخار ہوگیا ہے، آپ جلدی چلیں، سلامت بھائی نے کہا ہے کہ حکیم صاحب سے کہنا جلدی سے آکر کرامت کو دیکھ لیں اور دوا بھی دے دیں۔''

حکیم ارشاد نے جلدی سے بیگ اٹھایا جس میں مختلف اقسام کی دوائیں تھیں اور فضلو کے ساتھ چند منٹ میں کرامت کے پاس پہنچ گئے۔

حکیم صاحب نے جب کرامت کی نبض پر انگلی رکھی تو چونک گئے۔ ''ارے کرامت بیٹا تمہیں تو بہت سخت بخار ہے اور اچ گرمی بھی بہت شدید ہے۔''

حکیم صاحب نے فوراً ایک بالٹی ٹھنڈا پانی منگایا اور ایک دوسری بالٹی بھی منگالی۔ دوسری بالٹی خالی تھی۔

''کرامت بیٹا! چارپائی کی پٹی پر اپنا سر رکھ کر لیٹ جاؤ، تمہارے سر پر پانی ڈالنا بہت ضروری ہے۔ میں اپنے حساب سے پانی ڈالوں گا۔'' حکیم صاحب نے کہا۔

بخار اتنا تیز تھا کہ کرامت کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں اور پھر آنکھوں سے پانی بھی بہنے لگا تھا۔ حکیم صاحب کے کہنے کے مطابق کرامت نے اپنا سر چارپائی کی پٹی پر رکھ کر لیٹ گیا، حکیم صاحب پانچوں وقت کے نمازی تھے اور ساتھ ہی ساتھ دم درود بھی کیا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ کرامت کے سر پر پیشانی کی طرف سے گ میں پانی لے کر ڈالنا شروع کردیا۔ سر

سے ہوتا ہوا پانی خالی بالٹی میں گرنے لگا۔ نیچے گرتا ہوا پانی بھی گرم لگتا تھا، آہستہ آہستہ حکیم صاحب کرامت کے سر پر پانی ڈالتے رہے، جب پانی ختم ہوگیا تو انہوں نے ایک بالٹی پانی اور منگالیا اور اسے بھی کرامت کے سر پر ڈالنے لگے، آدھا گھنٹہ تک پانی سر پر ڈالتے رہے، اس کے بعد حکیم صاحب نے کرامت کا بخار جب چیک کیا تو بخار کی شدت میں کمی آگئی تھی۔

حکیم صاحب نے دوا کی چھ پڑیاں دیں اور بولے۔ ''کرامت بیٹا اس دوا کو تم ہر دو گھنٹے بعد کھانا، اللہ نے چاہا تو بخار ختم ہوجائے گا۔'' اس کے بعد حکیم صاحب کوئی دس منٹ تک بیٹھے رہے اور کلام الٰہی پڑھ پڑھ کر کرامت پر دم کرتے رہے۔ ''اچھا کرامت بیٹا، اب میں چلتا ہوں۔ تم ٹائم پر دوا ضرور کھانا۔''

ستاز مانہ تھا۔ کرامت نے حکیم صاحب کو ایک روپیہ دیا۔ اور حکیم صاحب کرامت کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔ حکم صاحب کے جانے کے بعد فضلو بھی دکان پر آگیا اور ساری تفصیل سلامت کے گوش گزار کردی۔

جاتے جاتے حکیم صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ ''شدید گرمی پڑ رہی ہے، بخار میں بھی شدت ہے لہٰذا رات میں چھت پر سونا تاکہ ٹھنڈی ہوا لگتی رہے۔''

دونوں بھائیوں کا اصول تھا کہ مغرب کی اذان سے چند منٹ پہلے دکان بند کردیا کرتے تھے۔ سلامت نے دکان بند کی، مسجد گیا اور نماز مغرب کے بعد گھر آگیا، وہ فوراً کرامت کے کمرے میں گیا اور کرامت کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''کرامت سر میں درد بھی ہورہا ہوگا؟'' سلامت نے پوچھا۔

''جی بھیا! سر میں کافی درد ہورہا ہے، پہلے سے اب بخار میں کمی آگئی ہے، حکیم صاحب نے کہا ہے کہ ہر دو گھنٹہ بعد دوا کھانا اور یہ بھی بول کر گئے ہیں کہ رات میں چھت پر سونا کیونکہ گرمی آج زیادہ ہے۔'' کرامت نے کہا۔

''تم لیٹ جاؤ! میں تمہارا سر دبا دیتا ہوں۔'' سلامت بولا۔

''بھیا اس کی ضرورت نہیں، آپ آرام کریں۔'' کرامت بولا۔

''بس تم شرافت سے لیٹ جاؤ، آگے کچھ اور نہ بولنا۔'' سلامت نے کہا۔ سلامت کو دیکھ کر کرامت اٹھ بیٹھا تھا۔ سلامت کے کہنے پر وہ دوبارہ لیٹ گیا۔

جب کرامت لیٹ گیا تو سلامت نے بہت پیار سے کرامت کا سر دبانا شروع کردیا۔ اس دوران وہ ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتا رہا تاکہ کرامت کی طبیعت بہل جائے۔ آدھا گھنٹہ تک وہ کرامت کا سر دباتا رہا۔ پھر سلامت اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

سرشام ہی دونوں بھائیوں کا بستر چھت پر کردیا گیا تھا۔ رات کا کھانا سب نے اکٹھا کھایا، حکیم صاحب نے کہا تھا کہ ''کرام رات میں روٹی چاول نہیں کھانا بلکہ گرم گرم دودھ پی لینا، دودھ میں دوا کی پڑیا ملالینا۔'' حکیم صاحب نے دودھ میں ملا کر پینے کے لئے الگ سے ایک پڑیا دی تھی۔ جسے کرامت نے گرم دودھ میں ملا کر پی لیا تھا۔

رات ساڑھے آٹھ بجے دونوں بھائی چھت پر چلے گئے اور اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے، رات میں چھت پر سونے کے لئے بچوں اور عورتوں کو اجازت نہیں تھی۔

سلامت کافی دیر تک ماضی اور حال کے متعلق باتیں کرتا رہا اور پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔ کرامت بھی نیند کی وادی میں پہنچ گیا تھا۔

بہت بڑی چھت تھی۔ چھت پر لائن میں تین کمرے موجود تھے۔ ان کمروں کی چھت ٹین کی تھی۔ جب دونوں بھائی گھر میں موجود ہوتے تو عورتیں اور بچے اوپر جاکر ان کمروں میں کبھی کبھار آرام کرتے تھے۔

رات کے ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا کہ اچانک دونوں بھائیوں کی آنکھ کھل گئی ایسا لگا کہ کوئی بہت بھاری بھرکم وجود چھت پر چل رہا ہے۔ اس کے چلنے سے ٹین کی چھت واضح طور پر اوپر نیچے ہونے لگی

تھی۔ یعنی جب وہ بھاری وجود قدم رکھتا تو چھت نیچے کو دب جاتی اور پھر جیسے وہ قدم اٹھاتا تو چھت اوپر کو ہوجاتی۔ اسی پر اکتفا نہیں تھا بلکہ وقفے وقفے سے وہ وجود اوپر کو اٹھتا اور دھڑام سے چھت پر گرتا۔ جس سے زوردار اور فلک شگاف آواز سنائی دیتی۔

دونوں بھائیوں کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ گھٹا ٹوپ اندھیری رات تھی۔ اتفاق سے چاند کی آخری تاریخیں تھیں۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ تو چھت پر موجود وہ شے کیسے نظر آتی۔ دونوں بھائی اٹھ کر اپنی اپنی چارپائی پر بیٹھ گئے تھے۔ سلامت نے کرامت کا ہاتھ دبا کر اشارہ دیا کہ ”کچھ بولنا نہیں۔“

دونوں بھائی ایسا محسوس کرنے لگے تھے کہ اس زوردار آواز سے پاس پڑوس بلکہ پورا گاؤں اب اٹھا کہ تب اٹھا۔ اس طرح ہوتے ہوئے کوئی پندرہ منٹ ہوچکے تھے۔ مگر ابھی تک ان دونوں بھائیوں کے علاوہ کوئی نہیں اٹھا تھا۔ کوئی بیس منٹ تک وہ مہیب آوازیں آتی رہیں اور پھر آوازیں آنا بند ہوگئیں۔ چھت اب اپنی اصل پوزیشن میں تھی۔

دونوں بھائی دوبارہ لیٹ گئے۔ ان کے دماغ میں طرح طرح کے سوالات تھے مگر وہ کسی بھی حتمی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہے تھے۔ نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور چلی گئی تھی۔ بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے ایک گھنٹہ سے بھی زیادہ ہوچکا تھا کہ اچانک دو بلیاں اس چھت پر نہ جانے کہاں سے آگئیں اور غرانے لگیں۔ اور پھر ان بلیوں کی آواز اتنی زوردار، خونخوار ہوگئی جو کہ ناقابل برداشت تھی۔

بلیوں کی آواز پر دونوں بھائی پھر اٹھ کر اپنے اپنے بستر پر بیٹھ گئے، اس مرتبہ بھی سلامت نے کرامت کا ہاتھ پکڑ کر اشارہ دیا کہ خاموش رہنے میں بہتری ہے۔ اب کرامت پر لرزہ طاری ہونے لگا تھا۔ اندھیری رات ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا مسلط تھا۔ سلامت نے محسوس کیا کہ کرامت کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ اپنے بستر پر سے اٹھ کر کرامت کے بستر پر بیٹھ گیا اور کرامت کے دونوں کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

اللہ کی پناہ! بلیاں اس طرح خوفناک اور بھیانک آوازیں نکالنے لگی تھیں کہ کان کے پردے متاثر ہونے لگے تھے۔ اچانک اسی دوران سلامت کی نظر چھت کی طرف اٹھ گئی تو اس پر جھرجھری طاری ہوگئی کیونکہ بلیوں کی آنکھیں نہیں بلکہ ایسا لگا کہ کسی نے اس جگہ دہکتے ہوئے چار انگارے رکھ دیئے ہوں۔

اگر عام حالات میں اس خوفناک طریقے سے بلیاں چیختیں تو ابھی تک پاس پڑوس اور قرب و جوار کے لوگ یقیناً اپنے اپنے گھروں سے نکل پڑے ہوتے۔ لوگوں کو ویسے بھی معلوم ہے کہ ایک یا ایک سے زیادہ بلیوں کا رونا یا چیخنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اب کرامت پر کپکپی سوار ہوچکی تھی۔ وقت ایسا تھا کہ سلامت سوائے خاموشی سے کرامت کو پکڑ کر بیٹھنے کے اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔

آج سے پہلے کبھی بھی ایسا نہیں ہوا تھا، جو حالات آج ان کے سامنے تھے۔ ان کے گھر یا چھت پر کبھی بھی کوئی بلی نہیں آتی تھی۔ سلامت کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ یقیناً یہ کوئی اور مسئلہ ہے۔ کرامت کو کندھے سے پکڑے ہوئے وہ بیٹھا رہا، تھوڑا وقت اور گزر گیا اب بلیوں کی چیخ میں فرق پڑ گیا تھا۔ اب وہ وقفے وقفے سے چیخنے لگی تھیں۔

اچانک ”اللہ اکبر..... اللہ اکبر“ کی صدا انہیں سنائی دی۔ اذان فجر کی آواز پورے گاؤں میں گونجنے لگی تھی۔ ”اللہ اکبر اللہ اکبر“ کی آواز کا آنا تھا کہ اچانک دونوں بلیاں نہ جانے کہاں غائب ہوگئیں۔ اب سلامت کی جان میں جان آئی۔ مگر کرامت کی حالت بدستور غیر رہی۔ جب ذرا سپیدہ نمودار ہوا تو کرامت کو سہارا دے کر سلامت نیچے کمرے میں لے آیا۔ کرامت کو بستر پر لٹا دیا اور خود فجر کی نماز کے لئے وضو بنانے چلا گیا۔ وضو بنا کر اس نے کرامت کے کمرے میں ہی نماز فجر ادا کی۔ دعا سے فارغ ہو کر اس نے کرامت پر کلام الٰہی پڑھ کر دم کیا۔ دم کرتے ہی ایسا لگا کہ جیسے کرامت کے جسم کو بجلی کے کرنٹ کا جھٹکا لگا ہو۔ کرامت کا جسم زور زور سے جھٹکا کھانے لگا اور پھر کرامت

شانت ہو کر بستر پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

سلامت ثمرین سے بولا۔ ”دودھ گرم کر کے لے آؤ۔“ ”ثمرین فوراً دودھ گرم کر کے لے آئی تو سلامت نے کرامت کو سہارا دے کر اٹھا اور گھونٹ گھونٹ گلاس کا سارا دودھ پلا دیا۔ اس کے بعد حکیم صاحب کی دی ہوئی دوا بھی کھلا دی۔ اس کے بعد قرآن کی دونوں ”معوذتین سورتیں“ پڑھ کر کرامت کو دم کیا تو اچانک کرامت نے سلامت کو عجیب نظروں سے گھورنے لگا۔ کرامت کی نگاہوں میں ایک عجیب طرح کی پراسراریت بھری تھی۔ جسے دیکھ کر سلامت کو اپنے جسم میں جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ لیکن وہ بدستور ”معوذتین سورتیں“ پڑھ کر دم کرتا رہا۔ ایسا کرنے سے کرامت کی طبیعت میں ٹھہراؤ آ گیا اور پھر چند منٹ میں ہی وہ گہری نیند سو گیا۔

کرامت کو گہری نیند میں دیکھ کر سلامت مطمئن ہوگیا، اس نے ناشتہ کیا اور پھر دکان کھولنے کے لئے چلا گیا۔ جب وہ دکان پر پہنچا تو دیکھا کہ دونوں نوکر پہلے پہنچ کر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ دکان کھول کر سلامت گلے پر بیٹھ گیا۔ اور پھر گاہکوں کا آنا جانا شروع ہوگیا۔

پونے دس بجے گردھاری لال دکان پر آئے اور ان پر نظر پڑتے ہی سلامت نے انہیں سلام کیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئے اور بولے۔ ”سلامت بیٹا! اب کرامت کی کیسی طبیعت ہے؟ اور جہاں تک مجھے امید ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ میری جانکاری کے مطابق کل رات اس کے ساتھ بہت ہی اوکھا مسئلہ رہا، میں نے اپنے جنتر منتر سے معلوم کرلیا ہے کہ کوئی اس کے پیچھے پڑ گیا ہے اور اگر جلدی سے اس کا بچاؤ نہ کیا گیا تو بھگوان نہ کرے.....“ اور انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”کاکا آپ صحیح کہہ رہے ہیں، کچھ کچھ اندازہ تو میں نے بھی لگا لیا ہے، میرے اندازے کے مطابق کچھ ہوائی چیزوں کا مسئلہ لگتا ہے، کل رات میں جو واقعات پیش آئے ہیں، اسے مدنظر رکھتے ہوئے میرا بھی ارادہ ہے کہ اس کا فوراً تدارک ہونا چاہئے، مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ کسی پہنچے ہوئے بندے کا ہمیں علم نہیں۔ ہم اسے کہاں ڈھونڈیں۔ اندرونی طور پر میں بھی لرز گیا ہوں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ کرامت کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“ سلامت نے کہا۔

”بیٹا سلامت! میں خود بھی کرامت کے معاملے میں اندر سے ہل کر رہ گیا ہوں، اس کا چھا بھلا بچہ بے موت مارا گیا۔ اس معصوم نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ رات میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا گھر گھپ اندھیرے میں چھپ گیا ہے۔ تمہارے گھر سے ہٹ کر چاروں طرف روشنی ہے، اس طرح کہیں اندھیرا چھانا اچھا نہیں ہوتا، جب کوئی دشمن جادو ٹونے پر اتر آتا ہے تو آہستہ آہستہ سارا گھر اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔“ گردھاری لال نے کہا۔

گردھاری لال اور سلامت یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں کرامت دکان پر آ گیا اور گردھاری لال پر نظر پڑتے ہی ان سے نگاہیں چرانے لگا۔

”ارے کرامت تم کیوں آ گئے، بھئی گھر پر آرام کرلیتے، کام تو ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے، جاؤ جا کر آرام کرو۔“ سلامت نے کہا۔

”بھیا! گھر میں پڑا پڑا، میں بور ہو رہا تھا، اس لئے آ گیا، یہاں رہوں گا تو طبیعت بھی بہل جائے گی۔“ اور پھر اچانک اس کا تیور بدل گیا۔ وہ گھور کر گردھاری لال کو دیکھنے لگا۔

”تم کیوں آ گئے، کام وام کا وقت ہے، تم تو بے کام آدمی ہو، کہیں اس طرح دھرنا دے کر بیٹھنا اور دوسروں کو پریشان نہ کرنا ٹھیک نہیں، جاؤ..... یہاں سے چلے جاؤ..... اور آئندہ ادھر آنے کے لئے خیال رکھنا۔“ کرامت بولتا چلا گیا۔

سلامت فوراً بولا۔ ”کرامت یہ تم کیا.....“ اور اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ گردھاری لال نے سلامت کو خاموش کرا دیا۔

وہ بولے۔ ”سلامت بیٹا! تم خاموش رہو، میں جانتا ہوں یہ خود نہیں بول رہا بلکہ اس سے بلوایا جا رہا

ہے۔ مجھے ساری حقیقت کا پتہ ہے۔ تم فوراً یکہ والے کو بلوالو، فضلو کو بھیج کر، میں اسے اپنے ساتھ حکیم وقار کے مطب دلی لے جارہا ہوں، حکیم وقار کے مطب میں ایک حکیم صاحب ہیں۔ ''حکیم کامل۔'' جو بہت پہنچے ہوئے ہیں، ایک منٹ میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرکے رکھ دیں گے، اور دلی یہاں سے ہے کتنی دور، دو گھنٹے کا تو راستہ ہے۔ ہم نے جانا ہے اور واپس آنا ہے۔ تم جلدی کرو، نہیں تو کرامت کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے اور آج کی رات اس پر اور بھی بھاری ہے۔''

''او بڈھے! زبان سنبھال کر بات کر نہیں تو تیرا ٹیٹوا دبادوں گا۔ میں تیرے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گا۔'' کرامت کا لہجہ بالکل بدل گیا تھا۔

اب گردھاری لال نے گھور کر کرامت کو دیکھا اور کچھ پڑھ کر اپنی سیدھی انگلی پر پھونک ماری اور انگلی کرامت کی آنکھ کے سامنے کردی، تو کرامت کے منہ سے نکلا۔ ''اوہ!'' اور اس نے ایک بہت لمبا سانس کھینچا۔

''اب بالکل خاموش ہوجا! ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو سمجھ لے..... خبردار! بالکل خاموشی مانگتا ہوں۔ اور چل میرے ساتھ.....'' گردھاری لال کی باتیں سن کر کرامت جیسے بھیگی بلی بن گیا اور نگاہیں نیچی کرلیں۔

سلامت یکہ والے کو لانے کے لئے فضلو کو بھیج چکا تھا۔ ''کاکا آپ برائے مہربانی کرامت کا خیال رکھنا، اگر دکانداری کا مسئلہ نہیں ہوتا تو میں خود بھی چلتا، ویسے بھی دلی گئے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ اللہ کرے کرامت جلدی ٹھیک ہوجائے، کتنے روپے لگیں گے۔ آپ روپے لے جائیں۔'' سلامت نے کہا۔

''سلامت بیٹا! اس میں کوئی خرچ نہیں۔ بس یکہ والے کو آنے جانے کا کرایہ دے دینا، کامل صاحب ایک پائی بھی نہیں لیتے۔''

اتنے میں یکہ والا آ گیا۔ اسے دیکھ کر سلامت بولا۔ ''راجا، انہیں دلی لے جا اور واپس بھی لیتے آنا، انہیں وہاں پر تھوڑا وقت لگے گا، اس کی فکر مت کرنا، جتنا بھی کرایہ بنے گا لے لینا۔''

''ارے سلامت بھیا! کوئی فکر نہ کریں، جو آپ کے دل میں آئے دے دینا، میں آپ کے آگے کیا بول سکتا ہوں۔ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی، ویسے میں نے دلی میں حکیم وقار کا مطب دیکھا ہوا ہے، بہت مشہور مطب ہے۔'' راجا نے کہا۔

''کرامت تم جا کر یکہ میں بیٹھو، گردھاری کاکا، تمہیں حکیم صاحب کے پاس لے جارہے ہیں، حکیم صاحب دلی میں رہتے ہیں، ان کا بہت بڑا مطب ہے۔ حکیم صاحب سے دوا لے کر واپس آجانا۔ فضلو بھی تمہارے ساتھ جارہا ہے۔ دکان کی فکر نہ کرو، میں سنبھال لوں گا۔'' سلامت نے کہا۔

سلامت کی بات سن کر کرامت بغیر چوں چراں کے خاموشی سے یکہ کے پاس گیا اور پھر یکہ پر چڑھ کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس کے بعد گردھاری لال اور فضلو بھی یکہ کے پاس گئے اور یکہ میں بیٹھ گئے۔

''گردھاری کاکا، آپ کی بہت بہت مہربانی کہ آپ اپنا کام چھوڑ کر کرامت کے ساتھ جارہے ہیں۔ اس کا اجر آپ کو اللہ ضرور دے گا۔'' سلامت نے کہا۔

''سلامت بیٹا! تم فکر نہ کرو، بھگوان نے چاہا تو کرامت بالکل چنگا بھلا ہوکر واپس آئے گا، تم لوگوں کو بھی میں اپنا ہی سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ بھی امید ہے کہ دشمن کا بیڑا ضرور غرق ہوگا، ذرا پتہ چل جائے پھر دیکھنا اس کا کیا حشر کروں گا۔ اچھا اب ہم چلتے ہیں، تین چار گھنٹے میں واپس آجائیں گے۔'' یہ بول کر انہوں نے کوچوان سے کہا۔ ''راجا، اب اپنے گھوڑے کی تیزی دکھلا۔''

کوچوان نے گھوڑے کی لگام ڈھیلی کرکے آگے جانے کے لئے اشارہ دیا تو گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ گھوڑا واقعی بہت تیزی دکھلا رہا تھا۔ اور اس طرح وہ لوگ سوا گھنٹے میں دلی حکیم وقار کے مطب کے سامنے پہنچ گئے۔ یکہ سے اتر کر گردھاری لال، کرامت اور فضلو مطب کی طرف بڑھ گئے، کوچوان یکہ کو ایک درخت کے سایہ تلے لے کر کھڑا کردیا۔ اور بیڑی سلگا کر دھواں اڑانے لگا۔

کرامت بالکل کوئی شور شرابہ کئے گردھاری لال کے ساتھ چلتا ہوا، مطب کے انتظار گاہ میں جا کر بیٹھ گیا۔ کرامت یوں خاموش تھا کہ گردھاری لال نے دکان پر کچھ پڑھ کر اس کی بندش کردی تھی۔

پندرہ منٹ بعد ہی ان کا نمبر آ گیا۔ ایک ملازم نے گردھاری لال اور کرامت کو حکیم وقار کے کمرے میں پہنچا دیا۔ حکیم وقار ان دونوں کو دیکھ کر مسکرائے اور بڑی شفقت سے سامنے موجود کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب دونوں کرسی پر بیٹھ گئے تو حکیم وقار نے پوچھا۔ ''محترم! کس تکلیف کے تحت آپ لوگ تشریف لائے ہیں.....؟''

''حکیم صاحب! دراصل ہمیں حکیم کامل سے ملنا ہے، یہ میرے جاننے والے ہیں، ان کا نام کرامت علی ہے، یہ ہوائی چیزوں کے چکر میں آگئے ہیں۔ ہم یہاں سے تھوڑے فاصلے پر رانی پور گاؤں میں رہتے ہیں۔''

''اچھا..... اچھا..... آپ اطمینان رکھیں، میں آپ لوگوں کو حکیم کامل کے کمرے تک پہنچا دیتا ہوں۔'' انہوں نے میز پر اپنے سامنے رکھی ہوئی گھنٹی بجائی تو فوراً ایک ملازم حاضر ہوگیا۔ ''جی حکیم صاحب!'' ملازم ہاتھ باندھ کر مودبانہ لہجے میں بولا۔

''شکور میاں! ان دونوں صاحبان کو حکیم کامل کے کمرے تک چھوڑ آؤ۔'' حکیم وقار نے کہا۔

''جی بہت اچھا۔'' ملازم نے کہا اور دونوں کے ساتھ حکیم کامل کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ حکیم کامل کے کمرے میں پہنچ کر مودبانہ لہجے میں بولا۔ ''حکیم صاحب یہ دو صاحبان آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' اور یہ بول کر ملازم الٹے پاؤں کمرے سے نکل گیا۔

ان دونوں کو دیکھ کر رولو کا اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

گردھاری لال نے ہاتھ ملایا، اور جب رولو کا نے کرامت کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا تو کرامت نے ہاتھ نہیں ملایا اور جلدی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

رولو کا نے کرامت کو غور سے دیکھا اور بولا..... ''اچھا..... تو یہ بات ہے..... خیر تمہاری مرضی .....'' یہ بول کر رولو کا اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''حکیم صاحب! میرا نام گردھاری لال ہے، اور ان کا نام کرامت علی ہے۔ ہم رانی پور سے آئے ہیں۔ لگتا ہے ان کے ساتھ کوئی ہوائی چکر ہوگیا ہے۔'' گردھاری لال نے کہا۔

''آپ اپنی زور زبردستی اور اپنی شکتی کے سہارے یہاں تک لے آئے، ورنہ یہ کسی صورت یہاں نہیں آتے۔ خیر میں انہیں چیک کرتا ہوں۔'' یہ بول کر رولو کا اپنی گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔

چند منٹ کے بعد رولو کا نے اپنی گردن اوپر اٹھائی اور ایک لمبا سانس کھینچ کر بولا۔ ''اچھا..... تو یہ معاملہ ہے..... گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔'' رولو کا مسکرانے لگا۔

کرامت کو رولو کا بہت گہری نظر سے دیکھنے لگا اور پھر بولا۔ ''کرامت صاحب! آپ کچھ بولنا پسند کریں گے..... کچھ تو بولیں، خیر چلئے نہیں بولنا چاہتے تو نہ بولیں..... لیکن ہم تو بولتے رہیں گے..... اچھا ہوتا اگر آپ ہماری بات کا جواب دیتے تو۔''

''گردھاری صاحب! آپ بھی شکتی شالی ہیں..... میں نے آپ کو پڑھ لیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ انہیں ساتھ لے آئے۔ ان کے ساتھ مسئلہ نہیں بلکہ مسائل ہیں۔ یہ منہ سے نہیں بولیں گے بلکہ ان کی زبان کھلوانی پڑے گی۔

کبھی کبھی انسان خودغرض اور مطلب پرستی میں اس قدر آگے بڑھ جاتا ہے کہ وہ اپنے قلبی اور خونی رشتوں کو بھی بھول جاتا ہے۔ اپنے عیش و آرام اور اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے لوگوں کو تکلیف اور اذیت پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے، لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، دوسروں کے منہ کا نوالہ چھین کر کھالیتا ہے، اور اگر کوئی اس کی راہ میں رکاوٹ بنے تو اپنے راستے کی رکاوٹ کو ہٹانے کے لئے دوسروں کو روندتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے، چاہے اس

کے لئے اسے کتنے لوگوں کی جان ہی کیوں نہ لینی پڑے۔ اس قدر مال واسباب، زروجواہر اور جگہ جائیداد جمع کرلیتا ہے کہ جیسے وہ اس دنیا سے جائے گا نہیں۔ لیکن وہ بھول بیٹھتا ہے کہ ''سامان سو برس کا ہے اور پل کی خبر نہیں۔'' رولو کا نے کہا۔

''حکیم صاحب! میں بہت آس لے کر آپ کے پاس انہیں لایا ہوں۔ بہت شریف النفس ان کا گھرانہ ہے، میرا یہ کہنا زیادہ مناسب رہے گا کہ ان لوگوں سے زیادہ شریف کوئی پورے رانی پور میں نہیں ہے، ان لوگوں کی ذات سے کبھی کسی فرد کو نقصان نہیں پہنچا اور نہ ہی کسی کو کوئی شکایت ہوئی۔'' گردھاری لال نے کہا۔

رولو کا بولا۔ ''دراصل شریف لوگوں ہی کو تنگ کیا جاتا ہے، بدمعاش کے تو کوئی قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ ان کی قسمت اچھی ہے کہ آپ انہیں آج لے آئے، ورنہ آج کی رات ان پر بہت بھاری ثابت ہوتی۔ اتنی بھاری کہ ان کا وجود ہی ختم ہوجاتا۔ ان کا دشمن بہت شاطر ہے اور اس نے بہت زبردست وار کیا ہے۔ ایک بہت گھناؤنے عمل کا سہارا لیا گیا ہے۔ ایسے عملیات بہت نیچ لوگ چند ٹکوں کے لئے کر بیٹھتے ہیں، کبھی کبھی عمل کرنے والے اگر غافل ہوجاتے ہیں تو پھر ان کا خود کا ستیاناس ہوجاتا ہے۔

اس دنیا میں زیادہ تر لوگ لالچی ہیں، اپنے فائدے کے لئے لوگوں کی زندگی سے کھیل جاتے ہیں۔ لوگوں کی زندگی چھیننے والے یہ نہیں سوچتے کہ ایک نہ ایک دن میری زندگی کا بھی خاتمہ ہوجائے گا۔ سارا دھن دولت یہی رہ جائے گا۔ ایسے کم عقل لوگ ہوتے ہیں جو ایک جان مار کر مال واسباب جمع کرتے ہیں۔ اور مال ودولت کو سینے سے لگائے رہتے ہیں۔ ان کا بس چلے تو تمام دھن ودولت اپنی قبروں میں بھی لے جائیں۔

جس کا سب سے بڑا بے وقوفی کا ثبوت یہ ہے کہ پہلے وقتوں میں جب فرعون مرتے تھے تو ان کی آخری آرام گاہ یعنی اہراموں میں کثیر تعداد میں دھن ودولت، زروجواہر مرنے والوں کی خواہش کے مطابق رکھ دیا جاتا تھا، مرنے والوں کے دماغ میں یہ بات بیٹھ جاتی تھی کہ ایک طویل مدت گزارنے کے بعد زندہ ہوجائیں گے۔ تب انہیں دولت کی ضرورت پڑے گی۔ وہ مرکھپ گئے۔ ان ہڈیاں گل سڑ گئیں، وہ زندہ نہیں ہوئے بلکہ ان کے مال واسباب اور زروجواہر کو لوگوں نے اپنی عقل سے نکالا اور عیش کیا، اور کررہے ہیں۔

''جی حکیم صاحب! آپ سو فیصد درست فرمارہے ہیں، اب ہمارے لئے کیا حکم ہے۔'' گردھاری لال نے کہا۔

رولو کا بولا۔ ''آپ بے فکر ہوجائیں، کرامت میاں کچھ بولیں گے نہیں، خاموش ہی رہیں گے، میں ان کی ہر طرح سے بندش کردیتا ہوں، کوئی بھی ہوائی چیز ان کے قریب نہیں آئے گی، اور کہیں جا بھی نہ سکے گی۔

جیسے چند یا کثیر تعداد میں فوج کسی قلعہ میں مقید ہوجاتی ہے اور باہر سے جب نئی کمک یا امداد ان تک نہیں پہنچتی تو اندر موجود تمام فوجی بے یارومددگار ہوجاتے ہیں اور اپنی جان بچانے کے لئے ہتھیار ڈال دیتے ہیں یا پھر باہر موجود فوج کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ بس یہی حال کرامت میاں کے اندر موجود وجود کا ہوگیا ہے۔ باہر کی کوئی بھی کمک ان کے قریب نہیں آسکتی بلکہ اندر والا اپنی مدد کے لئے کسی کو پکار بھی نہیں سکتا۔'' رولو کا بولا۔

''خیر میں ان کا مکمل وقتی بچاؤ کردیتا ہوں۔''

ان تمام باتوں کے دوران کرامت بالکل خاموش گردن جھکائے بیٹھا رہا۔ اس نے نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا تک نہیں۔ وہ بہت زیادہ عمیق گہرائی میں پہنچ کر کچھ سوچ رہا تھا، رولو کا نے اپنی دراز سے ایک کالی ڈوری نکالی اور اس میں سے ایک بالشت کا ایک ٹکڑا کاٹا اور اسے لے کر کرامت کے قریب پہنچا، کچھ پڑھ کر اس ڈوری میں تین گرہ لگا کر ڈوری کرامت کی سیدھی کلائی پر باندھ دی، اور واپس اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔

''گردھاری لال اب آپ انہیں لے جاسکتے ہیں۔ آپ بالکل بے فکر ہوجائیں، ذرہ برابر بھی ڈر

خوف ذہن میں نہ رکھیں اور باقی تفصیل میں رات میں معلوم کرلوں گا اور پھر حسب ضرورت رانی پور آپ لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں گا، ان کو اکیلے کمرے میں صاف ستھرے بستر پر لٹا دیجئے گا۔ کوئی انہیں ڈسٹرب نہ کرے، یہ اپنی اپنی مرضی سے اٹھیں بیٹھیں، کھائیں پئیں۔ کسی بھی کام کے لئے زبردستی نہیں کیجئے گا۔ وقت پر کھانا ان کے سامنے رکھوا دیجئے گا۔ یہ خاموشی سے کھانا کھالیں گے۔ کھانے میں دال ساگ سبزی روٹی چاول دے سکتے ہیں۔ گوشت مرغی مچھلی اور انڈا ان کے سامنے نہ رکھا جائے اور ہاں اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ کوئی بچہ اور خاص طور سے کوئی عورت ان کے کمرے اور ان کے قریب نہ جائے۔ اس کے لئے خاص تاکید ہے، اب آپ جاسکتے ہیں۔'' رولو کا اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا، اور مصافحہ کے لئے گردھاری لال کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا، اور کرامت سے ہاتھ نہیں ملایا۔

گردھاری لال نے کرامت کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے۔ ''کرامت میاں اٹھو چلیں۔'' یہ سنتے ہی کرامت اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور گردھاری لال کے ساتھ رولو کا کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

راجا یکہ لئے ایک درخت کے سایہ تلے کھڑا تھا۔ وہ تینوں کو دیکھ کر آگے بڑھا اور گھوڑے کی پیٹھ پر تھپکی دی۔ تینوں یکہ میں بیٹھے تو راجا یکہ پر اپنی جگہ بیٹھ کر گھوڑے کی لگام ڈھیلی کردی اور اشارہ ملتے ہی گھوڑا آگے بڑھتے بڑھتے ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

ایک گھنٹہ پانچ منٹ میں یکہ رانی پور پہنچ گیا۔ یکہ دکان کے سامنے رکا۔ سلامت دکان میں اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ جھٹ اٹھا اور یکہ کی طرف بڑھا۔ اور بولا۔ ''گردھاری کاکا، سب خیریت ہے ناں۔''

''ہاں بیٹا! سب خیریت ہے، میری معلومات بالکل صحیح تھی، کرامت بہت زبردست ہوائی چیز کے چکر میں ہے۔ عامل صاحب نے بچاؤ کے لئے بندش کردی ہے۔ اور ہوسکتا ہے وہ کل یا پرسوں یہاں آکر ہم سب کے سامنے حقیقت کی قلعی کھول دیں گے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔'' اور پھر کرامت کے رہن سہن اور معمولات کی ساری تفصیل سلامت کے گوش گزار کردی۔

''فضلو! تم دکان کو دیکھو، میں کرامت کو گھر چھوڑ کر چند منٹ میں آتا ہوں۔ اور ہاں گردھاری کاکا، آپ بھی چند منٹ اور یہاں ٹھہریں، میں واپس آکر آپ سے تفصیل سے بات کرتا ہوں۔'' یہ بول کر سلامت نے کرامت کا کندھا پکڑا اور اسے لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔

گھر پہنچ کر سلامت نے کرامت کو ایک کمرے میں بستر پر لٹا دیا۔ اور چند باتیں اس کی بیوی ثمرین کو بتا دیں اور اپنی بیوی جمیلہ سے بھی بولا۔ ''جمیلہ تم ذرا اس کا خیال رکھنا، کوئی اس کے کمرے میں نہ جائے اور خاص کر تم یا ثمرین بالکل بھی کمرے میں قدم نہ رکھنا، میں جلدی سے دکان بند کرکے آجاؤں گا۔'' یہ بول کر سلامت دکان کے لئے گھر سے نکل گیا۔

دکان کے باہر کرسی ڈالے گردھاری لال بیٹھے تھے۔ سلامت ان کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''ہاں! گردھاری کاکا! اب آپ ذرا تفصیل بتائیں۔''

''بیٹا تفصیل یہ ہے، بس سمجھو کہ کرامت کی جان بچ گئی۔ اگر اسے میں آج نہیں لے جاتا تو آج کی رات اس پر بہت بھاری تھی، اس کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ اور ہم لوگ ہاتھ ملتے رہ جاتے، جس طرح تمہارا بھتیجا کمال ہم سے جدا ہوگیا۔

دشمن نے بہت کاری وار کیا ہے، یہ جادوئی ہانڈی کا وار ایسا ہوتا ہے کہ اس سے بچنا مشکل ہوتا ہے، آج رات کرامت کے ساتھ بھی ایسا ہی ہونا تھا۔'' گردھاری لال نے بتایا۔

''کاکا! آپ کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے، ہم تو اس کا اجر دے نہیں سکتے، اس کا اجر آپ کو اللہ ہی دے گا۔ میرا ذہن یہ سوچ سوچ کر بہت بے چین ہے کہ ہمارا یہ دشمن ہے کون؟ اور اسے ہم سے دشمنی کیا

ہے؟'' سلامت بولا۔

''بیٹا! فکر نہ کرو، عامل صاحب نے کہا ہے کہ ''دشمن اپنے انجام کو پہنچے گا، اور یہ ہانڈی بھیجنے والا بھی دوسروں کے لئے عبرت کا نشان بن جائے گا۔'' تم اپنے سارے معمولات کے کام کرتے رہو، اپنے دماغ سے سوچ فکر نکال دو، باقی باتیں جس طرح میں نے بتائی ہیں اس کے حساب سے کرامت کا دیکھ بھال کرتے رہو، اچھا اب میں چلتا ہوں، گھر والے میرا انتظار کررہے ہوں گے۔'' یہ بول کر گردھاری لال اپنے گھر چلے گئے۔

ادھر سلامت کی بیوی جمیلہ دل ہی دل میں بہت خوش تھی۔ اس کے دل میں خوشی کے لڈو پھوٹ رہے تھے۔ وہ اپنے کرائے ہوئے جانی نقصان کے عمل پر پھولے نہیں سمارہی تھی۔ وہ اپنی اماں کو دل ہی دل میں داد دے رہی تھی۔ واہ اماں تم نے تو کمال کردیا، اتنا زبردست عمل کرایا کہ چند روز میں ہی تباہی شروع ہوگئی، اب میں یہ دیکھوں گی کہ کرامت کا بچہ مجھ پر کیسے حکومت کرے گا، ہمارے راستے میں کیسے رکاوٹ کھڑی کرے گا، اس گھر پر میرا راج ہوگا، اس گھر کی میں مہارانی ہوں۔

میں کرامت، اس کی بیوی اور اس کے بچوں کو نیست ونابود کرادوں گی، نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری، بس ایک مرتبہ اور اماں کے پاس جانے کی دیر ہے۔ کرامت تو حال سے بے حال ہوہی رہا ہے، بس دو چار دن کا مہمان ہے، پھر اس گھر پر میری حکومت ہوگی، سلامت میری مٹھی میں ہوگا۔''

مگر شاید جمیلہ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ مارنے والا سے بچانے والا زیادہ طاقتور ہوتا ہے، وہ اپنے انجام سے بے خبر تھی کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

مغرب سے پہلے پہلے سلامت دکان بند کرکے آگیا، جمیلہ نے اسے دیکھا تو بھونچکی ہوکر رہ گئی، ''آج اتنی جلدی دکان کیوں بند کردی؟ کیا آپ بھی کرامت کے ساتھ مریض بنتے جارہے ہیں، کچھ آپ اپنا بھی سوچیں، آخر ہمارے بھی بچے ہیں، ہمارے بھی اپنے ارمان ہیں۔''

''جمیلہ! میں تمہیں کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں، روز بروز تمہاری سوچ منفی ہوتی جارہی ہے، لگتا ہے تمہارا دماغ زیادہ خراب ہونے لگا ہے۔ ان باتوں کا سوچنا تمہارا کام نہیں، میں اپنا اور اپنی فیملی کے لئے اچھا ہی سوچتا رہتا ہوں، جو تمہارا کام ہے جو تمہاری ذمہ داری ہے اس پر نظر رکھو! اگر دوسرے معاملات میں ٹانگ اڑاؤ گی تو نقصان میں رہوگی، ٹینشن کا شکار ہوجاؤ گی رات دن کا سکون برباد ہوکر رہ جائے گا، زیادہ سوچ فکر انسان کو ذہنی طور پر مفلوج کرکے رکھ دیتی ہے۔'' سلامت نے جمیلہ سے کہا۔

مغرب کی نماز پڑھ کر سلامت آیا اور ثمرین سے بولا۔ ''ثمرین کرامت کا کھانا نکال دو، میں اسے کھلا دوں۔''

ثمرین نے جلدی جلدی کھانا نکالا تو سلامت نے کھانا اٹھایا اور کرامت کے کمرے میں لے گیا۔ کھانا رکھ کر گھڑے کا ٹھنڈا پانی بھی لے گیا۔ کرامت کے پلنگ کے قریب میز پر کھانا رکھا تھا۔ ''کرامت اٹھو کھانا کھالو۔'' یہ بول کر سلامت قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

سلامت کی باتیں سن کر کرامت نے اپنی آنکھیں کھولیں اور سلامت کو بھرپور نظروں سے دیکھا اور پھر کھانے میں مصروف ہوگیا، بولا کچھ بھی نہیں۔ کھانا کھانے کے بعد کرامت نے چلچی میں ہاتھ دھویا اور پھر اپنے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔

سلامت نے برتن اٹھائے اور پانی کا جگ بھی لے کر کمرے سے باہر آگیا۔ اس کے بعد جمیلہ نے اس کا کھانا لگادیا تو وہ اپنے اور کرامت کے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگا، پورے گھر کا کھانا ایک ہی جگہ پکتا تھا۔

رات ہوئی۔ سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں سوگئے۔ کرامت اپنے کمرے میں اکیلا پڑا تھا۔ رات کے سوا بارہ بجے ہوں گے کہ ان کے گھر کی چھت کے اوپر چاروں طرف ایک عجیب وغریب مہیب، خوفناک، بھیانک اور ڈراؤنی آواز..... گوں ں ں..... سنائی دینے لگی۔

(جاری ہے)

مردہ پریڈ

احسان سحر-میانوالی

سمندر کے تھہ میں نوجوان کی نظر اچانک سامنے کو اٹھی تو وہ تھراکر رہ گیا اس کی عقل دنگ رہ گئی، وہ کپکپانے لگا اس پر دھشت طاری ہوگئی کیونکہ مردہ انسانوں کی ایک فوج پریڈ کرتی ہوئی آگے بڑھی۔

ایک عجیب وغریب پراسراریت سے لبریز کہانی جو پڑھنے والوں کو دہشت زدہ کردے گی

''وہ ایک آسیب زدہ خلیج ہے اور زندہ انسان وہاں ڈوب کر بھی نہیں مرتا اور مردہ انسان غرق ہونے کے بعد پھر زندہ ہوجاتا ہے۔'' اس نے اپنے کندھوں کو سکیڑتے ہوئے کہا۔ ''اگرچہ میں موت سے نہیں ڈرتا مگر جہاں زندگی اور موت میں فرق ہی نہ ہو تو.....؟ میرے دوست جب مجھے وہ خلیج یاد آتی ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، اور خوف ودہشت سے میری آنکھیں بند ہوجاتی ہیں۔'' اور پھر واقعی اس نے کسی انجانے خوف سے ایک جھرجھری سی لی اور پھر کہنے لگا۔ ''میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس خلیج کی تہہ میں یہ روح فرسا پریڈ دیکھی ہے، مگر یہ اتفاق ہی ہے کہ میں زندہ بچ نکلا جبکہ کئی غوطہ خور اس مردہ پریڈ کو دیکھنے کے بعد یا تو تہہ میں بیٹھ گئے یا پھر ہمیشہ کے لئے ہوش وحواس کھو بیٹھے۔''

میرے لبوں پر بے اختیار ہنسی آ گئی اور میں سوچنے لگا! یہ روسی غوطہ خور بھی کتنے بزدل ہوتے ہیں، یہ محض اس کا واہمہ ہے، ہوسکتا ہے خلیج کی تہہ میں کسی غوطہ خور نے دور کہیں دوسرے غوطہ خوروں کے گروپ کو دیکھا ہو اور ڈر گیا ہو اور اس واہمہ کی تخلیق کو لوگوں پر بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا ہو..... کئی ماہ بعد میری ملاقات بحیرہ آسور کے ایک روسی ملاح سے ہوئی میں نے باتوں باتوں میں اس سے اس واقعہ کا ذکر کیا اور روسی ملاح کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور پھر ایک لمبی سی آہ بھر کر کہنے لگا۔ ”ہاں روڈیسا کی خلیج کی بابت یہ سب کچھ میں نے بھی سنا تھا۔ مگر میں اس ملک سے جنگ ختم ہونے کے بعد جلد ہی چلا آیا تھا اور پھر جب دوبارہ وہاں جانے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ غائب ہو چکے ہیں۔ لیکن آپ یقین کریں کہ وہ غوطہ خور نہیں تھے بلکہ بہت سے غرق شدہ لوگ تھے جنہوں نے خلیج کی تہہ میں دلدل کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ ان کے چہرے نہایت خوفناک اور کریہہ المنظر تھے۔ وہ چیتھڑوں میں ملبوس ہر وقت پریڈ کرتے رہتے تھے۔ جب بھی کوئی غوطہ خور وہاں جا نکلتا وہ اس خوفناک پریڈ کو دیکھ کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ چنانچہ جلد ہی تمام غوطہ خوروں کو معلوم ہو گیا اور پھر کوئی بھی غوطہ خور اس طرف جانے کی کوشش نہ کرتا۔ کچھ عرصے بعد مجھے ایک ایسا شخص ملا جو ایک جنگ میں برٹش نیوی کے ساتھ رہا تھا۔ اور اسے روڈیسا جانے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ اگرچہ اس برطانوی ملاح کے بیان نے اس بھیانک اور مہیب در انسان پر کافی روشنی ڈالی مگر افسوس کہ مردوں کی پریڈ کی اصل حقیقت معلوم نہ ہو سکی۔ برطانوی ملاح نے بتایا کہ جب روس میں غدر کا دور دورہ تھا رومنوف تہ خانے میں قتل کیا جا چکا تھا اور کرنیکی گورنمنٹ تباہ ہو گئی تھی اس وقت روڈیسا میں سیاسی فریقین نے اقتدار حاصل کرنے کے لئے پورے شہر کو مقتل بنا دیا اور شہر میں ہر طرف لوٹ مچ گئی۔

اس شہر میں ایک ہسپتال بھی تھا۔ اور پھر جرمنی کے حملے کے بعد بالشیو فوج نے روڈیسا کے شہر پر مکمل قبضہ جما لیا تو شہر میں پھر قتل وغارت شروع ہو گیا..... وارضی صلح کے کچھ عرصہ بعد یک تباہ کن برطانوی جہاز بحیرہ اسود میں سے گزرا اور اس نے روڈیسا کی بندرگاہ میں رکنے کے لئے لنگر ڈالا۔ مگر لنگر کسی وجہ سے تہہ میں اٹک کر ٹوٹ گیا۔

چنانچہ جہاز کے کپتان نے ایک ایک غوطہ خور کو لنگر نکالنے کے لئے پانی میں اترنے کا حکم دیا۔ غوطہ خور بمشکل تہہ تک پہنچ ہی پایا تھا کہ اس نے باہر نکالے جانے کے لئے اندھا دھند سگنل دینا شروع کر دیا۔ وہ فون پر پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ جہاز کے عملے نے اسے جلد ہی باہر کھینچ لیا۔ ڈیک پر آنے کے بعد جب اس کے چہرے سے نقاب ہٹایا گیا تو وہ بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑا۔ اس کے چہرے کی زردی اور تنی ہوئی سانسیں بتا رہی تھی کہ کوئی ہولناک حادثہ پیش آیا ہے۔

جلد ہی اسے ساحل پر پہنچا دیا گیا اور روڈیسا کے ہسپتال داخل کرا دیا گیا..... جبکہ ڈاکٹروں کی لاکھ کوشش کے باوجود غوطہ خور ہوش میں نہ آ سکا۔ اور اسی حالت میں مر گیا..... ڈاکٹر غوطہ خور کی حالت کے بارے میں کچھ بھی نہ جان سکے۔ البتہ انہوں نے بھی روڈیسا کے متعلق وہی زبان عام کہانی سنا دی۔ زمانہ غدر کے لوگ اغوا شدہ لوگ اپنی جانیں بچا کر خلیج کی تہہ میں اتر چکے ہیں اور وہی انہوں نے اپنا مسکن بنا لیا ہے اور چانچہ غوطہ خور اپنی انہی لوگوں کو دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھتے ہیں اور مر جاتے ہیں.....

جہاز کے کپتان نے اس کہانی کو محض ایک واہمہ قرار دیا۔ برٹش نیوی کا ایک عدد جہاز لنگر انداز ہو چکا تھا اور اسے ہر حالت میں نکالنا تھا، کپتان نے ایک بار پھر حکم دیا کہ لنگر نکالنے کے لئے کسی دوسرے غوطہ خور کو بھیجا جائے۔ اس دفعہ جہاز کے سب سے بہادر غوطہ خور کو سمندر کی تہہ میں اتارا گیا..... خلیج روڈیسا کچھ زیادہ گہری نہیں ہے اور اس کی تہہ بھی صاف ہے اور کیچڑ وغیرہ بھی البتہ ساحل کے قریب ہی ایک کیمیکل فیکٹری ہے چنانچہ فیکٹریاں اپنی ناکارہ روئیں اور بیکار ٹن کے ٹکڑے خلیج کی تہہ میں پھینک دیا کرتی تھیں۔ اس لئے تہہ میں کافی ملبہ اکٹھا ہو گیا تھا اور غوطہ خور افسر لنگر کی تلاش میں ملبے کو اوپر

اوپر ٹٹولنے لگا۔

مگر اچانک اس کی نظر اوپر اٹھی اور اس کا رواں رواں کانپ گیا۔ مردہ انسانوں کی ایک فوج پریڈ کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

ان میں سے کچھ نے تو پھٹی ہوئی فوجی وردیاں پہن رکھی تھیں اور کچھ عام شہری لباس میں موجود تھے۔ آنکھیں مچھلیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اور ان کے ادھ کھلے منہ ایک بھیانک منظر پیش کر رہے تھے۔ وہ نہایت آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ اور پھر وہ ایک دم رک گئے اور انہوں نے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی بانہیں اوپر اور نیچے کرنا شروع کر دی۔ جیسے وہ کسی پراسرار قدم سے قدم ملا کر چل رہے ہوں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ افسر کو خوش آمدید کہہ رہے ہوں۔ ان میں سے چند ایک کی داڑھیاں پانی میں لہرا رہی تھیں۔ مگر زیادہ تر داڑھی منڈتے تھے۔ ان کے پھولے ہوئے اور مکروہ چہرے ورغدر چہرے دیکھ کر اب افسر پر خوف طاری ہونے لگا تھا۔ اور پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ لوگ ابھی اس پر ہلہ بول دیں گے، اور پھر جہاز کے ڈیک پر ایک پرزور شور سے الارم بجنا شروع ہو گیا۔ جہاز کے عملے نے جو پہلے ہی خطرے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ فوراً ہی افسر کو باہر کھینچ لیا۔ مگر غوطہ خور افسر بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس بار روڈیسا کے ہسپتال سے ڈاکٹروں کو پہلے ہی بلا لیا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے غوطہ خور کو جلدی ہوش آ گیا اور پھر اس نے اس لمحے اور لڑکھڑاتے ہوئے انداز میں جو کچھ دیکھا تھا بتا دیا، وہی روڈیسا کی پراسرار کہانی مردہ لوگوں کی پریڈ..... اب میرے دل میں اس بھیانک داستان کا راز معلوم کرنے کے لئے تجسس بڑھ چکا تھا۔ کیا وہ واقعی انسانی مردہ تھے۔ مردہ یا زندہ۔

آخر یہ سب کیا تھا.....؟ اور پھر جو روڈیسا والے نہ بتا سکے وہ آخر کار شکاگو نے معلوم کر لیا..... اتفاقاً ایک دفعہ ایک ریستوران میں ایک ڈاکٹر سے میری ملاقات ہوئی چائے پیتے ہوئے باتوں ہی باتوں میں غوطہ خوری کا صحت پر اثر کا موضوع چل نکلا۔

ایک مثال کا ذکر کرتے ہوئے جونہی ڈاکٹر نے

میک اپ کی اہمیت کیا ہے؟۔

جب میک اپ اچھا ہو تو حسن میں نکھار، دلکشی نظر آتی ہے اور پھر میک اپ کرنے میں ہر خواتین کا اپنا ہنر، سلیقہ اور نفاست بھی ظاہر ہوتا ہے۔

پیاری بہنیں! ایک بیوٹیشن ہونے کے ناطے، میں کہہ سکتی ہوں کہ میک اپ بھی ایک فن ہے۔ ہر کام میں ماہر ہونے کی لئے تربیت اور پریکٹس ضروری ہے اور بغیر کسی ماہر کے سہارے کے کسی بھی کام میں ماہر ہونا مشکل ہے اور میک اپ کے فن میں ماہر ہونے کے لئے پیاری بہنوں کے لئے یہ کتاب بڑی تگ و دو اور محنت شاقہ سے تیار کی گئی ہے۔ بڑی حد تک یہ کتاب خواتین کے لئے میک اپ میں معاون و مددگار ثابت ہوگی اس کتاب میں میک اپ کے علاوہ جلد کی حفاظت ہاتھ پیروں کی حفاظت، بناؤ سنگھار، اور جدید دور کی میک اپ کی اشیاء کے متعلق بھی اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ صحت مند رہنے کے راز بھی اس کتاب میں درج ہیں۔

صابری دارلکتب

قذافی مارکیٹ اردو بازار لاہور

روڈیسا کا لفظ منہ سے نکالا۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ بے اختیار میری سانس رک گئی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ میں لڑائی کے دوران روڈیسا کے ہسپتال میں تھا۔ ایک روز باغیوں نے ہسپتال پر ہلہ بول دیا۔ اور ہمارے ایک ساتھی ڈاکٹر سکولوف کو اغوا کر کے لے گئے بعد ازاں جب بالشویکی اقتدار میں آ گئے تو انہوں نے ڈاکٹر سکولوف کو ڈھونڈنے میں ہماری بہت مدد کی۔ مگر معلوم ہوا کہ باغیوں نے ڈاکٹر کو قتل کر کے سمندر میں پھینک دیا تھا۔ چنانچہ ہم نے غوطہ خوروں کو بلا کر ڈاکٹر کی لاش ڈھونڈنے کے لئے کافی انعام کا لالچ دیا۔ مگر اس کام میں کئی غوطہ خوروں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے، جو بھی غوطہ خور خلیج کی تہہ میں اترا باہر آنے کے بعد بے ہوشی کی حالت میں ہی مر گیا......اور یا ہمیشہ کے لئے حواس کھو بیٹھا......

کچھ عرصہ بعد اسی جگہ پر ایک برطانوی جہاز کا لنگر گر گیا۔ لنگر نکالنے کے لئے یکے بعد دیگرے دو غوطہ خوروں کو بھیجا گیا، پہلا غوطہ خور تو باہر آتے ہی بے ہوشی کی حالت میں ہی مر گیا۔ مگر دوسرے غوطہ خور کو کسی ڈاکٹروں نے بچا لیا۔ پھر اس نے عجیب اور خوفناک کہانی سنائی۔ سمندر کی تہہ میں مردہ انسانوں کی ایک رجمنٹ پریڈ کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مگر کیا واقعی سمندر کی تہہ میں مردہ لوگ پریڈ کر رہے تھے۔

میں نے ڈاکٹر کو ٹوکا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ایسا نہ تو ہو سکتا ہے اور نہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر نے ایک لمبی سی آہ بھر کہا۔ دراصل باغیوں نے غدر کے دوران میں شہر کے معزز لوگوں کو پکڑ پکڑ کر جیل خانوں میں ڈالنا شروع کر رہا تھا، اور ان کی ٹانگوں کو ایک ساتھ زنجیروں کے ساتھ باندھنے کے بعد ہر ایک کے ٹخنوں کے ساتھ نہایت وزنی لوہے باندھ دیتے تھے۔ تا کہ وہ کسی بھی صورت بھاگ نہ سکیں، مگر جب باغیوں کو معلوم ہوا کہ بہت جلد بالشویکی پہنچ رہے ہیں تو انہوں نے تمام قیدیوں کو گولی مار دی، اور سب کو باندھی ہوئی حالت میں سمندر میں پھنکوا دیا۔ تا کہ بالشویکی کو باغیوں کا کسی طور پر پتہ نہ چل سکے۔

چنانچہ یہی وہ مردہ لوگ تھے جو غوطہ خوروں کی ہلاکت کا موجب بنے۔ لیکن ڈاکٹر وہ سب تو کھڑے تھے اور پریڈ بھی کر رہے تھے۔ یہ آخر کیسے میں نے ایک بار پھر ڈاکٹر کو ٹوکا...... ہاں آپ سچ کہتے ہیں وہ سب کھڑے ہی تھے۔ ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا۔ کیونکہ ان کے پاؤں کے ساتھ بھاری وزنی دار لوہے بندھے ہوتے تھے۔ اس لئے خلیج میں گرنے کے بعد ان کے پاؤں سیدھے تہہ پر جا لگے اور تہہ کے میلے میں دھنس گئے تھے۔ اور چونکہ وہاں پانی بھی زیادہ گہرا نہیں تھا اس لئے سطح آب پر اٹھنے والی لہروں کو اثر ان تک پہنچ جاتا تھا۔ اور پانی ارتعاش سے لاشیں ہلتی رہتی تھیں اور چونکہ وہ سب اکھٹے ہی زنجیر سے بندھے ہوتے تھے اس لئے وہ سب ایک ہی وقت میں اکٹھے ساتھ ہلتے تھے۔ اور بعض اوقات جب سطح پر زیادہ تیز لہریں اٹھتی تھیں اور ان کی وجہ سے ان کے ہاتھ بھی اوپر نیچے حرکت کرنے لگ جاتے تھے...... رہا یہ سوال کہ آخر ان کی لاشیں اتنی دیر تک گل سڑ کر ختم کیوں نہ ہو گئی...... تو شاید آپ نہیں جانتے کہ ساحل سمندر پر ایک بہت بڑی کیمیکل کی فیکٹری تھی جو اپنے ناکارہ اور فالتو کیمیکل سمندر میں پھینک دیا کرتی تھی چونکہ وہاں سمندر پر پانی میں ان روایات کا کافی اثر ہو چکا تھا اس لئے ان کے اثر کی وجہ سے یہ لاشیں گلنے سڑنے سے محفوظ رہیں...... ہاں مگر تھوڑی بہت پھول ضرور لگتی تھیں اور پھر ہم نے وہ تمام لاشیں بعد ازاں نکال لی تھیں۔ البتہ غوطہ خور ڈر اور خوف کے مارے جل کیسے۔ وہ نا جانے کیوں اصل حالت شناخت نہ کر سکے۔ حالانکہ وہ سب بہادر اور خطرات کا مقابلہ کرنے والے تھے۔ شاید ان کے خون میں رڈرنلین کی زیادتی ہو گئی تھی، جبکہ پہلے پانی ہی کی وجہ سے، ہاتھ کی وجہ سے۔ نائٹروجن ان کے خون میں مل چکی تھی......اور اسی رڈرنلین کی وجہ سے ان کی موت واقع ہو گئی......

”یوں اس پراسرار مردہ پریڈ کا معما ایک عرصے کے بعد حل ہو گیا۔“

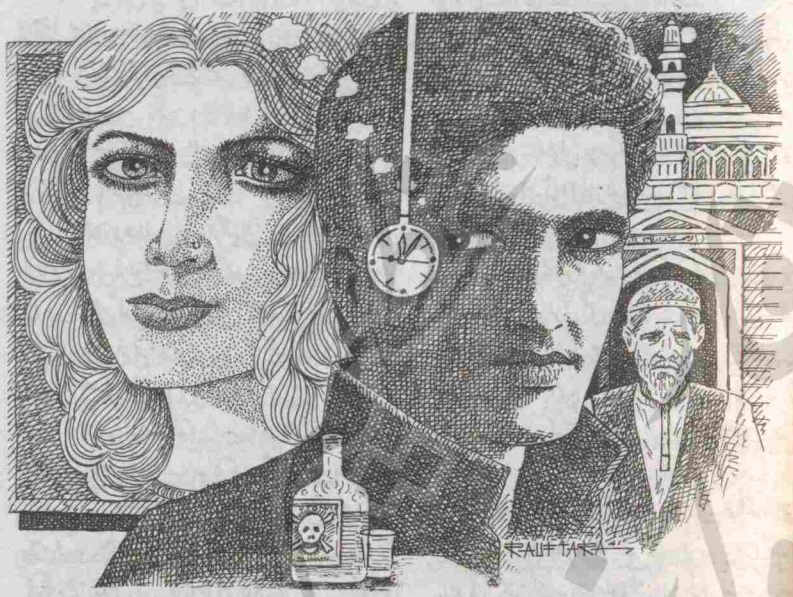

سرکش روح

افشاں رمضان-سرگودھا

اچانک کمرے میں دھواں اٹھنا شروع ہوا، پھر اس دھوئیں میں نیچے کی طرف دو خوبصورت پائوں نظر آئے اور پھر آہستہ آہستہ دھوئیں میں کسی نازنین کا وجود نظر آنے لگا کہ پھر اچانک ایک خوفناک منظر۔

رگوں میں لہو منجمد کرتی اور اچنبھے میں ڈالتی اور دل کو لرزہ براندام کرتی ڈراؤنی کہانی

”**کیا؟**“ ہاشم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”مجھے خود بہت حیرت ہو رہی ہے، ابھی کل ہی تو سونیا سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بالکل ٹھیک تھی۔“ چاندنی حیرت سے بولی۔

”آئی کانٹ بلیو دس۔“ ہاشم کو ابھی بھی سونیا کی اچانک موت کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہمیں خود کو سیٹ کرنا ہو گا ہاشم۔ اور فوراً وہاں چلنا ہو گا ورنہ فریدہ آنٹی بہت برا مانیں گی۔“ چاندنی نے الماری سے سیاہ چادر نکالی۔ جبکہ ہاشم، الماری سے شلوار سوٹ لے کر چینج کرنے کی غرض سے واش روم میں گھس گیا۔

شومئی قسمت کہ فریدہ آنٹی کے گھر پہنچنے سے قبل ہی دونوں ٹریفک میں بری طرح پھنس گئے۔ لگتا تھا، سارا شہر آج سڑکوں پر امنڈ آیا ہے۔

"پتہ نہیں یہ سگنل کب آن ہوگا؟" چاندنی کو ٹریفک بلاک پر سخت غصہ آرہا تھا۔

"بیک ٹرن لے لیں گاڑی کا؟" ہاشم نے رائے چاہی۔

"میں سمجھی نہیں۔" چاندنی نے اپنی کمان سی سیاہ ابرو اچکا کر ہاشم کی طرف دیکھا۔

"میرا مطلب ہے، گلیوں سے چلتے ہیں جس طرف تمہاری فرینڈ عروج کا گھر ہے۔ اس طرف سیٹھ صاحب کا بھی گھر ہے، جن کی بیٹی سنبل کے بی۔ اے میں ٹاپ کرنے کی خبر تم اخبار میں پڑھ کر مجھے سنا رہی تھیں۔" ہاشم نے تفصیل سے چاندنی کو راستہ سمجھایا۔

"اوہ اچھا! تو ٹھیک ہے، موڑو گاڑی۔ چاندنی نے فرنٹ اسکرین سے باہر دیکھا۔ گلیوں کا راستہ تھوڑا دشوار تھا مگر ریڈ سگنل پر رکے رہنے سے کہیں بہتر تھا کہ ہولے ہولے ہی سہی پر آگے بڑھا جائے۔ فریدہ آنٹی کی گلی میں داخل ہوتے ہی انہیں ایک بار پھر سے گاڑی کو بریک لگانا پڑے کیونکہ لوگوں کا جم غفیر جنازہ اٹھانے کے لئے گلی میں جمع تھا۔ انہیں شاید بہت دیر ہوگئی تھی۔ ہاشم نے ایک طرف گاڑی کھڑی کی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ چاندنی بھی اس کی ہم نوائی میں باہر کھڑی ہوگئی۔

ہاشم تیز قدموں سے جنازہ کی طرف بڑھا کیونکہ جنازہ اٹھانے کی لوگ تیاری کررہے تھے۔ کلمہ طیبہ سے نقش شدہ سبز چادر میں لپٹا ہوا وہ وجود سونیا کا تھا۔ جسے اٹھا کر لوگ آگے کو بڑھنے لگے اور ہاشم فوراً تیر کی طرح اپنی جگہ سے پلٹا اور اپنی گاڑی کے پاس آکر اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور واپس ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا ہاشم؟ آر یو آل رائٹ؟" چاندنی نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہی پوچھا۔

جواباً ہاشم نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام رکھا تھا اور دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔

"کیا ہوا ہاشم؟ مجھے بتاتے کیوں نہیں؟" چاندنی نے اس کے لرزتے ہاتھ تھامے۔

"کچھ نہیں! آئی ایم فائن۔" ہاشم نے پانی کی بوتل سے دو تین گھونٹ بھرے اور گاڑی آگے لے جاکر فریدہ آنٹی کے گھر کے سامنے روک دی۔

وہاں ماحول پر سوگواریت کا عالم طاری تھا۔ عورتوں کے بین کی آوازیں ابھی مدھم نہیں ہوئی تھیں۔ فریدہ آنٹی غم سے نڈھال تھیں۔

"بھلی چنگی تھی میری سونیا، تم لوگوں کے ساتھ کتنی خوش باش لوٹی تھی پکنک سے وہ۔" فریدہ آنٹی چاندنی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"پتہ نہیں آنٹی! اچانک اسے کیا ہوگیا۔" چاندنی کی آنکھیں بھی ڈبڈبانے لگیں۔

☆.....☆.....☆

آج موسم دوپہر ہی سے بہت خوشگوار تھا۔ رات کے نو بج چکے تھے۔ گھر جاتے ہوئے ہاشم نے چاندنی کے لئے سوہن حلوہ خریدا۔ جو اسے بہت پسند تھا۔ گھر پہنچ کر گاڑی جونہی گیراج میں کھڑی کی تو اس کی نظر خود بخود لان کی طرف اٹھ گئی۔ لان میں لگے رنگ برنگ کے پودے ہوا میں جھوم رہے تھے۔ چاند کی چودھویں رات تھی۔ لہٰذا چاند کی روشنی میں پورا لان نہایا ہوا تھا۔

ہاشم نے گاڑی سے سوہن حلوے کا ڈبہ نکالا اور لان کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ جہاں چاندنی اپنی دھن میں مگن لان میں موجود جھولے پر جھولا جھول رہی تھی۔ اس کا آسمانی رنگ کا دوپٹا ہوا کے دوش پر بل کھا رہا تھا۔ سیاہ دراز زلفوں کو پونی میں اچھی طرح قید کیا گیا تھا اس کے باوجود کچھ لٹیں، اڑ اڑ کر اس کے کندھوں پر سرکشی کررہی تھیں۔ ہاشم جھولے کے پاس آکر رک گیا۔ کچھ دیر وہ یونہی مبہوت کھڑا چاندنی کو دیکھتا رہا۔ دودھ جیسی شفاف رنگت پر ہلکا آسمانی جوڑا پہنے وہ کسی اور دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ ساکن کھڑے ہاشم پر اس کی نظر پڑی تو پیر زمین پر ٹکا کر جھولا روکا۔

"کیا ہوا؟" "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" چاندنی

کی شیریں آواز نے سکوت توڑا۔

"20 جنوری! ہیپی برتھ ڈے چاندنی۔" سوہن حلوے کا ڈبہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہاشم وہیں جھولے کے عین سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

"اوہ..... تو تمہیں یاد تھا۔" چاندنی نے دلکش مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے ڈبہ ہاتھ میں پکڑا۔

"یاد کیسے نہ ہوتا؟ جنوری کا مہینہ میرے لئے بہت اہم ہے۔ 15 جنوری کو میں پیدا ہوا۔ 20 جنوری تمہارا ڈے آف برتھ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ 26 جنوری کو یہ پری چہرہ لڑکی، جسے لوگ "چاندنی" کے نام سے جانتے ہیں، میری زندگی میں آکر میری ہم سفر بن گئی۔ پھر جنوری ہو اناں اہم؟ ہاشم اب اٹھ کر اس کے ساتھ ہی جھولے پر بیٹھ چکا تھا۔

"جنوری مجھے بھی بہت پسند ہے ہاشم، میرے لئے بھی یہ ماہ بہت اہم ہے۔ کچھ حساب چکانے ہیں اس ماہ میں۔" اس نے معنی خیز نظروں سے ہاشم کو دیکھا پھر ہاشم کو حیران ہوتا دیکھ کر اس نے فوراً بات بدلی۔ "پتہ ہے ہاشم! آج میں نے اپنے ہاتھوں سے ایلمنڈ کیک بنایا ہے۔ کچن میں رکھا ہے۔ جاؤ یہیں لے آؤ۔ آج میں لان میں کیک کاٹوں گی۔" چاندنی نے لہجے کو خوشگوار بنا کر بولا۔

"جو حکم ملکہ عالیہ! آج کا دن آپ کا دن ہے لہٰذا آپ کے ہر حکم کی تعمیل کی جائے گی۔" ہاشم دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر مودبانہ انداز میں جھکا۔ جھکنے کی وجہ سے موبائل اس کی جیب سے نکل کر زمین پر گر پڑا۔ جونہی ہاشم موبائل اٹھانے کے لئے نیچے جھکا تو دنگ رہ گیا۔ چاندنی نے گولڈن کلر کی صرف ایک پائل پہن رکھی تھی۔ حالانکہ وہ تو ہمیشہ دونوں پیروں میں پائل پہنا کرتی تھی۔

ہاشم نے نظر اٹھا کر اوپر چاندنی کی طرف دیکھا۔ دور افق پر موجود چاند پر نظریں جمائے وہ چاندنی میں کھوئی ہوئی تھی۔ کندھے اچکا کر ہاشم نے اپنے خیالات کو جھٹکا اور موبائل ہاتھ میں تھامے کچن کی طرف بڑھ گیا۔

"آج لگتا ہے میں ہواؤں میں ہوں۔ آج اتنی خوشی ملی ہے۔" کچن سے آتی گنگنانے کی آواز پر ہاشم کے پیر ٹھٹکے۔ چاندنی گانا گنگنا رہی تھی۔ پر چاندنی سے تو وہ ابھی لان میں مل کر آرہا تھا۔ ہمت جمع کرکے وہ کچن کے اندر داخل ہوا۔

اپنے لمبے بالوں کو کیچر میں قید کئے۔ ایپرن باندھے وہ رات کا کھانا بنا رہی تھی۔ "آگئے تم؟ آج میں کچھ خاص بنا رہی ہوں۔ گیس کرو؟" اس نے استفسار کیا۔ چاندنی کو یوں اچانک اپنے سامنے پاکر ہاشم کو کچھ سمجھ نہ آرہا تھا۔ اگر یہ اس کی شریک حیات چاندنی تھی تو وہاں لان میں کون تھی؟

وہ تیزی سے کچن میں لگی گلاس ونڈوز کی طرف بڑھ گیا، جو لان کی طرف کھلتی تھیں۔ پورا لان ویران پڑا تھا۔ ہوا اب بند ہوچکی تھی۔ تاہم جھولا ابھی بھی ہل رہا تھا جیسے ابھی کوئی اس پر سے اٹھ کر گیا ہو۔ تاہم سوہن حلوے کا ڈبہ ہلتے ہوئے جھولے پر جوں کا توں پڑا تھا۔

حیرت سے پھٹی آنکھوں کے ساتھ ہاشم ابھی یہ دیکھ ہی رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ فوراً مڑا۔

"تم ٹھیک تو ہو ہاشم؟" چاندنی پریشان کھڑی تھی۔ اس نے اورنج کلر کا ڈریس پہن رکھا تھا۔ جس پر سلور کلر کی لیس سے خوبصورت کام کیا گیا تھا۔ ایپرن باندھنے کے باوجود جگر جگر کرتی لیس واضح نظر آرہی تھی۔ ہاشم بے یقینی سے کبھی باہر ہلتے ہوئے جھولے کو، جس کے اوپر سوہن حلوے کا ڈبہ پڑا تھا اور کبھی اپنے سامنے کھڑی چاندنی کو دیکھتا۔ "یہ اسکائی بلیو کپڑے اچانک اورنج کیسے ہوگئے؟ ایک ہی وقت میں چاندنی لان اور کچن میں کیسے ہوسکتی ہے؟ وہ چاندنی تھی بھی یا نہیں؟" سوچ سوچ کر ہاشم کا دماغ پھٹا جارہا تھا۔

"تم ٹھیک نہیں ہو شاید۔ چلو میرے ساتھ۔" چاندنی اس کا بازو تھامے اسے کچن سے باہر لے کر

جانے لگی۔

چاندنی کی ہم راہی میں چلتے ہوئے کچن سے باہر نکلنے سے قبل ہاشم نے پھر مڑ کر پیچھے گلاس ونڈو کی طرف دیکھا جہاں لان میں رکھا ہلتا ہوا خالی جھولا صاف نظر آرہا تھا۔

مگر یہ دیکھ کر ہاشم کے باہر کی طرف بڑھتے قدم مزید لڑکھڑا گئے، جب اس نے جھولے پر ایک بار پھر چاندنی کو بیٹھے دیکھا۔ اب اس کے بال پونی کے بجائے مکمل طور پر کھلے ہوئے تھے۔ جو ہوا کے دوش پر بے قابو ہو رہے تھے اور ان سیاہ بالوں کی اوٹ سے چاندنی کا دلکش چہرہ غضب ڈھا رہا تھا..... ہاشم خود کو سنبھال نہ سکا اور ہوش کی دنیا سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

"چاندنی تمہیں ایک بات بتاؤں؟ یاد ہے اس دن سونیا کی میت کے پاس میں ایکدم کچھ غیر حاضر سا ہوگیا تھا۔" ہاشم چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے ہوئے کچن میں آ گیا جہاں چاندنی اچار گوشت بنانے میں مصروف تھی۔

"دو ہزار دفعہ تو پوچھ چکی ہوں میں۔ تم بتاؤ! تب ناں۔" چاندنی نے ٹماٹر کاٹ کر سائیڈ پر رکھے اور سنک میں ہاتھ دھونے لگی۔

"جب سونیا کا جنازہ میرے سامنے تھا تو میرے دل میں آیا کہ کاش! میں اس کا دیدار کرسکتا تو اچانک دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا کہ کفن میں ملبوس سونیا کے چہرے پر سے چادر ہلکی سی کھسکی اور سونیا ایک آنکھ کھولے مسلسل مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا۔ لوگ میت اٹھا کر آگے بڑھ چکے تھے۔ سونیا کا اچانک آنکھ کھول کر مجھے دیکھنا اور اس کے بعد سے پیش آنے والے عجیب وغریب واقعات....." ہاشم کچن میں شیلف پر بیٹھ گیا تھا۔ انہماک سے ہاتھ دھوتی چاندنی اچانک رک گئی تھی۔

"سچ بتاؤں ہاشم! مجھے کچھ دنوں سے عجیب سا محسوس ہونے لگا ہے یعنی گھر میں کسی تیسرے وجود کا احساس ہونے لگا ہے۔ کوئی ہے..... جو ہم دونوں کے علاوہ اس گھر میں ہے۔" چاندنی کے سرخ وسفید چہرے پر تفکر کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔

"فی الحال تو سالن کی جلتی ہوئی بو ہمارے گھر میں ہے۔" اچار گوشت کے جلنے کی ہلکی سی مہک محسوس کرکے ہاشم نے چاندنی کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔ جس پر وہ ایکدم ہنڈیا کی طرف متوجہ ہوئی۔ جبکہ ہاشم باہر ٹی وی لاؤنج سے آتی فون کی آواز پر شیلف سے اتر کر سیدھا لاؤنج کی جانب بڑھ گیا۔

اچار گوشت زیادہ نہیں جلا تھا۔ بس تھوڑا سا لگ گیا تھا۔ چاندنی نے جلدی سے فریج کھول کر دودھ نکالا اور تھوڑا سا سالن میں ڈال دیا۔ یوں جلنے کی وجہ مہک فوراً ختم ہوچکی تھی۔ اس اثناء میں ہاشم دوبارہ کچن میں داخل ہوا۔

"صباء کا فون تھا، نیویارک سے، آج شام کی فلائٹ سے پاکستان آرہی ہے۔" ہاشم نے ایک سرخ سیب اٹھا کر کھاتے ہوئے کہا۔

اچھا تو! نند صاحبہ آرہی ہیں، پھر تو بہت مزا آئے گا۔" چاندنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم کھانا تیار کرلو۔ اتنے میں، میں مارکیٹ سے کچھ ضروری سامان لے آتا ہوں۔ راستے میں ائیر پورٹ سے بھی ہوتا آؤں گا۔" ہاشم نے خوشی بھرے لہجے میں کہا اور باہر چل دیا۔

پکوڑے بنا کر چاندنی نے فریج سے دہی نکالا اور کڑھی چاول کی تیاری کرنے لگی۔ کیونکہ کڑھی چاول صباء کی فیورٹ ڈش تھی۔

شام کے سات بج چکے تھے۔ ہاشم کا میسج آیا کہ وہ ائیر پورٹ سے صباء کو لے کر گھر کے لئے چل پڑا ہے۔ تاہم ابھی ان کے پہنچنے میں کچھ دیر باقی تھی۔

کوکنگ سے فارغ ہوکر چاندنی سیدھا اپنے کمرے میں آئی اور وارڈ روب سے کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گئی۔ نہانے سے فارغ ہوکر وہ شیشے کے سامنے کھڑی اپنی گیلی دراز زلفوں کو تولیے سے خشک

کر رہی تھی کہ اچانک اسے اپنے پیچھے دھوئیں کا مرغولہ سا اٹھتا محسوس ہوا۔ گھبرا کر اس نے مڑ کر دیکھا تو کمرے کے عین وسط میں دھواں اکٹھا ہو رہا تھا۔ چاندنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ منظر دیکھ رہی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دھواں چھٹنا شروع ہوگیا۔ دھواں نیچے کی طرف سے چھٹنا شروع ہو رہا تھا۔ جوں جوں دھواں چھٹ رہا تھا۔ کوئی وجود متواتر ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ کسی نازک سی لڑکی کے دو پاؤں تھے۔ جن میں سے ایک پیر میں اس نے پائل باندھ رکھی تھی۔ اب کسی کے لمبے لہراتے بال بھی واضح ہونے لگے تھے۔ مگر اس سے پہلے کہ چاندنی وہ مکمل عکس دیکھ پاتی۔ ڈور بیل تیزی سے بجنا شروع ہوگئی اور سارا منظر آناً فاناً غائب ہوگیا۔

دروازہ کھولنے پر ہاشم بڑا سا بیگ دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ہی صباء تھی۔ نیلی جینز پر وائٹ کلر کی لانگ شرٹ پہنے، نیلے سن گلاسز لگائے اور ملٹی کلر کا اسکارف اوڑھے وہ نیویارک اور پاکستان کا حسین امتزاج لگ رہی تھی۔ چاندنی نے کچھ دیر قبل پیش آنے والے واقعے کا ذکر تک نہ کیا۔ مبادا کہ ماحول کی خوشگواریت پر اثر نہ پڑے۔ "واہ..... میری فیورٹ کھیر اور کڑھی....." صباء نے خوشی سے جیسے چلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب اتنا مت چلاؤ۔ کیا کھیر اور کڑھی ڈائنگ ٹیبل سے اٹھ کر بھاگ جائیں گی؟" چاندنی نے کڑھی کا ڈونگا صباء کی طرف بڑھایا۔ ان دونوں کی آپس میں بہت بنتی تھی۔ کھانے سے فارغ ہوکر چاندنی برتن سمیٹنے لگی۔ ہاشم نے بھی ہلکے پھلکے انداز میں اس کی مدد شروع کردی۔ وہ اپنی معصوم بیوی کو کبھی بھی مشکل میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چاہے وہ مشکل کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو۔

سفر کی وجہ سے صباء تھک چکی تھی۔ لہٰذا وہ ان کی مدد کے بناء سیدھی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اور لیپ ٹاپ سنبھال کر نرم مخملی بیڈ میں دھنس گئی۔ اس کی سفید مخروطی انگلیاں مہارت سے لیپ ٹاپ پر حرکت کر رہی تھیں۔ شاید وہ گوگل پر کوئی چیز سرچ کر رہی تھی۔

رات بہت گہری ہوچکی تھی۔ گیدڑوں کی آوازیں فضا میں ارتعاش سا پیدا کر رہی تھیں۔ چاند اور بادلوں کی آنکھ مچولی جاری تھی۔ چاندنی بے خبر سوئی پڑی تھی کہ اچانک کسی خواب کی وجہ سے گھبرا کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑے جگ میں سے پانی گلاس میں انڈیلا۔ ابھی وہ پانی پی ہی رہی تھی کہ یکا یک اسے کمرے میں سے چھن چھن کی آواز آنے لگی مگر وہ آواز کی سمت کا تعین نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ کسی پازیب کی آواز لگ رہی تھی جو متواتر تیز ہو رہی تھی۔ چاندنی کے جگانے پر ہاشم بھی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ چھن چھن کی آواز اب بھی ان کی سماعت میں مکمل طور پر آ رہی تھی۔

"میں دیکھتا ہوں۔" ہاشم نے پیر نیچے اتار کر سلیپر پہنے۔

"نہیں ہاشم! تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ میں بھی چلوں گی تمہارے ساتھ۔" چاندنی نے اس کے بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ جبکہ ہاشم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اپنے کمرے سے نکل کر وہ دونوں آواز کی سمت میں کوریڈور کی جانب بڑھے، کوریڈور کا ماحول مزید پراسرار لگ رہا تھا۔ ہاشم ابھی اردگرد نگاہ دوڑا ہی رہا تھا کہ اس کی نظر نیچے کی طرف جاتی سیڑھیوں پر پڑی۔ وہاں کوئی وجود تھا جس نے سفید لہنگا پہن رکھا تھا۔ وہ شاید کوئی لڑکی تھی۔ جس کی ان کی طرف پشت تھی۔ اس کے بال گھٹنوں تک آ رہے تھے اور وہ دھیرے دھیرے سے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ ہاشم نے پنجوں کے بل کھڑے ہوکر اس لڑکی کے پیروں کی سمت دیکھنے کی کوشش کی۔

اس نے لہنگا دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھایا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے پیر ہاشم آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے ایک پائل پہن رکھی تھی اور چھن چھن کی آواز اسی پائل میں سے آ رہی تھی۔

اوپر ریلنگ پر کھڑے چاندنی اور ہاشم با آسانی دیکھ سکتے تھے کہ اب اس پراسرار لڑکی کا رخ سیڑھیاں اتر

کر صباء کے کمرے کی جانب تھا۔ دونوں ہاتھوں سے لہنگا تھامے، چھن چھن کرتی وہ صباء کے کمرے کی طرف مسلسل بڑھے جارہی تھی۔ چاندنی کے منہ سے ایک بلند چیخ نکلنے کو ہی تھی کہ اچانک کسی نے پیچھے سے اس کے کھلے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ چہرہ موڑ کر دیکھا تو وہ ہاشم تھا جو ہونٹوں پر انگلی رکھے اسے نہ بولنے کا اشارہ کررہا تھا۔

صباء کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر وہ لڑکی تحلیل ہونا شروع ہوگئی۔ غالباً وہ کمرے کے اندر داخل ہورہی تھی۔

"ہاشم..... وہ لڑکی صباء کے کمرے....."

"چاندنی نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا..... چاندنی کی حالت بہت غیر ہورہی تھی۔

"تم خود کو سنبھالو چاندنی اور یہیں اوپر سے صباء کے کمرے کا بیرونی جائزہ لیتی رہو۔ میں ابھی آیا۔ یو ڈونٹ وری او کے؟" ہاشم نے چاندنی کی پیشانی پر موجود پسینے سے بھیگے بالوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا نیچے اتر گیا۔

صباء کے کمرے میں داخل ہوکر اس لڑکی کی چال کچھ بدل گئی تھی۔ لہنگے کو ہاتھوں کی مدد سے تھوڑا اوپر اٹھائے ہوئے، وہ جھکی جھکی سی حالت میں بیڈ پر لیٹی صباء کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جھکنے کی وجہ سے اس کے گھٹنوں تک لہراتے بال بکھر کر اس کے پورے وجود کا احاطہ کررہے تھے۔

دنیا جہاں کی معصومیت چہرے پر سجائے صباء بے خبر سو رہی تھی۔

بیڈ کے قریب پہنچ کر وہ لڑکی جھکی ہوئی حالت میں ہی کچھ دیر تک صباء کو گھورتی رہی۔ معاً اس نے اپنی انگلی اٹھائی جو جگہ جگہ سے کٹی پھٹی تھی، اپنی انگلی اٹھا کر اس نے صباء کے گلابی پنکھڑی نما ہونٹوں پر پھیرنا شروع کردی۔

صباء کے گلابی ہونٹوں کی ایک جہاں تعریف کرتا تھا اور اس پر صباء کی حسین مسکراہٹ ایک طلسم برپا کرتی تھی۔ نیویارک کی ہاورڈ یونیورسٹی میں، جس میں وہ زیر تعلیم تھی۔ اس کی مسکراہٹ کو "مونالیزا" کی مسکراہٹ سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ کچھ چلبلی لڑکیوں نے تو اس کا نام "صباء مونالیزا" تک رکھ دیا تھا۔ اور اب اس کے حسین ہونٹوں کا یہ حال تھا کہ جوں جوں وہ بھیانک لڑکی اس کے لبوں پر انگلی پھیرتی جارہی تھی۔ اب صباء کے ہونٹوں سے ہلکا ہلکا سا خون رسنا شروع ہوچکا تھا۔ تکلیف کے احساس سے جونہی اس نے آنکھیں نیم وا کیں تو فلک شگاف چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سفید رنگت ایکدم زردی مائل ہوگئی تھی۔

ہاشم نے صباء کے کمرے کی ڈور ناب گھما کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔

دروازہ نہ کھلنے پر وہ دو چار قدم پیچھے ہٹا اور پوری قوت سے اپنا کندھا دروازے پر دے مارا۔ چرچراہٹ کے ساتھ ہی ڈور کھلتا چلا گیا۔ اوپر ریلنگ پر کھڑی چاندنی نے جونہی دروازہ اوپن ہوتا دیکھا تو تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے کی طرف آنے لگی۔

اندر کمرے میں ایک طلاطم برپا تھا۔ ساری چیزیں اپنی جگہ سے ہٹ کر ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ اور صباء نیم بے ہوشی کی حالت میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ تاہم ایک بات اہم تھی۔ کمرے میں صباء کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

صباء کے سفید دمکتے چہرے پر جا بجا خون کی بوندیں تھیں اور اس کے لبوں سے رستا ہوا خون سرخ لپ اسٹک کا گمان دے رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

"مجھے تو آج بھی اس رات کا یقین نہیں آتا۔ کوئی اور مخلوق اس حد تک ہمارے معاملات میں انٹرفیئر کرسکتی ہے؟ آئی کانٹ بلیو دس۔ بٹ تھینک گاڈ کہ اس کے بعد کوئی اور واقعہ نہیں ہوا اور میں نے اتنے دن یہاں آرام سے stay کرلیا۔" صباء نے بلیک سن گلاسز آنکھوں پر جماتے ہوئے کہا۔ ہاشم اور چاندنی سے اسے الوداع کرنے کے لئے ائیر پورٹ پر کھڑے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد اعلانات شروع ہوگئے اور صباء کو بورڈنگ کارڈ مل گیا۔

"شکر ہے کہ صباء خیریت سے واپس چلی گئی۔ مجھے اس کی بہت فکر تھی کہ کہیں ہمارے گھر میں چلنے والے اس خوفناک گھن چکر کے چکر میں وہ نہ آجائے۔" ائیر پورٹ سے واپسی پر چاندنی نے کہا۔

"یونو چاندنی؟ ان تمام واقعات کا تعلق صرف ایک ہی بندے سے ہے کیونکہ ہر بار کے منظر میں وہ لڑکی صرف ایک ہی پائل پہنی ہوتی ہے۔ وہ پائل ہمیں بتاتی ہے کہ وہ جو کوئی بھی ہے۔ صرف ایک ہی لڑکی ہے۔" ہاشم نے اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے کہا۔ اور گاڑی اپنے گھر کی طرف جانے والے روڈ پر ڈال دی۔

شام کے دھندلکے آہستہ آہستہ پھیل رہے تھے۔ ہاشم ریموٹ ہاتھ میں پکڑے، بیڈ پر نیم دراز کوئی انگلش چینل دیکھ رہا تھا۔ اور چاندنی کچن میں اس کی فیورٹ ڈش "بھنڈی گوشت" بنا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد چاندنی کی آواز سنائی دی۔ "میز پر کھانا رکھ دیا ہے۔ باہر آجاؤ۔"

"چاندنی! موڈی بہت زبردست جارہی ہے، میں نہیں اٹھنے والا..... تم کھانا یہیں لے آؤ۔" ہاشم نے حکم صادر کیا اور چاندنی دانت بھینچ کر رہ گئی۔

"مائی ڈیئر وائف چاندنی! جب غصے میں اتنی حسین لگو گی تو غصہ بار بار دلانے کو جی چاہے گا نا ں....." ہاشم نے مسکراتے ہوئے ریموٹ ایک طرف پھینکا۔ اور تیزی سے کھانے کی طرف لپکا۔

کھانے سے فارغ ہوکر چاندنی ابھی برتن سمیٹ ہی رہی تھی کہ چھن چھن کی آواز ایک بار پھر سنائی دی،..... ہاشم نے متلاشی نگاہوں سے اطراف میں دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ کیونکہ کارپٹ پر ایک پاؤں تیزی سے اچھل کود کررہا تھا۔ اس کے ٹخنوں کے اوپر گولڈن کلر کی پائل بندھی ہوئی تھی۔ حیرت ناک بات یہ تھی کہ پاؤں کے اوپر کا سارا وجود مکمل طور پر غائب تھا اور وہ تیزی سے کمرے کے چاروں کونوں میں اچھلتا پھر رہا تھا۔

"باہر چلتے ہیں چاندنی اور اس کمرے کو لاک کردیتے ہیں۔ میں ابھی باہر جاکر اپنے دوست سے ملتا ہوں، اس کے جاننے والے ایک شاہ صاحب ہیں جو کہ بہت پہنچے ہوئے ہیں۔ آج اس تماشے کو ختم ہونا ہی ہوگا۔" سہمی ہوئی سی چاندنی کا ہاتھ پکڑے ہاشم نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

چاندنی دروازے سے باہر نکل چکی تھی۔ ہاشم اس کے پیچھے نکلنے ہی لگا تھا کہ دروازہ کھٹاک سے بند ہوگیا۔ چاندنی کو ایک دھکا سا لگا۔ اس کے نیلے رنگ کے دوپٹے کا تقریباً آدھا پلو دروازے میں آکر کمرے کے اندر ہی رہ گیا تھا۔ اس نے تڑپ کر دیکھا۔ ہاشم کمرے کے اندر قید ہوچکا تھا۔

اچانک دروازہ بند ہونے پر ہاشم نے گھبرا کر کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ وہی لڑکی ونڈو کی طرف منہ کئے کھڑی تھی۔ اور اس کا سارا وجود گھٹنوں تک آئے ہوئے بالوں میں چھپا ہوا تھا۔

دفعتاً لڑکی نے ہاشم کی طرف بڑھنا شروع کردیا۔ اس کا منہ ابھی بھی کھڑکی کے دوسری جانب تھا مگر قدم مسلسل ہاشم کی طرف بڑھے جارہے تھے۔ ہاشم کا گلا خشک ہونے لگا۔ وہ دھیرے دھیرے پیچھے کی جانب چلتا ہوا دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا جبکہ وہ لڑکی ہنستی ہوئی اسی کی جانب بڑھ رہی تھی۔

"تیرا اور تجھ سے وابستہ ہر چیز کا حشر کردوں گی میں۔ جس طرح میرا حشر کیا تھا تو نے..... زندگی چھین لی تھی تو نے مجھ سے۔ اب دیکھ! میں کیا کرتی ہوں؟" غراہٹوں بھری آواز کے ساتھ وہ مسلسل اس کی طرف بڑھ رہی تھی جبکہ حیرت زدہ سا ہاشم پیچھے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ لڑکی کا چہرہ بالوں میں ڈھکا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ سیاہ زلفوں میں مقید وجود اس کی جانب بڑھ رہا ہے۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے ہاشم دروازے کے ساتھ آلگا تھا۔ جہاں باہر کی طرف سے چاندنی کے دوپٹے کا آدھا پلو اڑا ہوا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر ہاشم نے نیلے دوپٹے کا پلو

اپنی مٹھی میں پکڑ لیا۔ جیسے اس مصیبت میں ہی اس کا سہارا ہو۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر چکی تھی۔ وہ لڑکی اب اس کے عین سامنے آکر رک گئی تھی۔

اچانک پتہ نہیں کیا ہوا؟ کہ ہاشم کو کسی انجانی قوت نے زور سے دھکا دیا اور وہ اچھل کر منہ کے بل زمین پر گر گیا۔ جہاں پہلے سے ہی کسی فوٹو البم کے اوراق خود بخود تیزی سے الٹ پلٹ ہو رہے تھے۔ حالانکہ کمرے میں کسی ہوا کا نام ونشان تک نہ تھا۔ معاً ہی البم کے اوراق ایک خاص تصویر پر آکر رک گئے۔ جیسے وہ ساری الٹ پلٹ اسی ایک تصویر کی تلاش کے لئے جاری تھی۔ وہ تصویر ''سونیا'' کی تھی۔ جس میں وہ ندی کنارے بیٹھی، پانی میں پیر ڈبوئے ہوئے تھی۔ ندی کا پانی اتنا شفاف تھا کہ اس کے پاؤں واضح دیکھے جاسکتے تھے، جن میں سے ایک پاؤں میں اس نے پائل پہن رکھی تھی۔

ہاشم کو اچھے طریقے سے یاد تھا کہ سونیا کی کوئی بھی تصویر ان کے گھر میں نہ تھی۔ پھر اچانک یہ انجانا البم اور اس میں موجود سونیا کی تصویر...... اوندھا لیٹا ہاشم ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ وہ لڑکی چلتی ہوئی اس کے پاس آگئی۔

یہ دیکھ کر ہاشم کے اوسان خطا ہوگئے کہ تصویر میں موجود سونیا کے پیروں میں ایک پائل تھی اور اس خوفناک لڑکی کے پیر میں بھی ایک ہی پائل تھی۔ ''تو کیا جو لڑکی اتنے دنوں سے ہمارا سکون برباد کر رہی ہے، وہ سونیا ہے؟''

ہمت جمع کر کے ہاشم نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور پھٹی آنکھوں کے ساتھ دیکھتا ہی رہ گیا، آج پہلی بار اس لڑکی کے چہرے پر سے بال ہٹے ہوئے تھے۔ اور وہ چہرہ کسی اور کا نہیں...... ''سونیا کا تھا...... سو فیصد سونیا کا......''

ہاشم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

باہر چاندنی بری طرح دروازہ پیٹے جارہی تھی۔ مگر اندر تو جیسے ہو کا عالم تھا۔ دوپٹے سے بے نیاز وہ ٹیلی فون کی طرف بھاگی مگر گھر کے تو جیسے سارے فون ہی ڈیڈ پڑے تھے۔ وہ بری طرح سے بوکھلاہٹ کا شکار تھی۔ کچھ بن نہیں پارہا تھا۔ اسی اثناء میں اس کی نظر دیوار پر لگی سینری پر پڑی۔ جہاں آیت الکرسی چاندی کی تاروں سے کندہ کی گئی تھی۔ چاندنی وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور ہاتھ باندھ کر آنکھیں موند لیں۔

''یا اللہ! ہاشم کو اپنی امان میں رکھنا۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس کو اپنی حفاظت میں رکھنا میرے اللہ۔ اس کو ہمیشہ میرے ساتھ رکھنا۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آنسوؤں کی لڑیاں اس کی بند آنکھوں سے بہہ کر شفاف گالوں پر بکھر رہی تھیں۔

☆......☆......☆

''اوہ! شٹ...... اس کو بھی ابھی خراب ہونا تھا۔'' احتشام نے زوردار مکا گیئر پر مارا۔ اور ویو مرر میں سے گردو اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ سائیں سائیں کی آواز ماحول میں پراسراریت پیدا کر رہی تھی۔ دور دور تک کسی ذی روح کا نام ونشان تک نہ تھا۔

''اتنی رات گئے کس سے ہیلپ لوں؟'' احتشام نے ریسٹ واچ پر ٹائم دیکھا جہاں رات کے دس بج رہے تھے۔ ''اوہ! چاندنی آپی......'' ایک خیال احتشام کو آیا۔ اور اس نے فوراً اپنا ون ٹچ ڈائلنگ نکالا مگر کچھ سوچ کر موبائل واپس پاکٹ میں رکھ دیا اور مسکراتے ہوئے باہر نکل کر گاڑی کو لاک کیا۔ ''چاندنی آپی کو سرپرائز دینا چاہیے۔'' مسکراتے ہوئے ہاتھ جیبوں میں ڈالے، وہ اس راستے پر چل پڑا جہاں کچھ ہی فاصلے پر چاندنی کا گھر تھا۔

چاندنی کے دو بھائی تھے۔ احتشام جو حال ہی میں سعودی عرب سے لوٹا تھا۔ دوسرا بھائی سجاد جو ہائیر اسٹڈی کے لئے آسٹریلیا گیا ہوا تھا۔ کبھی کبھار ہی پاکستان آتا تھا۔ ان تینوں کے والدین آسٹریلیا میں ہی رہتے تھے۔ کیونکہ ان کے والد آسٹریلیا پولیس کے اہم عہدے پر فائز تھے۔ اتنا عرصہ بیرون ملک رہنے کے باوجود یہ لوگ اپنی ثقافت نہیں بھولے تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنی بڑی بیٹی چاندنی کی شادی پاکستان میں ہی کی تھی۔ اور باقی دونوں بیٹوں کی شادیاں بھی کسی

پاکستانی فیملی سے ہی کرنا چاہتے تھے۔ گھر کے باہر پہنچ کر احتشام نے ایک بھرپور جائزہ لیا۔ ڈور بیل پر ہاتھ رکھا تو وہ خاموش تھی۔ چاروناچار اس نے کوٹ اتار کر کمر پر باندھا، اور گیٹ کی آہنی سلاخوں پر پیر دھر دیئے۔ اسے اس طرح کے ایڈونچر کرنے کی عادت تھی۔ گیٹ پھلانگ کر اس نے لان میں چھلانگ لگائی۔ لان گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ موتیا، رات کی رانی اور گلاب کی معطر خوشبو فضا کو مہکائے ہوئے تھی۔ وہ ابھی لان میں کھڑا ہو کر جائزہ لے ہی رہا تھا کہ اسے کسی کی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے نظر دوڑائی تو لان کے دائیں طرف والے کونے میں چاندنی بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دیا ہوا تھا۔

''آپی...... ! کیا ہوا؟'' احتشام تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

''اوہ سوری باجی! میں سمجھا میری بہن یہاں بیٹھی ہے۔'' اس نے اپنے بڑھتے قدم روکے۔ کیونکہ قریب آنے پر لڑکی نے اپنا سر اوپر اٹھایا تھا۔ وہ چاندنی کی کوئی فرینڈ تھی۔ جس سے احتشام صرف ایک بار ہی ملا تھا۔ اسے سعودی عرب سے لوٹے صرف دو دن ہی ہوئے تھے۔

''آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں باجی؟ اندر چلیں ناں...... میں نے بھی چاندنی آپی کو سرپرائز دینا ہے۔'' احتشام نے شرٹ پر سے مٹی جھاڑتے ہوئے کہا۔

اندر داخل ہونے پر بے ہوش پڑی چاندنی کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ وہ بھاگ کر اس کے پاس گیا۔ اور پاس پڑی بوتل سے پانی لے کر کچھ چھینٹے اس کے منہ پر مارے...... ہولے ہولے چاندنی کو ہوش آنے لگا اور اس کی آنکھیں کھلنے لگیں۔ ''آنکھیں کھولیں آپی...... دیکھیں میں آپ سے ملنے آیا ہوں اور یہ آپ کی بیسٹ فرینڈ سونیا باجی بھی آئی ہیں۔'' احتشام کے کہنے پر چاندنی نے آنکھیں کھول کر اسے اور اس کے پیچھے کھڑی سونیا کو دیکھا۔ تو چاندنی کو چکر آیا اور وہ دوبارہ بے ہوش ہونے کے قریب ہوگئی مگر اس سے پہلے کہ وہ بے ہوش ہوتی۔ ہمت کر کے اس نے لب کھولے اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ ادا کیے۔

''احتشام...... شی...... از...... ڈیڈ......'' یہ بولتے ہی چاندنی دوبارہ بے ہوش ہوگئی۔

''ہواز ڈیڈ آپی؟'' احتشام حیرت میں الجھ گیا۔

''آئی ایم ڈیڈ...... آئی ایم ڈیڈ'' سونیا کی مکروہ ہنسی گونج رہی تھی۔ پھر وہ غراتے ہوئے احتشام کی طرف بڑھنے لگی۔ احتشام نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سیدھا اوپر سیڑھیوں کی جانب دوڑ لگادی۔ اوپر کمرے میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ فرش پر ہاشم بے سدھ پڑا تھا۔ اس کی پیشانی پر بھی کافی جگہ زخم آئے ہوئے تھے۔ اس نے ہاشم کو اٹھا کر سیدھا کیا اور سہارا دے کر اوپر صوفے پر بٹھایا۔ گلاس میں پانی ڈال کر ہاشم کے منہ سے لگایا۔ پانی پلاتے وقت احتشام کے ہاتھ بری طرح سے کانپ رہے تھے جبکہ ہاشم ابھی بھی نیم غنودگی کے عالم میں تھا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے ہاشم بھائی؟ نیچے آپی کب سے بے ہوش پڑی ہیں آخر یہ......'' احتشام کو فوراً چپ ہونا پڑا۔ کیونکہ چاندنی کا ذکر سن کر ہاشم کو اس کی فکر ہوئی اور لڑکھڑاتے قدموں سے نیچے کی طرف جانے لگا۔

ہاشم کو جاتا دیکھ کر احتشام اٹھا اور واش روم کی جانب چل پڑا۔ آستینیں چڑھا کر وضو کی تیاری کرنے لگا۔ سعودی عرب میں رہ کر اس کا اپنے اللہ سے تعلق خاصا مضبوط ہو چکا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے؟

چاندنی کو ہوش آچکا تھا۔ وہ کھوئی کھوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھ ہی رہی تھی کہ اسے ہاشم اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ اٹھ کر تیزی سے ہاشم کی طرف بھاگی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ ہاشم تک پہنچتی سونیا ایکدم اس کے سامنے آگئی۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ ''نہیں چھوڑوں گی...... کسی کو بھی نہیں چھوڑوں گی......'' وہ ہم کلامی کیے جارہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے سرخ رنگ کی روشنی نکل کر چاندنی پر

پڑی اور چاندنی ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ شیشے کی میز پر جا گری۔ شیشے کی کرچیاں اس کے ہاتھوں اور منہ پر خون کی دھار چھوڑ گئی تھیں۔ ہاشم تلملا کر آگے بڑھا ہی تھا کہ اس کو بھی ایسا ہی زور کا جھٹکا لگا اور وہ صوفے پر سے ہوتا ہوا زمین پر آ گرا وہ کوئی انجانی طاقت تھی جو ہاشم کو زمین پر پٹخنے کا سبب بنی تھی۔

زخموں سے چور چاندنی ہمت کر کے اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہاشم کے پاس آ بیٹھی۔ ہاشم کے ماتھے پر شدید چوٹیں آئیں تھیں جسے چاندنی اپنے خون آلود ہاتھوں سے صاف کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی اثناء میں اسے کسی سیٹی کی آواز آئی۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا تو بھونچکی رہ گئی۔

سونیا گھٹنوں تک بال بکھرائے، کسی پرندے کی طرح دونوں بازو ہوا میں پھیلائے ان کی طرف اڑتی ہوئی آ رہی تھی، خوف سے چاندنی نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنا سر ہاشم کے کندھے پر ٹکا دیا۔

''ڈرو نہیں چاندنی! خدا پر بھروسہ رکھو۔'' ہاشم نے اٹھنے کی کوشش کی مگر زخموں سے اٹھنے والے شدید درد نے اسے دوبارہ زمین پر گرا دیا۔ مگر اچانک ہی دو ہاتھوں نے آگے بڑھ کر ہاشم کو گرنے سے بچایا اور اسے اپنے گلے لگا لیا۔ ہاشم کو تسلی دینے کے بعد اس مسیحا نے چاندنی کو سہارا دے کر اٹھایا اور جیب سے ٹشو نکال کر اس کے چہرے پر موجود زخموں سے خون صاف کرنے لگا۔ وہ مسیحا احتشام تھا۔

''آئیں شاہ صاحب۔'' احتشام نے ذرا اونچی آواز میں کہا۔ اس کی آواز کے ساتھ ہی ایک نورانی چہرہ شخص اندر داخل ہوا۔ انہوں نے سفید رنگ کا چغہ زیب تن کر رکھا تھا۔

''بے فکر ہو جاؤ۔ روح کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔''

اس کے ساتھ ہی انہوں نے حق اللہ کا نعرہ بلند کیا۔ ''اللہ پاک سب ٹھیک کر دے گا۔ آپ لوگ فکر نہ کریں۔'' انہوں نے کہا۔ اتنے میں ان سب کو لگا کہ کمرے میں جیسے کوئی بھونچال سا آ گیا ہے۔ وہ یقیناً سونیا کی کارستانی تھی۔

''کیوں اپنے پیچھے پڑا ہے بڈھے؟ زندگی سے اکتا گیا ہے کیا؟ سونیا کی گلا پھاڑتی ہوئی آواز گونجی۔

''تو جو کوئی بھی ہے، میرے سامنے آ جا ورنہ تو اچھی طرح جانتی ہے کہ تجھے حاضر کرنے کے میرے پاس کتنے طریقے ہیں۔'' شاہ صاحب بغیر کسی خوف کے بولے۔

''تو بیچ میں مت آ بڈھے..... پچھتائے گا بہت۔'' سونیا کی روح اپنے مخصوص حلیے میں سامنے آ چکی تھی اور بری طرح چنگھاڑ رہی تھی۔

''کیا بگاڑا ہے ان بچوں نے تیرا؟'' شاہ صاحب اونچی بارعب آواز میں بولے۔

''انہوں نے مجھ سے میری زندگی چھینی ہے۔ مجھے بے موت مارا ہے..... اور ہاشم تو..... تو نے ہی تو مجھے وہ کھلایا تھا، زہر میرے اندر اترتا چلا گیا اور اگلے ہی دن میں مردہ پائی گئی۔'' سونیا کی روح نے خونخوار آنکھوں سے ہاشم کو گھورا جبکہ ہاشم نا سمجھی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''ان دونوں کے بارے میں احتشام نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ ایسا نہیں کر سکتے۔ تو اپنے بارے میں بتا۔ کیا ہوا تھا تیرے ساتھ؟'' شاہ صاحب نے سونیا کی روح کے گرد ایک حصار سا کھینچ دیا تھا جس کی وجہ سے وہ اس حصار میں مقید ہو کر رہ گئی تھی۔ اور شاہ صاحب کے احکام کے مطابق عمل کرنے پر مجبور تھی۔ شاہ صاحب کے سامنے ایک گلوب پڑا تھا۔ انہوں نے گلوب پر ہاتھ رکھا اور گلوب میں منظر واضح ہونے لگا۔

''قسم سے چاندنی، اگر تو مجھے نہ بلاتی تو میرا تو ہالی ڈے کا ستیاناس ہو جاتا۔'' گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر سبز رنگ کے کپڑے پہنے سونیا بیٹھی تھی جبکہ چاندنی ڈرائیونگ کر رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ چپس کے پیکٹ سے بھی انصاف کر رہی تھی۔ ان دونوں سہیلیوں نے آج ہاشم کی ہم راہی میں ساحل سمندر کی سیر کا پروگرام بنایا

تھا۔ اور اب وہ تقریباً ساحل پر پہنچ چکی تھیں جہاں ہاشم جینز گھٹنوں تک موڑے، رنگین گلاسز لگائے، جاگنگ کے سے انداز میں بھاگتا ہوا ان کی جانب آ رہا تھا۔

''تھینک یو ہاشم بھائی! مجھے یہاں انجوائے کروانے کے لئے۔ میں کباب میں ہڈی بالکل نہیں بنوں گی۔ آپ دونوں انجوائے کریں اور کچھ کھانے کا بندوبست کریں۔ تب تک میں ایک لمبا چکر لگا کے آئی۔'' سونیا نے جھک کر پائنچے فولڈ کیے۔ دوپٹا کمر پر کس کر باندھا اور اونچی سی پونی ٹیل ہلاتی ہوئی بھاگ کھڑی ہوئی۔ پھر جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا اور وہ رک کر اونچی آواز میں ہاتھ لہراتے ہوئے چلائی۔ ''چاندنی..... میرے لئے لذیذ جھینگے ضرور بچا کر رکھنا۔'' اس کے ساتھی ہی وہ دوبارہ بھاگ کھڑی ہوئی۔

ہاشم اور چاندنی لمبی واک کے تھوڑی دیر بعد بیٹھے آئس کریم کھا رہے تھے کہ سونیا آ دھمکی۔

''میرے جھینگے کہاں ہیں؟'' سونیا نے متلاشی نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ سپرائٹ کی بوتل کے ساتھ پڑے ہیں۔ کب سے لے کر آیا ہوں۔'' ہاشم نے پاس کھڑی ''خان صاحب'' کی ریڑھی کی طرف اشارہ کیا۔ جلدی کھا لو سونیا، اب تو خان صاحب مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھ رہے ہیں کہ کہیں ہم ان کی پیالی ہضم کرنے کے چکر میں تو نہیں۔'' ہاشم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگ نہیں کھا رہے؟'' سونیا نے جھینگوں کا بڑا سا چمچ منہ میں ڈالا۔

''نہ بابا..... میں ایسی عجیب چیزیں نہیں کھاتی۔'' چاندنی نے برا سا منہ بنایا۔ جس پر ہاشم اور سونیا ہنس پڑے۔ ہنسی مذاق کے اس ماحول میں پتہ ہی نہ چلا کہ ایک کنکھجورا رینگتا ہوا کب کا سونیا کی پیالی میں آ کر گر گیا تھا۔ تیز مصالحہ جات کی وجہ سے آکسیجن میں مشکل ہوئی اور وہ مر گیا۔ اور اب اس کا مڑا تڑا بے جان وجود جھینگوں کا ہی حصہ لگ رہا تھا۔ مگر وہ تینوں ہی اس سے مکمل طور پر لاعلم تھے۔

کھانے پینے سے فارغ ہو کر وہ تینوں گاڑی میں بیٹھے۔ اور اسی رات سونیا کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اسے الٹیاں شروع ہو گئیں۔

''یہ میں نے کیا کھا لیا؟'' سونیا نے نڈھال ہوتے ہوئے سوچا۔ ''مگر میں نے تو گھر آ کر کچھ بھی نہیں کھایا۔ بس آج شام چاندنی اور ہاشم کے ساتھ ہی کھایا تھا۔'' سونیا کو ایک بار پھر الٹی ہوئی بڑی سی خون کی الٹی تھی اور وہ وہیں ڈھے گئی۔

اب گلوب کا منظر دھندلا گیا تھا۔ سونیا کی روح بغور گلوب پر ابھرنے والے منظر کو دیکھ رہی تھی۔

''مجھے انصاف چاہیے ان دونوں کی زندگی چاہیے۔'' سونیا کی روح غرائی۔

''ایک منٹ سونیا.....'' ہاشم پر اعتماد سا ہو کر اٹھا۔ ''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ کھانا میں نے زہریلا کیا تھا۔ وہ محض ایک اتفاق تھا کہ کھنکھجورا تمہاری پیالی میں گر گیا تھا اور جھینگوں کے ساتھ مکس ہو گیا تھا۔ تمہیں مار کر ہمیں کیا ملنا تھا؟ جان دینے اور لینے والی ذات تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں مداخلت کرنے والے؟ اس وقت جو عزیز ترین چیز میرے پاس ہے۔ وہ میری بیوی ہے۔ اور میں اس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایسا بالکل اتفاقاً ہوا۔ ہم بے قصور ہیں۔'' ہاشم نے چاندنی کو بازو سے پکڑ کر اپنے برابر میں کھڑا کیا۔ جبکہ سونیا حصار میں قید کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح لگ رہی تھی۔

''نہیں میں نہیں مانتی۔'' سونیا کی روح چیخی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے حصار توڑنے کی کوشش کی مگر اسے ایک کرنٹ سا لگا اور وہ وہیں گر گئی۔ وہ بری طرح سے پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ حصار توڑنے کی کوشش میں اس کا چہرہ آدھا جھلس گیا تھا۔

''تو..... تو سچ..... نہیں مانے گی؟'' شاہ صاحب نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''نہیں..... یہ سچ نہیں ہے۔'' وہ غرائی۔

''تو پھر تیار ہو جا بھسم ہونے کے لئے۔ بے شک سرکش روحوں کا یہی حال ہوتا ہے۔'' شاہ صاحب

نے اپنی مٹھی، جس پر وہ جانے کب سے کیا کیا پڑھ کر پھونک رہے تھے۔ سونیا کی روح کی طرف کردی، ہاتھ کی ہتھیلی سے ایک شعلہ سا لپکا اور حصار کی طرف بڑھا۔

چیخوں اور آہوں کا ایک طوفان برپا ہوگیا۔ اسے آگ کے شعلوں نے جکڑ لیا۔ اور جب آگ کے شعلے ختم ہوئے تو وہاں سونیا کی روح کا نام ونشان تک نہ تھا۔

"شاہ صاحب! میں اللہ کی ذات کو حاضر وناظر جان کر کہتا ہوں کہ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ وہ سب ایک اتفاق تھا۔" ہاشم تیزی سے شاہ صاحب کے پاس آیا۔ "میں سب جانتا ہوں بیٹا! اب وہ تم لوگوں کو کبھی تنگ نہیں کرے گی۔" شاہ صاحب نے ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور حق اللہ کا نعرہ لگاتے ہوئے چل دیئے۔

☆.....☆.....☆

"احتشام ذرا فون دیکھو جا کر، کس کا ہے؟" چاندنی نے مصروف سے لہجے میں کہا۔ احتشام ٹی وی لاؤنج میں آ گیا۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر ایک بڑی تصویر پر پڑی۔ وہ اس لڑکی کو ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ مونا لیزا کی مسکان والی حسین لڑکی۔ ہاورڈ یونیورسٹی میں پڑھنے کے باوجود وہ کبھی "پردے" سے بے نیاز نہیں ہوئی تھی۔ فون مسلسل بج رہا تھا۔

"کیا ہوگیا ہے احتشام؟ فون تو دیکھو! پیچھے سے چاندنی نے آ کر فون اٹھایا۔ اور احتشام شرمندگی مٹانے کو، تیزی سے باہر نکل کر ہاشم کے کمرے کی طرف آ گیا۔ چاندنی فون پر بات کر کے فارغ ہوئی تو چائے بنا کر سیدھا کمرے میں آنے لگی۔ جہاں سے ہاشم کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"احتشام! تو شادی کرلے، قسم سے جب سے اپنی شادی ہوئی ہے، کسی کنوارے لڑکے کی آزادی برداشت نہیں ہوتی مجھ سے۔" ہاشم نے انگڑائی لیتے ہوئے ہاتھ سر کے پیچھے باندھے۔ "ویسے احتشام! کوئی لڑکی ہے تیری نظر میں؟" ہاشم نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"ایک لڑکی تو ہے بھائی، جو مجھے بہت اچھی لگتی ہے اور جب وہ ہنستی ہے تو....." احتشام نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ہنستی ہے تو.....؟" ہاشم نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"جیسے سارا جہاں ہنسنے لگتا ہے۔" احتشام زیر لب مسکرایا۔ اس وقت وہ بالکل شاہ رخ لگ رہا تھا۔

"اوہ..... ہو....." ہاشم نے اسے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ اسی اثناء میں چاندنی چائے کی ٹرے لے کر اندر آ گئی اور احتشام کو کپ پکڑاتے ہوئے سرگوشی کی۔

"کہیں اس لڑکی کی مسکراہٹ "مونا لیزا" سے تو نہیں ملتی؟" چاندنی کی اس بات پر احتشام کے ہاتھوں سے کپ چھلکا۔ چاندنی اتنے میں سامنے صوفے پر بیٹھ چکی تھی۔

"آپی بس بھی کریں۔" احتشام نے پاس پڑا کشن اٹھا کر چاندنی پر پھینکا جسے چاندنی نے ہنستے ہوئے کیچ کرلیا۔ یکا یک سب کی مسکراہٹیں ایکدم غائب ہوگئیں۔ کیونکہ چھن چھن کی آواز بہت قریب سے آ رہی تھی۔ ہاشم، احتشام، اور چاندنی، تینوں ڈری سہمی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اتنے میں دروازہ ایک بھیانک چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور کوئی وجود اندر داخل ہوا۔ جس نے اپنے کالے اور موٹے پیروں میں پائلز باندھ رکھی تھی۔ گول شیپ کے بھدے سیاہ چہرے پر سرخی لگائی ہوئی تھی۔ وہ ان کی ملازمہ۔ "ممتاز" تھی۔ بی بی جی! آج کھانے میں کیا پکاؤں؟" فرہی مائل ممتاز، ہاشم اور احتشام کی طرف کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے شرماتے لجاتے پوچھ رہی تھی۔

ہاشم اور احتشام کے منہ سے ہنسی کے فوارے پھوٹ پڑے۔ وہ ہنس ہنس کر بے حال ہو رہے تھے۔ جبکہ چاندنی ان دونوں کو سرزنش نظروں سے گھورتی ہوئی ممتاز کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔

ملعون

ایس حبیب خان۔ کراچی

انسان صرف اور صرف اللہ کا محتاج ہے احکام خداوندی بجا لانے والے کو اللہ تعالیٰ دین دنیا میں ایسا نوازتا ہے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں مرنے کے بعد بھی ایسے شخص کی تعلیم اور عزت میں اضافہ ہی اضافہ ہوتا ہے۔

احساس ذمہ داری سے بیگانہ ایک شخص کی عبرتناک اور کربناک لرزیدہ لرزیدہ کہانی

آج کل یہ چیز بہت عام ہوگئی ہے کہ لوگ اپنی حاجتیں کن لوگوں سے پوری کروا رہے ہیں؟ وہ کون ہیں؟ اندر سے کیا ہیں کچھ معلوم نہیں۔ ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا یہ ایمان ہونا چاہیے کہ صرف ہم اس ذات پاک سے مانگیں جو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ وہ ذات جس نے پوری کائنات کو تخلیق کیا، جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، سب کو دینے والا وہی ہے۔ مگر لوگ اس ذات سے مانگنے کے بجائے جانے کہاں کہاں جا کر اپنا آپ خراب کرتے ہیں۔ یہ مذہب سے دوری کی وجہ سے ہو رہا ہے۔

بوڑھی آنکھیں تیز دھوپ میں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں اور وہ آنکھیں تھیں بوڑھی ہاجرہ کی۔ گرمی سے اپنی جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی اور چلتے چلتے اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ ایک راہگیر نے اس کو سہارا دے کر فٹ

ہاتھ پر بٹھایا اور قریبی دکان سے ٹھنڈے پانی کی بوتل لاکر اس کو پانی پلانے لگا۔ پانی پی کر ہاجرہ نے نیم وا آنکھوں سے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔ ”جیتے رہو بیٹا! اللہ تمہیں سلامت رکھے۔“

وہ راہگیر آگے بڑھ گیا اور ہاجرہ بھی ہمت کر کے اٹھ گئی، جیسے ہی اس نے فٹ پاتھ سے نیچے پیر رکھا۔

ایک تیز چمک اس کی آنکھوں میں آئی اور وہ فضا میں اچھل کر اڑتی ہوئی دور جا گری۔ روڈ پر لوگوں کا ہجوم جمع ہوگیا۔ خون میں لت پت ہاجرہ نے آخری ہچکی لی اور اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ مگر ان میں اب بھی تلاش تھی جو آخر تک رہی۔

جبار نے آنکھ کھول کر صرف اپنی ماں کو دیکھا جو اس سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ لوگوں کے گھروں میں کام کر کے وہ اپنا اور جبار کا پیٹ پال رہی تھی۔ بڑا ہوتے ہی جبار نے کل پرزے نکالنے شروع کر دیئے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا گندے لوگوں میں تھا۔ شراب، جوا اور کون سی گندی لت تھی جو اس نے نہیں پالی تھی۔

ماں سارا دن کام کر کے پیسے جمع کرتی اور اپنے بیٹے کے لئے کھانا بناتی۔ جسے کبھی کبھار، جبار اٹھا کر پھینک دیا کرتا اور ماں کو خوب ذلیل کرتا۔ ”سارے پیسے دبا کر میرے لئے یہ بناتی ہے؟ یہ بھی کوئی کھانا ہے؟“ اور گھر سے نکل جاتا تو بوڑھی ماں پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈتی رہتی۔ مگر اس دفع اللہ تعالیٰ نے جبار سے اپنا تحفہ واپس لے لیا کیونکہ آج جبار نے حد کر دی تھی۔ جبار نے اپنی ماں پر ہاتھ اٹھایا تھا، وہ بھی اس بات پر کہ اس نے میتھی آلو کا ساگ بنایا تھا۔ جبار نے ماں پر ہاتھ اٹھایا پھر دروازے پر لات مار کر باہر نکل گیا۔ بوڑھی ہاجرہ سسکتی رہی پھر آنسو صاف کر کے بیٹے کی تلاش میں نکل گئی۔ مگر اب کی بار جو نکلی تو پھر واپس نہ آئی۔ لوگوں نے اس کی لاش کو فلاحی ادارے میں جمع کرا دیا اور وہاں شناخت نہ ہونے پر لاوارث لاش سمجھ کر اسے دفنا دیا گیا۔

جبار اپنے غلیظ دوستوں میں بیٹھا شراب کے گلاس خالی کر رہا تھا۔ اس کے ایک ساتھی نے کہا۔ ”ابے تیری ماں دو روز سے تجھے ڈھونڈ رہی ہوگی۔“

تو جبار نے بے شرمی سے کہا۔ ”مرنے دے اس کو!“

مگر آخر کب تک وہ مفت میں عیش کرتا، ماں تھی تو بک بکا کے وہ اس سے پیسے چھین لیتا تھا وہ اب بالکل خالی ہاتھ ہوگیا تھا اور پھر اسی رات ان کا آپس میں زبردست جھگڑا ہوا اور بڑھتے بڑھتے بات اتنی بڑھ گئی کہ جبار نے چھری اپنے ساتھی کے پیٹ میں اتار دی اور وہاں سے بھاگ نکلا اور سیدھا اسٹیشن پہنچ کر ٹرین میں سوار ہوگیا۔ اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا کئی اسٹیشن گزر گئے تو پھر وہ ایک جگہ اتر گیا۔ ہر نظر جبار کو اپنی ہی جانب گھورتی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ پیدل چل رہا تھا، جانے کون سا گاؤں تھا۔ بھوک اور تھکن سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ گندے لوگوں میں پڑے پڑے اس کو کسی چیز کا ہوش نہ رہا تھا۔ بال اور داڑھی بے تحاشا بڑھی ہوئی تھی۔ چلتے چلتے اس کو سامنے ایک درخت نظر آیا اور وہ اس کے نیچے بنے چبوترے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے اور وہ وہیں ڈھیر گیا۔

بھنبھناہٹ کی ملی جلی آوازوں سے اس کے پپوٹوں میں جنبش ہوئی، بڑی مشکل سے اس نے آنکھیں کھولیں۔ ”بابا جاگ گئے!“ کی آواز واضح اور تیز تھی جو جبار کے کانوں سے ہوتی اس کے دماغ میں گھوم گئی۔

”آپ تین دن سے یہاں آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں آپ کون ہیں بابا؟“ ایک آدمی نے سوال کیا۔

جبار نے بولنا چاہا مگر اس کے خشک ہونٹوں پر جمی ہوئی پپڑیوں نے اس کے ہونٹوں کو چپکا دیا تھا۔

ایک آدمی دوڑ کر کھانا لے آیا۔ چنگیری میں روٹیاں اور ”میتھی آلو کا ساگ“ تھا۔ آدمی نے نوالہ بنا کر جبار کے منہ میں دیا۔ پہلا نوالہ تو جبار فوراً ہی سٹک لیا۔ پھر وہ چبا کر کھانے لگا۔ کھانا جبار کو اتنا لذیذ لگا کہ وہ بغیر رکے منہ چلائے جا رہا تھا، یہ وہی کھانا تھا جس کی وجہ سے اس بدبخت نے اپنی بوڑھی ماں پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے خوب پانی پیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ”چلو بابا جی کو آرام کرنے دو۔“ لوگ آپس میں کہتے ہوئے اٹھ گئے۔ پیٹ میں روٹی گئی تو جبار کے شیطانی دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا۔ ”بابا جی!“ اس نے اپنے چہرے کی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد دو آدمی اسے سہارا دے کر اٹھا کر لے گئے اور ایک مکان کے سامنے رک کر کہا۔ ”بابا جی! یہ رحیم کا گھر ہے اور اب آپ کے رہنے کا بندوبست اس کے گھر میں ہے۔“ اسے ایک کمرے میں لے آئے، جہاں چارپائی پر صاف ستھرا بستر لگا ہوا تھا۔ آدمیوں کے جانے کے بعد جبار ہاتھ پیر پھیلا کر لیٹ گیا اور آنے والے وقت کو سوچ کر اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

”یہ تعویذ پانی میں گھول کر بچے کو پلا دینا مسلسل تین روز، بچے کا بخار اتر جائے گا۔“ جبار نے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ جس پر آڑی ترچھی لکیریں پڑی تھیں، آدمی کو دیتے ہوئے کہا۔ ”بابا جی نذرانہ.....“ آدمی نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ جبار دھاڑا۔ ”ہمیں پیسے دے گا؟“

”میں تو.....وہ!“

”مجھے معاف کر دیں بابا جی!“ اس آدمی نے جبار کے پیر پکڑ لیے۔ جا گھر!“ جبار نے کہا اور دل میں بولا۔ ”ایک بار بھروسہ جیت لوں پھر تو پیسے ہی پیسے ہیں۔“ اس آدمی کے بچے کو موسمی بخار تھا جو دو دن میں اتر گیا مگر دھوم جبار کے تعویذ کی مچ گئی اور اس سے بھی زیادہ اس بات کی کہ بابا جی پیسے نہیں لیتے۔ پھر جبار کے پاس گاؤں کے لوگوں کی لائن لگ گئی اور گاؤں کے سیدھے لوگ جبار پر اندھا اعتماد کرنے لگے۔

جبار نے ایک روز لوگوں سے کہا۔ ”وہ یہاں سے جا رہا ہے کیونکہ اسے معلوم ہوا ہے کہ اب اس کو اکیلا رہنا ہوگا اور اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کا علم اس سے چھن جائے گا۔

گاؤں کے لوگ اس کے آگے گڑگڑانے لگے اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے۔ ”ہم آپ کے لئے علیحدہ مکان بنوا دیں گے۔ آپ یہاں سے نہ جائیں۔“ اور پھر تھوڑے دنوں میں جبار کے لئے علیحدہ مکان کا انتظام ہوگیا۔ ٹھکانہ نہ ملا تو جبار نے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنا دیا اور رات کے اندھیرے میں کالے دھندے شروع کر دیئے۔ راتوں رات گاڑیوں میں لوگ آتے نشہ، جوا بلکہ کیا کچھ نہ کرتے اور صبح ہوتے ہی جبار بابا جی بن جاتا۔

گاؤں کے لوگوں کو بھی اس نے نشے کی لت لگا دی تھی۔ وہ نشے کی پڑیاں تعویذ کے طور پر دیتا اور جب نشہ ٹوٹنے لگتا تو سب دوڑے ہوئے اس کے پاس آتے اور وہ ”مشکل عمل کا مشکل خرچہ“ بتا کر لوگوں سے پیسے لوٹتا۔ مگر یہ دھندا کچھ زیادہ فائدہ مند نہ تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہاں کے لوگوں کے پاس زیادہ مال نہیں ہے۔ تو اس نے شہر جانے کا ارادہ کیا اور ایک رات بغیر بتائے وہاں سے غائب ہوگیا۔

بس سے اتر کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا جگہ انجان تھی پھر کچھ دور جا کر اسے ایک ہوٹل نظر آیا وہاں اس نے نوکری کرنے والے ایک لڑکے کو بلایا اور اسے اپنے ساتھ بٹھا کر کچھ پیسے دیئے اور علاقے کے لوگوں کے بارے میں معلومات کرنے لگا۔ کافی ساری باتوں میں صرف اس کو ایک ہی ”اپنے مطلب“ کی لگی۔ پھر وہ کھانا کھا کر ”اپنی منزل“ پر چل پڑا اور تھوڑی دور جانے کے بعد اسے اپنا مطلوبہ مکان نظر آ گیا۔ مکان باہر سے بے حد شاندار تھا۔ جبار نے گیٹ پر دستک دی تو چند لمحوں بعد ایک عورت نے گیٹ کھولا۔ ”پانی پلا دے“ اس عورت سے کہا۔

عورت دروازہ بند کر کے پانی لینے چلی گئی۔ جبار دروازے سے ہٹ کر سائیڈ کی دیوار سے ٹیک لگا کر نیچے بیٹھ گیا۔ عورت نے گیٹ کھولا اور ادھر ادھر دیکھا پھر اس کی نظر جبار پر پڑ گئی تو وہ گلاس ہاتھ میں

لے کر آئی اور اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''بابا! پانی۔''

جبار نے سر اٹھائے بغیر ہاتھ بڑھا کر گلاس لے لیا اور اس کے اندر جھانک کر غور سے دیکھنے لگا۔ عورت اسے دیکھ کر بولی۔ ''آپ پانی کیوں نہیں پی رہے؟''

جبار نے افسوس کے انداز سے سر کو ادھر ادھر ہلایا اور بولا۔ ''پھول سی بچی ہے مگر چلے گی.....'' اتنا کہہ کر اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

عورت کو ایک زوردار چھناکا لگا اور وہ وہیں زمین پر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ''آپ کو کیسے معلوم کہ میری بیٹی چل نہیں سکتی!''

جبار نے مکاری سے آنکھیں بند کرلیں وہ عورت کو بے چین کرنا چاہ رہا تھا۔ ''بابا جی!'' عورت کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔

''ہم نے یہ تو نہیں کہا کہ بچی چل نہیں سکتی، ضرور چل سکتی ہے۔''

عورت نے جھٹ سے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ ''آپ جو کہیں گے، میں وہ کروں گی آپ.....'' اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

''ہم بڑی دور سے آئے ہیں اور ہمارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے آج یہاں ہیں کل جانے کہاں ہوں۔ اور تمہارا کام مشکل ہے، وقت لگے گا۔'' جبار بولا۔

''آپ اس کی فکر نہ کریں اور اندر چل کر ہمیں اپنی خدمت کا موقعہ دیں۔'' اور پھر اس عورت نے جبار کو گھر کے اوپر والے کمرے میں ٹھہرا دیا۔ دراصل وہ گھر علاقے کے سب سے امیر آدمی کا تھا اور اس کی کمزوری اس کی معذور بیٹی تھی۔ جبار نے پہلے ہی سب معلوم کرلیا تھا۔ بس اس آدمی کی طرف سے کچھ کھٹکا ہوا تھا مگر رات کو جب وہ آدمی احترام سے اس سے ملنے آیا تو جبار کے دل سے وہ دھڑکا بھی نکل گیا وہ لوگ پوری طرح اس کے جال میں پھنس چکے تھے۔ آدمی کے جانے کے تھوڑی دیر بعد نوکر نے دسترخوان سجا دیا۔ دسترخوان پر کیا کچھ نہ تھا بریانی، کباب، کھیر، پھل.....

جبار نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور شروع ہوگیا۔ شروع شروع میں اس نے صرف نشے کی ہلکی دوا دی اور کہا۔ ''اس عمل سے بچی کو نیند آئے گی اور بچی سوتی رہے گی۔ اس عرصے میں اس نے گھر کا روٹین معلوم کرلیا آدمی صبح چلا جاتا گھر میں عورت اور بچی کے علاوہ دو نوکر ہوتے تھے۔ پھر ایک روز جبار نے ایک لمبی فہرست سامان کی عورت کے آگے رکھ دی اور کہا ''یہ آج ہی منگوا دو، آج عمل ہوگا اور تمہاری بچی اپنے پیروں پر کھڑی ہوجائے گی۔''

عورت نے فوراً نوکروں کو دوڑایا۔ پھر جبار نے دو گلاسوں میں بے ہوشی کی دوا ڈال کر دونوں ماں بیٹی کو پلائی اور گھر کے سارے زیورات، اور نقدی سمیٹ کر فرار ہوگیا۔ اور سیدھا جا کر دوسرے شہر جانے والی بس میں سوار ہوگیا۔ زیورات اور روپوں والی پوٹلی اس نے اپنی گود میں رکھ لی۔ بس چلتی رہی چلتی رہی اور پھر اس بس کے آخری اسٹاپ پر وہ اتر گیا۔ بس چلی گئی۔

چلتے چلتے اچانک جبار کو کرنٹ لگا اور اس نے پوٹلی کو دبایا اور وہیں زمین پر بیٹھ کر پاگلوں کی طرح اسے کھولنے لگا۔ مگر یہ کیا! وہاں تو خالی پوٹلی اسے منہ چڑا رہی تھی۔ اس کے تو پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں جاگا ہوا تھا اور پوٹلی میری گود میں تھی تو زیورات اور روپے کہاں چلے گئے؟ پھر کافی دیر بعد وہ مرے ہوئے قدموں سے اٹھا اور آگے بڑھنے لگا۔

علاقہ کافی ویران تھا اور سامنے ایک بہت بڑا گیٹ تھا۔ اس نے ایک راہ چلتے آدمی سے معلوم کیا۔ ''یہ کون سی جگہ ہے؟ یہاں رہنے کو کوئی ہوٹل ملے گا؟''

آدمی ہنسنے لگا۔ ہوٹل؟ یہاں میں بھی اس لئے نظر آرہا ہوں کہ ایک ضروری کام سے گزرنا تھا مجھے یہاں سے، یہاں کوئی آبادی نہیں ہے۔''

''مگر کیوں؟ جبار نے سوال کیا۔

''یہ سامنے جو گیٹ نظر آرہا ہے ناں۔ ''یہ

شمشان گھاٹ ہے" خوف سے یہاں کوئی نہیں آتا۔ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے چلے جاؤ۔ اور آدمی تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ گیا۔ اس سے پہلے کہ جبار آگے بڑھتا کھر، کھر کی عجیب آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے نظر دوڑائی تو شمشان گھاٹ کے دروازے پر ایک وجود پڑا نظر آیا۔ جبار اس کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے لگا۔ "اپنے زیورات وروپے نہیں لے جائے گا۔" اس وجود سے کھر کھراتی ہوئی آواز آئی۔

جبار کو زبردست جھٹکا لگا۔ اس نے بے یقینی سے اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ "تجھ سے ہی کہہ رہا ہوں۔" پھر کھر کھراتی آواز آئی۔

اب جبار نے سوال کیا۔ "کون ہو تم اور میرے بارے میں کیسے جانتے ہو؟"

کھی..... کھی کر کے وہ وجود اپنے میل میں لتھڑے دانتوں کی نمائش کرنے لگا۔ "جب تیری گود میں رکھی پوٹلی سے زیورات غائب کر سکتا ہوں تو تیرے بارے میں جاننا کیا بڑی بات ہے۔"

جبار کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی اور خوف سے خون جم گیا۔ وہ وجود اب بالکل اس کے سامنے تھا۔ "توے سے بھی زیادہ سیاہ، گنجا اور بے انتہا سڑاند، بدبو اس کے وجود سے آ رہی تھی۔" مجھے کچھ نہیں چاہیے کہہ کر جبار نے جانا چاہا تو اس کے پیر زمین کے اندر دھنس گئے۔ "ڈرتا کیوں ہے؟ ہم تو تیری سہائتا کرنا چاہتے ہیں۔' کھر کھراتی آواز جبار کے کانوں سے ٹکرائی۔ "چل اندر چل کر بات کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ وجود مرگھٹ کے دروازے کی جانب بڑھ گیا اور دروازہ ایک جھٹکے سے خود بخود کھل گیا۔

جبار نے اپنے پیروں کو حرکت دی تو وہ آزاد تھے۔ اس نے واپسی کے لئے قدم بڑھایا تو ایک ان دیکھی دیوار سے ٹکرا گیا۔ پھر اس نے دائیں جانب قدم بڑھایا تو پھر ان دیکھی دیوار سے ٹکرا گیا پھر بائیں جانب بھی ایسا ہی ہوا۔ صرف ایک راستہ بچا تھا سیدھا مرگھٹ کے دروازے پر جاتا تھا۔ جبار نے اس طرف قدم بڑھائے تو چلتا چلا گیا۔ اندر وہ سیاہ وجود کھڑا تھا پھر وہ اسے لے کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ فضا میں گوشت جلنے کی بو واضح طور پر محسوس ہو رہی تھی۔ اس سیاہ وجود نے زمین پر ہاتھ پھیرا تو وہاں جبار کی پوٹلی کے زیورات اور روپے آ گئے۔ "بس اتنے میں خوش ہے یا ساری زندگی عیش کرنا چاہتا ہے؟" اس نے کہا۔

"ساری زندگی....." کھی کھی کرتی ہنسی نے جبار کی آواز دبا دی۔ "مگر اس کے بدلے کچھ دینا ہوگا۔" وہ بولا۔

"کیا؟ میرے پاس تو یہی ہے بس!" جبار نے زیورات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مورکھ! یہ نہیں بلکہ تیرا ایمان چاہیے!" اس نے کھر کھراتی آواز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" جبار نے کہا۔

"مطلب تیرے دین سے تیرا کوئی واسطہ نہیں ہوگا!" وہ بولا۔

"میں ویسے کون سا نماز، روزہ کرتا ہوں۔" جبار نے ڈھٹائی سے کہا۔

"تیرے جیسے کی ہی تو تلاش تھی۔ لے سب سے پہلے یہ کھا!" اس سیاہ وجود نے ایک پتے پر رکھی کوئی چیز اس کی جانب بڑھائی۔

"یہ تو غلاظت ہے۔ تھو!" جبار نے کراہت سے تھوکتے ہوئے کہا۔

"غلاظت ہے تو کیا ہوا؟" اس سیاہ وجود نے ڈھٹائی سے کہا۔ "چل اچھا تیری خاطر میں اسے بدل دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے پتہ پھر جبار کی جانب بڑھایا اب کی بار پتے پر جبار کو مٹھائی نظر آئی۔ جبار نے ہاتھ بڑھا کر پتہ لے لیا۔ ایک لمحے کو اس کے دل نے گواہی دی کہ وہ یہ نہ کھائے۔ "جلدی کر سے برباد نہ کر" کھر کھراتی ہوئی آواز ابھری مگر اس گندے سیاہ وجود نے اپنا غلیظ ہاتھ اس کے منہ پر مضبوطی سے جما دیا۔ جبار کا ایمان خراب ہو چکا تھا۔ اس نے پہلی بار کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا اور دوسری نظر کا دھوکا، اس کے

بعد جبار وہیں مرگھٹ میں پڑا رہا اور غلاظت کی دلدل میں دھنستا چلا گیا اور اسے یہ بھی علم نہ رہا کہ وہ ایمان سے خارج ہو چکا ہے۔

جانے کتنا عرصہ گزر گیا جب ایک روز اس سیاہ وجود نے اس سے کہا۔ "میرا کام ختم ہو گیا، میں چلتا ہوں۔ تجھ جیسا اور بھی تو تلاش کرنے ہیں اور غائب ہو گیا۔

جبار نے ایک بہت شاندار گھر شہر کے بہترین علاقے میں خرید لیا اور لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو بہت عبادت گزار ظاہر کیا۔ اور لوگ اپنے مسائل کے حل کے لئے اس کے پاس آنے لگے۔ ان کے سامنے جبار بہت پاکیزہ ماحول پیش کرتا تھا۔

"بس آپ کچھ ایسا کر دیں کے ان لوگوں کی زبانوں پر تالے لگ جائیں بہت ایمانداری اور سچائی کی دم ہیں وہ لوگ خاص طور سے میرے داماد کو تو ایسا کر دیں کہ جو میری بیٹی کہے وہ اس سے انکار نہ کر سکے۔" زینت نامی عورت نے جبار کے سامنے زہر اگلتے ہوئے کہا۔

"کام تو ایسا ہوگا کہ زبان پر تالے پڑ جائیں گے۔ تیری بیٹی کی مرضی کے بغیر تیرا داماد ہل کر نہ دے گا۔ عمل مشکل ہے اور ساتھ ہی خرچ....." عورت نے جبار کی انگلی کا اشارہ سمجھتے ہوئے بہت سارے بڑے نوٹ اس کے پاس رکھ دیئے۔

آمنہ بیگم صبح شام اپنے بیٹے کے لئے دعا کرتی تھیں۔ پچھلے چند دنوں سے انہیں اپنے بیٹے کی زیادہ فکر لاحق ہو گئی تھی۔ وہ مسلسل برے برے خواب دیکھ رہی تھیں اور اپنے رب سے پناہ مانگ رہی تھیں۔ مگر دشمن نے سب سے پہلے ڈھال بننے والے الفاظ یعنی ماں کی زبان ہی بند کر دی اور وہ سیڑھیوں سے ایسی گریں کہ پھر اٹھ نہ سکیں اور ان کا بیٹا! اس کا وہی حال ہوا جو جبار نے بتایا تھا۔ اور زینت نامی عورت اپنی بیٹی کے ساتھ مل کر اس کے گھر میں جشن منا رہی تھی۔

ارشد نامی شخص ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور لمبی لائن میں اپنی باری آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ کوئی اچھے کردار کا مالک نہ تھا اور نہ ہی کسی جائز مقصد کے لئے آیا تھا۔ وہ شریف صاحب کے گھر کرائے پر رہ رہا تھا اور جبکہ اب مالک مکان نے گھر خالی کرنے کا کہا تو اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ "جو کیا جائے کر لو! مکان تو تمہارا باپ بھی خالی نہیں کرا سکتا۔" مجبوراً مالک مکان نے عدالت سے رجوع کر لیا۔ اب اس لئے جبار کے پاس ارشد آیا تھا۔ جبار نے اسے دو دن بعد بلایا تھا اور وہ آج اسی لئے آیا تھا۔ اس کی باری آنے پر جبار نے اس کو ایک پڑیا دی اور کہا۔ "اس میں موجود سیندور مالک مکان اور آنے جانے والے راستے پر پھینک دے۔" "یہ کیا چیز ہے بابا جی؟" ارشد نے پوچھا۔ زبردست چیز ہے۔ جبار نے مکاری سے کہا۔

"اس سے کیا ہوگا بابا جی؟" ارشد نے پوچھا۔

"اس سے کیا ہوگا؟" جیسے ہی یہ تیرے مالک مکان کے پیروں تلے آئے گا۔ اس کا دل اس گھر سے اچاٹ ہو جائے گا۔ اور وہ خود یہ گھر خالی کر دے گا۔ جبار نے کہا۔ "مگر یہ بہت نایاب ہے! اس لئے....."

"آپ فکر نہ کریں۔" ارشد نے جلدی سے جیب سے نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔

تین روز بعد پورے علاقے میں شریف صاحب کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ بہت سے لوگوں نے اپنے دانتوں تلے انگلیاں داب لیں تھیں کہ شریف صاحب کو اچانک کیا ہو گیا! "شریف صاحب نے اپنے بچوں اور بیوی کو ذبح کر کے انہیں گھر کے صحن میں پھینک دیا اور گھر سے کہاں چلے گئے کسی کو کچھ پتا نہ چل سکا۔

ارشد نے لوہا گرم دیکھا تو چوٹ ماردی اور محلے کے لوگوں سے کہا۔ "اچھا ہی ہوا جو تین روز پہلے میں نے ان سے گھر خرید لیا تھا ورنہ مجھے بھی پریشانی ہوتی۔" اور وہاں قبضہ کر کے رہنے لگا۔

"جب سے وہ آیا ہے ہمیں تو ہر چیز کے لالے پڑ گئے ہیں۔ ہمارے سارے کام رک گئے ہیں۔ پہلے تو

کمپنی کے مالک کو کچھ پتہ نہیں چلتا تھا مگر یہ ناجانے کہاں سے ٹپک پڑا ہے ہمارے سروں پر، یہیں آپ میرا کام کردیں۔'' مراد نے ساری کہانی جبار کو سنادی۔

''تجھے بھی کوئی نقصان پہنچایا ہے اس نے؟'' جبار نے پوچھا۔

''میرے بارے میں مالک کو اس نے سب بتا دیا اور مالک نے اسی وقت مجھے نوکری سے نکال دیا۔'' مراد نے بتایا۔

''فکر کیوں کرتا ہے؟ نام کیا ہے تیرے مالک کا؟'' جبار نے پوچھا، تو مراد نے اپنے مالک کا نام بتادیا۔

''پہلے تیرے مالک کو راستے پر لے آؤں پھر اسے بھی دیکھ لیں گے۔'' جبار نے کہا۔

جبار آفس کے اکاؤنٹس میں ہیر پھیر کرتا تھا مگر جب سے نیا منیجر عاشر آیا تھا اس کے سارے کرتوت دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ عاشر بہت ہی ایماندار اور مذہبی انسان تھے اور اس کے آگے ان کی ایک نہ چلی اور اس نے کمپنی کے مالک کو تمام صورت حال سے آگاہ کردیا۔ مگر جبار کا کالا عمل بھی اپنا اثر دکھا رہا تھا اور کمپنی نے پرانا ہونے کی وجہ سے مراد کو دوبارہ رکھ لیا۔ ہاں مگر عاشر کا کچھ نہ بگڑا۔ نقصان پہنچانے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔ عاشر کو ایک دوسری جگہ سے بہت اچھی آفر ہوئی تو اس نے کمپنی سے ریزائن کردیا اور جبار کے گندے عمل سے پہلے ہی وہاں سے چلا گیا۔

عاشر وہی نوجوان تھا جس نے جبار کی ماں ہاجرہ کر مرنے سے پہلے پانی پلایا تھا اور ہاجرہ کے منہ سے اس کے لئے دعا نکلی تھی۔ ''اللہ تمہیں سلامت رکھے۔'' شاید اللہ نے اس ماں کی دعا سن کر عاشر کو اس کے کئے کا پھل دے دیا تھا۔ مگر جبار کے گناہ تھے کہ بڑھتے ہی جارہے تھے۔

''لڑکے والوں نے میری بیٹی کے بجائے میری نند کی لڑکی کو پسند کرلیا۔ آپ بس میری بچی کا راستہ صاف کردیں۔'' شاہانہ بیگم بولیں۔ اور جبار کے گھٹنے کے نیچے نوٹوں کی گڈی رکھ دی۔ اگلی رات شاہانہ کے شوہر نے اسے بتایا کہ۔ ''آپا کا فون آیا ہے۔ ارم کا انتقال ہوگیا ہے۔ شام کو اسے گھبراہٹ ہوئی اور پھر اسے خون کی الٹیاں ہونے لگیں۔ اسپتال جاتے جاتے اس نے دم توڑ دیا۔ ڈاکٹرز کی رپورٹ نے بتایا کہ اس کے اندرونی اعضاء کٹ گئے تھے۔'' شاہانہ بیگم یہ سن کر لرز گئیں۔

''میں نے تو صرف رشتے کی بات کی تھی۔'' مگر اب کیا ہوسکتا تھا ایک ناحق خون ان کی گردن پر آچکا تھا۔ وہ جبار کے پاس گئیں تو اس نے یہ کہہ کر بھگا دیا کہ ۔''یہ سب یہاں آنے سے پہلے سوچتی!''

''دھندا تو خوب چل رہا ہے مگر دوسرے کو بھی دیکھنا پڑتا ہے اگر ابھی سے نہ روکا تو کل کو ہمیں ہی مشکل ہوگی'' لیاقت نے مکاری سے کہا۔ ''لے یہ اس کی دکان کے آگے ڈال دینا۔ جبار نے ایک پڑیا لیاقت کو پکڑا دی اور لیاقت نے ایک لفافہ اس کے قدموں میں رکھ دیا۔ لیاقت کا کپڑے کا کاروبار تھا اور اللہ کے حکم سے اچھا چل رہا تھا مگر حسد ایسی چیز ہے جو انسان کو سب کرنے پر مجبور کردیتی اور وہ جائز و ناجائز سب بھول جاتا ہے۔ اگلے دن موقع دیکھ کر لیاقت نے وہ پڑیا کریم کی دکان کے آگے ڈال دی۔ اس پڑیا سے رائی کے دانے نکل کر بکھر گئے۔ اس سے اگلے روز سب کو پتہ چلا کہ رات کریم کی دکان میں آگ لگ گئی اور اس کا لاکھوں کا مال جل کر راکھ ہوگیا۔

''بس اب تو صرف آپ کا ہی آسرا ہے۔'' عورت نے سر جھکا کر جبار سے کہا۔

''نہیں ملے گا وارث، اس عورت کو نکال دے اور دوسری لے آ۔ یہ تیرے بیٹے اور گھر دونوں کے لئے منحوس ہے۔'' جبار نے آنکھیں بند کر کے کہا۔

مگر کیسے نکالوں؟'' عورت نے پوچھا۔

''یہ پکڑ! اس کو پانی میں ڈال کر پلا دے۔'' اس کے منہ سے وہی الفاظ نکلیں گے جو ہم چاہیں گے۔

عورت نے کاغذ مٹھی میں دبا لیا اور گھر جا کر اس

کی ہدایت کے مطابق اپنی بہو کو پلا دیا۔ اگلے روز اس کے بیٹے اور بہو کا زبردست جھگڑا ہوا۔ یہ بات کیا تھی گھر کے دوسرے لوگوں کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا عورت کے بیٹے کا کہنا تھا کہ بات ایسی تو نہیں ہے جس پر لڑائی کی جائے جبکہ بہو کا کہنا تھا کہ اسے اب اس گھر میں نہیں رہنا۔ بہو کی سوئی بس اسی بات پر اٹکی ہوئی تھی۔ لڑکے نے ایک زوردار تھپڑ اس کے جڑ دیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور کہنے لگی۔ ''مجھے ابھی اس وقت طلاق چاہیے۔''

گھر کے سارے لوگ اس کو سمجھانے لگے مگر اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ پڑوسی بھی جاگ گئے اور پورا محلہ ان کے گھر کے آگے جمع ہوگیا۔ پھر جب بات شوہر کی برداشت سے باہر ہوگئی تو اس نے بیوی کو طلاق دے دی۔ سارے لوگ اس عورت پر تھوتھو کرنے لگے۔

''کیسی بدذات ہے۔ جو خود اپنا گھر خراب کررہی ہے۔'' وہ خاموشی سے اپنی ماں کے گھر چلی گئی۔

شاہانہ بیگم دروازے پر بے ہوش پڑیں تھیں اور ان کے شوہر منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر انہیں ہوش میں لارہے تھے۔ اور ساتھ ہی اپنی بیٹی کی جانب غصے سے دیکھ بھی رہے تھے۔ جو صرف اتنی سی بات پر طلاق لے آئی تھی کہ اس کے شوہر نے دو چار روز بعد اس کی ماں کے گھر جانے کا کہا تھا، اس کا کہنا تھا کہ آج کل وہ بہت مصروف ہے۔ دو چار روز بعد لے چلے گا۔

شاہانہ بیگم کو ہوش تو آ گیا مگر ان کی زبان بند ہوگئی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ ان کے اعمالوں کی سزا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں ہی ان کی بیٹی کی صورت میں دی تھی۔ اپنی نند کی بیٹی کا خون جو تھا ان کی گردن پر۔

جبار اپنا ایمان تو خراب کرہی چکا تھا۔ اور برائی اور غلاظت کے دلدل میں سر سے پیر تک دھنسنے کے بعد وہ اس احساس سے عاری ہو چکا تھا کہ وہ کتنے لوگوں کی زندگیوں سے کھیل چکا ہے۔ کتنوں کا گھر اجاڑ چکا ہے۔ اس کا کوئی مذہب نہیں تھا بس اس کا دین ایمان سب کچھ پیسہ تھا۔ جبکہ بے وقوف لوگ اس غلیظ کو کوئی اللہ والا سمجھ کر اس کے پاس آتے تھے۔

''بابا جی! آپ کے حکم کے مطابق میں نے اپنی بہو کو نکال کر اپنے بیٹے کی دوسری شادی کروادی ہے۔''

''ہوں!'' جبار نے عورت کی بات سن کر کہا۔ ''ایسا کر یہ اپنی بہو کو دودھ میں دے دینا، مگر دھیان رہے ٹھیک بارہ بجے!'' جبار نے ایک پڑیا عورت کو دی اور کہا۔ عورت نے پڑیا لی اور نوٹوں کی ایک موٹی سی تہہ اس کے پیروں میں رکھ دی۔ عورت نے گھر جا کر پڑیا کھول کر دیکھی اس میں بابا نے یہ بھی کہا تھا کہ۔ ''یہ دودھ میں پڑتے ہی حل ہوجائی گی۔'' سوئی کے ٹوٹے ہوئے ساتھ ٹکڑے تھے۔

اس نے دودھ کا گلاس بھرا اور وہ ٹکڑے گلاس میں ڈالنے والی تھی کہ کہ کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ عورت نے چونک کر دیکھا تو وہ اس کا بیٹا تھا۔ ''امی یہ کیا کررہی ہیں آپ؟'' اس نے حیرت سے پڑیا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! یہ تیری خوشی کے لئے ہے۔ ایک بہت بڑے بابا نے دی ہے۔'' عورت نے جلدی سے کہا۔

''امی! آپ کو علم ہے کہ آپ کیا کررہی ہیں۔ یہ سوئیاں ہیں، کوئی انسان اس کو کیسے کھا سکتا ہے۔ آپ کو احساس ہے اس کا اور جہاں تک خوشی کی بات ہے تو میرے رب نے اگر میرے نصیب میں یہ خوشی لکھی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی اور اگر میرے رب کا حکم نہیں ہے تو دنیا کا کوئی شخص مجھے نہیں دے سکتا۔ امی! کیا ہمارا ایمان اتنا کمزور ہے کہ ہم اللہ کے بجائے ان ڈھونگیوں کے پاس جائیں۔ اور اس سے مانگیں۔ ٹھیک ہے اب یہ میں کھاتا ہوں دیکھتا ہوں کہ کیا ہوتا ہے۔'' اور اس نے وہ سوئیاں دودھ کے گلاس میں ڈال کر حلق سے اتار لیں۔ اس کی ماں اسے روکتی رہ گئی مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ لمحہ بھی نہ گزرا تھا اس کا بیٹا تڑپنے لگا۔ وہ زمین پر لوٹ رہا تھا۔

عمل کی ہوئی سوئیاں اس کے جسم کے اندر تیر رہی تھیں اور وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر ٹھنڈا ہوگیا۔ اس کی

ماں نے چیخ چیخ کر لوگوں کو جمع کیا اور اسے اسپتال لے گئی مگر اس کے جسم میں کسی سوئی کا نام و نشان تک نہ ملا۔ اس عورت کو بھی اپنے کیے کی سزا مل گئی۔

کہتے ہیں ناں جب گناہ حد سے زیادہ ہو جائیں تو پھر اس کی سزا سامنے آجاتی ہے۔ اور ایسا ہی جبار کے ساتھ بھی ہوا۔ وہ شاید بھول گیا تھا کہ جس پروردگار نے اس کی رسی ڈھیلی کی ہے۔ جب وہ کھینچے گا تو وہ کچھ بھی نہ کر سکے گا۔

جبار آدھی رات کے بعد مرگھٹ سے واپس آرہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا کہ اچانک جانے کہاں سے ایک فقیر اس کی گاڑی کے آگے چلنے لگا۔ اس نے ہارن پر ہارن دیتا رہا کہ وہ ہٹ جائے مگر وہ اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ جھنجھلا کر وہ گاڑی سے باہر آیا اور بولا۔ ''ایک طرف ہو، مجھے جانا ہے۔''

''سڑک کیا تیرے باپ کی ہے؟'' فقیر نے حقارت سے کہا۔

''اے بڈھے ہوش کے ناخن لے اور زبان سنبھال! مجھے تو جانتا نہیں ہے۔'' جبار نے غصے سے کہا۔

''تجھے! جانتا ہوں۔ ناپاک، اور غلاظت کھایا ہوا، تیری حقیقت کیا ہے؟ میرے سامنے۔'' فقیر نے اطمینان سے کہا۔

''بکواس بند کر ابھی مجھے جلدی ہے ورنہ تجھے مزا چکھا دیتا۔'' جبار بولا۔

''روکا کس نے ہے؟'' فقیر بے خوفی سے بولا۔

''ٹھہر!'' اور پھر جبار کے ہونٹ ہلنا شروع ہو گئے۔ مگر وہ چونک کر رک گیا۔ پھر اس نے سر جھٹک کر دوبارہ کوشش کی مگر اسے کوئی لفظ بھی یاد نہ آیا۔

''کر لی کوشش؟'' فقیر یہ کہتا ہوا اسے گھور کر دیکھا تو جبار کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اتنا جلال تھا اس فقیر کے چہرے پر ''تجھ جیسے ایمان سے خارج کی کیا اوقات جو ایک مسلمان کا مقابلہ کرے۔ بدنصیب تو نے اپنا ایمان خود خراب کیا ہے۔ بدنصیب تو اسی وقت سے ہو گیا تھا جس روز تو نے اپنی ماں پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ پھر تو نے گند کھا کر اپنا ایمان کھویا اور اسی پر بس نہیں تو نے کتنے گناہ کیے، کتنے لوگوں کی زندگیاں برباد کیں۔ تیری رسی ڈھیلی تھی کہ شاید تو اپنے گناہوں سے توبہ کر لے مگر تو نے توبہ کا سارا وقت گنوا دیا، تیرا وقت اب ختم۔'' یہ کہہ کر فقیر نے جبار کے منہ پر تھوک دیا۔

جبار کو ایسا لگا کہ جیسے کسی نے اس کے منہ پر تیزاب انڈیل دیا ہو۔ اتنی جلن اس کے چہرے پر ہو رہی تھی کہ وہ گلا پھاڑ کر چیخنے لگا۔ اس نے اپنا منہ صاف کرنے کے لئے اپنا دایاں ہاتھ اٹھانا چاہا تو اس کا ہاتھ مفلوج تھا۔ اس نے فقیر کی طرف دیکھا مگر وہاں کسی کا نام و نشان نہ تھا اور فضا میں اذان فجر کی آواز گونجنے لگی۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس کی حالت بگڑنے لگی۔ کوئی نہ جانتا تھا۔ کہ وہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ کسی کو معلوم نہ تھا۔ اس کے پورے جسم پر بڑے بڑے زخم ہو رہے تھے۔ اور ان زخموں میں بے پناہ تکلیف ہونے لگی تھی۔ اور خاص طور سے جب دھوپ تیز ہوتی تو اس کی تکلیف میں شدید اضافہ ہو جاتا جس کی وجہ سے وہ تڑپنے لگتا اور چیخنے لگتا۔

بس آسمان کی طرف منہ اٹھائے اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے تھے۔ اور پھر ایک دن وہ سڑک کے کنارے مردہ پایا گیا۔

ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ہم اللہ کے محتاج ہیں۔ اللہ ہی ہمارا مالک ہے۔ وہ ہمیں دینے والا۔ جبار جیسے لوگوں کے پاس جا کر کیوں اپنا آپ خراب کریں۔ جو چیز انسان کے نصیب میں نہیں ہو وہ اسے کیسے مل سکتی ہے۔ جو مانگنا ہے اللہ تعالیٰ سے مانگیں وہ ہماری جائز خواہشات ضرور پوری کرے گا اور کسی دوسرے کا برا چاہنا یہ کون سی اچھی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان سب چیزوں سے بچائے (آمین)

خوفناک وکٹوریہ

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

کوچوان سمیت وکٹوریہ میں تین آدمی بے حس و حرکت بیٹھے تھے ان کے چہرے سفید لٹھے کی طرح نظر آرہے تھے، ان میں زندگی کی رمق باقی نہیں تھی، لیکن پھر اچانک ایک دل دہلانے والا منظر رونما ہوا

پراسراریت کے لبادے میں لپٹا ہوا ایک عجیب و غریب اور دہشت ناک شاخسانہ

جو حالات میں آپ کے سامنے بیان کرنے لگا ہوں ان کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ حقیقت پر مبنی ہیں۔ یہ واردات خود مجھ پر گزری ہے۔ اور اس کی جزئیات میرے ذہن میں آج بھی ایسے ہی تازہ ہیں جیسے کل کی بات ہو حالانکہ اس واقعہ کو پورے بیس سال بیت چکے ہیں۔ ان بیس سالوں کے طویل عرصے میں، میں نے صرف ایک آدمی کو اپنی یہ سچی آپ بیتی سنائی تھی۔ کیونکہ اسے بیان کرتے ہوئے ایک سنسنی میرے جسم میں دوڑ جاتی ہے اور رواں رواں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ سے فقط اتنا چاہتا ہوں کہ آپ جو بھی نتائج اخذ کریں اپنے تک ہی رکھیں انہیں مجھ پر ٹھونسنے کی کوشش ہرگز نہ کیجئے گا، میں کوئی توضیح یا تشریح سننے کے لئے تیار نہیں، نہ مجھے دلیلیں قائل کر سکتی ہیں۔ اس واقعے کے بارے میں میرا ذہن قطعی صاف ہے، اپنے

حواس کی درستگی پر بھی یقین ہے اور جو فیصلہ میں کر چکا ہوں اس پر قائم رہوں گا۔

ہاں تو سنئے! ٹھیک بیس سال پہلے کی بات ہے۔ کراؤس (یورپی پرندہ) کے شکار کا موسم ختم ہونے میں صرف تین چار دن باقی تھے۔ میں اپنی بندوق لئے سارا دن شکار کی تلاش میں پھرتا رہا مگر کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ مشرق سے آندھی آنے کا امکان تھا۔ دسمبر کا مہینہ اور مقام انگلستان کے انتہائی شمال میں وہ وسیع علاقہ تھا جو بالکل اجاڑ اور بنجر ہے۔ سفید سفید پروں کی مانند برف کے نرم گالے گرنے لگے تھے۔ جو ببول جیسی "ہیدر" کی جھاڑیوں میں پھولوں کی طرح اٹکتے جارہے تھے۔ یہ برف باری کسی شدید طوفان کی آمد کا اعلان تھی۔ دھند نے شام سے پہلے ہی ملگجا دھندلکا چاروں طرف پھیلا دیا تھا اور اس دھند میں گھر کا راستہ بھول گیا۔ وہ سماں، وہ ماحول اور یک وتنہا راہ گم کردہ انسان! تصور کیجئے میری کیا حالت ہوگی۔ ایک اضطراب اور پریشانی کے عالم میں آنکھوں کے سامنے ہاتھ کا چھجا سا بنائے راہ تلاش کرنے کی کوشش اور بڑھتی ہوئی تاریکی میں آگے ہی آگے چلا جارہا تھا۔ اودے رنگ کے کلرز زمین پر چھوٹے چھوٹے ٹیلے کی طرح ابھرے ہوئے تھے جن کا سلسلہ تقریباً دس بارہ میل تک چلا گیا تھا۔ نہ کہیں دھوئیں کی رمق نہ کہیں کھیتی باڑی کا نشان، نہ آدم نہ آدم زاد، ہر طرف ہو کا عالم اور سنسان بیابان۔ بار بار ادگرد دیکھتا تھا کہ کہیں کوئی پناہ لینے کی جگہ نظر آئے مگر توبہ کیجئے اس کا گمان بھی عبث تھا۔

میں صبح ناشتہ کرتے ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا اور اب تک ایک دانہ بھی منہ میں نہیں پڑا تھا۔ بھوک، پیاس، تھکان اور گھبراہٹ نے مجھے بالکل نڈھال کر دیا تھا مگر ضعف ونقاہت کے باوجود، میں بندوق کندھے پر رکھے بوجھل قدموں سے آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔

شاید قدرت کو میری قوت برداشت اور صبر کا امتحان منظور تھا کہ موسم کی شدت میں اضافہ کرنے کے لئے حوصلہ شکن تیزی سے برف باری ہونے لگی۔ سردی ناقابل برداشت ہوگئی اور رات سر پر آ گئی۔ میری بے بسی کا یہ عالم تھا کہ تاریک آسمان کی طرح مستقبل بھی سیاہ معلوم ہونے لگا تھا۔ کہیں امید کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی تھی۔ مجھے پکا یقین ہوگیا کہ میں صحرائے موت میں آ گیا ہوں۔ اب بچ نکلنا ممکن نہیں۔

اس روح فرسا خیال کے ساتھ ہی میری آنکھوں کے سامنے اپنی بیوی کی معصوم صورت آ گئی۔ دل اور بھی بوجھل ہوگیا۔ وہ بہت بھولی بھالی تھی کیونکہ فقط چار مہینے تو ابھی ہماری شادی کو ہوئے تھے۔ ہمارے سینے ارمانوں سے بھرے تھے اور اتنی جلدی دائمی قیامت سے کم نہ تھی۔ صبح جب میں گھر سے نکلا تھا تو اس نے بڑے محبت بھرے انداز میں مجھ سے جلدی لوٹ آنے کا تقاضا کیا تھا۔ اور میں نے اسے پکا یقین دلایا تھا کہ رات ہونے سے پہلے ہی گھر پہنچ جاؤں گا۔ میں سوچنے لگا اس بے چاری کا کیا حال ہورہا ہوگا۔ اس کے دل میں کیسے کیسے وسوسے پیدا ہورہے ہوں گے۔ وہ اس ریگنتی ہوئی رات میں نہ جانے کب تک کھڑی میری راہ تکتی رہے گی۔ اس کا نازک دل اکیلے میں ہول رہا ہوگا۔ کیسی منحوس گھڑی تھی جب ہم نے موسم خزاں اس پہاڑی علاقے میں گزارنے کا پروگرام بنایا تھا۔

آہ! اب میں یہاں میلوں تک پھیلی ہوئی تاریک وسنسان وسعتوں میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ اور وہ بدنصیب ایک دور افتادہ گاؤں کی بے رونق سرائے میں میری واپسی کی آس لگائے بیٹھی ہے۔ اپنی رفیق حیات کا خیال ہی وہ قوت بخش تصور تھا جس کے سہارے تھکن سے چور چور ہونے کے باوجود اس امید میں آگے بڑھ رہا تھا کہ شاید ایسا ٹھکانہ مل جائے جہاں تھوڑا بہت کھانا اور چند لمحے کا آرام میسر آجائے۔ پھر تو میں آدھی رات سے پہلے پہلے اپنی فکرمند بیوی کے پاس پہنچ سکتا ہوں۔ کاش! کوئی راستہ بتانے والا ہی مل جاتا۔ مگر کوئی امید بر نہیں آرہی تھی۔

رات گہری اور ڈراؤنی ہوتی گئی، برف باری مسلسل ہوتی رہی اور میں انجانے راستوں پر چلا جارہا تھا۔ بار ہا میرا دل گھبرا جاتا، دہشت طاری ہونے لگتی اور

میں بے اختیار مدد کے لئے زور زور سے پکار اٹھتا مگر کہیں سے کوئی جواب آنے کے بجائے میری ہی آواز رات کے سناٹے میں دیر تک گونجتی رہتی اور ماحول کو مزید ڈراؤنا بنا جاتی۔ آخر یہ تکلیف دہ اور اذیت ناک احساس پیدا ہونے لگا کہ اس بھیانک کالی رات میں چلتے چلتے میں موت کی تاریک وادی میں اتر جاؤں گا۔

مجھے ان راہ گم کردہ مسافروں کی الم ناک داستانیں یاد آ گئیں جو اسی طرح برف باری میں جائے پناہ نہ پاکر برف پر گرے اور موت نے انہیں اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ میں نے خود سے سوال کیا "تم آخر کب تک چلتے رہو گے؟ وہ لمحہ قریب ہے جب اعضاء چلنے سے جواب دے جائیں، قوت برداشت سلب ہوجائے اور عزم واستقلال ساتھ چھوڑ دیں۔ اس وقت موت کا ہوکا عفریت تمہیں دبوچ لے گا۔ تم چپ چاپ اس کا نوالہ بن جاؤ گے" ان بھیانک خیالات کی یورش سے بچنے کے لئے میں پھر زور زور سے چلانے لگا۔ میری آواز ویسی ہی دردناک تھی جو ایک ڈوبتے ہوئے آدمی کے حلق سے نکلتی ہے۔

ایک لمبی ہانک لگا کر میں غور سے سننے لگا کہ کسی طرف سے کوئی جواب آتا ہے یا نہیں اور میرا دل دھڑک اٹھا جب مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہیں دور بہت دور سے کسی نے میری پکار کا جواب دیا ہے۔ نہ جانے وہ فریب سماعت تھا یا میری ہی صدائے بازگشت، واقعی اس صحرائے بے کراں میں کوئی دوسرا متنفس بھی موجود ہے؟ میں نے حقیقت کی جستجو میں پے در پے صدائیں بلند کرنا شروع کردیں۔ اور خوشی کی کوئی حد نہ رہی جب اتھاہ تاریکی میں حد نظر پر مدھم سی روشنی کا ایک ننھا سا ہالہ ابھرتا ڈوبتا دکھائی دیا۔ میں اپنی پوری قوت سے اس روشنی کی طرف دوڑا جو دھیرے دھیرے قریب تر اور روشن تر ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ میں ایک بوڑھے آدمی کے سامنے جا کھڑا ہوا جس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ سب سے پہلا فقرہ جو بے اختیار میرے منہ سے نکلا وہ یہ تھا۔ "شکر ہے خدا کا!"

بوڑھے نے لالٹین اوپر اٹھائی، تیوری چڑھائے آنکھیں بھینچ بھینچ کر میری صورت دیکھی اور جلے بھنے لہجے میں غرا کر بولا۔ "کس بات کا شکر کررہے ہو؟"

میں نے فوراً جواب دیا۔ "تمہارے ملنے کا بابا، میں اس خیال سے ڈرنے لگا تھا کہ کہیں برف میں دفن ہو کر ہی نہ رہ جاؤں۔"

"کیا حرج تھا؟ یہاں تو آئے دن یہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ لوگ مٹی کے ڈھیلوں کی طرح برف میں دبتے رہتے ہیں۔ اگر قدرت نے تمہارے مقدر میں بھی اسی طرح مرنا لکھ دیا ہے تو کون روک سکتا ہے۔ کیا کہتے ہو؟"

مجھے بوڑھے کی اس بے رخی اور شقی القلبی پر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ تاہم میں نے زندہ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔ "محترم! اگر خدا کی یہی مرضی ہے تو اب ہم دونوں ہی برف میں دب کر مریں گے۔ مجھے قدرت کے فیصلے سے انکار نہیں مگر تمہارے بغیر ہرگز نہیں مروں گا۔ اچھا یہ تو بتاؤ! یہاں سے ڈولڈنگ کتنی دور ہوگا؟"

"بھلے سے بیس میل ہوگا کچھ کم یا زیادہ!"

"اور نزدیک ترین گاؤں کتنے فاصلے پر ہے؟"

"سب سے پاس والا گاؤں وانیک ہے۔ اور وہ دوسری طرف بارہ میل دور ہے۔"

میں اس کے جواب پر حیرت زدہ تھا۔ پھر پوچھا۔ "بابا ادھر بیس میل پر آبادی ہے اور ادھر بارہ میل سے پہلے کہیں آبادی کا نشان تک نہیں پھر تم کہاں رہتے ہو؟"

اس نے لالٹین والے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ادھر..... پیچھے!"

میں بوڑھے کے سر ہوگیا کہ تمہارے ساتھ چلوں گا۔ وہ میرے اصرار پر برہم ہو کر ساتھ چلنے سے منع کرتا، اور بڑبڑاتا رہا کہ "میں تمہیں اپنے گھر میں گھسنے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔" بوڑھا سخت آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بہت بے مروت اور دل جلا۔ وہ نفی میں سر ہلاتا بالشتیے کی طرح پھدکتا رہا اور میں سائے کی طرح ساتھ لگا رہا۔ حتیٰ کہ وہ ایک مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ بوڑھے نے تالے میں چابی گھمائی اور میں نے لالٹین کی دھندلی

سی روشنی میں دیکھا کہ وہ دروازہ کسی قلعے کے دروازے کی مانند مضبوط تھا۔ چوبی دروازے پر آہنی میخیں ترتیب سے جڑی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی دروازہ کھلا، میں بوڑھے کو دھکیل کر اس سے پہلے اندر داخل ہوگیا۔

میں نے خود کو ایک وسیع ہال میں پایا جس کی چھت شکستہ ہوکر جھک آئی تھی۔ وہ بڑا کمرہ حیرت انگیز حد تک خستہ اور گندہ تھا۔ اور رہائشی استعمال سے زیادہ گودام دکھائی دیتا تھا۔ ایک کونے میں چھت تک اناج کا ڈھیر لگا تھا، دوسری طرف اوپر تلے آٹے کی بوریاں تھیں۔ ادھر ادھر زراعتی آلات، لکڑی کے ڈول، ٹوٹے پھوٹے اوزار اور دیگر کاٹھ کباڑ بھرا پڑا تھا۔ کڑیوں سے سوکھے گوشت کے بہت بڑے بڑے ٹکڑے قطار در قطار ٹنگے تھے۔ عین وسط میں کوئی عجیب سی چیز ایک میل خوردہ پھٹی پرانی چادر میں لپٹی رکھی تھی۔ میں حیرت اور تجسس پر قابو نہ پاسکا اور چادر کا کونا اٹھا کر دیکھا۔ وہ ایک بہت بڑی دوربین تھی جس کے شیشے کا قطر بلا مبالغہ پانچ انچ تھا۔ میں ایک ایک چیز پر حیرت زدہ تھا کہ اچانک بہت زور سے گھنٹی بجی، بوڑھا گھنٹی کی آواز سن کر عجیب انداز میں مسکرایا اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یہ آپ کی طلبی ہورہی ہے جناب، ادھر ان کا کمرہ ہے۔“

اس نے ہال کے سامنے والی دیوار میں ایک سیاہ دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں جان بوجھ کر زور زور سے قدم رکھتا ہوا ادھر بڑھا۔ اور اجازت لئے بغیر اندر جا پہنچا۔ نیم تاریک کمرے میں ایک بوڑھا جس کا سر غیر معمولی طور پر بڑا اور سفید بالوں سے بھرا ہوا تھا میز کے قریب بیٹھا تھا۔ میز پر کتابوں اور کاغذات کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی غیر مصالحانہ انداز میں کرسی سے اٹھا اور کرخت لہجے میں جھڑک کر پوچھا۔ ”کون ہیں آپ؟ یہاں کیسے آئے؟ آپ چاہتے کیا ہیں؟“

میں نے بھی تیزی سے ترکی بہ ترکی ہر سوال کا مختصر جواب دیا۔ ”جیمز مرے، بیرسٹر ایٹ لاء بنجر علاقے میں پیدل چلتے چلتے کھانا، شراب اور آرام!“

اس کی بھنویں سکڑ گئیں، برہمی اور غصے کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ”مگر میرا گھر کوئی سرائے نہیں ہے۔“

پھر بڑے غضب ناک انداز میں گرج کر بوڑھے کو ڈانٹا۔ ”جیک! تم نے انہیں اندر کیسے آنے دیا؟“

وہ بوڑھا لجاجت سے بولا۔ ”نہیں جناب! میں نے بہت منع کیا مگر یہ مجھے دھکا دے کر زبردستی مجھ سے پہلے گھر میں گھس آئے۔ میں اتنے لمبے چوڑے سوا چھ فٹ کے آدمی کا مقابلہ تو نہیں کرسکتا سرکار!“

وہ غصے میں پھنکارا۔ ”اب فرمایئے جناب! میرے گھر میں زبردستی گھسنے کا آپ کو کیا حق ہے؟“

”وہی جس کے تحت ڈوبنے کی حالت میں آپ کی کشتی میں سوار ہوسکتا تھا۔ حفاظت خود اختیاری کا حق!“

”کیا معنی؟ حفاظت خود اختیاری کا کیسا حق؟“

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”زمین پر ایک انچ برف جم چکی ہے۔ صبح تک اتنی گہری ہوجائے گی کہ جس میں میرا وجود چھپ جائے۔“

وہ تیزی سے کھڑکی کی طرف گیا پردہ ہٹا کر دیکھا اور بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”سچ کہتے ہو، اگر پسند کرو تو رات بسر کرسکتے ہو جیک کھانا لاؤ۔“ یہ کہتے ہوئے مجھے شانوں سے پکڑ کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ خود اپنی کرسی سنبھال کر پہلے کی طرح مطالعہ میں پورے انہماک سے مصروف ہوگیا۔

میں نے بندوق کونے میں رکھ کر کرسی آتش دان کے قریب کھینچ لی۔ اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ کمرہ بھی ایسی اشیاء سے بھرا ہوا تھا جو میرے لئے عجیب اور باعث حیرت تھیں۔ دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا اور بدنما نقشے سے بن گئے تھے۔ الماریوں میں موٹی موٹی پرانی کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ انگیٹھی پر نظام شمسی کا ایک نمونہ رکھا تھا۔ ارضیاتی نمونے، عمل جراحی کا پورا سامان، کٹھالیاں، قرنبیق، بلوریں پیالے اور ایک خوردبین رکھی تھی۔ ہر طرف کتابوں کا ایک ڈھیر لگا تھا کرسیوں پر بھی کتابیں رکھی تھیں۔ فرش پر نقشے، زائچے، کاغذات، چربے اور لکھنے پڑھنے کی ہر وہ چیز

جس کا تصور کیا جاسکتا ہے بکھری پڑی تھیں۔

ہر چیز حیرت انگیز اور انوکھی تھی۔ بار بار میری نظر میزبان سے کمرے کے آخری سرے تک اور پھر لوٹتی ہوئی میزبان پر آکر ٹھہر جاتی تھی۔ میں ماحول سے متاثر ہوکر اس الجھن میں مبتلا تھا کہ اس اجاڑ وسنسان میلوں تک پھیلے ہوئے بنجر علاقے میں رہنے والا یہ شخص کون ہے؟ اس کا سفید الجھے بالوں والا بڑا سر جو کنپٹیوں کے رخ زیادہ چوڑا تھا، بڑا پرکشش تھا اور لوشیں دان بیتھوون سے مشابہ تھا۔ اس کی انہماک اور محویت بھی بالکل ویسی ہی تھی۔ ابھی میں مشاہدے میں گم تھا کہ جیک کھانا لے کر آگیا۔ اس کے آقا نے زیر مطالعہ کتاب بند کی، اٹھا اور خندہ پیشانی سے مجھے دسترخوان پر آنے کی دعوت دی۔ دسترخوان پر گوشت، انڈے، خستہ روٹی اور سرور بخش شراب کی بوتل تھی۔ اس نے خوش دلی سے کہا۔ ”جناب! ہر شے گھر کی ہے۔ اس ماحضر سے اشتہا تو کیا بجھے گی البتہ امید ہے نقاہت اور کمزوری کسی حد تک دور ہوجائے گی۔“

اس نے صرف ایک پیالہ دلیہ، گلاس دودھ لیا، جو خاص طور پر اس کے لئے تھا۔ میں نے کھانے کی بہت تعریف کی جس کا اس نے شکریہ ادا کیا۔ اور کھانے سے فارغ ہوکر میرے ساتھ ہی آتش دان کے پاس آبیٹھا۔ پھر اچانک بولا۔ ”جناب میں گزشتہ تیس سال سے اسی جگہ مکمل گوشہ نشینی کی زندگی بسر کررہا ہوں۔ چار سال پہلے ایک آدمی یہاں پہنچ گیا تھا، یا آج آپ نے اس دہلیز کے اندر قدم رکھا ہے۔ آپ کی دنیا سے قطعی لاتعلق ہوچکا ہوں۔ لہٰذا اگر آپ مجھے کچھ معلومات بہم پہنچائیں تو بڑی عنایت ہوگی۔“

میں اس غیر متوقع سوال پر قدرے بوکھلا گیا پھر سنبھل کر بولا۔ ”میں اپنی بساط بھر جواب دینے کی کوشش کروں گا۔“ اس نے بڑے عجیب عجیب سوالات کا سلسلہ شروع کردیا۔ جن کا تعلق سائنسی ایجادات اور ان کی انسانی زندگی پر اثرات سے تھا۔ میں سائنس کا طالب علم نہیں تھا اور ان باتوں سے تقریباً نابلد تھا۔ اس لئے تسلی بخش جوابات نہ دے سکا۔ جب اس نے یہ سلسلہ بند کیا تو میں نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ لیکن اب اس نے میری فراہم کردہ معلومات پر بحث کے انداز میں اپنے استنباطی خیالات کا اظہار شروع کردیا۔ اس کی کہنیاں گھٹنوں پر رکھی تھیں، ہتھیلیوں پر چہرہ ٹکا ہوا تھا اور نگاہیں آگ پر گڑی تھیں۔ وہ بولتا رہا اور میں سحر زدہ معمول کی طرح بے حس وحرکت بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ تقریر میں اتنا ڈوب گیا کہ میری موجودگی کا بھی احساس نہ رہا اور جیسے تصور میں کسی عظیم مجمع کے سامنے تقریر کرتا رہا۔ ایسی فصیح وبلیغ، شستہ ورواں اور مدلل عالمانہ تقریر میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ اور نہ اس کے بعد آج تک کہیں ایسی تقریر سنی ہے۔ عملی سائنس سے لے کر ذہنی نظریات تک خارجی کائنات سے لے کر ہیئت اراضی تک، مادہ سے روح اور حیات انسانی سے مابعد الموت تک، ہر موضوع پر وہ ایسی فلسفیانہ، دقیق اور مفصل گفتگو کرتا رہا جیسے خواب کی حالت میں بول رہا ہو اور خیالات اسے چلا رہے ہیں۔ برقی قوت سے اعصابی قوت، والٹس میں میس مر، ریشن ہاک سے سویڈن برگ، سپی نوزا، کونڈی لاک، ڈیلس کارٹس، برکلے، ارسطو، افلاطون اور مانی اور دیگر مشرقی صوفیا تک ہر ایک کی ذات اور ان کی تعلیمات پر اس نے علمی ومحققانہ انداز میں روشنی ڈالی۔

رفتہ رفتہ اس کے لہجے میں تلخی پیدا ہوتی گئی اور آخر میں اس نے کہا۔ ”دنیا کی نظر میں ہر وہ بات غیر یقینی اور واہمہ ہے جو عام انسانوں کی محدود عقل پر پوری نہ اترتی ہو دائرہ علم سے ماوراء ہو۔ ہر وہ شے جوان کے چیر پھاڑ کے کمرہ میں زیر تجربہ نہ لائی جاسکے محض فریب اور ناقابل قبول ہے۔ سائنس دان جن، بھوت، بدروحوں کے وجود اور مافوق الفطرت مظاہر کے منکر رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود علم طبیعیات، علم تاریخ اور علم آثار قدیمہ کسی سلسلے میں بھی اتنی متنوع اور بے شمار شہادتیں نہیں ملتیں جتنی اس موضوع کے بارے میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ آخر یہ کیسی توہم پرستی ہے جس کا دنیا بھر کے سائنس دان آج تک تدارک نہیں کرسکے؟ کیا وجہ ہے کہ اتنی ہمہ گیر، وسیع اور قرن ہا قرن سے جاری تحریک تو ہم

پرستی کا قلع قمع نہیں کرسکی؟ آج بھی عہد پارینہ کی طرح دانائے حکمت ودانش اور متین وثقہ بزرگ خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے، کسی نسل اور کسی زبان سے تعلق رکھتے ہوں ان مافوق الفطرت مظاہر کی تصدیق کرتے ہیں۔ چوں کہ میں بھی پہلے آنکھوں دیکھی پر یقین لانے کا قائل تھا اس لئے محض سچائی معلوم کرنے کی خاطر میں نے اپنے آپ کو وقف کردیا۔ تحقیق کی، یقین دلایا اور پوری جرات ودیانت کے ساتھ اپنی اٹل معلومات جو زندگی کا بہترین زمانہ تحقیق وتدقیق صرف کرکے حاصل کی تھیں۔ اور جن کے حصول میں بے حد دکھ، تکالیف اور مصاحب جھیلے تھے دنیا کے سامنے پیش کیں تو مجھے جھوٹا اور احمق قرار دیا گیا۔ سائنس دانوں نے میرا مذاق اڑایا۔ حق پرستی کی مجھے سزا ملی جو مجھ سے پہلے ہوش مندوں کو ملتی رہی ہے۔ میں بدظن اور دل برداشتہ ہوا کہ سب سے کنارہ کش ہوکر یہاں آپڑا جہاں اب آپ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ میں نے دنیا والوں کو بھلا دیا اور انہوں نے مجھے فراموش کردیا۔ یہ تئیس برس پہلے کی بات ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اس طرح اٹھا جیسے گفتگو ختم کرچکا ہو اور گھومتا ہوا کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ پردہ ہٹا کر باہر دیکھا اور کہا۔ "برف باری تھم چکی ہے۔" اور لوٹ کر آتش دان کے قریب آ گیا۔ میں زندگی میں اتنا حیرت زدہ کبھی نہ ہوا تھا۔ جتنا اس کی گفتگو سن کر ہوا۔ میں جیسے خواب سے چونک پڑا اور میرے منہ سے نکلا۔ "رک گئی!" اور اپنے پاؤں پر نگاہیں جمائے سوچنے لگا کہ کیا کوئی تدبیر ایسی ہوسکتی ہے کہ میں بیس میل کا سفر طے کرکے صبح ہونے سے پہلے پہلے گھر پہنچ جاؤں بے اختیار ایک آہ کے ساتھ یہ الفاظ میری زبان پر آگئے۔ "کاش میں بیس میل پیدل چل سکتا۔" میرے میزبان نے میرے الفاظ دہرائے۔ "بیس میل پیدل چل سکتا..... آخر اتنی فکر کس بات کی ہے؟"

اپنی بیوی کی!" میں نے بے تابی کے ساتھ کہا۔ "جو ڈولڈنگ کی ایک سرائے میں تنہا میرے لئے بے قرار اور مضطرب ہورہی ہوگی۔ میں اس قدر پریشان اور بے چین ہوں کہ اگر گھوڑا اور رہبر مل سکے تو اسے دس گنی اجرت دینے کے لئے تیار ہوں۔"

وہ مسکرایا۔ "اگر آپ آٹھ دس گھنٹے صبر اور آرام سے نہیں گزار سکتے تو آپ کی خواہش اس سے کم اجرت پر بھی پوری ہوسکتی ہے۔ شمال سے رات کی ڈاک آتی ہے جو ڈولڈنگ میں گھوڑے تبدیل کرتی ہے۔ یہ وکٹوریہ ڈاک یہاں سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر ایک جگہ سے گزرتی ہے۔ اب سے سوا گھنٹہ بعد وہ اس چوراہے پر پہنچے گی۔ اگر جیک اس اجاڑ بنجر علاقے میں آپ کی راہنمائی کرکے آپ کو پرانی وکٹوریہ روڈ تک پہنچا دے اور اس راستے پر ڈال دے جو آگے جا کر نئی سڑک سے ملتا ہے تو میرا خیال ہے آپ باآسانی گھر پہنچ سکتے ہیں؟"

"یقیناً بڑی خوشی سے۔" وہ میری بے تابی دیکھ کر مسکرایا۔ گھنٹی بجائی، بوڑھے نوکر کو تمام ہدایات دے کر سمجھا دیا۔ پھر دواؤں کی الماری میں سے وہسکی کی بوتل اور ایک پیمانہ نکال کر کہا۔ "برف بہت کافی پڑ چکی ہے۔ اجاڑ اور برفیلے راستے میں رات کے وقت سفر کرنا بے حد دشوار اور تکلیف دہ ہوگا۔ لہٰذا روانہ ہونے سے پہلے ایک گلاس آتش سیال کا اندر چلا جائے تو کیا مضائقہ ہے؟"

میں نے اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے معذرت چاہی مگر اس کے اصرار پر مجبور ہونا پڑا۔ مگر جیسے ہی شراب حلق سے نیچے اتری ایسا محسوس ہوا جیسے اندر آگ لگ گئی ہے۔ میرا سانس تقریباً گھٹ گیا۔ وہ بولا۔ "بہت تیز ہے مگر اب سردی پاس نہیں پھٹکے گی۔ دیر بالکل نہ کریں۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ اچھا شب بخیر!"

میں اس سے مصافحہ کرکے مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا مگر وہ پلک جھپکتے میں ہال بھی عبور کرچکا تھا۔ ہم باہر نکلے جیک نے باہر سے دروازہ مقفل کیا اور ہم دونوں برف کی دبیز تہہ جمی اجاڑ زمین پر چل دیئے۔ کڑاکے کی سردی ہورہی تھی۔ آسمان سیاہ شامیانے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ کہیں مدہم سا ستارہ تک نہ تھا۔

ہمارے قدموں کی چاپ کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ گہرا سناٹا بہت ڈراؤنا اور بھیانک معلوم دیتا تھا۔ میرا باتیں کرنے کو دل چاہ رہا تھا مگر جیک بے زاری کے انداز میں گھٹتا چپ چاپ چل رہا تھا۔ دراصل وہ میرے ساتھ آنے پر خوشی سے رضامند نہیں ہوا تھا۔ میں نے اپنے ذہن کو مصروف رکھنے کے لئے بڑی بڑی رقموں پر سود، در سود کے سوال حل کرنا شروع کردیئے۔ کبھی اس بوڑھے کی تقریر کے فقرے یاد کرکے حیران ہوتا۔ کبھی کوئی گیت گنگنانے لگتا۔ ایک جگہ پہنچ کر جیک اچانک رک گیا۔ اور بولا۔ "وہ ادھر آپ کی سڑک ہے۔ پتھر کی دیوار دائیں ہاتھ رکھ کر چلتے چلتے جانا سیدھے۔"

"اس چوراہے کا فاصلہ کتنا ہے؟"

"یہی کوئی تین میل کے لگ بھگ ہے۔" میں نے بٹوا نکالا تو وہ کھل کر بولنے لگا۔ "پیدل چلنے میں کوئی وقت نہیں ہوگی کافی اچھی سڑک ہے۔ البتہ ڈھلوان بہت زیادہ ہے۔ اور شمال کی طرف اتنی ہے کہ موٹر گاڑی وغیرہ نہیں گزر سکتی۔ چوک میں کھمبے پر سمتوں کے اشارے ہیں۔ جہاں یہ کھمبا ہے وہاں دیوار ٹوٹی ہوئی ہے اس کا دھیان رکھنا۔ یہ جگہ خطرناک ہے۔ جب سے وہ حادثہ ہوا تھا اس کی آج تک مرمت نہیں ہوئی؟"

میں نے چونک کر پوچھا۔ "کون سا حادثہ؟"

"اف! رات کی ڈاک لے جانے والی وکٹوریہ اسی جگہ دیوار سے ٹکرا کر نیچے کھڈ میں جا گری تھی، 500 فٹ سے زیادہ گہرائی ہے۔ سارے ملک میں اتنی خراب کوئی سڑک نہیں ہے جتنی یہ ہے۔"

"اوہو! یہ دیوار کھمبے کے پاس ٹوٹی ہوئی ہے نا؟ میں اس کا خیال رکھوں گا۔ اچھا خدا حافظ!"

"شب بخیر جناب۔ اور شکریہ بھی۔" جیک نے نصف کراؤن جیب میں ڈالا۔ سلام کا خفیف سا اشارہ کیا اور الٹے پاؤں لوٹ گیا۔ جب تک لالٹین کی مدہم روشنی دھندلی ہوتے ہوتے نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اکیلا پرانی وکٹوریہ روڈ پر جلدی جلدی چل دیا۔ مگر جلد ہی تنہائی کا خیال شدت سے ابھر کر مجھے ڈرانے لگا میں اس ڈر پر قابو پانے کی انتہائی کوشش کرتے ہوئے تیز تیز چلنے لگا۔ اب رات کافی بھیگ چکی تھی اور سردی اتنی بڑھ گئی تھی کہ تیز چلنے کے باوجود میرا سارا جسم سردی سے سن ہورہا تھا۔ پاؤں بالکل شل تھے۔ سانس اندرونی خوف کے باعث ایسے پھول رہا تھا جیسے میں سڑک کے بجائے کسی بہت بلند پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی کی طرف قدم بقدم چڑھ رہا ہوں۔ جلد ہی میں ہانپنے لگا اور ایک جگہ رک کر پتھر کی دیوار کا سہارا لینے پر مجبور ہوگیا۔ دیوار سے ٹیک لگاتے ہی اتفاقاً میری نگاہ پیچھے کی طرف اٹھ گئی۔ اور دور بہت دور روشنی کی ایک کرن جگنو کی مانند چمکتی دیکھ کر سارے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی پہلا خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ شاید جیک نئی سڑک تک میرا ساتھ دینے کے لئے لوٹ آیا ہے۔ میں ٹکٹکی باندھے اس روشن نقطے کو دیکھ رہا تھا جو گہری تاریکی میں تیزی سے قریب اور روشن تر ہوتا جارہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس روشنی کے بالکل متوازی ایک اور روشنی نمودار ہوگئی اور یہ دونوں زرد ستارے سے یکساں رفتار سے میری طرف آنے لگے۔ اب میں نے باآسانی اندازہ لگالیا کہ یہ وکٹوریہ آرہی ہے اور یہ دونوں اس کی بتیاں ہیں لیکن حیرت اس بات پر ہوئی کہ ایسی خطرناک سڑک پر جس کے متعلق ہر ایک کو علم ہے کہ وہ ٹریفک کے ناقابل ہے اور ایک زبردست حادثے کو جنم دے چکی ہے کون انجان ہے جو اتنی تیزی سے اپنی گاڑی دوڑائے لارہا ہے۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے لیمپوں کی روشنی اتنی قریب آگئی کہ ان کی دھندلی لائٹ میں گاڑی کا ڈھانچہ واضح ہوکر صاف دکھائی دینے لگا۔ اچانک میرے ذہن میں یہ شبہ گزرا کہ میں اندھیرے میں چوراہا کہیں پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ کھمبے کا بھی دھیان نہیں رہا اور اب میں اس سڑک پر ہوں جہاں سے رات کی ڈاک لے جانے والی وکٹوریہ گزرتی ہے۔ اور یہ وہی وکٹوریہ آپہنچی ہے۔ اگر یہ نکل گئی تو گھر پہنچنے کی امید تا قیامت پوری نہیں ہوگی۔ یہ سوچتے ہی میں وکٹوریہ رکوانے کے

لئے تیار ہوگیا۔ وکٹوریہ سڑک کا موڑ مڑی۔ میں نے دھند اور ہلکی روشنی میں دیکھا کہ وکٹوریہ میں چار گھوڑے جتے تھے جن کے نتھنوں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ پاسبانی اور کوچوانی کے فرائض ادا کرنے والے کے ساتھ ایک سواری بیٹھی تھی۔ میں اچھل کر سامنے آ گیا۔ اپنا ہیٹ ہلایا اور زور سے پکارا۔ مگر وکٹوریہ پوری رفتار سے میرے قریب آ کر گزر گئی۔

اس خیال سے میرا دل بیٹھ گیا کہ شاید انہوں نے مجھے دیکھا ہی نہیں اور نہ میری آواز سنی لیکن دوسرے لمحہ میں نے دیکھا کہ کوچوان نے رسیاں کھینچیں۔ وکٹوریہ رک گئی۔ میں تیزی سے لپکا۔ کوچوان نے سردی سے بچنے کے لئے فرغل آنکھوں تک کیا ہوا تھا۔ اور اطمینان سے بیٹھی ہوئی سواریوں میں سے کسی نے بھی جو وکٹوریہ کی کھڑکھڑاہٹ کے باوجود سوئی ہوئی معلوم ہوتی تھیں میری طرف توجہ نہ دی۔ باہر بیٹھی ہوئی سواری تک نے میری طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ جو جس حالت میں تھا اسی طرح بیٹھا رہا۔ آخر میں نے خود دروازہ کھولا۔ اور اندر جھانکا۔ صرف تین مسافر تھے چنانچہ میں بھی سوار ہوگیا۔ دروازہ بند کرلیا اور خالی کونے میں سکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت اپنی خوش قسمتی پر میں بہت ہی نازاں تھا۔

وکٹوریہ کی اندرونی فضا کی کیفیت الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ باہر کی بہ نسبت اندر زیادہ خنکی محسوس ہوئی۔ ایک سیلی سی ناگوار بو پوری طرح رچی بسی ہوئی تھی میں نے یکے بعد دیگرے تینوں مسافروں کی طرف دیکھا۔ وہ مرد تھے اور پیچھے کی طرف قدرے جھکے اپنے اپنے خیالات میں گم سوئے ہوئے سے لگتے تھے۔ میں نے گفتگو کا سلسلہ جاری کرنے کے لئے اپنے مقابل بیٹھے مسافر کو مخاطب کیا۔ ”آج رات کس قدر شدید سردی ہے!“

اس نے آہستہ سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا مگر کوئی جواب نہ دیا میں نے پھر کہا۔ ”معلوم ہوتا سردی کا موسم آغاز ہی میں اپنا جوبن دکھا رہا ہے۔“ اگر اندھیرا ہونے کی وجہ سے اس مسافر کی صورت صاف دکھائی نہیں دیتی تھی مگر اتنا صاف نظر آتا تھا کہ وہ پوری طرح آنکھیں کھولے مجھے تک رہا ہے۔ پھر وہ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا؟ میں جھنجھلا گیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں اس بے اعتنائی پر جھگڑتا مگر مجھے سفر طے کرنا تھا اس لئے غصہ پی گیا۔

سردی سے میری ہڈیوں کا گودا تک متاثر ہو چکا تھا۔ وکٹوریہ میں بسی ہوئی عجیب بو، ناقابل برداشت تھی۔ دماغ پراگندہ ہو کر ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ اور اپنے بائیں ہاتھ والے مسافر کی طرف مڑ کر اس سے پوچھا کہ اگر اسے کوئی اعتراض نہ ہو تو کھڑکی کھول لوں؟ وہ بھی نہ ہلا جلا نہ کوئی جواب دیا۔ میں نے قدرے بلند آواز میں اپنا سوال دہرایا۔ مگر پھر جواب ندارد۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا چنانچہ جھلا کر کھڑکی کا کھٹکا گرا دیا۔ لیکن کھٹکا گرنے کے ساتھ ہی چمڑے کی پٹی ٹوٹ کر میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے دیکھا کہ شیشے پر پھپھوندی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ برسوں سے وکٹوریہ کی صفائی نہیں ہوئی۔ میرے جسم میں جھرجھری پیدا ہوئی اور میں چوکنا ہو کر ایک ایک چیز کا بغور معائنہ کرنے لگا۔ میں نے اندازہ کیا کہ وکٹوریہ کی شکستگی و کہنگی آخری حد کو پہنچ چکی ہے۔ اس کا ہر حصہ نہ صرف ناقابل مرمت بلکہ بھربھرا ہو چکا ہے۔ دریچے کی جھریاں ہاتھ لگتے ہی ایسے بکھر گئیں جیسے ریت کی بنی ہوئی ہیں۔ چمڑے کے بند گل سڑ کر جگہ جگہ تڑخ چکے تھے۔ فرش پاؤں کا دباؤ پڑتے ہی اس طرح چرچراتا تھا جیسے ٹوٹ رہا ہو۔ الغرض سارا ڈھانچہ حباب کی مانند بودا ہو چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ وکٹوریہ برس ہا برس تک کسی گاؤں کے کچے مکان میں بند رہی ہو اور ابھی ابھی نکال کر سڑک پر لائی گئی ہو تاکہ ایک دو آخری چکر اور لگا لے۔

اب میں تیسرے مسافر کی طرف پلٹا اور ڈرتے ڈرتے اسے مخاطب کر کے کہا۔ ”اس وکٹوریہ کی حالت تو قابل رحم ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے ڈاک لے جانے والی اصل وکٹوریہ آج کل زیر مرمت ہے؟“

اس نے آہستہ سے سر اٹھایا، میری طرف دیکھا

مگر چپ رہا۔ میں تا زندگی اس کی وہ نظر نہیں بھول سکوں گا جو اس نے مجھ پر ڈالی تھی۔ اس سے نظریں ملتے ہی میرا خون خشک ہوگیا۔ ایسی سرد کپکپی مجھ پر طاری ہوئی جیسے دل برف کی ڈلی بن گیا ہو۔ اب اتنے سال گزرنے کے باوجود بھی اس کا تصور کرتے ہوئے میرے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگتے ہیں۔ اف! اس کا چہرہ لاش کی مانند نیلگوں تھا۔ اس کے ہونٹوں میں خون کی رمق تک نہ تھی اور وہ اسی طرح کھنچے ہوئے تھے جیسے اس پر موت کا کرب طاری ہو۔ اور چرے ہوئے ہونٹوں میں سے اس کے دانت دکھائی دے رہے تھے۔

میرے اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر رہ گیا۔ ایک عجیب خوف نے مجھے دبوچ لیا۔ ایک خوفناک دہشت نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اب میری نگاہ وکٹوریہ کی نیم تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو چکی تھی۔ میں نے گھبرا کر اپنے سامنے والے مسافر کی طرف دیکھا اس کی بھی وہی کیفیت تھی۔ چہرے پر زردی کھنڈی تھی اور وہی دل میں اتر جانے والی تیز نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ انتہائی سردی کے باوجود میری پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ میں نے پہلو میں بیٹھے ہوئے مسافر پر نظر ڈالی۔ اف خدایا میں بیان نہیں کر سکتا کہ کیا دیکھا۔ وہ مردہ تھا۔

ان میں سے کوئی بھی زندہ انسان نہیں تھا۔ اور میں خود بھی اپنے آپ کو زندہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ان کے بھیانک اور عفونت چہروں پر کافور کی سی چمک تھی۔ ان کے بالوں میں قبر کے سیلے ہوئے ذرات جمے تھے۔ ان کے کپڑوں پر مٹی لگی تھی اور وہ کرم خوردہ ہو کر جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ ہڈیوں کے ڈھانچے جیسے لمبے لمبے تھے، لگتا تھا انہیں دفن ہوئے مدت گزر چکی اور وہ ابھی ابھی قبروں سے اٹھ کر آئے ہیں۔ ان کی کوئی چیز اگر زندہ دکھائی دیتی تھی تو وہ صرف ان کی بھیانک اور خوفناک آنکھیں تھیں جو بدستور مجھے گھورے جا رہی تھیں۔

ایک دہشت زدہ، ایک دل دوز اور دردناک چیخ، بے اختیار میرے منہ سے نکلی اور میں نے بوکھلا کر دروازہ کھولنے کی ناکام کوشش کی۔ اسی لمحہ بادل کی اوٹ سے پل بھر کے لئے چاند نے اپنا چہرہ نکالا اور اسی روشنی میں، میں نے چوراہے پر اس کھمبے کو بھوت کی طرح کھڑا دیکھا جس پر راستوں کے اشارے لگے تھے اور پلک جھپکنے میں دیوار کا ٹوٹا ہوا حصہ بھی نظروں کے سامنے آ گیا۔

پھر پلک جھپکتے میں وکٹوریہ اور ہنہناتے ہوئے گھوڑے لڑکھڑاتے اور گھومتے ہوئے نیچے اتھاہ گہرے کھڈ میں جا گرے۔ ایک زبردست کان پھاڑنے والا دھماکہ ہوا۔ میرے دل کو زبردست دھچکا لگا اور پھر کچھ ہوش نہ رہا۔

جب مجھے ہوش آیا تو ایسا لگا جیسے میں برسوں کی گہری نیند سے بیدار ہوا ہوں۔ میری بیوی پٹی سے لگی آبدیدہ اور غمگین نظروں سے مجھے تک رہی تھی۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر اس نے خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے جو کچھ بتایا وہ مختصراً یہ تھا کہ میں ایک چٹان پر گرا تھا۔ میری موت یقینی تھی مگر اس برف کی تہہ نے بچا لیا جو چٹان پر تقریباً ایک فٹ جمی ہوئی تھی دن چڑھے چند چرواہوں کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ مجھے وہاں سے اٹھا لائے۔ اور ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے مجھے ہذیانی حالت میں پایا۔ میرا ایک بازو ٹوٹ گیا تھا اور سر میں شدید چوٹیں آئی تھیں۔

میری جیب میں موجود کاغذات سے میرا پتہ چلا۔ میری بیوی کو بلایا گیا۔ جس کی محبت بھری تیمارداری نے مسیحائی کا کام کیا۔ جہاں میں گرا تھا، یہ وہی جگہ تھی جہاں نو برس پہلے رات کی ڈاک لانے والی وکٹوریہ کو حادثہ پیش آیا تھا۔ ان ڈراؤنے واقعات کا جن سے میں دوچار ہوا تھا اپنی بیوی سے قطعاً ذکر نہیں کیا تھا البتہ ڈاکٹر کو بتایا مگر اس نے دماغ پر بخار چڑھنے سے ڈراؤنے خواب دکھائی دینا تعبیر کیا۔ ہماری کافی بحث ہوئی۔ میں اسے حقیقت تسلیم کرانا اور منوانا چاہتا تھا۔ اور ڈاکٹر اسے بخار کی حالت میں دکھائی دینے والا خواب قرار دیتا رہا۔

قارئین! اب آپ بھی جو چاہیں رائے قائم کرلیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ بیس سال قبل روحوں والی اس خوفناک وکٹوریہ میں چوتھی سواری، میں تھا۔

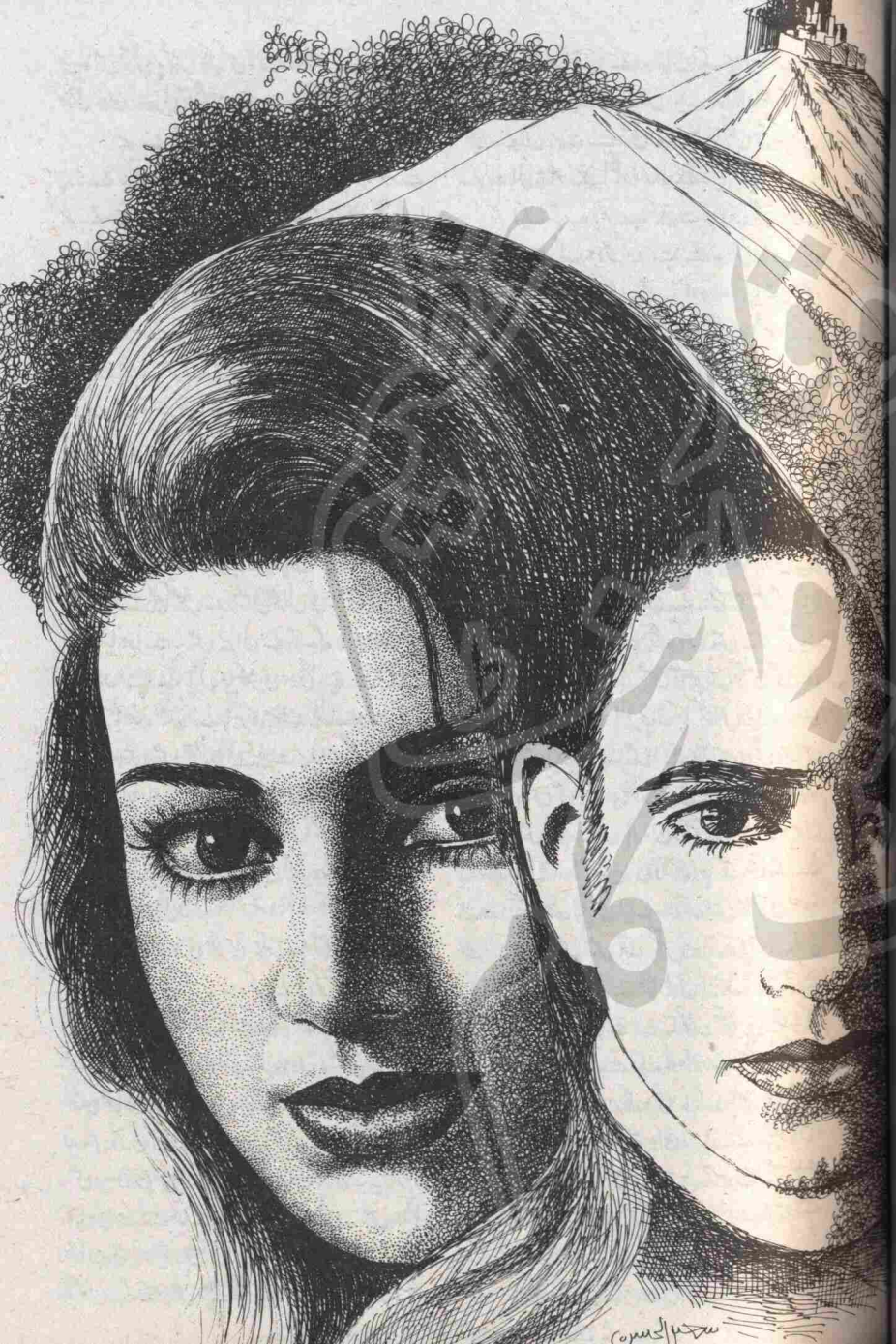

سنہری تابوت

ایم اے راحت

قسط نمبر:3

خراماں خراماں اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ناقابل فراموش کہانی۔

شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اچنبھے میں ڈالتی حیرت انگیز اور تحیر انگیز کہانی

یہ بے وقوف لوگ۔ آشوانی قوت کو کیا جانیں مجھے وہ قوت حاصل ہے کہ میں مستقبل میں جھانک سکتا ہوں۔ میں صدیوں پرانے ماضی سے نکل کر حال میں آسکتا ہوں۔ کیا سمجھ میں دوسروں کے جسم پر قبضہ کرنے کی قوت رکھتا ہوں۔ یہ راز صدیوں سے میرے سینے میں دفن ہے تو نہیں جانتی کہ کتنی کاوشوں کے بعد میں نے صحرائے مصر کے اہرام سے نکل کر انسانی قالب اختیار کیا ہے۔ اس کو بھی برسوں گزر گئے۔ میں کب سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا کہ کوئی ایسا ذریعہ ہو جائے جس سے مجھے ان کھنڈرات تک آنے کا موقع مل جائے اور آخر کار مجھے یہ موقع مل گیا۔

یہ بیوقوفوں کی پوری ٹیم جو سمجھتی ہے کہ آشوانی تہذیب کے سارے راز معلوم کرلے گی، یہاں آئی ہے۔ کیا سمجھی لیکن.....؟

انہوں نے میرا کام آسان کردیا ہے۔ میں کب سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا۔ اور آخر کار یہ دن آ گیا اور اب، اب وہ ہوگا۔ جس کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ تیرا جسم تیرا دماغ میرے قبضے میں ہے۔ اور میں تجھے..... میں تجھے عظیم دور کی نزائلہ کا روپ دوں گا۔ سمجھ رہی ہے ناں تو.....؟ نزائلہ جو صدیوں سے اس کا انتظار کر رہی تھی کہ کوئی اسے ان گہرائیوں سے نجات دلائے۔'' وہ چند لمحات کے لئے خاموش ہوا پھر بولا۔ ''اور کوئی مجھ سے نہیں جیت سکتا۔ آہ..... ماضی میں کیا ہوا ہے تو کیا جانے۔ اس شہر کی تباہی کے طوفان میں نجانے کیا کیا ختم ہوگیا۔ ختم ہوگیا..... سمجھ رہی ناں۔ لیکن ہم نے وقت کے فاصلے عبور کرلئے ہیں۔ ہم تباہیوں کے نرغے سے نکل آئے ہیں۔ جلدی کر نزائلہ میری محبوبہ وقت بہت کم ہے۔'' اس کی آواز بند ہوگئی اور پھر یوں لگا جیسے اچانک کوئی زنجیر سی ٹوٹ گئی ہو۔ میں نے حیران نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اور پھر خوف و حیرت سے دم بخود رہ گئی۔ یہ تو مجھے پہلے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ میں اپنے کمرے میں نہیں ہوں۔

میرے چاروں سمت پتھروں کی سیاہ دیواریں تھیں۔ یہ پورا کمرہ ہی سیاہ پتھر کا بنا ہوا تھا۔ چھت پر ایک خوفناک تصویر بنی ہوئی تھی۔ بند دروازوں کے پٹوں پر بھی مچھلیوں جیسی شکلیں بنی ہوئی تھیں بلندی پر بنے ہوئے دریچوں سے سورج کی تیز روشنی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ پورا کمرہ سیاہ اور چکنے پتھروں کا بنا ہوا تھا۔ میں گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اچانک مجھے یوں لگا

جیسا میں فرش پر نہیں بلکہ کسی آرام دہ پتھر کے بنچ پر بیٹھی ہوئی ہوں۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

میرے شانے عریاں تھے۔ اور پیروں میں چوڑے تسمے والے پنڈلیوں تک کے خوبصورت جوتے تھے۔ بالکل عجیب وغریب لباس تھا میرا۔ ایسا جیسا تابوت میں لیٹی ہوئی لڑکی کا تھا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے کھڑی ہوگئی۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ اگر یہ خواب نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔ یہ تو ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے۔ کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے ایک کونے میں آئینہ نظر آیا۔ اور میں کانپتے قدموں سے آئینے کی سمت بڑھ گئی۔ پھر میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ آہ..... چہرہ تو میرا ہی تھا۔ لیکن بہت ہی عجیب وغریب انداز میں..... میں..... حیران تھی۔

مجھے وہ ساری باتیں یاد آنے لگیں۔ جو روشاق نے کہی تھیں۔ روشاق کمال کی بات ہے۔ یہ سب کیا ہوا ہے۔ میں حیرانی سے آگے بڑھی اور اس بڑے دریچے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ جو مجھے سامنے نظر آرہا تھا۔ میں نے باہر کا منظر دیکھا۔ اور میرے پورے بدن میں عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ نجانے مجھے کیا کیا یاد آرہا تھا۔ قدیم واقعات جن کا تعلق اناطوق سے تھا۔ سبوعہ، فرطانہ، نزائلہ، سارے نام مجھے یاد آرہے تھے اور مجھے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے میں پاگل ہوجاؤں گی۔

میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ میں بار بار اپنے بدن کو نوچ کر یہ باور کرنے کی کوشش کررہی تھی کہ جو کچھ مجھے نظر آرہا ہے۔ وہ حقیقت ہے یا ایک خواب، کیا میں عالم خواب میں ہوں۔ لیکن یہ خواب نہیں تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے ایک بہت ہی قدیم دور کی آبادی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ آشوانی آبادی تھی۔ سورج کی تیز روشنی میں نہائی ہوئی۔ یہ تاریخی آبادی میرے سامنے زندہ اور آباد تھی۔ میں واقعی خواب نہیں دیکھ رہی تھی۔ دور تک پھیلے ہوئے شہر میں لوگوں کے ہجوم میں چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ کچھ فاصلے پر گھنے درختوں کے درمیان ایک بڑا سا میدان تھا۔ دوسری جانب نشیب میں ایک بندرگاہ نظر آرہی تھی۔ جہاں بہت سے جنگی جہاز جو بالکل قدیم طرز کے بادبانی جہاز تھے۔ لنگر انداز تھے۔

ایک عجیب وغریب کیفیت ہورہی تھی۔ لوگ سڑکوں پر بھاگ دوڑ کررہے تھے۔ مرد، عورتیں، نوجوان اور بوڑھے سبھی تھے۔ ''اوہ..... کیا میں اپنی اصلی حالت میں واپس آؤں گی۔ سب سے افسوسناک بات یہ ہی تھی کہ میں دوہری کیفیت کا شکار تھی۔ کاش! میں کسی ایک طرف ہوجاؤں۔ میں کسی ایک طرف۔'' اس وقت میری دلی آرزو یہ ہی تھی۔

لیکن انسان جو کچھ چاہتا ہے۔ سب کچھ اسی طرح تو نہیں ہوجاتا۔ میں اس طلسم سے نکل نہیں پارہی تھی۔ جو میری زندگی پر مسلط ہوگیا تھا۔ اس سے پہلے بھی آثار قدیمہ کی کھدائی کے لئے جو کچھ کیا جاتا رہا تھا۔ ہارون دانش نے مجھے اس میں برابر شریک رکھا تھا۔ لیکن میں اس بار جس طلسم میں پھنسی تھی۔ وہ میرے تصور سے بھی باہر تھا۔ کیا کروں کیا نہ کروں مناظر بدل رہے تھے۔ میں اچھے خاصے ہوش وحواس کے عالم میں تھی اور یہ سوچ رہی تھی کہ یہ سب کچھ حقیقت نہیں ہے۔ میں ہارون دانش کی بیٹی نشاء ہوں ''نشاء دانش.....'' لیکن اسی وقت اچانک ہی میں نے اسے دیکھا اور پہچان لیا۔ حالانکہ اس کا کوئی تصور میرے ذہن میں نہیں تھا۔ لیکن میرے ذہن نے یہ کہا۔ کہ وہ اناطوق ہے۔ اناطوق آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ ابھی وہ میرے قریب نہیں پہنچ پایا تھا۔ کہ اچانک ہی۔ عقب سے ایک اور عورت آتی ہوئی نظر آئی۔ سانولے سے رنگ کی مالک چیتے کی طرح پھرتیلی، جوان بدن رکھنے والی، سیاہ لمبے لمبے بال، اور بڑی بڑی کالی آنکھیں۔ اس نے سرخ رنگ کا عبا نما لباس پہنا ہوا تھا۔ جس پر بڑے بڑے اژدھے کڑھے ہوئے تھے۔

اس کی کمر پر چمڑے کی پیٹی بندھی ہوئی تھی۔

جس پر قیمتی ہیرے ٹکے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں کنگن نما زیورات بھی ہیروں سے مزین تھے۔ لیکن اس وقت اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہورہی تھیں۔ اس نے تیز قسم کی کوئی خوشبو لگا رکھی تھی۔ جس سے پورا ماحول خوشبودار ہوگیا تھا۔

کچھ بھی تھا۔ اس جنونی حسن میں بلا کی جنسی کشش تھی۔

''اناطوق! یہ تم پاگلوں کی طرح مجھے کیوں گھور رہے ہو.....؟'' اس نے چیختے ہوئے لہجے میں کہا۔ لیکن اناطوق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اس وقت صرف دیدہ وربنی ہوئی تھی۔ وہ پھر بولی۔

''تم اس طرح کمرے میں کیا کررہے ہو.....؟ میں نے تمہیں اتنی بار سمجھایا ہے کہ اس چڑیل کے چکر میں نہ رہا کرو۔ یہ تمہیں تباہ وبرباد کردے گی۔'' دفعتاً ہی شہزادے کے منہ سے غرائی ہوئی آواز نکلی۔

''میں نے کتنی بار تم سے کہا ہے کہ تم اس کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ کہا کرو۔''

''میں تمہیں ہوشیار کررہی ہوں۔ اگر تم نے اس سے زیادہ رابطے بڑھائے تو میں تمہیں قتل کردوں گی، میں یہ برداشت نہیں کرسکتی۔''

''بکواس بند کر..... فرطانہ تو جانتی ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ سمجھ رہی ہے ناں تو.....؟'' پھر شہزادہ وہاں سے باہر نکل گیا۔ اور میری نگاہیں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے شہزادے کے ساتھ ساتھ سفر کررہی ہوں۔ اور پھر میں نے وہ مندر دیکھا۔ جو آشوانی مندر تھا۔ مندر میں ہر جگہ پجاریوں کا ہجوم تھا وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ میں شہزادے کا تعاقب کرتی رہی۔ اچانک ہی لاتعداد نوجوان اور حسین پجارنوں کا ہجوم نظر آیا۔ انہوں نے اتنے باریک اور ریشمی لباس پہن رکھے تھے کہ ان کے جسم ان لباسوں سے نمایاں تھے۔

شہزادہ اسی ہال سے گزرتا ہوا جہاں وہ پجارنیں عبادت میں مصروف تھیں۔ ایک بڑے دروازے کی سمت چل پڑا۔ دروازے پر کھڑی ایک حسین پجارن ادب سے آگے بڑھی تو شہزادے نے کہا۔

''تم..... تم آگے بڑھو..... آگے بڑھو.....''

اور پھر شہزادہ ایک بڑے سے کمرے میں پہنچ گیا۔

کمرہ حسین پردوں اور ساز وسامان سے سجا ہوا تھا۔ کونے میں ایک دیوی کا تانبے کا بت کھڑا ہوا تھا۔ اور فرش پر بچھے ہوئے دبیز قالین پر ایک عورت خاموش بیٹھی سامنے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن اسے دیکھ کر ایک بار پھر میں دنگ رہ گئی۔

''میرے خدا..... یہ بھی میں ہی تھی۔ میں ہی تھی یہ۔ ہاں..... یہ میں ہی تھی۔'' میرے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی۔ اور اچانک ہی مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے ہوں۔ میں نے وحشت زدہ نگاہوں سے پلٹ کر دیکھا۔ تو یہ پاپا تھے..... میرے پاپا.....

میرے حلق سے دوسری چیخ نکلی اور میں دوڑ کر پاپا سے لپٹ گئی۔ میرے حلق سے سسکیاں نکل رہی تھیں اور پاپا۔ میرے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ مجھے لئے ہوئے اس کمرے میں آگئے جہاں ہماری رہائش گاہ تھی۔ وہ سارا ماحول نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تھا۔ جس نے مجھے اپنے طلسم میں جکڑ رکھا تھا۔ مجھے اس قدر کمزوری محسوس ہورہی تھی۔ کہ کھڑا نہیں ہوا جارہا تھا۔ پاپا نے مجھے مسہری پر بٹھا دیا اور بولے۔

''کیا بات ہے جانو! یہ تمہارا رنگ پیلا کیوں پڑ رہا ہے۔'' اب میں پاپا کو کیا بتاتی یہ کوئی چھوٹی کہانی تو تھی نہیں پھر بھی پاپا شاید میرے دل کی بات سمجھ گئے انہوں نے کہا۔

''مجھے اب خود بھی یہ احساس ہورہا ہے۔ کہ بات کچھ ضرورت سے زیادہ ہی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ میرا خیال ہے۔ ہمیں واپسی کا سفر اختیار کرنا چاہیے۔ میں اس سے زیادہ رسک نہیں لے سکتا۔ تم مجھے خاصی

پریشان نظر آرہی ہو۔"

"پاپا..... میں آپ کو کیا بتاؤں جو کچھ مجھ پر بیت رہی ہے وہ بیان کرنے کے قابل نہیں ہے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ تم جو کچھ کہہ رہی ہو میں سمجھ رہا ہوں۔ چلو ہم کل کوئی میٹنگ کر کے کچھ فیصلہ کرتے ہیں۔ لیکن آنے والا کل پہلے سے بھی زیادہ الجھا ہوا تھا۔ مائیکل جون نے ہی اطلاع دی تھی کہ کچھ تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ وہ خاصا بدحواس سا نظر آرہا تھا۔ پاپا نے حیرت سے کہا۔

"کیا ہوا مائیکل.....؟"

"میں بتاتا ہوں۔" دروازے سے امیر الحسنات نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

میں اور پاپا حیران نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھنے لگے۔ امیر الحسنات نے کہا۔

"پروفیسر صاحب! روشاق غائب ہے۔ رات کو تقریباً ساڑھے چار بجے اسے لینڈ کروزر میں جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ اسے جاتے ہوئے دیکھنے والے وہ عرب مزدور ہیں جو یہ بات جانتے ہیں کہ وہ ایک اہم آدمی ہے۔"

"مگر کہاں.....؟" پاپا نے حیران لہجے میں کہا۔

"یہ ایک ناقابل فہم سوال ہے۔ غائب کے لفظ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس بات کا کسی کو علم نہیں ہے کہ وہ کہاں چلا گیا۔" امیر الحسنات نے سرد لہجے میں کہا۔

مائیکل جون بولا۔ "اور وہ تابوت سے لاش بھی نکال کر لے گیا ہے۔ اور وہ کتاب بھی جو ہمیں دستیاب ہوئی تھی۔" اس انکشاف نے ہم سب کو دنگ کر دیا تھا۔ پاپا تو دیر تک کچھ بول ہی نہ سکے۔ پھر انہوں نے کہا۔

"اور لینڈ کروزر کے بارے میں کچھ معلوم ہوا وہ تو سرکاری تھی میرا مطلب ہے کہ محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے ہمیں دی گئی تھی۔"

"ظاہر ہے۔ اتنی جلدی تمام باتیں معلوم نہیں ہوسکتیں لیکن اس نے جو کچھ کیا ہے وہ ناقابل معافی ہے۔ لاش کی گمشدگی اور کتاب کی گمشدگی سے اس بات کا اظہار بھی ہوجاتا ہے کہ وہ کسی نیک ارادے سے نہیں گیا۔ اور شاید اب وہ واپس نہ آئے۔" پاپا کا موڈ خراب ہوگیا۔ انہوں نے سرد لہجے میں کہا۔

"اس نے جو کچھ بھی کیا ہے۔ اس کی مکمل ذمہ داری آپ لوگوں پر عائد ہوتی ہے۔ کیا سمجھے.....؟"

"ہمیں اس سے انکار نہیں ہے۔ ہم ٹریپ ہوگئے تھے۔" مائیکل جون نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"سنو! میں خود بھی ان حالات سے اکتا گیا ہوں۔ میرے خیال میں ہمیں اپنے کام کو ادھورا چھوڑ کر جانا پڑے گا۔"

"حالانکہ یہ ایک دکھ بھری بات ہوگی۔ آپ اس سلسلے میں غور کریں۔ پروفیسر۔ وہ کچھ چیزیں لے کر غائب ہوگیا ہے۔ لیکن وہ چیزیں ایسی نہیں ہیں۔ جو ہمارے آگے بڑھنے کا راستہ روکیں۔ ہم کیوں نہ اپنا کام جاری رکھیں۔"

"اس کا فیصلہ کرنے کے لئے مجھے وقت درکار ہے۔ آپ لوگ کھدائی کی نگرانی کیجئے۔ میں ریسٹ کرنا چاہتا ہوں۔" پاپا کے لہجے سے پتا چل رہا تھا کہ وہ ان حالات سے کافی دلبرداشتہ ہوگئے ہیں۔

بہرحال اس کے بعد تقریباً سارا دن ہی یہ سلسلہ جاری رہا۔ میں نے اس سلسلے میں خود کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا ظاہر ہے کہ پاپا، مائیکل جون اور باقی لوگ اصلیت جانتے تھے۔ یہ بات بھی طے تھی کہ مائیکل جون اور امیر الحسنات ہی روشاق کو اپنے ساتھ لے کر آئے تھے چنانچہ وہ پاپا سے کچھ کہنے کی گنجائش بھی نہیں رکھتے تھے۔ وقت گزر گیا۔ یہ اندازہ تو ہوگیا تھا کہ پاپا اب بددل ہوگئے ہیں اور شاید وہ واپسی ہی کا فیصلہ کریں میں نے بھی ان سے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ یوں رات کو کافی دیر تک ہم دونوں جاگتے رہے۔ پاپا اپنے طور پر سوچتے رہے تھے۔ لیکن صبح

میرے لئے بھی بڑی پریشان کن تھی۔

معمول کے مطابق جاگی تھی کسی خاص بات کا احساس نہیں ہوا لیکن تھوڑی دیر کے بعد یہ احساس ہوگیا کہ پاپا اپنی جگہ موجود نہیں تھے۔ عموماً ایسا نہیں ہوتا تھا اتنی صبح وہ اٹھ کر کہیں نہیں جاتے تھے پھر بھی میں نے سوچا۔ کہ ہوسکتا ہے اٹھ کر کہیں باہر نکل گئے ہوں۔

مختصر یہ کہ تمام تر معلومات کے بعد یہ پتہ چلا کہ پاپا موجود نہیں ہیں۔ اس احساس نے میرے ہاتھ پاؤں پھلا دیئے تھے۔ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ کہ پاپا مجھے بتائے بغیر کہیں جاسکتے ہیں۔ لیکن وہ کہیں چلے گئے تھے اور اس کے بعد ایک ہیجانی دن گزارنا پڑا۔ امیر الحسنات، مائیکل جون، اور دوسرے تمام لوگ پاپا کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

روشاق کو تو خیر جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اور بعد میں وہ لینڈ کروزر شہر کے ایک علاقے میں مل گئی تھی جس میں روشاق یہاں سے فرار ہوا تھا۔ لیکن پاپا یہاں سے کہاں گئے اور کیسے گئے؟ اس کا کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا۔ تین دن، چار دن، چھ دن، آٹھ دن رو رو کر میرا برا حال ہوگیا تھا۔ بلکہ اتنی حالت خراب ہوگئی تھی کہ مجھے ہسپتال لے جاکے ڈرپ لگوانی پڑی۔

مائیکل جون اور امیر الحسنات بھی بددل ہوگئے تھے۔ آخر میں انہوں نے کہا۔

"پروفیسر ہارون دانش! موجود نہیں ہیں۔ تو اب ہم یہاں وقت ضائع کر کے کیا کریں گے۔ بے بی میں تم سے یہ مشورہ کرنا چاہتا ہوں کہ اب تمہارا کیا ارادہ ہے.....؟"

"انکل..... پاپا....." میری رندھی ہوئی آواز ابھری۔

"ہاں.....! ہم خود پریشان ہیں یوں سمجھ لو کہ مقامی حکومت ہارون دانش کی تلاش کے لئے۔ ہر وہ قدم اٹھا چکی ہے جس سے وہ دستیاب ہوسکتے ہیں لیکن کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ تم نے شاید دیکھا ہو کہ انتظامی محکمے کا ایک بہت بڑا گروپ یہاں آیا اور اس نے ان غاروں کو چھان مارا جہاں کھدائی کی گئی ہے۔ کہ خدانخواستہ کہیں پروفیسر دانش کسی حادثے کا شکار نہ ہوگئے ہوں۔ لیکن ایسا کوئی نشان بھی نہیں ملا۔

بہت تعجب اور افسوس کی بات ہے۔ بے بی! مجھے آپ سے مشورہ کرنا ہے۔ کہ اب کیا ارادہ ہے.....؟"

"کیا میں پاپا کو اس طرح چھوڑ کر چلی جاؤں....."

"نہیں..... وہ پراسرار طریقے سے غائب ہوئے ہیں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کب تک دستیاب ہوں گے۔ ہم خود بھی چونکہ بددل ہوگئے ہیں۔ لیکن بے بی! اگر تم یہاں رکنا چاہو تو مقامی حکومت تمہارے قیام کا بندوبست کرسکتی ہے۔ تم یہاں رک جاؤ۔"

"میں پاپا کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گی۔" میں نے جواب دیا۔

مائیکل جون اور امیر الحسنات، اپنے اپنے وطن واپس چلے گئے۔ حکومت تیونس نے پاپا کی اہم شخصیت کو قدر نگاہ رکھتے ہوئے۔ میرے لئے بہترین رہائش گاہ کا بندوبست کیا۔ اور مجھے بتایا گیا کہ وہ تمام ذرائع استعمال کئے جارہے ہیں۔ جن سے پاپا کے بارے میں پتہ چل سکے۔ لیکن پندرہ دن، بیس دن، ایک مہینہ گزر گیا۔ پاپا کا کوئی نام ونشان نہیں ملا تھا۔ مقامی حکام بہت اچھے تھے۔ وہ بہترین میزبانی کررہے تھے میری۔ لیکن میں سوچ رہی تھی کہ اب کب تک یہاں رکوں؟

آخر بجھے دل کے ساتھ میں نے اپنے وطن واپسی کا فیصلہ کرلیا تو ان لوگوں نے مجھے رخصت کردیا۔ میں گھر آگئی۔

یہاں ہمارے پاس ملازموں کی فوج تھی۔ سب کے سب پاپا کے لئے دکھی تھے۔ انہیں اطلاع مل چکی تھی کہ پاپا گم ہوگئے ہیں۔ بڑے دکھ بھرے انداز میں میرا استقبال کیا گیا۔ میری خاص آیا۔ ندیمہ جو میری ماں کی موت کے بعد میرے لئے نگران مقرر کردی گئی تھی۔ اور جو مجھے بہت ہی پیار کرنے لگی تھی۔

دھاڑیں مار مار کر روتی رہی۔ لیکن میری آنکھوں سے آنسو نہیں نکلے تھے۔ البتہ میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"تم میں سے ایک بھی شخص پاپا کا سوگ نہ منائے۔ کیا سمجھتے ہو تم سب کے سب۔ میرے پاپا زندہ ہیں اور یقیناً واپس آجائیں گے۔ سب سے زیادہ خلوص سے آیا ندیمہ اور ہمارے ایک بہت ہی اہم اور قدیم ملازم ریاض علی نے بڑے خلوص سے آمین کہا تھا۔ بہرحال گھر کی کیفیت کچھ عجیب سی ہوگئی تھی۔ جیسا کہ میں نے بتایا۔ کہ گھر میں ملازموں کی پوری فوج موجود تھی۔ پاپا نے غالباً اسی لئے ان سب کو رکھا تھا کہ وہ خود بھی اکیلے رہتے تھے۔

میں تنہائیوں میں پاپا سے سوال کرتی تھی کہ اتنی محبت کرنے کے بعد انہوں نے مجھے اس طرح کیوں چھوڑ دیا انہوں نے اپنی حفاظت میرے لئے کیوں نہیں کی۔ اور اگر وہ زندہ ہیں تو اتنے عرصے تک مجھ سے دور کیوں رہے ہیں۔ کیا انہیں اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ میں انہیں کتنا یاد کرتی ہوں گی۔

بہرحال وقت گزرتا رہا۔ پھر ایک دن میں نے آیا ندیمہ سے کہا۔

"ندیمہ بیگم! مجھے ایک بات کا جواب دیجئے۔"

"ہاں..... ہاں..... بولیں کیا بات ہے.....؟"

"میری ماں تو بہت چھوٹی عمر میں اس دنیا سے چلی گئی تھیں۔ لیکن پاپا اس طرح کیوں چلے گئے.....؟" آیا ندیمہ نے ہمدردانہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ دیکھتی رہیں..... یوں لگا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ ان کے چہرے پر ایک ہلکی سی ہچکچاہٹ تھی۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی ویسے ماں کی موت کے بعد میں نے آیا ندیمہ کا بہت احترام کیا تھا۔ وہ بھی مجھے بہت چاہتی تھیں لیکن اس وقت نجانے کیوں مجھے ان پر غصہ آنے لگا۔

"میں نے آپ سے ایک سوال کیا ہے۔ اور مجھے اس کا جواب نہیں دے رہیں۔"

"میں کیا جواب دوں نشاء..... ظاہر ہے وہ میرے مالک تھے۔ اور پھر ملک سے باہر وہ گم ہوئے مجھے کیا معلوم اس بارے میں....."

"مجھے تم سب سے پتہ نہیں کیوں ایک نفرت سی محسوس ہو رہی ہے۔ یہ بتاؤ کوئی رہ گیا ہے۔ میرا اس دنیا میں۔"

"ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں نشاء بیٹی! کہ ہم بھی تمہارے لئے تمہارے اپنوں سے الگ نہیں ہیں۔"

"ہوں....." میں نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔ یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ یہ لوگ میرے اپنے کیسے ہو سکتے ہیں۔ پتہ نہیں کیسی کیفیت ہوگئی تھی بس ہر وقت ذہن پر غبار سا طاری رہتا تھا۔ میں شدید حیران تھی۔ پاپا سے مجھے یہ امید نہیں تھی اور میں یہ بات یقین کرنے کے لئے تیار نہیں تھی کہ میرے پاپا اس دنیا میں نہیں ہیں۔ انسان اتنی آسانی سے تو نہیں مر جاتا۔ پتہ نہیں کون سے حالات تھے۔ جس کی بنا پر انہیں کہیں جانا پڑا۔

بہرحال کوٹھی میں پاگلوں کی طرح چکراتی پھرتی تھی۔ باہر جانے کا شوق ہی نہیں تھا۔ حالانکہ گھر میں دو، تین تین گاڑیاں موجود تھیں۔ ڈرائیور موجود تھے۔ کبھی کبھی دل چاہتا تھا کہ گھر سے باہر نکلوں لیکن بس ایک عجیب سا احساس ذہن و دل پر طاری رہتا تھا۔ پھر اس دن میں پاپا کی لائبریری میں پہنچ گئی۔ پاپا کی لائبریری بھی بہت وسیع تھی چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ ان کتابوں میں ساری کائنات چھپی ہوئی تھی۔

میں یونہی لائبریری کا جائزہ لیتی رہی حالانکہ یہ لائبریری میں نے کتنی ہی بار دیکھی تھی لیکن اس وقت نجانے کیوں میرے ذہن پر ایک عجیب سا احساس سوار تھا۔ لائبریری کی ہر چیز بے پناہ قیمتی تھی۔ پاپا کی تصویر ایک طرف لگی ہوئی تھی۔ دیواروں پر فراعنہ کے دور کو نقش کیا گیا تھا۔ اہرام مصر کے ماڈل جگہ جگہ سجے ہوئے تھے۔ ایک طرف ابوالہول کا بہت بڑا مجسمہ لگا ہوا تھا۔

قبل از مسیح کے بہت سے باب یہاں درج تھے۔ تابوتوں میں فرعونوں کی ممیاں رکھی ہوئی تھیں۔

میں دیر تک اس ماحول کا جائزہ لیتی رہی۔ پھر میں نے ایک کتاب اٹھالی پاپا کی اس لائبریری میں میں نے کتنی بار بہت سی کتابیں دیکھی تھیں۔ لیکن بس دیکھنے کی حد تک آج پہلی بار میں نے ایک کتاب نکال کر اس کے اوراق کھولے تھے۔ دل پر ایک عجیب سا بوجھ طاری ہوگیا یہ کتاب نجانے کب کی لکھی گئی تھی۔ میں نے اسے پڑھنا شروع کیا۔

"مصر کی تاریخ نیل کی تنگ وادی پر مشتمل ہے۔ اس وادی کی لمبائی دوسرے آبشار اور ڈیلٹا کے درمیان آٹھ سو میل ہے۔ خود ڈیلٹا کی شکل خانے کی جیسی ہے اور یہ بھی ایک سو میل لمبا ہے۔ قبل از تاریخ میں مصر کے اطراف کی معاون وادیاں جو اب خشک ہو چکی ہیں۔ یقیناً بہتی ہوں گی۔ اور ان کی وجہ سے کھیتی باڑی میں کافی مدد ملتی ہوگی۔ جب لوگوں نے نیل اور ڈیلٹا کے اس علاقے میں آبادیاں قائم کرلیں۔ تو اس میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ تقریباً پانچ ہزار سال قبل مسیح اور چار ہزار قبل مسیح تک مصر کی تاریخ کا حیرت انگیز اور پائیدار دور شروع ہو چکا تھا۔

دریائے نیل میں ہر سال مقررہ وقت پر سیلاب آتا تھا۔ اور اس کے لئے کھیت پہلے سے تیار کر دیئے جاتے تھے یوں مصر کی زراعت ایک شاندار روایت رکھتی تھی۔ حالانکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی طغیانیاں زراعت کے لئے زبردست رکاوٹ سمجھی جاتی رہی ہیں۔ مصر میں بھی ہر سال دریائے نیل سے بہنے جانے والی کیچڑ آس پاس کے میدانوں میں پھیل جاتی تھی۔ لیکن اس سے زمین کی زرخیزی کو مدد ملتی تھی۔ دریا کے مشرقی اور مغربی جانب دور دور تک صحرائی علاقے پھیلے ہوئے تھے۔ اور حقیقتاً یہ زرعی زمین کی حفاظت کا سامان تھے۔

جنوبی حصے میں نیل ان علاقوں کے اندر سے گزرتا ہے۔ جہاں زمانہ قدیم کے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی آبادیاں بکھری ہوئی تھیں۔ خود ڈیلٹا کی حفاظت کے لئے بھی دونوں جانب صحرائی علاقہ تھا۔ اور سامنے سمندر یہ سرزمین جو ایک انوکھی سرزمین تصور کی گئی۔ ایک پائیدار معاشرے کے لئے ہر لحاظ سے موضوں تھی۔

مصریوں نے صحرائی علاقوں سے بحیرہ قلزم تک کا راستہ پیدا کرلیا تھا۔ اور ان ملکوں سے تجارت شروع کر دی تھی۔ جو بحیرہ ہند کے کناروں پر واقع تھے۔ یوں مصری شہنشاہیت الگ تھلگ نہ رہی۔

بلکہ مشرق قریب کے بین الاقوامی نظام میں مصر بھی پورا پورا حصے دار بن گیا۔ مصر مخلوط آبادی کا حامل تھا۔ یہودی اور عرب سام کی اولاد کہلاتے تھے۔ ہندی، یورپی، یا آریائی لوگ یافث کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔

یام، سام، اور یافث تینوں حضرت نوحؑ کے فرزند تھے۔ اور نسلی طور پر ہمیشہ یہ تنازعہ چلا آتا رہا ہے۔ ہامی، سامی، اور یافثی آریائی نسلیں کبھی واضح نہیں ہوئیں۔ لیکن یہ بالکل سچ تھا کہ مصری زبان یہودیوں، عربوں، فنقیوں، بابلیوں اور مشرق قریب کی دوسری ثانوی قوموں کی زبان سے ملتی جلتی نہیں ہے۔ ہندی، یورپی زبان میں سنسکرت مشرق اوسط کی فارسی یا پھر یونانی اور لاطینی زبانیں شامل ہیں۔ جن کی شناخت باآسانی کی جاسکتی ہے۔ چار ہزار تین سو قبل مسیح کے آس پاس مصر میں دو حکومتیں قائم تھیں.....

ایک بالائی مصر کی حکومت جو خاص وادی نیل میں تھی۔ دوسری زیریں مصر کی حکومت جو نیل کے زیریں حصے اور ڈیلٹا پر مشتمل تھی۔ پھر یہ دونوں حصے ایک ہوگئے۔ لیکن ان کے اتحاد اور لامرکزیت کا سلسلہ مختلف اوقات میں جاری رہا۔ مصر کی تاریخ میں فیصلے شاہی خاندانوں کی بنیاد پر ہوا کرتے تھے۔ اور ان شاہی خاندانوں نے سربراہ فرعون یا بادشاہ کہلاتے تھے۔ چین کی طرح یہاں کے ابتدائی حکمران خاندانوں کی حیثیت سے بھی ثانوی اور ان کی صحیح

تاریخیں نہیں ملتیں۔ البتہ تیسرے شاہی خاندان سے جو دو ہزار سات سو قبل مسیح کے قریب قائم ہوا۔ مصر کی مستند تاریخ کا آغاز ہوگیا۔

اس وقت کا دارالحکومت ممفس تھا۔ جو دریائے نیل کے کنارے قاہرہ سے چودہ میل دور تھا۔ اور اب وہ قاہرہ کا ہی ایک حصہ بن چکا ہے یہیں سے مصر اور مصر زیریں کی متحدہ سلطنت پر حکمرانی کا سلسلہ جاری رہا۔ اسے قدیم بادشاہی دور کہا جاتا ہے۔ چوتھا خاندان دو ہزار چھ سو قبل مسیح کے درمیان برسر اقتدار آیا۔ اور مصر کے مشہور اہرام اس خاندان کے عہد میں تعمیر ہوئے۔ اصل میں یہ ان بادشاہوں کے مقبرے تھے۔ اور پھر خاندانوں کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ یہاں تک کہ تیسرے خاندان کا دور آ گیا یہ چوتھی قبل مسیح کا واقعہ ہے۔

پھر مصر پر سکندر قابض ہوگیا۔ اور یونانی شاہی خاندان مصر پر حکمران رہا۔ یہاں تک کہ اینٹونی اور قلوپطرہ نے شکست کھائی تو تیس سال قبل مسیح میں مصر رومیوں کے زیر اقتدار آ گیا۔ یہ بڑی تحقیقی کتاب تھی۔

میری آنکھیں کتاب کے صفحات پر جمی رہیں۔ اور میں تحریر کی منزلوں سے گزرتی رہی مجھ پر ایک عجیب سا سرور طاری ہوتا جا رہا تھا۔ اور آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔ دل و دماغ پر ایک عجیب سی لطیف کیفیت طاری تھی۔ اور مجھے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی مدہم آواز میں مجھے مصر کے بارے میں بتا رہا ہو۔ قدیم بادشاہی سلسلہ تیسرے سے چھٹے شاہی خاندان تک رہا۔ پھر ایک سو سال تک افراتفری رہی۔ نویں خاندان نے دو ہزار سال قبل مسیح فرعونی اقتدار سنبھال لیا۔

سترھواں خاندان مصری تھا۔ جس نے ہکسوس کو باہر نکالا اور اٹھارویں خاندان کا بادشاہ طہوٹمس سالس تھا۔ جس نے فلسطین اور شام فتح کیے۔ اس کے بعد مصر کے عقیدے کے متعلق تفصیلات درج تھیں۔

دماغ کی چولیں ہل رہی تھیں۔ پاپا کی معیت میں مصر بھی بہترین دریافت رہا تھا لیکن اب، بہت عجیب لگ رہا تھا۔

یہ رات بڑی پریشان کن رہی سوتی جاگتی رہی۔ صبح کو طبیعت پر بہت بوجھ تھا۔ جاگ رہی تھی لیکن نہ جانے کیا کیا سوچیں دامن گیر تھیں۔ اس دن فیض بابا سے بہت ساری باتیں ہوئیں۔

فیض بابا بھی ہمارے بہت پرانے ملازم تھے۔ گاڑی چلاتے تھے اور بہت مشتاق ڈرائیور تھے۔

"جی فیض بابا....." میں نے پوچھا۔

"ناشتہ کرلیا آپ نے.....؟"

"ہاں..... کیوں.....؟"

"کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"بیٹھ جائیں میں نے کہا۔"

"نہیں....." فیض بابا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اور میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"میں سمجھی نہیں فیض بابا....."

"بیٹے میں کبھی آپ کے پاس بیٹھا ہوں۔ بیٹے محبت اپنی جگہ آپ ایک اعلیٰ نسب لڑکی ہیں۔ باظرف اور نیک فطرت۔ لیکن بیٹے ہم آپ کے ملازم ہیں اور ہمیں اپنے مرتبے کا خیال ہے۔"

"میں نہیں سمجھی بابا۔ اور آپ یقین کریں اس سے پہلے میں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ جب آپ میرے سامنے آئے تو میرا رویہ کیسا رہا....."

"ارے بیٹے۔ یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے۔"

"نہیں ہے نا.....؟"

"ہاں بیٹے آپ کا شکریہ۔" فیض بابا نے کہا۔

"تو پھر بیٹھ جایئے۔" میرا لہجہ بے حد سرد تھا فیض بابا پھیکی سی ہنسی کے ساتھ نیچے فرش پر بیٹھنے لگے تو میں نے صوفے کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "فیض بابا۔" فیض بابا کے انداز میں جھجک تھی لیکن شاید انہوں نے میرے سرد لہجے کو محسوس کیا اور صوفے پر بیٹھ گئے پھر بولے.....

"شکریہ۔ نشاء بیٹے۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر

کہا..... "بات یہ ہے کہ میں نے پہلے بھی کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ میرے گھر میں مالک کون ہے اور ملازم کون۔ لیکن اب فیض بابا میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوگئی ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں کہ میرے پاپا آپ کا کتنا احترام کرتے تھے اور....."

فیض بابا نے میری بات کاٹ دی اور ہاتھ اٹھا کر جلدی سے بولے۔

"نا بیٹا نا۔ تم تھے کا لفظ کیوں استعمال کر رہی ہو وہ ہیں بھول کر بھی کبھی تھے کا لفظ استعمال مت کرنا۔ وہ ہیں اور انشاء اللہ تعالیٰ رہیں گے۔" فیض بابا کی بات پر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ "آمین فیض بابا۔"

"بیٹے آپ نے مجھے پوری تفصیل بے شک نہیں بتائی لیکن اتنا مجھے معلوم ہے کہ مالک گم ہوگئے ہیں اور خدانخواستہ ان کی لاش دستیاب نہیں ہوئی۔ میں اپنے مالک کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ آسانی سے کسی کے جال میں نہیں پھنس سکتے۔"

"آپ نے میرا دل بڑھا دیا ہے بابا۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔"

"کبھی فکر مت کرنا بیٹا۔ میں اتنا بوڑھا نہیں ہوا ہوں کہ تمہاری طرف ٹیڑھی نگاہ سے دیکھنے والے کو اپنے پیروں پر صحیح سلامت کھڑا رہنے دوں۔" میں واقعی فیض بابا کی باتوں سے بڑی تقویت محسوس کرنے لگی تھی۔ میں نے کہا۔

"میں کیا کروں بابا۔ آپ کو تھوڑی سی تفصیل بتاؤں۔ یہ بات تو آپ کے علم میں ہے کہ ہمارے ساتھ تین افراد تیونس گئے تھے۔ وہاں ہم کارچوک نامی پہاڑ پر آشوانی تہذیب کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے تھے۔"

میں نے فیض بابا کو پوری کہانی تفصیل سے سنا دی۔ اس وقت وہ مجھے اپنے بہترین ساتھی محسوس ہو رہے تھے۔ وہ حیرت سے یہ داستان سنتے رہے۔ پوری داستان سننے کے بعد انہوں نے شانے ہلاتے ہوئے کہا۔

"خدا کے بھید خدا ہی جانتا ہے۔ لیکن تم نے میری بات کی تصدیق کردی۔"

"کون سی بات کی بابا صاحب۔"

"یہی کہ میرے مالک زندہ ہیں اور تم دیکھ لینا کہ بہت جلد وہ واپس آ جائیں گے۔"

"شکریہ بابا خدا آپ کو سلامت رکھے۔"

"ایک بات کہوں بیٹا۔"

"جی بابا۔"

"مان لوگی میری بات"

"جی مان لوں گی۔"

"بیٹا سب سے پہلے ایک بات پر یقین قائم کرلو۔"

"جی بابا۔"

"وہ یہ کہ تمہارے پاپا زندہ ہیں اور بہت جلد تم سے آملیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اپنے آپ کو تروتازہ رکھو اس طرح تمہارے فیض بابا کی آبرو بھی قائم رہے گی۔"

"وہ کیسے فیض بابا؟"

فیض بابا گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر بولے۔ "کل جب میرے مالک میرے سامنے آئیں گے اور مجھ سے پوچھیں گے کہ فیض تم نے میری غیر موجودگی میں میری اکلوتی بیٹی کا کتنا خیال رکھا۔ تو میں فخر سے کہہ تو سکوں گا کہ دیکھ لیں مالک، میری نشابی بی خوش وخرم اور تروتازہ ہیں۔"

"آپ بہت اچھے ہیں فیض بابا یقین کریں پاپا کی گمشدگی کے بعد میرا دل بری طرح ٹوٹ گیا تھا۔ آج آپ سے ہونے والی باتوں میں اتنا پیار ہے کہ میں مطمئن ہوگئی ہوں مجھے یہ بتایئے کہ میں پاپا کا انتظار کیسے کروں۔"

"میں بتاتا ہوں۔"

"جی بتایئے۔"

"بیٹا تمہارے کچھ دوست ہیں؟"

نہیں ..... کبھی مجھے دوست بنانے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی میرے پاپا ہی میرے بہترین دوست تھے۔"

"پھر تھے کہا۔"

"سوری فیض بابا۔ تھے نہیں ہیں۔"

"شکریہ! انشاء بیٹی۔"

"ہاں تو بتائیے۔"

"تم گھر سے باہر نکلو گی تفریحات میں دل چسپی لو گی، میں تمہارا ڈرائیور ہوں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔"

"ہم کہاں جائیں گے فیض بابا۔" میں نے سوال کیا۔ فیض بابا سوچ میں پڑ گئے۔

"پھر بولے۔"

ف "تاج محل۔"

"آگرہ۔"

"ارے نہیں بیٹا! ہوٹل تاج محل۔"

"آپ کو اس کے بارے میں کیسے معلوم فیض بابا.....؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ایک بار مالک کے کچھ غیر ملکی دوست آئے تھے اور ہوٹل تاج محل میں ٹھہرے تھے۔ مالک نے ہوٹل کے بڑے ہال میں مجھے بلایا تھا کسی کام کے لئے۔ تب میں نے وہ جگہ دیکھی تھی۔ بس کیا بتاؤں بیٹا! بڑی خوبصورت جگہ تھی ایسے ایسے خوبصورت لوگ وہاں بیٹھے تھے کہ میرا دل چاہا میں بھی وہیں بیٹھ جاؤں۔" فیض بابا کہنے لگے۔

"بابا..... مجھے عجیب لگے گا۔"

"مگر یہ عجیب بات دلکش ہوتی ہے۔"

"ارے واہ۔ آپ تو بڑے دانش ور ہیں فیض بابا۔"

فیض بابا اچانک ہی میرے مشیر اور دوست بن گئے تھے ایک خوبصورت لباس میں ملبوس ہو کر میں ہوٹل تاج محل پہنچ گئی۔ بے شک یہ ماحول میرے لئے اجنبی نہیں تھا بابا کے ساتھ کئی بار ہوٹلوں وغیرہ میں جا چکی تھی لیکن تنہا پہلی بار کسی ہوٹل میں آئی تھی۔ ویٹر نے میری راہنمائی ایک میز کی طرف کی۔ اور میرے لئے کرسی کھینچ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میں نے خود اعتمادی سے کہا۔

"کوئی اچھا سا مشروب۔" ویٹر گردن خم کر کے چلا گیا۔ میں نے ماحول کا جائزہ لیا، بہت ہی اعلیٰ مینجمنٹ یہاں موجود تھی۔ ملکی اور غیر ملکی افراد پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بعد میں نے میز پر رکھا مینو اٹھا لیا اور اس کے اندراجات پر نگاہ ڈالنے لگی ویٹر نے چند ہی لمحوں کے بعد کاغذ جیسے ہلکے شیشے کے برتن میرے سامنے سجا دیئے۔ بہت ہی خوبصورت جگ میں ایک نفیس مشروب اور ٹرے میں خوب گلاس رکھے ہوئے تھے اس نے خود ہی ایک گلاس میں مشروب انڈیلا اور ادب سے پیچھے ہٹ گیا۔ مشروب کا گلاس اٹھا کر میں چھوٹے چھوٹے سپ لینے لگی۔ تب ہی میری نگاہ خود سے کچھ فاصلے پر ایک میز کی جانب اٹھ گئی اور دوسرے لمحے میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ وہ ایک عمر رسیدہ عورت تھی۔ غالباً کسی مغربی ملک سے تعلق رکھتی تھی دودھ جیسا سفید رنگ اتنے ہی سفید بال، سفید لباس، لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ سفید کاغذ جیسے رنگ میں خون کی ذرا بھی آمیزش نہیں تھی۔ آنکھوں کے ڈھیلے بھی سفید سفید، یہاں تک کہ اس کے ہونٹ بھی سفید تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہ ہو۔ یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی لیکن اسے دیکھ کر مجھے روشاک یاد آ گیا تھا۔ شاید نہ بھی یاد آتا لیکن عورت کی گود میں ایک سیامی بلی بیٹھی تھی اور یہ بلی بالکل ایسی تھی جیسی میں نے روشاک کے پاس دیکھی تھی۔ جوں ہی میری نگاہ بلی پر پڑی مجھے یوں لگا جیسے بلی کی آنکھوں سے کچھ شعاعیں خارج ہو رہی ہوں اور پھر اچانک ہی بلی نے ایک بھیانک آواز نکالی۔ اور عورت کی گود سے اچھل کر میز پر چڑھی پھر وہاں سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ اور پھر برق رفتاری سے دوڑتی ہوئی ایک دروازے سے باہر نکل گئی میں نے محسوس کیا کہ کسی نے اس کی جانب توجہ نہیں دی تھی۔ میرا دماغ کچھ لمحوں

کے لئے جھنجھنا گیا تھا عجیب سا واقعہ تھا اس عورت کا روشاق سے کیا تعلق تھا اور پھر یہ بلی۔

"تھوڑا سا تعجب بھی ہوا تھا۔ اس شاندار ہوٹل میں کسی ایسے جانور کو کیوں پرمیشن دی گئی تھی۔ جانوروں کے اندر لانے پر بھی پابندی ہوتی ہے۔ بہرحال میں خاموش رہی اور اپنے مشروب سے سپ لیتی رہی۔

چند لمحات کے بعد ویٹر قریب آیا تو میں نے کہا۔

"ویٹر کیا ہال میں جانوروں کو لانے کی اجازت ہے.....؟"

"جانوروں کی؟"

"ہاں.....!"

"نہیں میڈم.....!"

"مگر یہاں ابھی ایک بلی بھاگی ہے جو ان خاتون کی گود میں تھی۔"

"بلی.....؟"

"ہاں بلی!! تم نے نہیں دیکھی۔" میں جھنجھلا سی گئی۔

"نہیں میڈم۔ میں نے کیا کسی نے بھی نہیں دیکھی ویسے یہاں کسی بھی جانور کو لانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"کمال کرتے ہو۔"

"کسی چیز کی ضرورت میڈم۔" ویٹر نے گردن خم کر کے کہا۔

"ابھی نہیں۔ بتا دوں گی۔" میں نے بگڑے ہوئے موڈ سے کہا۔

ایک بار اس عورت پر نگاہ ڈالی جو کچھ کھانے میں مصروف تھی۔ پھر اس کے بعد میں دوسری طرف متوجہ ہو گئی لیکن بار بار میری نظریں اس کی جانب اٹھ جاتی تھیں۔ میں نے اسے ایک بار بھی اپنی طرف متوجہ نہیں دیکھا تھا پھر اچانک ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور اس طرف چلی گئی۔ جہاں واش روم تھا۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک نوجوان آدمی جو بہت ہی خوبصورت تراش کے سفاری

خوشخبری

طلسماتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورۂ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یمنی، عمیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو تکیے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہو جائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد، نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مردو عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورۂ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826-0333-2327650

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر

بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

سوٹ میں ملبوس تھا اور خود شکل وصورت سے اچھا نظر آرہا تھا۔ میرے پاس آیا اور جھک کر بولا۔

"قسم سے کھانا کبھی کبھی بہت عجیب لگتا ہے میڈم۔ میں پھر بھی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں آپ سے فلرٹ کرنے نہیں آیا۔ آپ مجھے صرف چند منٹ اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت دے دیں۔" میں نے حیرت سے اسے دیکھا تو وہ بولا۔

"وہ ادھر میز نمبر چالیس پر میری منگیتر بیٹھی ہوئی ہے۔ والدین نے اس کا نام مثل رکھا ہے لیکن میرے خیال میں اس کا نام خون ریز ہونا چاہیے تھا۔ اگر اسے اس بات کا اندازہ ہوجائے کہ خدانخواستہ میں آپ سے تعارف حاصل کرنے یا فلرٹ کرنے کے لئے آیا ہوں تو آپ یقین کریں کل صبح کے اخبارات میں میری تصویر ضرور ہوگی جس کے ساتھ بڑے بڑے الفاظ میں یہ شعر لکھا ہوگا۔

حسرت ان غنچوں پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

یہ نوجوان کون ہے اور میرے پاس کیوں آیا ہے؟ مجھے اکا کوئی اندازہ نہیں تھا لیکن میں گھر سے باہر اسی لئے نکلی تھی کہ اپنی زندگی میں تبدیلیاں پیدا کروں کسی سے شناسائی حاصل کروں، کسی سے دوستی کروں۔ یہ شخص مجھے اچھا لگا تھا۔ الفاظ اور گفتگو میں شوخی تھی لیکن سلیقے کے ساتھ میں نے کہا۔

"میں کیا خدمت کرسکتی ہوں آپ کی.....؟"

"دونوں میں سے ایک....."

"کیا مطلب.....؟"

"مجھے یہاں بیٹھنے کی اجازت دیجئے۔ اور اشارے سے مثل کو اپنے پاس بلا لیجئے۔ یا پھر وہاں میری میز پر چلیے۔"

"مثل کو یہاں بلا لیجئے۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔ اس کے اشارے پر بہت ہی خوبصورت اور نازک سی مثل اٹھ کر میری میز پر آگئی اور دونوں میرے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بہت خوبصورت جوڑی ہے آپ کی۔ ویسے مثل تمہارے منگیتر واقعی شریف آدمی ہیں کیونکہ انہوں نے تمہارا نام تو بتا دیا اپنا نہیں۔"

"یہ عسکری ہیں۔ اور آپ یقین کیجئے کہ یہ قطعی اس قابل نہیں تھے کہ میں ان سے منگنی کرتی۔ مگر انہوں نے اتنا رونا پیٹنا مچایا کہ آخر میں پگھل گئی اور اب انہیں زندگی بھر بھگتنے کا فیصلہ کرچکی ہوں۔"

"آپ یقین کیجئے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک نکاح نہیں ہوجاتا میں ان کی کہی ہوئی ہر بات پر روبوٹ کی طرح گردن ہلاتا رہوں گا۔"

"میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں.....؟" مثل بولی۔

"میں نشاء دانش ہوں۔"

"کیا خوبصورت نام ہے۔ آپ تنہا ہیں.....؟"

"ہاں....."

"اب یہ بتائیے کہ ہم آپ کی کیا خدمت کریں۔"

"آپ میری میز پر ہیں اس لئے میزبان میں ہوں۔"

"دیکھا نہ مثل۔ کیسی عمدہ رہی، آج کے پیسے بچ جائیں گے اور ہم کل پھر آجائیں گے ورنہ مشکل ہوجاتا۔ نشاء صاحبہ کولڈ کافی اور کچھ اسنیکس منگا لیجئے۔" عسکری نے شوخ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ اور میں نے ویٹر کو اشارہ کردیا۔ وہ دونوں بڑی دل چسپ باتیں کرتے رہے۔ وہ عمر رسیدہ عورت جس کے پاس میں نے بلی دیکھی تھی اور ویٹر نے جسے ماننے سے انکار کردیا تھا واش روم کی طرف گئی تھی۔ تو واپس نہیں آئی تھی۔ اتنی دیر تک کسی کا واش روم میں رکنا ممکن نہیں تھا۔ اسی وقت عسکری نے کہا۔

"اس طرف ایک راہداری ہے۔ جو باہر لان میں نکلتی ہے۔"

میں نے چونک کر عسکری کو دیکھا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی کہ اس نے میری سوچ کو کیسے پڑھ لیا۔ وہ بولا۔

"مجھے خوشی ہے کہ آپ نے بھی اس پر توجہ دی۔ لیکن کیا قصہ ہے مجھے نہیں معلوم۔" عسکری پھر بولا۔

"وہ ایک عجیب عورت تھی اس کی گود میں ایک خوبصورت بلی بیٹھی ہوئی تھی جو بعد میں اس کی گود سے بھاگ کر باہر نکل گئی۔ لیکن یہاں موجود کسی شخص نے یا ہوٹل کی انتظامیہ نے اس بلی کو نہیں دیکھا۔ جس پر مجھے تعجب ہوا۔

"اوہ مثل۔ بلی تو ہم نے بھی اس کی گود میں نہیں دیکھی۔ مس نشاء ایک بات بتائیے آپ پہلے سے اسے جانتی ہیں یا آج ہی اسے دیکھا تھا۔ یا پھر چھوڑیئے۔ میں آپ کو اصل بات بتا دوں۔ جس کی وجہ سے میں یہاں آپ کے پاس پہنچا۔ میں واش روم گیا تھا اور اس وقت میں واش روم میں ہی تھا جب میں نے باہر ایک آواز سنی۔ اس عورت کی آواز جسے ہم دونوں ہال میں دیکھ چکے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"ہاں۔ تم دونوں احتیاط سے اس کا تعاقب کرو اور اس کا گھر دیکھ کر آؤ۔ وہ میرے لئے انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ مجھے اس کے گھر کا پتہ چاہیے لیکن خبردار اسے شک نہ ہو۔" پھر میں نے واش روم سے باہر نکل کر انہیں دیکھا عورت آگے بڑھ گئی تھی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ اور وہ دونوں جنہیں آپ کا پیچھا کرنے کی ہدایت کی گئی تھی ہال میں واپس آگئے۔ بس آپ کا جو حلیہ اس عورت نے بتایا تھا میں نے اس کے تحت آپ کو ہوشیار کرنا مناسب سمجھا۔"

عسکری کے اس انکشاف سے ایک لمحہ کے لئے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ خاص طور سے سیامی بلی اور عورت کا خوف سے عاری چہرہ مجھے روشاق کی یاد دلاتا تھا اور روشاق کے بارے میں آپ کو علم ہے کہ وہ میرے لئے کیا حیثیت رکھتا تھا۔

کچھ دیر تک میں عسکری کے اس انکشاف سے چکرائی چکرائی رہی۔ پھر میں نے خود کو سنبھالا نوجوان جوڑا بالکل صاف اور سادہ سی فطرت کا مالک لگتا تھا۔ مجھے ان کے انداز میں کوئی فریب نہیں محسوس ہوا تھا اور پھر وہ انوکھی عورت اور سیامی بلی لیکن لمحوں کے اندر مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ آگے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اور میں نے فیصلہ کرلیا اور میری کیفیت بحال ہوگئی۔

"آپ تنہا ہیں مس نشاء.....؟" عسکری نے سوال کیا۔

"جی۔ تنہا ہی سمجھئے۔ میں مسکرا کر بولی۔

"آپ ہمارے اس انکشاف سے خوفزدہ تو نہیں ہیں۔"

"جی نہیں۔"

"لیکن وہ دونوں صورت سے کافی خطرناک معلوم ہوتے تھے۔"

"آپ دونوں بہت اچھے ہیں میرے دوست بنیں گے۔" میں نے عسکری کی بات کو نظر انداز کرکے کہا۔

"آپ جیسی بہادر لڑکی کا دوست بننا کون پسند نہیں کرے گا۔ ویسے اب تو اچانک ہی آپ بھی مجھے پراسرار لگنے لگی ہیں۔ یعنی ایک بھیانک سی۔ غیر ملکی خاتون نے کچھ لوگوں کو آپ کے تعاقب پر لگایا ہے اور آپ کو ان کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہے۔"

"میں تو خیر جو کچھ بھی ہوں۔ لیکن آپ دونوں بہت اچھے ہیں۔ میں آپ سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔" اس بار عسکری کے بجائے مثل جلدی سے بولی۔

"یہ تو ہماری خوش بختی ہے نشاء جی آپ پلیز! میرا نمبر لے لیں۔ اور مجھے اپنا نمبر بتا دیں۔"

"ہاں، ہاں لکھ لو۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

میں نے مثل کا نمبر لیا اور اسے بھی اپنا نمبر بتا دیا، پھر کہا۔

"کبھی تم دونوں میرے گھر آؤ۔ اور سنو مجھے اپنی شادی میں بلانا مت بھولنا۔"

"ارے ارے ہماری شادی تو ابھی بہت دور

ہے ہم تو جلدی جلدی آپ کے پاس آئیں گے۔'' پھر اس کے بعد حیرت انگیز طور پر عسکری اور مثل نے مجھ سے اس بارے میں نہیں پوچھا۔ میں نے جو دل میں فیصلہ کیا تھا وہ یہ تھا کہ اس پراسرار عورت کے بارے میں کسی طرح انکشاف ہوسکتا تھا کہ میرا تعاقب کرنے والے میرا گھر دیکھ لیں اور بات کسی نہ کسی شکل میں آگے بڑھے۔ اگر وہ روشاق جیسی نہ ہوتی اور اس کے پاس روشاق جیسی سیامی بلی نہ ہوتی تو مجھے ان فضولیات سے کوئی دل چسپی نہ ہوتی۔ غرض یہ کہ ہمارے درمیان دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ مجھے اس نوجوان جوڑے سے مل کر دلی خوشی ہوئی تو کم از کم دل بہلانے کے لئے کوئی تو ملا۔ پھر ہم لوگوں نے ایک دوسرے سے اجازت طلب کی۔ میں باہر نکل آئی۔ پارکنگ لاٹ پر فیض بابا آرام سے گاڑی میں نیم دراز تھے۔ انہوں نے مجھے دور سے آتے نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ جب قریب جاکر میں نے پچھلا دروازہ کھولا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔

''معافی چاہتا ہوں نشاء بیٹا.....''

''کس بات کی فیض بابا۔'' میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کے دروازہ کھولنے پر میں نیچے نہیں اترا۔''

''چلیے۔''

''گھر ہی چلوں بیٹے۔''

''ہاں۔''

راستے میں ہر طرح سے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی اور یہ اندازہ لگانے لگی کہ کوئی میرا تعاقب کررہا ہے یا نہیں۔ مگر مجھے گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہونے تک ایسا کوئی سراغ نہ ملا۔ تاہم میں اپنے کمرے میں آگئی اور ضروریات سے فراغت حاصل کرکے اپنے بیڈ پر پہنچ گئی۔ سوچیں تو تنہائی کا سب سے بڑا سہارا ہوتی ہیں۔ زندگی میں پتہ نہیں غم تھے یا نہیں لیکن اب پاپا کا خیال ایک غم کی شکل ہی اختیار کرگیا تھا۔ میں تو زندہ ہوں پاپا پتہ نہیں کس حال میں ہوں گے۔ وہ بھی تو میرے بارے میں سوچ رہے ہوں گے۔ اس کے علاوہ مما تھیں جن کا اب خیال بھی نہیں آتا تھا۔ وہ ہی ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ پلکوں پر بوجھ سے آپڑا تھا۔ غالباً نیند آنے والی تھی۔

اچانک ہی تکیے کے پاس رکھے فون پر وائبریشن ہوئی میں نے فون اٹھالیا۔ ایک لمحے میں پتہ چل گیا کہ مثل کا فون ہے۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ دوستی کا یہ طریقہ بھی ہوتا ہے۔

''ہیلو مثل۔''

''ہیلو نشاء۔ سوری! عسکری سے بات کرو۔'' دوسرے لمحے عسکری کی آواز سنائی دی۔

''نشاء جی کچھ گستاخیاں کی ہیں۔ آپ نے تو ان دونوں پر توجہ ہی نہیں دی تھی جنہیں آپ کا تعاقب کرنا تھا۔ ہمارے دل میں تجسس تھا اور دوستی کا رشتہ بھی تھا۔ یہ خیال تھا ہم دونوں کو کہ کہیں راستے میں آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ ہم نے بھی آپ کا تعاقب کیا۔ وہ دونوں گرے کلر کی ایک کار میں بڑی ہوشیاری سے آپ کا پیچھا کرتے ہوئے آپ کی کوٹھی تک گئے۔ پھر جب آپ کی کار کوٹھی میں داخل ہوگئی تو وہ پورے دس منٹ تک وہاں رکے اور پھر واپس چل پڑے۔ اس وقت مثل نے ایک کارآمد مشورہ دیا اس نے کہا کہ کیوں نہ ان کا پیچھا کرتے ہوئے نیو لائن سوسائٹی تک پہنچے جہاں ان کی کار کا بنگلہ نمبر چھ بارہ میں داخل ہوگئی۔ ہم نے بھی وہاں انتظار کیا اور جب یہ اندازہ ہوگیا کہ وہ وہاں سے واپس آگئے۔ اور اب آپ کو اطلاع دے رہے ہیں۔

''اوہ مائی گاڈ۔ آپ لوگوں نے اتنی تکلیف اٹھائی میرے لئے۔''

''دوستی جو ہوئی ہے۔ اب آپ ہمیں مزید خدمت بتائیے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اس کاوش کا شکریہ۔ یہ اطلاع میرے لئے کارآمد ہے۔ آپ کے لئے مزید ہدایت ہے کہ مثل

کو اس کے گھر چھوڑیئے اور آپ جاکر آرام سے اپنے گھر سو جایئے۔ شب بخیر۔'' میں نے مزید کچھ سنے بغیر فون آف کردیا اور بہت دیر تک میرے ذہن میں وہ پراسرار عورت چکراتی رہی۔ پھر میں نے سوچا کہ میں کوئی بزدل لڑکی نہیں ہوں۔ مجھے نیو لائن سوسائٹی کے ان مکینوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہیے۔

بس یہ سوچتے سوچتے سوگئی تھی۔ دوسری صبح پتہ نہیں کیوں طبیعت ہشاش بشاش تھی، گھر کے ملازمین پاپا کی گمشدگی پر اپنے دکھ کا اظہار کرنے کے لئے بہت سنجیدہ رہنے لگے تھے۔ میں ضروریات سے فراغت حاصل کرکے سوچ میں ڈوب گئی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ذہن میں اسراق کے واقعات چکرا رہے تھے۔ میں نے لباس تبدیل کیا اور تیار ہوکر باہر نکل آئی۔

فیض بابا گاڑی صاف کررہے تھے۔ مجھے تیار دیکھ کر بولے۔

''کہیں جارہی ہیں نشاء بیٹی۔ میں ذرا کپڑے بدل آؤں۔''

''نہیں فیض بابا آپ بس چابی مجھے دے دیجئے۔''

''میں چلوں نشاء بیٹی۔'' فیض بابا نے کہا۔

''چابی۔'' میں نے ہاتھ پھیلا کر سرد لہجے میں کہا۔ اور فیض بابا نے خاموشی سے چابی میرے حوالے کردی۔ میں نے کار اسٹارٹ کی اور چل پڑی۔ بس ایک دیوانگی ہی تھی اور سوچ کی وحشت پر غور بھی نہیں کیا تھا کہ اجنبی جگہ میرے ساتھ کیا واقعات پیش آسکتے ہیں۔ نیو لائن کا علاقہ شہر سے کافی دور ایک پوش علاقہ تھا۔ کافی لمبا سفر طے کرکے آخر کار میں نیو لائن سوسائٹی پہنچ گئی۔ اور پھر کوٹھی نمبر چھ سو بارہ تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہ لگا۔ میں اس کے جائے وقوع کا جائزہ لیتی رہی بالکل ہی الگ تھلگ اور ذرا عجیب سی طرز تعمیر کا نمونہ تھی۔ گاڑی ایک طرف کھڑی کرکے میں نیچے اتری اور پھر کوٹھی کے گیٹ کے پاس پہنچ گئی لمحوں کے اندر یہ اندازہ ہوگیا کہ کوٹھی ویران پڑی ہے۔ بس اس کے بعد یہی کہا جاسکتا ہے کہ میرے وجود میں ایک پراسرار عمل کا آغاز ہوگیا ہے۔ میں نے کوٹھی کا سرسری نگاہ سے جائزہ لیا۔ پوری عمارت سنسان محسوس ہوتی تھی۔ میں آگے قدم بڑھاتی ہوئی کوٹھی کے بڑے دروازے پر پہنچ گئی۔ پرانے طرز کا دروازہ تھا لیکن میں نے اسے ہاتھ سے دبایا تو وہ کھل گیا۔ دروازے کے دوسری طرف بہت بڑا ہال تھا۔ اوپر کے حصے میں قدیم طرز کے روشن دان بنے ہوئے تھے جس سے تیز روشنی اندر آرہی تھی اور اس روشنی میں صاف شفاف ہال کا منظر عجیب تھا۔ باہر سے اس قدر ویران اور بدنما نظر آنے والی عمارت کا یہ ہال اتنا صاف ستھرا ہوگا سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا لیکن جس چیز نے مجھے سخت حیران کردیا۔ وہ یہ تھی کہ یہاں انتہائی قدیم مصری نوادرات کی سجاوٹ تھی۔ منقش دیواریں سونے کے برتن، اہراموں کے ماڈل، ایک دروازے پر سرخ پردہ لٹک رہا تھا۔ ہر طرف ایک ہولناک سناٹا طاری تھا۔ ایک پراسرار سکوت چھایا ہوا تھا۔

خاصی دیر انتظار کیا اور میرے اندر ایک جھنجھلاہٹ سی پیدا ہوگئی۔

''کوئی ہے۔ یہاں کوئی ہے.....؟''

میری آواز کی بازگشت ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ اچانک سرخ پردے میں جنبش ہوئی اور پھر دو سفید برف جیسے ہاتھ نمودار ہوئے۔ ان ہاتھوں نے پردہ ہٹایا اور جو کوئی ان سے نمودار ہوا اسے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہوگئی۔ میری آنکھیں ساکت ہوگئیں وہی عورت وہی روح جیسی شکل والی عورت میرے سامنے تھی میں نے اب اسے قریب سے دیکھا تھا۔ یہ چہرہ عام انسانی چہروں سے بالکل الگ تھا۔ اس پر برف جیسی سفیدی تھی۔ نقوش بے حد حسین تھے۔ لیکن چہرے میں زندگی نہیں تھی۔ بس یوں جیسے پتھر سے

تراش دیا گیا ہو۔ بے تحاشہ حسین نیلاہٹیں لئے ہوئے آنکھیں لیکن بے نور ان میں زندگی کے ستارے نہیں تھے۔ غیر معمولی طور پر لمبی سفید گردن، لمبے لمبے بال ہاتھ سیدھے لٹکے ہوئے بدن پر سرخ اور گہرے رنگ کا لبادہ پہنے وہ مجھے دیکھ رہی تھی لیکن یوں لگتا تھا جیسے مجھے نہ دیکھ رہی ہو۔

پھر وہ آگے بڑھی اور یہاں بھی مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ اس کے پاؤں لمبے لبادے سے ڈھکے ہوئے۔ لیکن لبادہ کتنا ہی ڈھیلا کیوں نہ ہو چلتے ہوئے گھٹنے کچھ مڑتے ہیں۔ پاؤں اٹھتے ہوئے جو محسوس ہوتے ہیں۔ مگر مجھے یہ پاؤں اٹھتے ہوئے محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

وہ جیسے پھسلتی ہوئی میرے پاس آ رہی تھی جوں جوں وہ قریب آتی گئی مجھے ایک پراسرار سی ٹھنڈک کا شدید احساس ہوا۔ میرے بدن میں ہلکی سی کپکپی دوڑ گئی مگر میں اسے خوف کا نام نہیں دے سکتی تھی۔ پھر اس کے منہ سے ایک کھرکھراتی سی آواز نکلی۔

"نزائلہ.....؟"

میرے ذہن میں ایک زوردار چھناکہ سا ہوا۔ اور مجھے کارچوک کے کھنڈرات میں ملنے والی وہ کتاب یاد آ گئی جس میں انا طوق کی کہانی درج تھی۔ شہزادہ سبوعہ کی محبوبہ نزائلہ اور پھر تابوت میں ملنے والی لاش جو میری لاش تھی۔ آہ یہ پراسرار عورت جو روشناق جیسی تھی۔ مجھے نزائلہ کے نام سے پکار رہی تھی میں نے اپنی ذہنی قوتوں کو آواز دی یہ سارے کا سارا گورکھ دھندا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن میں اسے سمجھنا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"کون ہو تم.....؟"

"میں کون ہوں۔ تمہیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں۔ مجھے وہ کتاب چاہیے جو تمہارے باپ نے کہیں پوشیدہ کر دی ہے۔"

"کون سی کتاب۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"انا طوق کی وہ خفیہ کتاب جس میں اس نے مصر کے ایک اہرام کی کہانی لکھی ہے۔ وہ قدیم اہرام جس میں مصر کی ایک خفیہ تاریخ چھپی ہوئی ہے۔"

"وہ کتاب میرے پاپا کے پاس؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں۔ اور میرے پاپا کہاں ہیں۔" میں نے پھر کہا۔ اور عورت دانت پیسنے لگی۔

"وہ چوہا ہی تو غائب ہو گیا ہے۔ کون سے بل میں جا چھپا ہے۔ یہی تو پتہ نہیں چل رہا۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں اس نے خود کو تاریخ کے پردوں میں چھپا لیا ہے۔ یہی تو نہیں معلوم ہے کہ اس نے تاریخ مصر کے کون سے دور میں پناہ لی ہے لیکن کب تک چھپا رہے گا۔ ہم اسے تلاش کریں گے۔" اچانک اس کی آنکھوں کی نیلاہٹیں سرخیوں میں بدل گئیں۔ اس نے شرارے برساتی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر غرا کر بولی۔

"ہمیں وہ کتاب بھی مل جائے گی اور تمہارا باپ بھی۔ لیکن تاریخ کے بہت سے راز ابھی کھلنے نہیں چاہیے۔ جاؤ یہاں سے چلی جاؤ۔ ہم تمہیں تاریخ کا قیدی نہیں بنانا چاہتے۔ جاؤ نکل جاؤ یہاں سے۔"

"سنو عورت تم جو کوئی بھی ہو مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔ مجھے میرے پاپا کے بارے میں بتاؤ۔"

"میرے ہاتھوں اپنی موت کو آواز نہ دو۔ میں تمہیں تاریخ کے ہر صفحے سے مٹا دوں گی۔ جاؤ چلی جاؤ یہاں سے۔ میری تم سے دوسری ملاقات کہیں اور ہو گی۔" دفعتاً میرے ذہن میں آگ جل اٹھی۔ میں نے دانت کچکچا کر کہا۔

"اگر میرا تاریخ سے کوئی تعلق ہے تو بوڑھی ظالمہ تو مجھے نہیں مٹا سکے گی۔"

"میں کیا کر سکوں گی۔ اور کیا نہیں کر سکوں گی۔ اسے مجھ پر چھوڑ دے۔"

"ٹھیک ہے تو نے مجھے اب اس بات پر آمادہ کر ہی دیا ہے تو میں دیکھوں گی۔"

میں نے اب وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور واپسی کے لئے پلٹ پڑی۔ برق رفتاری سے کار چلاتی ہوئی آخر کار میں گھر واپس آ گئی۔ پھر وہ رات میرے لئے بہت سی سوچوں کی رات تھی۔ اب میں غور کر کے ان تمام واقعات کا تجزیہ کر رہی تھی۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ مجھے اپنا رویہ بدلنا چاہیے۔ گھر کے ملازموں کے ساتھ میں بہت خشک ہو گئی تھی۔ جبکہ پاپا کی زندگی میں، میں ان سب سے خوب گھلی ملی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ میری تنہائی مجھے ڈس رہی تھی۔ کوئی ایسا ہو جس سے دل کی باتوں کو تو کہہ سکوں۔ ملازموں میں سب میرے لئے ہمدرد اور وفادار تھے لیکن وہ اس سطح کے لوگ نہیں تھے۔ کہ انہیں راز دار بنا سکوں۔

میری سوچیں نہ جانے کیا کیا ہوتی رہیں اور پھر مجھے نیند آ گئی۔ دوسری صبح حیرت انگیز طور پر خوشگوار تھی۔ دن نکھرا نکھرا محسوس ہو رہا تھا۔ ناشتے کی میز پر میں نے آیا ندیمہ سے کہا۔

"آیا جی آپ نے بہت دن سے مجھے انڈوں کا حلوا نہیں کھلایا۔"

"میری جان آپ پر قربان نشاء بیٹی۔ آپ ان دنوں ٹھیک سے ناشتہ بھی کب کر رہی ہیں۔"

"ہاں پاپا کے لئے پریشان تھی لیکن اب....." میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"لیکن کیا.....؟ ندیمہ نے پر اضطراب لہجے میں کہا۔ اور میں مسکرا دی۔

"بتاؤ نشاء بیٹی....."

"میرا دل کہتا ہے پاپا زندہ ہیں۔"

"انشاء اللہ۔" ندیمہ نے پر خلوص لہجے میں کہا۔ پھر بولی۔ "کوئی نشان ملا ہے۔"

"نہیں کوئی خاص نہیں۔"

"بیٹے ایک بات کہوں۔"

"ہاں کہیے۔"

"میرے مالک زندہ ہیں۔" ندیمہ کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں چونک پڑی میں نے اسے غور سے دیکھ کر کہا۔

"آپ کچھ عجیب سے انداز میں بات کر رہی ہیں ندیمہ۔"

"ہاں نشاء بیٹی میری خوش خبری سنانے سے پہلے تم نے بڑے عجیب انداز میں میرے مالک کی زندگی پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔"

"خوش خبری.....؟" میں نے چونک کر ندیمہ کو دیکھا۔

"ہاں۔"

"آپ کو اس طرح توقف اختیار کرنا چاہیے۔ آیا ندیمہ۔"

"آپ ناشتہ کر لیں بیٹی۔"

"بات کیا ہے؟ مجھے بتائیں۔" میری آواز میں غراہٹ پیدا ہو گئی۔

"وہ بیٹی تمہیں معلوم ہے کہ میں بڑی باقاعدگی سے لائبریری کی صفائی کرتی ہوں۔ آج صبح بھی میں جب لائبریری میں داخل ہوئی تو وہاں مالک کے سگار کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔"

"کیا.....؟" میں اچھل پڑی۔

"الماری کے تیسرے خانے میں صاحب کے سگار کے ڈبے رکھے ہوتے ہیں۔ میں نے ایک ڈبے کو کھول کر دیکھا۔ اسے تازہ تازہ کھولا گیا تھا اور اس میں سے ایک سگار کم تھا۔ اور اس سے پہلے بھی میں سگار کے ڈبے دیکھ چکی تھی اس ڈبے میں سگار پورے تھے اور وہ پیک تھے۔ تب میں ایش ٹرے کو تلاش کرنے لگی اور صاحب کی مخصوص ایش ٹرے میں ان کا بجھا ہوا سگار موجود تھا۔"

"اوہ میرے خدا۔" میں جلدی سے اٹھ گئی اور دروازے کی جانب لپکی۔

"نشاء بی بی..... نشاء بی بی ناشتہ..... ناشتہ۔"

ندیمہ کی آواز میرے کانوں میں گونجتی رہ گئی تھی۔ میں برق رفتاری سے لائبریری کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

ندیمہ کا کہنا درست تھا پاپا سگار بہت کم پیتے تھے بس اس وقت پیتے تھے جب تاریخ کی کوئی گتھی الجھ جاتی تھی۔ اور یہ سگار عام سگار نہیں تھے بلکہ پاپا انہیں باقاعدہ امپورٹ کیا کرتے تھے۔

پاپا کے سگار کی خوشبو نے مجھے بے اختیار کردیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور میرے منہ سے درد بھرے انداز میں نکلا۔

"پاپا..... پاپا..... کہاں ہیں آپ۔ پاپا میرے سامنے آئیں میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ پاپا مجھ سے گریز نہ کریں۔ میں مررہی ہوں آپ کے لئے۔ ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ دیں۔ آجائیں پاپا میرے سامنے آئیں۔"

میری نگاہیں چاروں بھٹک رہی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے پاپا ابھی اسی الماری کے پیچھے سے مسکراتے ہوئے نکل آئیں گے۔ پھر میں خود بھی ہر کونے کھدرے میں جھانکنے لگی۔ اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی اور میں نے وحشت زدہ انداز میں پلٹ کر دیکھا۔ لیکن وہ پاپا نہیں آیا ندیمہ تھی۔ اندر آگئی اور بولی۔

"میں نے غلط تو نہیں کہا تھا نشاء بٹی ابھی تک سگار کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ اور کہا۔

"ہاں یہ پاپا ہی کے سگار کی خوشبو ہے۔ آؤ بیٹھو۔"

"آپ نے ناشتہ نہیں کیا۔"

"کرلوں گی۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا پاپا یہاں آئے تھے.....؟"

"میں کیسے بتا سکتی ہوں۔ بس سگار کی یہ خوشبو۔"

"کاش پاپا یہاں موجود ہوں۔ چلو ناشتہ کرلو۔"

ناشتے کے بعد میں لائبریری میں آگئی لائبریری میں ابھی تک ہلکی ہلکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی لیکن کہیں بھی مجھے پاپا کی موجودگی کے آثار نہیں مل رہے تھے۔ پھر میری نگاہیں کتابوں میں بھٹکنے لگیں۔ وہ کون سی کتاب ہے جو وہ پراسرار عورت حاصل کرنا چاہتی ہے۔ مگر مجھے کوئی اندازہ نہیں ہوسکا۔ البتہ میرے ذہن میں کچھ اور سوچیں جاگزیں ہوئیں تھیں اور ان کے تحت میں نے دو افراد کو طلب کرلیا۔ ان میں سے ایک رازق خان تھا۔ جو ریٹائر حوالدار تھا۔ اور فوج سے اپنی خدمات ختم کرکے ہمارے ہاں ملازم ہوگیا تھا۔ بہت بہادر اور نیک انسان تھا۔ دوسرا شہباز خان تھا۔ ایک سزا یافتہ شخص جس نے کسی کو شدید زخمی کردیا تھا۔ لیکن پاپا نے اسے بڑی عزت آبرو کے ساتھ اپنے ہاں ملازم رکھ لیا تھا۔ میں نے ان دونوں کو طلب کرلیا۔

"خان بابا آپ سے ایک کام آن پڑا ہے۔"

"جان مانگو خدا کا قسم دے گا۔"

"نہیں خان بابا مجھے آپ کی زندگی چاہیے۔"

"حاضر چھوٹا صاحب۔"

"اور شہباز بھائی آپ کو بھی تکلیف دوں گی۔"

"آپ حکم کرو بہن صاحب۔"

"شہباز بھائی پاپا کسی کی دشمنی کا شکار ہوگئے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون لوگ ہیں وہ پاپا کی لائبریری سے کوئی چیز چرانا چاہتے ہیں۔ آپ دونوں کو لائبریری کی نگرانی کرنا ہوگی۔ میں گیٹ پر کسی اور کی ڈیوٹی لگادوں گی۔"

"اوہ پناہ خدایا۔ ابھی آپ ہمارا وفاداری دیکھو۔ ٹکڑے اڑادیں گے خانہ خراب کے۔"

"آپ فکر نہ کریں نشاء بی بی۔ ہم ہوشیار رہیں گے۔"

ان دونوں کی یہ ڈیوٹی لگا کر میں نے انہیں بتایا کہ انہیں کہاں پوشیدہ رہ کر لائبریری کی نگرانی

کرنی ہے۔ البتہ ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا تھا وہ یہ کہ لائبریری کے سامنے والے حصے میں روشنی رکھوں۔ کہیں خدانخواستہ یہ لوگ پاپا ہی کو کوئی نقصان نہ پہنچادیں۔ میں نے اس کا بندوبست کیا۔ اور مطمئن ہوگئی۔

رات کو نجانے کب تک نیند نہیں آئی تھی۔ پھر سوگئی۔ اس وقت رات کے پونے تین بجے تھے۔ جب اچانک بندوق کی خوفناک گرج ابھری۔ یہ رازق خان کی بندوق کی آواز تھی۔ میں اچھل کر بستر پر بیٹھ گئی بس ایک لمحے ذہن کو سنبھالا اور پھر بدن پر گاؤن ڈال کر مردانہ وار باہر نکل آئی۔ دوسرے ملازمین بھی اس انوکھی بات پر حیران ہوکر باہر نکل آئے تھے۔ میں رکے بغیر لائبریری کی طرف بھاگی۔ میں نے رازق خان کو دیکھا جو اپنی رائفل سنبھالے سینہ تانے کھڑا تھا مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"چور کا بچہ۔ خدائی خوار۔ ہم نے چھوٹی صاحب اس کا دونوں ٹانگوں کا خانہ خراب کردیا اور اس کا دوسرا ساتھی اس کو کندھے پر اٹھا کر بھاگ گیا۔ ابھی شہباز خان اس کا پیچھے گیا ہے۔ دومنٹ میں دونوں پکڑا جائے گا۔ ادھر دیکھو چھوٹا صاحب۔ یہ کتنا خون پڑا۔"

میں نے زمین پر پڑے خون کے دھبوں کو دیکھا کافی خون تھا۔ اس کے ساتھ ہی خون کے دھبوں کی ایک لکیر بیرونی حصے کی جانب چلی گئی تھی۔ جہاں سے وہ فرار ہوئے تھے میرے ذہن میں اچانک عسکری اور مشل آگئے۔ عسکری نے ایسے دو افراد کے بارے میں بتایا تھا۔ جنہیں اس پراسرار عورت نے میرا گھر دیکھنے کے لئے آمادہ کیا تھا۔ شاید یہ وہی دونوں ہیں۔

بہرطور میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ تھوڑی دیر میں شہباز خان واپس آگیا۔

وہ بری طرح ہانپ رہا تھا پھولے ہوئے سانس کے ساتھ اس نے کہا۔ "کم بخت انسان تھے یا بھوت وہ اپنے زخمی ساتھی کو لے کر بھاگ رہا تھا۔ لیکن اتنی رفتار سے کہ توبہ۔ پھر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔"

"جاؤ تم لوگ آرام کرو۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"چھوٹی بیگم صاحب۔" رازق خان نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"ہاں بولو۔"

"آپ ناراض ہوگیا؟"

"کیوں؟"

"وہ نکل گیا۔"

"تو پھر.....؟"

"ہم اس کو پیٹ میں گولی نہیں مارا۔"

مجھے رازق خان کے انداز پر ہنسی آگئی۔ میں نے کہا۔

"ارے بابا۔ ٹانگیں تو توڑ دی تم نے اس کی۔ پیٹ پھاڑنے سے ہمیں کیا مل جاتا۔ جاؤ شہباز خان تم بھی آرام کرو۔ جاؤ شاباش۔" میں نے کہا اور وہ دونوں سر جھکا کر واپس چلے گئے۔ میں انہیں جاتے دیکھتی رہی۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ میں شہباز سے کہہ کر خون کے یہ دھبے تو صاف کرالیتی۔ میں قریب آکر خون کے یہ دھبے دیکھنے لگی۔ اس سے کم سے کم یہ بات تو ثابت ہوئی تھی کہ وہ دونوں مافوق الفطرت نہیں تھے۔ خیر میں نے تو انہیں دیکھا بھی نہیں تھا۔

"اب کیا کروں۔" آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لائبریری میں داخل ہوگئی لائٹ جلائی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی میرے چاروں طرف دنیا کی پراسرار کتابیں مسکرا رہی تھیں۔ ان میں کائنات کا علم چھپا ہوا تھا۔ کروڑوں کردار کتابوں کے صفحات میں سو رہے تھے۔ مختلف شخصیات کے حامل جن کی کہانیاں لازوال تھیں کتابوں میں دفن کیا انوکھا خیال تھا دنیا کے ہر ملک میں موت کے بعد انسانوں کی تدفین کے لئے قبرستان

ہوتے ہیں لوگ اپنی اپنی رسومات کے تحت اپنے مرنے والوں کی تدفین کرتے ہیں لیکن کتابیں زندہ مدفن ہوتی ہیں جن میں موت کے بعد بھی وہ کردار اپنے عمل کے ساتھ چلتے پھرتے رہتے ہیں۔

''پاپا خدا آپ کو لمبی عمر دے۔ زیادتی کر رہے میرے ساتھ، پہلے تو آپ نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ ہمیشہ مجھے اپنے اعتماد میں رکھا یہ کون سی مصلحت ہے کہ آپ اس طرح روپوش ہیں۔ میں بے چین اور بے سہارا ہوں۔ کیا آپ کو اندازہ نہیں ہے۔''

دیر تک پاپا سے باتیں کرتی رہی پھر اس کتاب کا خیال آیا۔ جس کے لئے یہ ہنگامہ آرائی ہوئی تھی۔ اور میری نظریں پھر اطراف میں بھٹکنے لگیں۔ کون سی کتاب ہے وہ آخر۔ کیا ہے اس میں۔ بہت دیر تک میری نگاہیں بھٹکتی رہیں پھر اکتا کر وہاں سے نکل آئی۔ گھر کے نوکر جو رزاق خان کی بندوق کی گرج دار آواز سے جاگ کر باہر نکل آئے تھے۔ ان میں سے کچھ تو خوفزدہ تھے کچھ میرے خوف سے میرے پاس نہیں آئے تھے لیکن اب وہ سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ ہر جگہ تاریکی پھیل گئی تھی۔ ایک کمرہ روشن نظر آرہا تھا میں اس کے سامنے سے گزری تو مجھے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ کمرہ ندیمہ بیگم کا تھا۔ کس سے باتیں کر رہی تھیں مجھے اندازہ نہیں ہوسکا اور شاید میں اپنی فطرت کے مطابق اس بات پر غور بھی نہ کرتی لیکن میرے کانوں میں اپنا نام پڑا تھا۔ تو میرے قدم رک گئے۔ ایک آواز ندیمہ بیگم کی تھی۔ اور دوسری فیض بابا کی۔ ندیمہ بیگم کہہ رہی تھیں۔ ''میں تو اب ان واقعات سے خوفزدہ ہوگئی ہوں خدا نہ کرے کچھ اونچ نیچ ہوگئی اور مالک نے آکر مجھ سے سوال کیا تو میں کیا جواب دوں گی۔

''مگر ندیمہ بیگم ہم اپنا فرض کیسے چھوڑ سکتے ہیں واقعات بے شک سمجھ نہ آنے والے ہیں۔ مگر صاحب نے ہم دونوں پر ہی اعتماد کیا تھا۔ ندیمہ بیگم یہ بات صرف تمہیں معلوم ہے یا مجھے کہ جو بی بی صاحب نشاء بیٹی کی ماں کہی جاتی تھی وہ ان کی ماں نہیں تھی۔''

مجھے یوں لگا جیسے میرے دماغ میں کوئی چیز پھٹی ہو۔ دماغ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہو۔ ایسی شدید چمک دماغ اور آنکھوں میں ہوئی تھی کہ پورا ماحول تاریک ہوگیا تھا۔ یوں لگا تھا کہ جیسے برین ہیمرج ہوگیا ہو۔ گرنے سے بچنے کے لئے دیوار کا سہارا لیا۔ شکر تھا کہ دروازے میں ہاتھ نہیں لگے۔ ورنہ ان لوگوں کو پتہ چل جاتا۔ دل چاہا کہ زمین پر لمبی لمبی لیٹ جاؤں۔ پورے بدن میں جیسے سیال آتش پگھل رہا تھا سارا وجود پھٹک رہا تھا۔ یہاں گر پڑی تو خواہ مخواہ تماشہ بنے گا۔ نجانے کس طرح قدم اٹھاتی ہوئی اپنی خواب گاہ تک آئی۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی اور پھر فرش پر بیٹھتی چلی گئی میرا دل چاہ رہا تھا کہ برف کی سلوں پر لیٹ جاؤں اتنی آگ لگ رہی تھی سارے وجود میں کہ الفاظ بیان نہیں کرسکتی پھر مجھے اپنے واش روم کا خیال آیا جس میں پاپا نے ایک خاص کولنگ پلانٹ لگایا تھا یعنی اگر کبھی ٹھنڈے پانی سے نہانے کو دل چاہے تو اسے کنٹرولڈ ٹمپریچر پر لایا جاسکتا ہے۔ دروازے کی چٹخنی لگائی۔ واش روم میں داخل ہوئی۔ اور واٹر ٹمپریچر کو خاصا نیچے لے آئی پھر لباس اتار کر شاور کے نیچے بیٹھ گئی۔ چاروں طرف سے سرد پانی کی پھواریں میرے بدن کا احاطہ کرنے لگیں۔ مجھے اندازہ نہیں رہا کہ کب تک اس یخ پانی سے نہاتی رہی۔ پھر جب بدن کی کپکپاہٹ ہونٹوں سے سسکیوں کی شکل اختیار کر کے نکلنے لگی۔ تو مجھے ہوش آیا۔ شاور بند کر کے لباس تبدیل کیا۔ اور کمرے میں آگئی۔

''آہ میری زندگی اس قدر پراسرار کیوں ہے؟ کون ہوں میں؟'' وہ عورت میری ماں نہیں تھی جس نے مجھے ہمیشہ ماں کا پیار دیا تھا۔ تو پھر کون تھی وہ؟ اور تمہیں سب کچھ معلوم تھا آیا ندیمہ اور بابا فیض زندہ نہیں چھوڑوں گی تم دونوں کو۔ صبح ہونے دو۔''

(جاری ہے)

خونی گڑیا

اقصیٰ رباب۔ فیصل آباد

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہر سو مسلط تھا، کمرے میں زیرو کا بلب اپنی روشنی پھیلانے میں مصروف تھا کہ بستر پر پڑی ہوئی بے جان گڑیا میں اچانک حرکت پیدا ہوئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے.....

اچانک ایک خونی واقعہ رونما ہوا، وہ واقعہ کیا تھا یہ تو کہانی پڑھ کر ہی پتہ چلے گا

آج موسم کافی خوشگوار تھا۔ ہلکی سی بوندا باندی کے باعث ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ موسم کی اس لطافت نے مجھے مجبور کردیا کہ آج بازار چلی ہی جاؤں۔ گھر کی ضروری خریداری کرنی باقی تھی جو میں کافی دنوں سے نظر انداز کر رہی تھی۔ گھر کا سامان خریدتے ہوئے اچانک میری نظر ایک چھوٹی سی گڑیا پر پڑی جس میں ناقابل بیان کشش تھی۔ اس کی نیلی آنکھیں، براؤن بال اور سرخ ہونٹ یوں لگتا تھا جیسے یہ بے جان نہیں، ان میں زندگی ہے۔ کچھ تھا جو مجھے اس گڑیا سے نظریں ہٹانے نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اسے خرید لیا۔

جب گھر کے پاس آئی تو وہاں اکثر ایک پاگل ملتا ہے جو کسی سے کچھ نہیں کہتا مگر آج خلاف توقع وہ میری طرف بڑھا اور میرے ہاتھ سے شاپنگ بیگ

چھین لیا۔ اور ساری چیزیں زمین پر پٹخ دیں۔ گڑیا کی طرف دیکھ کر زور سے چیخا ''خونی گڑیا۔ تم نے لی خونی گڑیا۔'' یہ کہہ کر وہاں سے بھاگ گیا۔ میں حیران ہوگئی اور بے ساختہ میرے منہ سے نکلا ''پاگل'' اور میں سامان بیگ میں ڈالنے لگی۔

گھر آئی تو ممانے چیزیں دیکھیں۔ گڑیا دیکھ کر ہنسنے لگیں اور بولیں۔ ''ابھی بھی تمہارا بچپنا نہیں گیا۔'' گڑیا تھی ہی اتنی پیاری کہ انہیں بھی بہت پسند آئی۔

ہماری فیملی میں ایک بچے کی برتھ ڈے تھی۔ میں نے سوچا اب بازار نہیں جایا جاتا چلو گڑیا ہی اسے گفٹ کردیتے ہیں۔ حالانکہ وہ مجھے اتنی پسند آئی تھی کہ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ کسی کو بھی دوں۔

میں نے بڑے پیار سے گڑیا کو پیک کیا اور اسے گفٹ دے آئی۔ گھر واپس آئی تو گڑیا کو یاد کر کے ایک مسکراہٹ بے ساختہ میری لبوں پر آ گئی۔ میں نے بستر کے پاس پڑی میز کو دیکھا جہاں میں گڑیا رکھتی تھی۔

رات میں سوئے ہوئے میں نے خواب میں دیکھا جیسے گڑیا میرے پاس آئی اور بولی۔ ''تم نے تو مجھے چھوڑ دیا ہے۔ مگر میں تمہیں چھوڑ کر کہیں اور نہیں جاسکتی اور میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔'' صبح میں نے ناشتہ کرتے ہوئے اپنی امی کو خواب سنایا تو وہ ہنسنے لگیں اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''لگتا ہے تمہیں گڑیا سے عشو ہوگیا کہ اب وہ خواب میں بھی تمہارے حواسوں پر مسلط رہتی ہے۔'' میں بھی ان کی بات سن کر مسکرائی اور کالج چلی گئی۔

کالج سے واپسی پر میں کمرے میں گئی تو دانستہ طور پر میں نے اس میز کو دیکھنے سے احتراز کیا کیونکہ خالی میز مجھے اداس کرنے لگا تھا۔ میں نے گھر والوں کے ساتھ لنچ کیا اور ٹی وی دیکھنے میں مشغول ہوگئی۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا جب میں اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور لائٹ آن کی۔ میری سرسری سی نظر میز پر پڑی۔ اس لاشعوری نظر کو میں شعوری کوشش سے دوسری طرف کرنا چاہ رہی تھی کہ جب مجھے احساس ہوا کہ میز پر تو گڑیا پڑی ہے۔ میں نے جلدی سے دوبارہ دیکھا کہ مجھے وہم ہوا ہے۔ مگر یہ تو کوئی وہم نہیں تھا گڑیا تو حقیقت میں میز پر موجود تھی اور مجھے لگا کہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔

میں زور سے ''میری گڑیا'' کہتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کے کئی بوسے لے ڈالے۔ امی بھی میری آواز سن کر آ گئیں اور جب گڑیا کو میرے ہاتھ میں دیکھا تو حیران رہ گئیں۔ خوشی کے بجائے ان کی آنکھوں میں مجھے تفکر نظر آیا۔ کچھ خوف تھا جو کسی سوچ کے ساتھ ملا ہوا ان کی آنکھوں میں پناہ گزیں تھا۔ اس خوف اور گہری سوچ کی آمیزش ان کی آنکھوں سے صاف جھلک رہی تھی۔ امی مجھے بغیر کچھ کہے واپس پلٹ گئیں اور میں اپنی گڑیا کے ساتھ محو گفتگو ہوگئی۔

گڑیا کے ساتھ کھیلتے مجھے کس وقت نیند آئی۔ وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ مجھے کچھ دیر بعد ایسے لگا جیسے گڑیا میرے پاس سے اٹھ کر کہیں گئی ہے، میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں گڑیا سچ میں میرے پاس نہیں تھی۔ نجانے کہاں غائب ہوگئی تھی۔ میں تھوڑی دیر بعد سوگئی۔

صبح جب حسب معمول میری آنکھ کھلی تو گڑیا میرے بستر پر ہی موجود تھی۔ میں حیران رہ گئی کہ گڑیا کے میرے پاس ہونے میں کیا خواب ہے اور کیا سچ۔ ناشتے پر امی نے مجھ سے پوچھا۔ ''تم رات 12 بجے کے آس پاس کمرے سے نکل کر کہاں گئی تھیں؟''

امی کی بات سن کر میں حیران رہ گئی کہ میں تو کہیں بھی نہیں گئی تھی۔

امی نے کہا۔ ''میں نے خود تمہارے کمرے کا دروازہ کھلتے دیکھا تھا۔''

عجیب کشمکش تھی۔ میں کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی اور امی کا کہنا تھا کہ انہوں نے خود میرا دروازہ کھلتے دیکھا۔ اتنے میں باہر شور مچ گیا۔ امی باہر گئیں اور کچھ دیر بعد واپس آئیں۔ ہمارے ساتھ والے گھر

کی خاتون کو کسی نے بہت برے طریقے سے مار ڈالا تھا۔ اس کا سارا جسم کٹا پھٹا تھا مگر حیرت انگیز طور پر خون کا ایک قطرہ فرش پر موجود نہیں تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی حیران کن تھی کہ کسی جنگلی جانور نے ان کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا ہے۔ یہ ایسا خوفناک اور اپنی نوعیت کا عجیب وغریب پہلا واقعہ تھا جس نے پورے علاقے کو خوفزدہ کر ڈالا تھا۔ مگر اب یہ حادثہ اور گھروں میں پیش آ گیا۔ سب لوگ سکتے اور خوف کے عالم میں آ گئے۔ کسی کو کوئی حل نہیں سوجھ رہا تھا۔

پولیس بھی حیران تھی اور کوئی اندازہ نہیں لگا پا رہی تھی۔ اگر کوئی جانور ہوتا تو کسی نہ کسی کو کچھ نہ کچھ تو ضرور نظر آ جاتا۔ مگر ایسے لگتا تھا جیسے کوئی چیز زمین سے نکلتی ہے اور خون پی کر زمین کے اندر چلی جاتی ہے۔ لوگوں کے چوکنا ہونے اور پولیس کی سخت نگرانی کے باوجود کسی کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کوئی بھی سراغ نہیں مل رہا تھا مگر روز صبح ایک لاش لازمی مل جاتی۔

ایک دن امی نے مجھ سے کہا۔ ''سائرہ! تم آج رات نہیں سوسکتی۔ تم نے بس سونے کی ایکٹنگ کرنی ہے۔''

میں نے حیرانگی سے پوچھا ''امی وہ کیوں.....؟ اور کس لئے؟

امی نے کہا۔ ''تم دیکھنا کہ گڑیا رات کو زندہ ہو کر تمہارے کمرے سے نکلتی ہے۔''

میری گڑیا سے محبت عود کر باہر آئی اور میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''امی آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟ میری گڑیا سارے قتل کر رہی ہے؟ وہ خونی ہے کیا؟'' اور ایک دم مجھے اس پاگل کی بات یاد آ گئی کہ۔ ''یہ خونی گڑیا ہے۔''

میں نے ارادہ کرلیا کہ آج رات کسی بھی قیمت پر نہیں سونا۔ رات 12 بجے جب میں سونے کی ایکٹنگ کر رہی تھی اور اندر سے ڈر بھی لگا ہوا تھا مجھے نجانے کیا کچھ ہوجائے۔

اچانک گڑیا میرے ساتھ بستر سے اٹھی میری طرف مسکرا کر دیکھا اور کمرے سے چل پڑی۔ اس وقت میری وہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ دل کر رہا تھا کہ کہیں بھاگ جاؤں۔ کہیں جا کر چھپ جاؤں۔ دوبارہ اس گڑیا کو اب نہ دیکھوں۔ کچھ دیر گزری ہوگی جب گڑیا کمرے میں آ گئی اور میرے بستر پر آ کر میرے ساتھ لیٹ گئی۔ مجھے لگ رہا تھا میری سانس بند ہوجائے گی۔ ایک ایک لمحہ عذاب تھا۔ پوری رات ایک لمحہ بھی میں نہ سوسکی تھی۔

صبح ناشتے پر امی نے دیکھا میری آنکھیں سرخ ہیں۔ انہوں نے دھیرے سے مجھ سے پوچھا، تو میں نے سارا واقعہ سنا دیا۔ امی بھی لرز کر رہ گئیں۔ اب ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرنا چاہیے۔ کون تھا جو اس بات پر یقین کرتا۔ سب ہمیں پاگل سمجھتے۔ اس کا حل ہمیں ہی کرنا تھا۔ اور ہم کسی کی مدد بھی نہیں لے سکتے تھے۔

ایسے میں مجھے پاگل کی یاد آئی۔ مجھے یقین تھا کہ اس پاگل کو ضرور علم ہوگا اس مشکل سے نکلنے کا۔

میں باہر نکلی تو تھوڑی دیر کے بعد مجھے وہی پاگل نظر آ گیا میں اس کی طرف لپکی اس نے حیران ہو کر مجھے اپنی طرف آتے دیکھا۔ میں قریب جا کر روہانسی آواز میں بولی۔ ''آپ کو یاد ہے جب میں ایک گڑیا لائی تھی تو آپ نے اسے خونی گڑیا کہہ کر پکارا تھا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے اسے ساری صورتحال بتائی مگر اس کی آنکھوں میں مجھے کوئی خوف اور حیرت نظر نہ آئی۔ جیسے سب کچھ وہ پہلے سے جانتا ہو۔ میں نے اس سے مدد کی درخواست کی۔

اس نے کہا۔ ''گڑیا نے اب تک تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اس کا مطلب وہ تم لوگوں پر مہربان ہے۔'' اس نے مجھے ایک عجیب وغریب چاقو تھما دیا اور بولا۔ ''میری بات دھیان سے سنو! وہ گڑیا روز رات کو 12 بجے زندہ ہوتی ہے۔ تمہیں بہت ہمت

سے کام لینا ہے۔ یہ چاقو اس وقت اس کے دل میں گھونپنا ہے جب وہ ابھی پوری طرح نہ زندہ ہونے مردہ یعنی ابھی 12 پر گھڑی کی سوئی جائے اور ساتھ ہی یہ چاقو اس کے دل میں گھونپ دینا۔ ذرا سی دیر بہت تباہی مچادے گی اور ذرا سی پہل اسے ختم ہونے سے بچا لے گی۔ وقت کی پابندی پر اس گڑیا کی موت اور تمہاری زندگی کا دارومدار ہے۔ کر پاؤ گی اس طرح؟'' میرے اعصاب تو لگتا تھا مفلوج ہوگئے ہیں۔ نہ میں اقرار کرسکتی تھی نہ انکار۔ مگر اس کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں تھا میرے پاس۔ اگر کامیاب ہوجاتی تو اس خون خرابے کو روک پاتی اور اگر ناکام رہتی تو اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی۔ پھر کم سے کم روز لاشیں دیکھنے سے تو بچ جاتی۔ روز روز کے مرنے سے بہتر تھا ایک بار ہی مرجاؤں یا سب کو مرنے سے بچالوں۔

میں نے اس کے دیئے ہوئے چاقو کی مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں پکڑا اور واپس گھر آ گئی۔ امی کو اس پاگل کی باتیں بتادیں۔ امی حیرت سے سنتی رہیں۔

جب میری بات ختم ہوگئی تو امی بولیں۔ ''ہم انسان بھی کمال ہیں جو ہم سے کئی درجہ زیادہ عقلمند اور سمجھ دار ہوتا ہے، ہم لوگ اسے ہی ''پاگل'' سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ ظاہری دنیا تو کیا، ہماری آنکھوں سے اوجھل دنیا کی بھی خبر رکھتے ہیں یعنی غیب کی اکثر باتوں سے آگاہ ہوتے ہیں اور جب وہی غیب کی باتیں، ماورائی حقائق ہمارے سامنے اپنی زبان پر لاتے ہیں اور ہم ان کی گہری باتوں کو سمجھنے کے لائق نہیں ہوتے تو انہیں ''پاگل'' کے نام سے منسوب کرڈالتے ہیں۔''

رات ہوتی جارہی تھی اور ہمارا پل پل ہم پر غضب ڈھاتے ہوئے گزر رہا تھا۔

میں حسب معمول کمرے میں آ گئی۔ وہ گڑیا جس کا چہرہ مجھے اتنا حسین لگتا تھا کہ نظر ہٹانے کو دل نہیں کرتا تھا۔ آج اس کی طرف دیکھنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں ہورہا تھا۔ دل خوف اور نفرت سے بھرا ہوا تھا۔

وقت آہستہ آہستہ سرکتا جارہا تھا۔ کبھی دل میں آتا کہ جلدی سے 12 بج جائیں اور کبھی دل دعا کرتا کہ 12 کبھی نہ بجیں۔ کبھی خوف مجھ پر غالب آنے لگتا اور کبھی ہمت مجھے حوصلہ دینے بیٹھ جاتی۔

11:30 بج چکے تھے اور میرے دل کی دھڑکن اتنی تیز، ایسا لگ رہا تھا کہ دل سینے کے اندر ہی پھٹ جائے گا میرے کانوں میں میرے دل کے تیز دھڑکنے کی آواز صاف آرہی تھی۔ دھڑکن کی آواز کے سوا میں اور کوئی آواز نہیں سن رہی تھی۔

اسی کیفیت میں 11:59 ہوگئے۔ میں نے چاقو کو دونوں ہاتھوں میں بلند کرکے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور جب 11:59 اور 59 سیکنڈ پر گھڑی پہنچی تو اسی لمحے میرے دونوں ہاتھوں نے تیزی سے نیچے کی طرف حرکت کی۔

گڑیا میں زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے اور اسی لمحے میرا چاقو اس کے دل میں اتر گیا۔

ایک چیخ تھی اور گڑیا کی کئی بھیانک بدلتی شکلیں اور پھر آخر میں بستر پر کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ ہی گڑیا، اور نہ ہی چاقو۔

اگلے ہی پل، امی میرے کمرے میں تھیں، انہوں نے مجھے اپنے ساتھ گلے سے لگالیا۔ آنسو ان کی آنکھوں سے جاری تھے اور میری آنکھیں بھی نم تھیں۔

ایک ''پاگل'' نے کتنے لوگوں کو موت سے بچا لیا تھا۔

اگلے دن سب حیران تھے کہ آج کوئی لاش نہیں ملی۔ کچھ دن کے بعد سب کو سکون ہوگیا کہ اس خونی بلا سے جان چھوٹ گئی۔ مگر اس خونی بلا کے ڈر نے علاقے کے لوگوں کو نیکی کی طرف مائل کردیا تھا۔ اب مجھ سمیت بہت سارے لوگ نماز کی پابندی کرنے لگ گئے ہیں۔

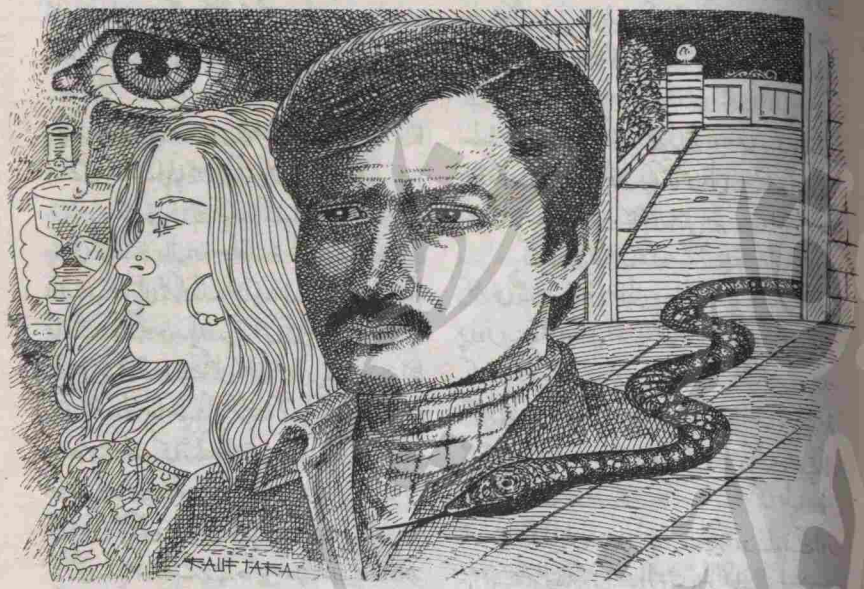

سرسراہٹ

صباء رمضان۔ پنڈ دادنخان

مارے طیش اور غصے سے لڑکی کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں اس نے تیزی سے پلٹی کھائی اور دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ خوفناک سانپ کا روپ دھارلیا اور اس کے منہ سے ناقابل برداشت خوفناک پھنکار سنائی دی۔

خوف وہراس کے گرداب میں غوطہ زن اپنی نوعیت کی انوکھی لرزہ طارتی کرتی کہانی

وہ پورے چاند کی رات تھی۔ آسمان پر بادلوں کا ایک ہجوم سا تھا جیسے وہ سب چاند کے مکمل جوبن کو دیکھ کر مدہوش ہوگئے ہوں۔ وقفے وقفے سے چاند کو اپنے گھیرے میں لیتے تو فضا میں تاریکی سی چھا جاتی۔ کبھی کبھی چاند خود کو بادلوں کے گھیرے سے باہر نکل جاتا اور پھر اپنی چاندنی زمین پر بکھیرنے لگتا۔ ہلکی ہلکی ہوا موسم میں خنکی بڑھا رہی تھی۔ لوگ گرم رضائیوں میں دبکے راحت کی وادیوں کی سیر کررہے تھے۔ گرمیوں میں امیر لوگوں کا فل اے سی کی وجہ سے مزا ہوتا ہے۔ رات کے اس پہر وسیع وعریض رقبے پر پھیلی ہوئی کوٹھی کے لان کے سرسبز پودوں میں بے چینی کا طلاطم برپا تھا۔ کوئی ہرے پتوں میں کلبلاتی ہوئی سرگردان پھر رہی تھی، پتوں میں اس ہلچل کو اگر کوئی جاگنے والا فرد دیکھ لیتا تو ہراساں ہوجاتا۔

بالآخر اس چیز نے پتوں میں سے سر نکال کر باہر کا جائزہ لیا۔ دو ننھی چمکتی آنکھیں پتوں سے نمودار ہوئیں اور گردوپیش کا جائزہ لینے لگیں۔ سبز گھنے پتوں سے جھانکتی شعلہ بار دو ننھی آنکھیں..... محفوظ ماحول دیکھ کر وہ سیانا سا وجود پتوں کی اوٹ سے نکلا، اور رینگتا ہوا کوٹھی کے اندرونی حصوں کی جانب بڑھنے لگا۔

کسی چیز کی تیز مہک اسے کچن کی طرف کھینچے جارہی تھی۔ بہرحال وہ سونگھتا ہوا کچن کے اندر داخل ہوا۔ اب وہ پل بھر کو رک کر ایک بار پھر اردگرد دیکھ رہا تھا۔ جیسے کچھ کھوج رہا ہو۔ خیر اس کی نظر اپنی من چاہی شے پر پڑ گئی تو وہ جیسے کھل اٹھا۔ فوراً رینگتے ہوئے اپنا رخ چھوٹے صاحب کی طرف کردیا جس میں ٹھنڈا دودھ موجود تھا۔ کسی نے احتیاط سے مگ میں دودھ رکھا ہوا تھا۔ وہ سنہری رنگت کا ایک چھوٹا سا سانپ تھا۔ اس کی لمبائی بمشکل چند انچ تھی۔ بہرحال بڑی تگ ودو کوشش کے بعد وہ مگ پر چڑھ گیا اور دودھ پینے لگا، اور پھر وہ اپنا بیلنس نہ رکھتے ہوئے اچانک مگ میں گر پڑا۔ مگ سے نکلنے کی اس نے بہت کوشش کی مگر چند انچ پر مشتمل وہ سانپ مگ سے باہر نہ نکل سکا۔ اس شاندار کوٹھی کی پرانی ملازمہ سکینہ کچن میں آئی اور اس نے ادھر ادھر دیکھا اور جھٹ اس نے مگ اٹھا کر گھبراتے ہوئے ایک ہی سانس میں سارا دودھ پی گئی۔ کچن میں اس وقت اندھیرے کا راج تھا۔ سکینہ کا یہ روز کا معمول تھا کہ سب کے دودھ پینے کے بعد اپنے لئے وہ ضرور دودھ بچا لیتی تھی اور کام کاج سے فراغت کے بعد گھر جاتے ہوئے دودھ پیتی تھی۔ دودھ پینے کے بعد وہ کچن سے نکلی اور اپنے سرونٹ کوارٹر کی طرف خراماں خراماں بڑھ گئی اور کمرے میں جا کر چارپائی پر لمبی تان کر سوگئی۔

رات اپنی چادر آہستہ آہستہ سمیٹ رہی تھی۔ افق پر صبح کے اجالے نمودار ہونے کو تھے۔ اس علاقے میں چند عالی شان گھروں کے علاوہ کچے پکے مکانات بھی تھے۔ دائیں طرف جھونپڑیوں کی بھی چھوٹی سی قطار تھی۔ غرض کہ اس علاقے میں مالی لحاظ سے ہر طرح کے افراد رہائش پذیر تھے۔ البتہ نیلے رنگ کے پتھروں والی وہ کوٹھی سب میں نمایاں تھی جس کے نیلے پتھر رات میں ہیروں کی مانند جگمگاتے تھے۔ اور جس کے در و دیوار کو آدھے سے زیادہ سرسبز درختوں، پتوں اور پودوں نے ڈھک رکھا تھا۔ اس کوٹھی کی خوبصورتی کے باعث اس میں بسنے والے افراد کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ دنیا میں ہی جنت میں میں رہتے ہیں۔

صبح کی کرنیں اس کوٹھی کے نقش ونگار کو اور نمایاں کررہی تھیں۔ بالائی منزل پر واقع کمرے کے بھاری پردوں سے ہلکی روشنی اندر داخل ہورہی تھی۔ گلابی رنگ کے نرم مخملی کمبل سے دو سپید بازو باہر نکلے اور بھرپور انگڑائی لی۔ سفید داغ، سڈول بازو کو چاندی کا ہلکا سا جگمگاتا بریسلٹ اور حسین بنا رہا تھا۔ نرم کمبل میں لیٹی اس حسین نازنین کو دیکھنے کے لئے کسی کا بھی دل بے تاب ہوسکتا تھا۔

پھر ان خوبصورت ہاتھوں نے اپنے چہرے سے ہولے ہولے کمبل کو کھسکانا شروع کیا۔ سفید چہرے پر بکھری ہوئی سیاہ بالوں کی چند لٹیں، بادلوں میں چھپے ہوئے چاند کی مثال لگ رہی تھیں۔ مندی مندی آنکھوں سے اس حسینہ نے وال کلاک پر نظر ڈالی تو ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ آج تو اس کے کالج کا پہلا دن تھا اور وہ اتنی دیر تک سوئی رہی تھی۔ ”عدنان لالہ! آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟ میں آج کالج سے لیٹ ہوگئی۔“

ناشتے کی میز پر عدنان کی چھوٹی بہن صباء شکوہ کناں ہوئی۔ ”میں تو خود رات بہت لیٹ سویا تھا۔ احتشام بھائی کا فون آیا تھا بس ان سے گپ شپ لگاتا رہا۔“ عدنان نے اورنج جوس کا گلاس اٹھالیا۔

”تو کیا آج تم کالج نہیں جاؤ گی.....؟“ ایسے تو تمہارا امپریشن برا پڑے گا بیٹا۔“ ان کی والدہ فوراً بول پڑیں۔

”چھوڑیں امی! آج صباء آپی کو چھٹی کروالیتے ہیں۔ کیونکہ کم از کم مجھ سے تو یہ بالکل برداشت نہیں ہوگا کہ کوئی میری اتنی معصوم سی آپی کو ڈانٹے۔“ حسان بھی

اپنی کرسی کھینچ کر بیٹھ چکا تھا۔

”ویسے کوئی میری اتنی پیاری بیٹی کو ڈانٹے، یہ برداشت تو مجھ سے بھی نہیں ہوگا۔“ ان کی والدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تو بس پھر! صباء کو چھٹی کروالیتے ہیں کیونکہ لیٹ آنے پر ان کی کھنچائی تو پکی ہے۔“ عدنان نے دیسی گھی کے پراٹھے کا نوالہ توڑ کر منہ میں رکھتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

”امی جان زندہ باد۔“ صباء اپنی والدہ سے لپٹ گئی۔ کیونکہ ان کی والدہ کی اجازت کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

”یہ سکینہ نے آج میرے لئے چائنیز آملیٹ کیوں نہیں بنایا؟“ حسان نے حیرت سے میز پر نظر دوڑائی۔

”وہ صاحب جی! بس ابھی لائی۔“ پاس ہی کھڑی ملازمہ سکینہ فوراً کچن کی جانب بڑھ گئی۔

”ایسا تو آج تک نہیں ہوا کہ سکینہ اپنا کام بھول جائے۔“ عدنان پرتشویش لہجے میں بولا۔ کیونکہ سکینہ واقعی بہت ذمے دار ملازمہ تھی بس کھانے پینے کے معاملے میں تھوڑا سا اندیدہ پن سب کو کھٹکتا تھا۔

”ارے چھوڑیں لالہ! اس کا اپنا کوئی مسئلہ ہوگا۔ ہم کیوں اس کی فکر میں ہلکان ہوں؟ عدنان سے کہنے کے بعد صباء نے اپنا رخ والدہ کی سمت موڑا۔ ”مما آپ مجھے یہ بتائیں کہ میرا ففتھ کلاس کا فوٹو البم کہاں ہے؟“

”کیوں بیٹا؟ اس کی اب کیا ضرورت پڑ گئی آپ کو؟“ والدہ محترمہ ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولیں۔

”وہ مما! اصل میں میری دوست ہے ناں چاندنی۔ اس کا کل شام فون آیا تھا۔ باتوں باتوں میں وہ کہہ رہی تھی کہ ففتھ کلاس کی الوداعی تقریب کے وقت اس نے پنک کلر کا فراک پہن رکھا تھا، جس کے پیچھے بہت بڑے بڑے پر لگے ہوئے تھے۔ جبکہ میں کہتی ہوں، اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ بس اسی بات پر ہماری شرط لگ گئی۔ اس فوٹو البم میں ہماری پارٹی کی تصویریں ہیں، بس اسی لئے دیکھنا چاہ رہی ہوں۔“ تفصیل بتاتے ہوئے صباء نے دودھ کا گلاس منہ سے لگایا۔

”فوٹو البم تو اسٹور روم میں پڑا ہے۔ بائیں طرف ریک کے آخری خانے میں ہے۔“

”اچھا عدنان! میری آج ذرا میٹنگ ہے، شاید لیٹ ہوجاؤں۔ صباء اور حسان کا خیال رکھنا اور تم تینوں ہی گھر سے باہر نہیں نکلو گے رائٹ؟“ والدہ محترمہ نے جاتے جاتے حکم صادر کردیا۔ وہ ایک سوشل ورکر تھیں جبکہ ان کے شوہر بھی شہر کی مشہور شخصیت تھے۔ صبح جا کر رات گئے ان کا گھر آنا ہوتا۔ نیلے پتھروں والی کوٹھی میں رہنے والے افراد کی بس یہی زندگی تھی۔

”لالہ! میں اسٹور سے فوٹو البم لے کر آتی ہوں، آپ سکینہ سے کہہ کر برتن اٹھوالیں۔“ صباء کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

کوریڈور سے ہوتے ہوئے بالائی منزل کی جانب جاتی محرابی سیڑھیوں کے عین نیچے اسٹور واقع تھا۔ جس کو زیادہ تر لاک لگا رہتا تھا۔

صباء نے چابی لاکر میں گھمائی اور دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آن کرنے کی کوشش کی تو اچانک یاد آیا کہ بلب تو فیوز ہوچکا ہے۔ اور پھر بھلا اسٹور میں نیا بلب لگاتا بھی کون؟ صباء نے قدم آگے بڑھائے اور بائیں طرف بڑھنے لگی جہاں ریک رکھا تھا۔ دیوار پر بنے چھوٹے سے روشندان سے سورج کی نہایت مدھم روشنی اندر آرہی تھی۔ وہ جھک کر بیٹھی اور ریک کے آخری خانے سے البم تلاش کرنے لگی۔ چند منٹ بعد ہی اسے البم مل گیا۔ فوٹو البم لے کر وہ اٹھی تو اسے اپنے اردگرد کچھ سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس نے گردوپیش میں نگاہ دوڑائی تو بھونچکا رہ گئی۔

ریک کے سب سے اوپری حصے کے اوپر دو بڑی بڑی سرخ آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ صباء گھبرا کر

دائیں طرف کو ہٹی تو مزید حیران رہ گئی۔ ان سرخ بڑی بڑی آنکھوں کے ڈیلے صباء کی حرکت کے ساتھ ہی حرکت کررہے تھے۔ ایک زوردار چیخ اس کے منہ سے نکلی اور وہ بدحواس ہوکر بھاگتی ہوئی اسٹور روم سے نکلی اور بالکل سیدھ کی سمت میں بھاگتے ہوئے سامنے کی طرف آتے کسی وجود سے ٹکرا گئی مگر اس سے پہلے کہ وہ گرتی، کسی نے اسے بازوؤں سے تھام لیا۔ اس نے اپنا مسلسل چیخیں مارتا منہ بند کرکے آنکھوں کو کھولا تو سامنے پینٹ شرٹ میں ملبوس تقریباً سات فٹ کا مالک کھڑا تھا۔ وہ بلاشبہ انتہائی بارعب شخصیت لگ رہا تھا۔ صباء نے گھبرا کر اس شخص کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ بولے اندر کی طرف بھاگ گئی۔

اس پروجاہت شخص نے ایک نظر اندر کی جانب بھاگتی صباء پر ڈالی اور دوسری نظر زمین پر گرے اس کے لال دوپٹے پر ڈالی لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے آگے بڑھ کر لال رنگ کا ستاروں بھرا آنچل اٹھایا اور صوفے پر رکھ دیا۔ جیسے وہ اس دوپٹے کو زمین پر گرا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

''ارے حشام بھائی! آپ کب آئے؟'' ٹی وی لاؤنج سے نکلتے عدنان کی نظر اپنے بڑے بھائی بشیر کے دوست پر پڑی تو سیدھا اسی کی طرف آیا۔ ''بس عدنان یار! بشیر نے کچھ چیزیں تم لوگوں کے لئے بھیجی ہیں، وہی دینے آیا ہوں۔'' احتشام نامی اس پروجاہت شخص نے کالے رنگ کے دو بڑے بیگز عدنان کے ہاتھوں میں تھمائے۔

''آپ بیٹھیں بھائی! میں سکینہ کو چائے کا بول کر جارہا ہوں۔ پی کر جایئے گا۔ اصل میں مجھے ضروری کام نہ ہوتا تو آپ کے ساتھ بیٹھ کر خوب گپ شپ لگاتا۔'' عدنان نے مسکراتے ہوئے عذر پیش کیا اور چلا گیا۔

سی گرین کلر کے صوفے پر بیٹھے احتشام کی نظریں بار بار صوفے پر پڑے سرخ رنگ کے دوپٹے پر بھٹک رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی امید بھری نظریں اس آس پر بھی ادھر ادھر دوڑا رہا تھا کہ شاید وہ آنکھیں بند کرکے چیخیں مارتی دیوانہ وار بھاگتی لڑکی انہیں دوبارہ نظر آجائے۔ مگر چائے کی آخری چسکی بھرنے تک ان کی نگاہیں متلاشی ہی رہیں۔ بالآخر وہ ناامید سے ہوکر اٹھے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے باہر کی جانب بڑھنے لگے۔

''اوہ! میرا دوپٹہ.....'' صباء شیشے کے سامنے کھڑی ہوئی تو اچانک اسے یاد آیا کہ اس کا دوپٹہ تو وہیں گر گیا تھا۔ وہ تیزی سے نکل کر کوریڈور کی طرف آئی جہاں سے احتشام ایک نظر پھر دیکھنے کی چاہ لئے لوٹ گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

''بہت درد ہورہا ہے بی بی جی۔'' انیس سالہ سکینہ پیٹ پر ہاتھ رکھے سسک رہی تھی۔

''یہ تمہیں ہر ڈیڑھ دو ہفتے بعد ایسا درد کیوں ہوجاتا ہے؟ مما بھی گھر پر نہیں ہیں۔ پاپا تو آتے ہی رات کو ہیں۔ ہم کیا کریں؟ صباء روہانسی ہوگئی۔

''مجھ سے کوئی کام نہیں ہوگا بی بی جی! بہت درد ہورہا ہے۔'' سکینہ نڈھال سی ہورہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسے ابکائی سی آئی تو وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اندر واش روم کی جانب بھاگی۔

''سکینہ.....سکینہ.....'' صباء اسے پکارتی رہ گئی۔

''جاؤ صباء آپی! اندر جاکر اسے دیکھ لو، کہیں کوئی اور ہی مسئلہ نہ ہو۔'' حسان نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا تو صباء جیسے تپ اٹھی۔ ''شرم کرو حسان! وہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہے، ابھی تو اس سے بڑوں کی شادیاں نہیں ہوئی ہیں۔ تم بھی نا بس..... آنے دو مما کو، تمہاری تو خوب شکایت کروں گی۔'' حسان کو سرزنش کرتے ہوئے صباء اٹھ کر سکینہ کے پیچھے چلی آئی۔ ''بی بی جی! نقاہت سی ہوگئی تھی۔ اب تو پیٹ کا درد بھی بالکل ٹھیک ہوگیا ہے۔'' سکینہ دوپٹے سے منہ پر آیا پسینہ پونچھتے ہوئے بولی۔

''کام وام بعد میں ہوتے رہیں گے سکینہ، پہلے تم میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلو۔ یہ پیٹ درد، سر درد

بے شک چھوٹے درد ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا چیک اپ بھی ضروری ہوتا ہے۔'' صباء فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ اور گیراج میں جاکر گاڑی نکالنے لگی۔

''آپ مریضہ کی کیا لگتی ہیں؟'' ڈاکٹرنی نے سوالیہ نظروں سے صباء کی طرف دیکھا۔ ''ڈاکٹر صاحبہ! سکینہ کے والدین گاؤں میں ہوتے ہیں۔ بیماری اور بڑھاپے کے باعث کام کاج کے قابل نہیں ہیں۔ اس کے بڑے بہن بھائی قریبی کوٹھیوں میں کام کرتے ہیں۔ اور یہ ہمارے گھر.....'' صباء نے تفصیل بتائی۔ ''مبارک ہو آپ کو، شی از ایکسپیکٹڈ۔'' ڈاکٹرنی کے الفاظ گویا بجلی بن کر صباء پر برسے۔

رات میں صباء اپنے بستر پر لیٹی کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ یہ بات سکینہ یا کسی دوسرے فرد کو کس طرح بتائے۔ بستر پر پڑی وہ چھت کو گھورے جارہی تھی۔ ''مجھے کم از کم سکینہ سے اس معاملے میں بات کرنی چاہیے۔'' ایک خیال اس کے ذہن میں آیا اور وہ بستر سے اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھی۔

جونہی اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی..... صباء کو یاد آنے لگا کہ یہی آنکھیں اسے اسٹور میں ریک کے اوپر نظر آئی تھیں۔ اس کے کھردرے بے جان بال آپس میں بری طرح سے الجھے ہوئے تھے۔ معاً ہی اس نے اپنے پیر کمرے کے اندر رکھ دیئے۔ اس کے پیروں میں سفید پھولوں کے گجرے پائل کی طرح بندھے ہوئے تھے۔

صباء خوف کے مارے پیچھے ہٹتی جارہی تھی اور وہ لڑکی اس کی طرف بڑھے جارہی تھی۔ بالآخر صباء کی پشت دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ سانس اس کے گلے میں جیسے اٹک سی گئی۔

لڑکی اب صباء کے بالکل اوپر جھک گئی تھی۔ صباء نے خوف کی زیادتی کے باعث آنکھیں زور سے بھینچ لی تھیں۔

''آنکھیں کھول..... آنکھیں کھول.....'' صباء کے اوپر جھکی وہ لڑکی دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔ بولنے کی وجہ سے اس کے منہ سے سانپ کی سی پتلی زبان بار بار نکل رہی تھی، جسے وہ اندر کرتی تھی۔ اگر اس کی زبان صباء دیکھ لیتی تو اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوجاتے۔ بہرحال لڑکی کے کہنے پر صباء نے اپنی آنکھیں کھول دیں تو دم بخود رہ گئی۔

اس خوفناک لڑکی کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں نیلا رنگ گھلنے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں سیاہ سے نیلی ہوتی جارہی تھیں۔ اور اس کے الجھے ہوئے کھردرے بال اپنے آپ ہی سمٹ کر اس کے سر پر اکھٹے ہوکر کوئی شکل بنارہے تھے۔ صباء پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ اب اس پراسرار لڑکی کے سر پر اسی کے کھردرے بالوں کا بہت بڑا پھن بن چکا تھا۔ اور اس کی آنکھیں بھی مکمل طور پر نیلی ہوچلی تھیں۔ کوئی بھی بڑے سے بڑا دل والا وہ منظر برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ صباء تو پھر ایک دھان پان سی لڑکی تھی۔ وہ مکمل طور پر بے ہوش ہونے کو تھی۔ اسی لمحے اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور سکینہ دودھ کا گلاس ہاتھ میں تھامے اندر داخل ہوئی۔ صباء کے اوپر جھکی لڑکی نے تڑپ کر پیچھے کی طرف دیکھا اور فوراً ہی اس کی ہیت تبدیل ہونے لگی۔ دیوار کے ساتھ کھڑی صباء زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ سکینہ نے دودھ کا گلاس میز پر رکھا اور بھاگ کر اسی جانب آئی۔ بے ہوش ہونے سے قبل بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ صباء نے اتنا ضرور دیکھا تھا کہ اس لڑکی کی ہیت اب لمبے سے سانپ میں بدل گئی تھی۔ جاتے جاتے سانپ نے صباء کے پاس بیٹھی ہوئی سکینہ کے پیروں کو اپنے پھن سے چھوا تھا۔ جیسے اس نے ان پیروں کو بوسہ دیا ہو۔

صبح کے وقت صباء نے اپنے بھائی کے سامنے بیٹھ کر سارا واقعہ بیان کردیا۔

''لڑکی کا ایک دم سانپ بن جانا..... واہ..... یوں لگتا ہے کوئی زبردست کہانی پڑھ رہے ہوں۔'' عدنان نے صباء کی بات مذاق میں اڑائی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں لالہ! اگر سکینہ نہ آتی تو نہ

جانے وہ لڑکی میرا کیا حشر کردیتی۔'' سہمی سہمی سی صباء کے دائیں طرف عدنان اور بائیں طرف حسان بیٹھا تھا۔

''نہ یقین کرو آپ دونوں میری بات کا..... شام کو کراچی سے، بشیر بھائی کا فون آئے گا ناں، دیکھنا وہ کیسے ایکدم میری بات کا یقین کریں گے اور بھابھی اور اسماعیل کو لے کر تم دونوں کی ڈانٹ ڈپٹ کے لئے دوڑے چلے آئیں گے۔'' صباء نے مان سے اپنے سب سے بڑے بھائی کا ذکر کیا جو روزگار کے سلسلے میں اپنی بیوی اور بیٹے اسماعیل کے ہمراہ کراچی میں رہتے تھے۔

تینوں بہن بھائی کافی دیر تک بحث کرتے رہے اور ہنستے رہے۔ باتوں باتوں میں اسے سکینہ کا خیال آیا تو وہ اٹھ کر سیدھا سرونٹ کوارٹر کی جانب چلی گئی۔ سکینہ چارپائی پر پڑی ہوئی چھت کو گھورے جارہی تھی۔ وہ اردگرد کے ماحول سے بالکل لاتعلق لگ رہی تھی۔ اس کے عین سرہانے غالباً اس کی کوئی دوست آئی ہوئی تھی۔ جو اس کے سرہانے بیٹھی اسے تکے جارہی تھی۔ اس کی کمر پر بالوں کی چوٹی گوندھی ہوئی تھی۔ صباء نے سکینہ کو ڈسٹرب کرنا ضروری نہیں سمجھا اور قریب جاکر اس دوست کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ لڑکی نے جونہی مڑ کر صباء کی جانب دیکھا تو صباء کی گھگی بندھ گئی۔ وہ تو وہی لڑکی تھی..... بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی..... صباء فوراً پیچھے ہٹی۔

''ہر دفعہ مجھے تنگ کردیتی ہے.....'' لڑکی نے اچک کر اس کی گردن پکڑلی۔ اس لڑکی کی ہتھیلیاں نہایت چھوٹی جبکہ انگلیوں کا سائز خاصا لمبا تھا۔ اس کے حلق سے آواز کے ساتھ ہی سیٹیاں نکل رہی تھیں اور سانپ جیسی دو شاخہ زبان بار بار لبوں سے باہر نکل رہی تھی۔

صباء کی گھٹی گھٹی چیخیں سن کر سکینہ نے کروٹ لی اور فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ صباء کو بہت حیرت ہورہی تھی کہ سکینہ اس لڑکی سے بالکل انجان لگ رہی تھی۔ جیسے وہ اسے نظر ہی نہ آرہی ہو۔ لڑکی سکینہ کو دیکھتے ہی ایک بار پھر ہوا میں تحلیل ہوکر لمبے سے سانپ کی جوبن میں آگئی۔ سانپ نے سکینہ کے پیروں کو پہلے کی طرح ایک بار پھر بوسہ دیا اور کونے والی پتلی نالی سے نکل گیا۔

''کیا ہوا بی بی جی آپ کو۔'' سکینہ حیران پریشان سی صباء کو سنبھال رہی تھی۔ وہ اس بات سے قطعی طور پر لاعلم تھی کہ کوئی سانپ اس کے پیروں کا بوسہ لے کر جاتا ہے۔

''کچھ نہیں! بس یونہی دل گھبرا گیا تھا۔'' صباء نے فوراً گھڑے میں سے مٹی کے پیالے میں پانی انڈیلا اور غٹاغٹ پینے لگی۔ پانی پیتے ہوئے ایک سوال اس کے حلق میں پھانس کی طرح چبھ رہا تھا کہ ''آخر یہ لڑکی تبھی اسے کیوں نظر آتی ہے جب وہ سکینہ سے اس کی حالت کے متعلق سوال کرنے آتی ہے۔'' وہ معمہ اس سے حل نہیں ہوپا رہا تھا۔ اس نے چپ کر کے پانی پیا اور خالی سی نظر سکینہ پر ڈال کر واپس کوٹھی کی طرف آگئی۔

☆.....☆.....☆

سورج کی روپہلی دھوپ اپنی کرنوں سمیت آنگن میں اتر رہی تھی۔ راکنگ چیئر پر ایستادہ، چہرے پر اخبار پھیلائے احتشام دور..... بہت دور کہیں کھوئے تھے، اس خوفزدہ چہرے والی لڑکی نے پہلے دن سے ان کی نیندیں چرا رکھی تھیں، بشیر سے ان کی بہت گہری دوستی تھی مگر اپنے دوست کی عدم موجودگی میں وہ ان کے گھر آخر کس بہانے سے جاتے؟ وہ تو اس مہ جبیں کا نام تک نہ جانتے تھے۔ وہ ابھی انہی یادوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ ہمسائے کے گھر سے تیز میوزک کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ اکثر اپنی صبح کی ابتدا میوزک سے کرتے۔ احتشام کو اپنے پڑوسیوں کی اس عادت سے شروع سے چڑ تھی۔ وہ بار بار اپنے پڑوسیوں سے کہہ چکے تھے کہ صبح کی ابتدا گانوں کے بجائے اللہ پاک کے بابرکت نام سے کرنی چاہیے۔ مگر آج کل کے دور میں کوئی کسی کی بھلا کہاں سنتا ہے؟ احتشام نے بیزار سے ہوکر اخبار سمیٹا اور راکنگ چیئر سے اٹھنے ہی لگے تھے کہ گانے کے الفاظ نے ان کے دل کے تاروں کو چھو لیا۔ گانے کے بول کچھ یوں تھے..... ''ہاتھوں کی لکیروں پر لکھا ہے..... تیرا میرا دل کا رشتہ ہے.....''

جانے یہ گانا سن کر احتشام کے من میں وہ پریشان چہرہ لئے لڑکی کا عکس کیوں ابھر آیا؟ اس کے ساتھ ہی لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ گاڑی کی چابیاں اٹھا کر گیراج کی جانب بڑھ گئے۔

صبح کی نماز پڑھ کر صباء اپنے کمرے میں جارہی تھی کہ اس کی نظر کچن میں ناشتے کی تیاریوں میں مصروف سکینہ پر پڑی۔ اس نے اپنا رخ کچن کی جانب کرلیا جہاں سکینہ آٹا گوندھ رہی تھی۔ آج کل اس کے جسمانی نشیب و فراز میں کافی فرق آچکا تھا۔

لیکن وہ ان پڑھ لڑکی اس سے بالکل غافل تھی۔

''تمہارے پیٹ میں کافی دنوں سے درد نہیں ہوا سکینہ؟'' بات شروع کرنے کے لئے صباء شیلف پر رکھے برتنوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔

''ہاں بی بی جی! اب بس ہلکا ہلکا درد ہی رہتا ہے، وہ تو میں سہہ لیتی ہوں۔ جب تیز درد ہوتا ہے پھر مجھ سے نہیں رہا جاتا۔'' آٹا گوندھنے کے بعد سکینہ نے پانی سنک میں انڈیلا اور اپنے ہاتھ خشک کرنے لگی۔

کیا تمہارے کسی لڑکے سے تعلقات ہیں؟''

صباء اصل بات پر اتر آئی۔ بی بی جی؟ مجھے سمجھ میں نہیں آئی۔'' سکینہ نے مارے حیرت کے اپنی موٹی موٹی سرمہ لگی آنکھیں مزید پھیلائیں۔

''دیکھو سکینہ! تمہیں مجھے سب کچھ بتانا ہوگا ورنہ تمہاری زندگی خراب ہوسکتی ہے۔ تم جانتی ہو؟ اس دن ڈاکٹرنی نے تمہاری رپورٹس دیکھ کر کیا کہا تھا کہ تم ایکسپیکٹ کررہی ہو۔'' صباء سکینہ کے کندھوں پر ہاتھ رکھے بول رہی تھی۔

''وہ کیا ہوتا ہے بی بی جی؟'' سکینہ نے ناسمجھی سے آنکھیں پٹ پٹائیں اس پر صباء نے جھنجھلا کر دروازے کی طرف رخ کرلیا، اس کی سکینہ کی طرف پشت تھی بھلا سکینہ کہاں انگریزی سمجھ سکتی تھی۔ کوفت کے مارے اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا پھر ایک ٹھنڈا سانس بھر کر دوبارہ سکینہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

''میں یہ کہنا چاہ رہی تھی سکینہ کہ تم..... الفاظ صباء کے گلے میں ہی اٹک گئے۔ دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں سکینہ کے کندھوں کے پیچھے سے اسے گھور رہی تھیں۔ صباء دہشت زدہ سی ہوکر پیچھے ہٹی۔ اب وہ لڑکی ہولے ہولے سرک کر سکینہ کے کندھوں کے پیچھے سے ہٹ رہی تھی۔

''کہ..... صباء نے تھوک نگل کر بات مکمل کرنے کی کوشش کی مگر پیچھے موجود اس لڑکی نے گردن دھیرے سے نفی میں ہلائی۔ اس کی گردن کی چرچراہٹ صباء واضح سن سکتی تھی پھر پتہ نہیں، سکینہ کیوں ان سب سے بیگانہ تھی؟ مگر آج صباء نے بھی پکا تہیہ کرلیا تھا کہ سکینہ کو سب کچھ بتا کر رہے گی حالانکہ لڑکی صباء کو قہر آلود نگاہوں سے گھور رہی تھی۔

''تم پیٹ سے ہو سکینہ۔'' صباء نے چیخ کر کہا تو سکینہ کے ہاتھوں سے کپ کی ٹرے چھوٹ گئی۔ سارے کپ چکنا چور ہوگئے اور وہ ساکت سی وہیں کھڑی رہ گئی۔

صباء کے الفاظ کا اثر، سکینہ سے زیادہ اس کے پیچھے کھڑی لڑکی پر ہوا۔ اس کے بال یک لخت بہت لمبے ہوگئے اور زمین کو چھونے لگے۔ منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگیں اور اس کی دوشاخہ لمبی زبان بار بار، اندر باہر ہونے لگی۔ گردن ٹیڑھی کئے وہ گول مول چکر میں گھومتی صباء کی جانب بڑھنے لگی۔

''آج نہیں چھوڑوں گی..... نہیں چھوڑوں گی تجھے۔'' گول مول چھوٹے چھوٹے چکروں میں گھومتی وہ صباء کی جانب بڑھتی ہی رہی تھی۔ گھومنے کی وجہ سے اس کے لمبے بال لٹو کی طرح گھوم رہے تھے۔ صباء نے گھبرا کر کچن کے دروازے کی طرف دوڑ لگائی مگر وہاں پہلے سے ہی کوئی کھڑا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا چست لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ وہ بلاشبہ بے حد حسین لڑکا تھا مگر وہ صباء کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا، اس کی دوشاخہ زبان صاف نظر آرہی تھی۔ صباء واپس الٹے قدموں بھاگی۔ اسے یہ سمجھنے میں قطعی دیر نہ لگی کہ وہ ناگ اور ناگن کے نرغے میں پھنس چکی تھی۔

فرش پر بکھرے کپوں کے ٹکڑے اس کے حسین اور نازک پاؤں کا رنگ سفید سے سرخ کر چکے تھے۔ وہ بے آسرا سی ہو کر کچن میں لگی گلاس وال کے ساتھ چپک گئی، جو لان کی طرف تھی۔ ناگ اور ناگن مکروہ ہنسی ہنستے ہوئے صباء کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے بیچوں بیچ سکینہ خلاؤں میں گھورتی مجسمہ بنی ساکت کھڑی تھی۔

صباء نے آنکھیں بند کر کے اپنے رب کو پکارا اور عین اسی لمحے ایک خیال اس کے ذہن میں کوندا۔ اس نے شیلف سے بیلن اٹھایا اور دو تین بار پوری قوت سے گلاس وال پر دے مارا۔ گلاس وال میں اب اتنا بڑا سوراخ ہو چکا تھا کہ صباء جیسی دھان پان سی لڑکی با آسانی نکل سکے۔ صباء تمام ہمت، جمع کر کے شیلف پر چڑھی اور گلاس وال میں بنے سوراخ میں سے باہر کی جانب کود گئی۔ اور مین گیٹ کی طرف بھاگنے لگی۔ خون میں تر اس کے سفید اور لال پاؤں سرسبز گھاس پر اپنا نشان چھوڑتے جا رہے تھے۔ گیٹ کراس کر کے وہ جونہی سڑک پر آئی تو سامنے سے آتی پراڈو سے ٹکرا گئی۔

''کون ہیں آپ؟ جانتی ہوں اگر میں عین وقت پر گاڑی نہ روکتا تو آپ کہاں ہوتیں؟ اندھی ہو کر چل رہی تھیں کیا.....؟'' نیچے بیٹھی نڈھال سی لڑکی جونہی اٹھ کر کھڑی ہوئی، بلند قامت احتشام کے الفاظ حلق میں ہی اٹک گئے۔ اور ایک ٹک اس موہنی صورت کو دیکھتے رہ گئے۔

''آپ..... آپ وہی ہیں ناں، جو اس دن ہمارے گھر آئے تھے بشیر بھائی کے دوست..... آپ پلیز! مجھے یہاں سے لے چلیں..... وہ..... وہ میرے پیچھے ہی آ رہے ہوں گے۔ پلیز! مجھے یہاں سے دور لے چلیں۔'' صباء کے پسینہ زدہ چہرے پر آنسو ڈھلک کر اسے اور نم بنا رہے تھے۔ احتشام منہ کھولے اس کے چہرے کی معصومیت میں ہی کھوئے ہوئے تھے کہ صباء نے اپنے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

''میں جو کہہ رہی ہوں، آپ کیوں نہیں سن رہے ہیں آخر؟'' دو موٹے موٹے سانپوں کو لان کی تاشیدہ گھاس پر تیرتا دیکھ کر وہ چیخ ہی تو پڑی تھی۔ احتشام کو جیسے ہوش سا آیا۔ انہوں نے تیزی سے صباء کے لئے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر پراڈو تیزی سے آگے بڑھا دی۔

صباء نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ زخمی پیروں سے خون رس رہا تھا۔ احتشام کا بہت دل چاہا کہ وہ اپنی جیب سے رومال نکال کر اس لڑکی کے زخموں پر رکھ دیں مگر وہ اس پہلے سے خوفزدہ لڑکی کو مزید خوفزدہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کتنا عجیب اتفاق تھا کہ وہ اس لڑکی سے جب بھی ملے، اسے ایک کشمکش میں دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد صباء نے آنکھیں کھول دیں اور مرر سے باہر سرپٹ دوڑتی عمارتوں کو دیکھنے لگی تھی جب احتشام نے سوال داغا تھا۔

''کون لوگ آپ کے پیچھے لگے ہیں؟''

''لوگ.....؟'' صباء نے حیرت سے ان کا سوال دہرایا۔ ''وہ..... لوگ تو نہیں ہیں..... وہ تو.....

صباء کھوئی کھوئی سی بول رہی تھی۔ سہمی سہمی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جب بیک ویو مرر پر پڑی تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

دو بڑے بڑے سانپ کار کی پچھلی سیٹ پر پھن پھیلائے بیٹھے تھے۔ صباء نے بے یقینی سے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ایک فلک شگاف چیخ اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔ احتشام نے فوراً مڑ کر اس کی سمت میں پیچھے دیکھا اور عین اسی لمحے اسٹیرنگ بے قابو ہوا، ان کی گاڑی زوردار طریقے سے اچھلی اور سڑک سے نیچے ڈھلوان میں اترتی چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

نیلے پتھروں والی کوٹھی کی فضا میں اگربتیوں کی خوشبو رچی بسی تھی۔ خلقت تو خیر اتنی زیادہ اکٹھی نہ تھی، بس گھر کے دو چار افراد جو خاموشی سے سر جھکائے میت کے اردگرد بیٹھے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد گلی میں سے رونے اور چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میلے کپڑوں میں ملبوس، تیل سے

لتھڑے بالوں والی عورتیں سینہ کوبی کرتے ہوئے کوٹھی میں داخل ہو رہی تھیں۔ عدنان اور حسان میت کے پاس والی جگہ ان کے لئے چھوڑ کر باہر پلر کے ساتھ آ کر کھڑے ہو گئے جہاں ہرے پتوں کی بیل اوپر تک گئی ہوئی تھی۔

بستی والے سکینہ کا جسد خاکی لینے آئے تھے۔ وہ معصوم لڑکی بدنامی اور خوف کے ڈر سے خودکشی کر چکی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی..... کہ "وہ بالکل بے قصور ہے، اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ پھر آخر اس کی حالت ایسی کیوں ہوئی؟ یہ سوال وہ اپنے ساتھ لئے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکی تھی۔

صباء کے والدین انتہائی پریشان تھے۔ بشیر بھائی بھی بھابھی اور اسماعیل کو لے کر کراچی سے آ گئے تھے۔ عدنان اور حسان الگ رونی صورتیں بنائے بیٹھے تھے۔ گھر میں سوگواری کا عالم طاری تھا۔

"آخر میری بچی صباء کدھر گئی؟ کیسے رہوں گی میں اپنی بچی کے بناء؟" والدہ بیٹی کی جدائی میں رو رو کر ہلکان ہوئے جا رہی تھیں۔

"امی آپ فکر مت کریں اور اللہ پر بھروسہ رکھیں، دیکھنا ہماری گڑیا کیسے ہنستی مسکراتی واپس آئے گی۔" بشیر بھائی نے اسماعیل کو گود سے اتارا۔

"انشاء اللہ بھائی۔" حسان کے چہرے سے اداسی ٹپک رہی تھی۔

"کچن کی ٹوٹی ہوئی گلاس وال..... پھر لان میں کسی کے خون آلود پیروں کے نشانات..... یہ سب چیزیں معمول کے مطابق نہیں ہیں، کسی اوپری طاقت کا کرتا دھرتا لگتا ہے مجھے تو۔" عدنان پر تشویش ہوا۔ "آج کل کے دور میں..... بشیر بھائی ابھی بول ہی رہے تھے کہ عدنان نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے چپ کروا دیا اور سب گھر والوں کو صباء کے خوف کے بارے میں بتانے لگے۔ حسان بھی اس میں برابر کا شریک ہوا کیونکہ صباء نے اسٹور روم میں دیکھی جانے والی آنکھیں، اس کے بعد اپنے کمرے میں اس پراسرار لڑکی کا موجود ہونا، پھر اچانک سانپ بن جانا، یہ دونوں واقعات صباء نے عدنان اور حسان سے شیئر کئے تھے۔ مگر تب انہوں نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا تھا اور اب بری طرح پچھتا رہے تھے۔

"پاپا..... مجھے نہیں پتہ! صباء آنٹی کو لے کر آئیں کہیں سے بھی..... وہ میرے ساتھ فٹ بال بھی کھیلتی تھیں، مجھے چاکلیٹس بھی کھلاتی تھیں اور مجھے پارک میں بھی لے کر جاتی تھیں۔ مجھے نہیں پتہ پاپا، صباء آنٹی کو لے کر آئیں، میں نے ان کے ساتھ کھیلنا ہے۔" ننھا اسماعیل مسلسل ضد کئے جا رہا تھا۔ بشیر بھائی نے اسے اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔

"صباء ہنستی مسکراتی واپس آئے گی۔ اسے ایک ماں کی دعا واپس لائے گی۔" والدہ نے کہا اور اٹھ کر وضو کی غرض سے واش روم کی طرف چلی گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد وہ وضو کر کے لوٹ آئیں۔ لونگ روم میں سب یونہی بیٹھے تھے، جیسے پہلے تھے۔ "اب مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے، میں اپنے اللہ کے حضور تب تک جھکی رہوں گی، جب تک وہ میری بچی کو صحیح سلامت نہیں لے آتا۔" والدہ نے کہا اور دوپٹہ سر پر اچھی طرح اوڑھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ سب لوگ یونہی سر جھکائے بیٹھے رہ گئے۔

"نہیں چھوڑوں گی تجھے میں..... میرا بچہ مار دیا تو نے..... کہا تھا، اگر اس کنیا کے پیٹ میں میرا بچہ پلتا رہتا اور اپنی مدت پوری ہونے پر باہر نکل آتا..... تو نے میرے ننھے بچے کا انت کر کے اچھا نہیں کیا..... تو نے اس کنیا کو سب کچھ بتا کر اچھا نہیں کیا..... اس نے اپنا انت کر لیا ہے اور ساتھ ہی میرے بچے کا بھی انت ہو گیا ہے۔" ناگن منہ پھاڑ پھاڑ کر دھاڑیں مار رہی تھی کہ اس کے عین سامنے صباء دیوار سے چپکی بیٹھی تھی۔ اس اندھیرے کمرے میں کوئی دروازہ نہ تھا، بس چاروں طرف دیواریں ہی دیواریں تھیں۔ باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

"میرے بچے کا تو انت ہو گیا..... مگر تیرا انت میں اتنی آسانی سے نہیں ہونے دوں گی..... تیرا جیون تیرے لئے مشکل کر دوں گی۔" وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہی تھی۔ صباء کے تو جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں تھا۔

اسی لمحے تاریک کمرے میں بگولہ سا نمودار ہوا اور اسی سیاہ ناگ کی شکل لینے لگا۔ ناگ کو دیکھتے ہی لڑکی اپنا غصہ اور کرب بھول کر واپس ناگن کی جون میں آنے لگی اور دونوں ہی باریک نالی سے باہر نکل گئے۔

احتشام کو ہوش آیا تو وہ مٹی کے چٹیل میدان میں پڑے تھے۔ انہوں نے گھبرا کر دیکھا تو پرانے زمانے کی ایک قدیم گاڑی نزدیک ہی کھڑی تھی۔ اس میں پیٹرول بھی تھا۔ انہوں نے کھڑے ہو کر گاڑی کا جائزہ لیا۔ اس کا مالک دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ احتشام دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ان کی پراڈو تو جانے کہاں غائب ہو چکی تھی۔ ڈرائیو کرتے ہوئے انہیں وہ لمحات یاد آنے لگے۔ کہ کیسے چھپے موجود دونوں سانپوں نے انہیں اور صباء کو تباہ ہوتی گاڑی سے باہر اچھالا تھا اور ان سانپوں میں اتنی طاقت جانے کہاں سے آ گئی تھی؟ اس کے بعد صباء کا کوئی، اتا پتا نہ تھا اور وہ قدیم طرز کی گاڑی میں شہر کی طرف رواں دواں تھے البتہ ان کا دل اور ان کی آنکھیں کہیں کھوئی ہوئی تھیں۔

"اے شہد جیسی رنگت والی لڑکی! تم جانے آج پھر کہاں کھو گئی ہو۔ وہ پل آخر کب آئیں گے جب تم اپنی تمام خوفزدگیاں بھلا کر، پورے چاند کی رات کو میرے پہلو میں بیٹھو گی اور ہم دونوں دیر تک چودھویں کے چاند سے باتیں کریں گے۔

احتشام کو اتنا یقین تو پکا ہو چلا تھا کہ وہ خوفزدہ چہرے والی لڑکی جس کے معصوم حسن نے ان پر طلسم کر رکھا ہے۔ ضرور کسی مصیبت میں ہے۔ وہ جلد از جلد صباء کے گھر والوں سے بات کرنا چاہتے تھے۔

"امی! آخر آپ کب تک نہیں کھائیں گی؟ صباء آپی کو کچھ نہیں ہوگا، میں اللہ سے ان کے لئے دعا کرتا ہوں۔" حسان پکوڑے کی پلیٹ پکڑے اپنی والدہ کے پاس آ بیٹھا تھا۔

"صرف دعاؤں سے کام نہیں چلے گا حسان۔" اندر آتے ہی احتشام کی آواز پر والدہ اور حسان نے چونک کر دیکھا۔ احتشام نے گاڑی کے سفر کی ساری داستان ان کے گوش گزار کر دی، یہ بھی بتایا کہ کس طرح صباء خون آلود پیروں کے ساتھ لان کی طرف سے بھاگتی ہوئی آئی تھی..... دو موٹے موٹے اور لمبے سانپوں کا اس کے پیچھے گاڑی تک پہنچ جانا.....

"ہمیں کسی کی مدد لینی پڑے گی۔" عدنان فیصلہ کناں ہوا۔

اور میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ ہماری مدد کون کر سکتا ہے۔" والدہ کچھ سوچ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور فون پر کوئی نمبر ملانے لگیں۔

ادھر سیاہ ناگ نے اپنا بھاری سا پھن اٹھایا اور پوری طاقت سے صباء کے پیر دے مارا۔ صباء نے اپنا پیر پکڑ کر زور دار چیخ ماری، اس کا رنگ اچانک نیلا پڑنے لگا۔ اس کے فوراً بعد ہی دوسرا سانپ آگے بڑھا اور صباء کے پیر سے زہر چوسنے لگا۔ یہ سارا عمل صباء کے لئے بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ درد کی لہروں سے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔

"تجھے یہ تکلیف بار بار سہنی ہوگی کنیا، تیری زندگی کا انت ایک دفعہ میں ہم نہیں کر سکتے۔ تجھے تڑپا تڑپا کر ماریں گے ہم۔" تاریک کمرے میں ناگن کی بپھری ہوئی آواز گونج رہی تھی۔ "اوہ.....! میرا بچہ....." ناگن کی درد میں ڈوبی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ صباء نے ایک بات نوٹ کی تھی کہ ناگن کی آنکھیں ویسے تو بڑی بڑی سیاہ رنگ کی تھیں مگر جب وہ طیش اور غصے کے عالم میں آتی تو اس کی آنکھوں میں نیلاہٹ ابھرنے لگتی تھی۔

اس تاریک کمرے میں کوئی دروازہ نہ تھا۔ چاروں طرف بڑے بڑے سیاہ پتھر لگے تھے جو ہمہ وقت صباء کا منہ چڑاتے رہتے تھے۔

احتشام نے مطلوبہ پتے پر آ کر گاڑی روکی۔ ایک شخص دور سے انہیں درختوں کے درمیان بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ لباس کے نام پر اس نے صرف ایک جانگیا

پہن رکھا تھا۔ وہ اپنی دھن میں مگن تھا۔

احتشام، عدنان اور حسان اس کے پاس جا کر بیٹھے اور اسے ساری روداد سنا ڈالی۔

"ہوں....." بوڑھے نے کہا۔

"بابا، کیا وہ سانپ ہماری بہن؟" اور حسان نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"نہیں بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں ہے، اصل میں ناگ ناگن کا وہ جوڑا تمہاری بہن سے ناراض ہو گیا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے آہستہ آہستہ بولے۔

"وہ صباء کو تکلیف کیوں پہنچا رہے ہیں؟" احتشام کو تشویش لاحق ہوئی۔

"بات دراصل یہ ہے کہ سانپوں کی دنیا میں سانپ اپنے زیادہ تر چھوٹے بچوں کو خود ہی کھا جاتے ہیں جو باقی بچ جاتے ہیں وہ انہیں جی جان سے پیارے ہوتے ہیں۔ ناگ اور ناگن وہ بچہ، جو غالباً تمہاری نوکرانی غلطی سے نگل گئی تھی۔ اس کے اندر جا کر بالکل انسانی بچے کی طرح پرورش پانے لگا تھا۔ ناگ اور ناگن کا جوڑا مطمئن تھا کہ ان کا بچہ نوکرانی کے پیٹ میں پلتا رہے گا اور اس کا سائز اور وزن جو ایک مقررہ وقت پر اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھے گا۔ یوں اس بچے کی ولادت عام انسانی بچے کے مطابق ہوگی۔ اور وہ اپنے بچے کو جو اس وقت تک مکمل سانپ بن چکا ہوگا، لے جائیں گے مگر تمہاری نوکرانی کی خودکشی کی وجہ سے اس کے اندر موجود بچہ سانپ بھی ختم ہو گیا۔ بس ناگ اور ناگن کے اس جوڑے کو یہی قلق ہے۔" بابا اپنے خاص علم کے ذریعے ساری معلومات دے رہے تھے، کہ حسان درمیان میں بول پڑا۔

"بابا وہ سانپ سکینہ کے پیٹ میں آیا کہاں سے.....؟"

"میرا علم بتا رہا ہے کہ وہ ننھا سانپ تمہاری نوکرانی کی کسی چیز کے ساتھ غلطی سے نگل لیا تھا۔ ناگ اور ناگن کے جوڑے نے اپنے بچے کی پرورش کرنے کی بہت کوشش کی مگر تمہاری بہن نے اسے اس کے حاملہ ہونے کی اطلاع دے دی جس پر اس نے دلبرداشتہ ہو کر خودکشی کر لی۔

اب جوڑا اپنے بچے کی موت کا ذمہ دار تمہاری بہن کو گردانتا ہے۔ اس لئے تمہاری بہن ابھی تک ان کے قبضے میں ہے۔ بابا لمحے بھر کو چپ ہوئے۔ "ہماری بہن کو بچا لیں بابا، ہم اس کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔" عدنان نے بابا کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور منت سماجت کرنے لگا۔

"آج سے ٹھیک دو دن بعد جمعرات ہے۔ میرا عمل اور طاقت اس وقت اپنے زوروں پر ہوتی ہے۔ تم لوگ اسی جگہ جانا، میرا ساتھی اس مقام کی نشاندہی کرے گا، جہاں ناگ ناگن کے اس جوڑے نے تمہاری بہن کو روکا ہوا ہے۔ بابا نے کہا اور اٹھ کر ایک طرف کو جانے لگے۔

☆.....☆.....☆

"تمہیں پتہ ہے؟ آنے والی پورن ماشی کی رات کو تم ایک مکمل ناگن بن جاؤ گی۔ ہماری بستی کے تقریباً سبھی سانپوں کا زہر تم میں سرایت کرتا اور پھر باہر نکلتا ہے۔ تھوڑی سی دور گھٹنا سے گزرنے کے بعد تم اپنے اس شریر سمیت ایک مکمل ناگن بن جاؤ گی..... ہماری بستی کی ایک حسین ترین ناگن..... میرا وچار ہے کہ ہر ناگ پھر تم سے بیاہ کرنا چاہے گا۔" سیاہ چست کپڑوں میں ملبوس، نیلی کانچ، جیسی آنکھیں لئے وہ صباء سے بولے جا رہا تھا۔

"میں تھوکتی ہوں تم سب پر..... ایک بات جان رکھو کہ میرا رب سب سے بڑا ہے اور وہ جانتا ہے کہ میرا اس پورے معاملے میں کوئی قصور نہیں، سکینہ کو مطلع کرنا میرا فرض تھا جو میں نے پورا کیا۔ میرا جو چاہو حشر کر لو، میں تم پر اور تمہارے انتقام پر یقین نہیں رکھتی، میرا یقین صرف اپنے رب پر ہے۔ وہی مجھے بچائے گا۔ نڈھال سی صباء کو اپنے رب پر پورا بھروسہ تھا۔

"کیا تمہارا دھرم، تمہیں یہاں سے باہر نکال کر لے جا سکتا ہے کنیا؟"

"ہاں..... میرا رب میرے لئے کوئی نہ کوئی

وسیلہ بنائے گا۔" عزم و یقین سے بھری صباء کی آواز تاریک کمرے میں گونجی۔ اور وہ سامنے موجود جھپکنے کی حرکت سے عاری اپنی نیلی آنکھیں اس کے چہرے پر جمائے اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

ادھر جمعرات کے دن صبا کے گھر والے اسی جگہ پہنچ گئے جہاں درخت کی جھنڈ میں وہ بابا ملے تھے۔

"بابا! صباء آپی کب تک ہمارے پاس ہوں گی؟" گاڑی سے اترتے ہی حسان بولا۔

"صبر کرو بچہ! اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مجھے اپنے ساتھی کو اندر سے بلانے دو، پھر ہم سب اس کی راہنمائی میں آگے بڑھیں گے۔" بابا یہ کہہ کر اندر اپنی کٹیا میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد بابا باہر آ گئے مگر ان کے ساتھ کوئی بھی نہ تھا۔

"چلو بچو! جلدی چلو، اس سے پہلے کہ جمعرات کی گھڑی بیت جائے۔" بابا ایک خاص سمت کو تیز تیز چلنے لگے۔

"مگر بابا! اور آپ کا ساتھی کہاں ہے؟ جس نے ہمیں راستہ بتانا تھا۔" عدنان حیرت زدہ سا ہو کر بولا۔

"وہ ہمیں راستہ بتا رہا ہے بچہ۔" بابا نے مسکراتے ہوئے زمین کی طرف اشارہ کیا۔ تو سب لوگ ایکدم دنگ رہ گئے۔

زمین پر ایک کنگ کوبرا تیزی سے بل کھاتا ہوا آگے کی طرف رینگ رہا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ اپنے مطلوبہ آشیانے کے باہر کھڑے تھے۔ وہ ایک سیاہ رنگ کی گنبد نما چھوٹی سی عمارت تھی۔

"اس کے اندر ہم کیسے داخل ہوں گے بابا؟ اس طرف تو دیواریں ہی دیواریں ہیں۔" احتشام عمارت کے چاروں طرف گھومتے ہوئے بولا۔ مگر فوراً ہی اسے چپ ہونا پڑا کیونکہ کنگ کوبرا ایک نالی کے ذریعے عمارت کے اندر داخل ہو رہا تھا۔

کمرے میں موجود صباء ایکدم گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ باریک نالی میں سے کنگ کوبرا اندر داخل ہو رہا تھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے بڑے بڑے سیاہ پتھروں کی دیوار پر چڑھنا شروع کر دیا۔ پتھروں کی سطح نہایت کھردری تھی اور وہ قدرے باہر کو بھی ابھرے ہوئے تھے۔ اس لئے کنگ کوبرا کو دیوار پر چڑھنے میں آسانی ہو رہی تھی۔ کچھ اونچائی پر پہنچ کر اس نے ایک پتھر پر اپنا پھن زور سے مارا۔ پتھر کاغذ کے پرزے کی طرح نیچے آ گرا۔ اس کے فوراً بعد ہی ایک پورا تختہ نیچے آ گرا۔ چاند کی تیز روشنی چھن چھن کر اندر آنے لگی تو جیسے صباء کی آنکھوں کو بھی ٹھنڈک ملی۔

اتنا بڑا سوراخ دیکھ کر صباء میں تو جیسے توانائی بھر گئی۔ وہ ہمت کر کے اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس سوراخ کے پاس آئی اور قریب ٹوٹی ہوئی کرسی پر چڑھ کر اس سوراخ میں سے باہر نکل گئی۔ باہر اپنے گھر والوں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ وہ بھاگ کر ان سے لپٹ جانا چاہتی تھی، مگر اس کے پیروں کو کسی زنجیر نے جکڑ لیا تھا۔ سیاہ رنگ کے ایک موٹے سے سانپ کی زنجیر نے..... وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور نیچے گر گئی۔ اب وہ ناگن اپنا گھیرا تنگ کر رہی تھی اور صباء کے پیروں سے ہوتی ہوئی اس کے دل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ صباء کا رنگ مارے دہشت کے پیلا پڑ چکا تھا۔

"مجھے جانے دیں بابا، وہ صباء کو..... احتشام صباء کو بچانے کے لئے آگے آئے کہ بابا نے اس کا بازو تھام لیا۔ "میرا ساتھی یہ کام کر دے گا بچہ۔" بابا نے احتشام سے کہہ کر کنگ کوبرا کی آنکھوں میں جھانکا، جواب تاریک کمرے سے نکل کر واپس ان کے پاس آ چکا تھا۔ کنگ کوبرا اپنی ننھی آنکھوں سے کچھ دیر بابا کی آنکھوں میں دیکھتا رہا، پھر جیسے ساری بات سمجھ کر تیزی سے آگے رینگ گیا۔ کنگ کوبرا ناگن کے بلوں میں لیٹی صباء کے پاس پہنچا تھا کہ ایک سمت سے ایک اور لمبا سا بھاری بھرکم سانپ رینگتا ہوا آیا۔ وہ غالباً ناگ تھا۔

کنگ کوبرا جو ناگن سے الجھ رہا تھا، اس نے چونک کر اپنا پھن ناگ کی طرف اٹھایا۔ بابا نے اپنے ساتھی کو مشکل میں دیکھا تو اپنی پوٹلی سے بین نکالی اور بجانا شروع کر دی۔ ناگ بین کی مدھر لے پر جھومنا

شروع ہوگیا۔ اسے اپنے اردگرد کا ہوش نہ رہا تھا۔ بابا نے آگے بڑھ کر بین کی دھن میں مست ناگ کو پکڑ کر پٹاری میں بند کردیا۔

کنگ کوبرا کے وار کی وجہ سے ناگن صباء پر گرفت ڈھیلی کر کے اسے مکمل طور پر چھوڑ چکی تھی۔

اب وہ ایک لڑکی کی جون میں آ گئی تھی جو گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی اور خونخوار آنکھوں سے کنگ کوبرا کو گھور رہی تھی۔ جیسے ابھی اسے کچا چبا جائے گی۔

''اس لڑکی یعنی ناگن کا سانپ کے روپ میں آنا بہت ضروری ہے بچہ، میرا ساتھی اس کا مقابلہ تبھی کرسکتا ہے، جب وہ سانپ کی جون میں ہوگی۔'' بابا فکر مند سے انداز میں بولے۔

کنگ کوبرا اب کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا، بس بڑی سی کنڈلی مارے، ساکت بیٹھا لڑکی کو گھورے جا رہا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی لڑکی بھی زہر خند مسکراہٹ سے کنگ کوبرا کو گھور رہی تھی۔

''بابا یہ پٹاری مجھے دیجئے۔'' احتشام نے ہاتھ بڑھا کر پٹاری لی پھر بابا کو فکر مند دیکھ کر بولے۔ ''آپ فکر نہ کریں بابا، میں سانپوں کو ہاتھ میں پکڑنا جانتا ہوں، آپ بس مجھ پر بھروسہ رکھیں۔'' احتشام نے پٹاری لی اور ناگن لڑکی کے بالکل سیدھ میں جا کر کھڑا ہوگیا۔

کنگ کوبرا اپنی جگہ پر کنڈلی مارے بالکل ساکت تھا۔

احتشام نے پٹاری کا ڈھکن اٹھایا اور اس میں موجود سیاہ ناگ کو پھن سے پکڑ کر باہر نکالا، سیاہ ناگ کے جبڑے بالکل بھینچے ہوئے تھے۔ اور وہ مجبور نگاہوں سے اپنی ناگن کو دیکھ رہا تھا۔

مارے طیش اور غصے کے ناگن لڑکی کی آنکھوں میں نیلاہٹ اترنے لگی اس نے تیزی سے پلٹی کھائی اور دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ سانپ کا روپ دھارن کرگئی۔ سانپ کی جون میں آتے ہی اس نے تیزی سے اچھل کر احتشام پر حملہ کرنا چاہا مگر کنگ کوبرا نے اسے اچھل کر فضا میں ہی جالیا۔ دونوں آپس میں بری طرح گتھم گتھا ہوگئے۔

''یہاں سے بھاگ چلتے ہیں بھائی۔'' عدنان اور حسان کے یہ پے کھڑی سہمی سی صباء نے کہا تو بابا فوراً بولے۔ ''نہیں بچہ! اس ناگن کو یوں آزاد نہیں چھوڑ سکتے۔ تھوڑی دیر صبر کرو۔ میرا ساتھی اسے زیر کرلے گا۔ ناگ تو میرے پاس پٹاری میں بند رہے گا تو تمہاری آئندہ زندگی میں کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرے گا، مگر ناگن اتنی آسانی سے قید نہیں کی جاسکتی۔'' بابا آگے بھی کچھ بتانا چاہتے تھے مگر فوراً چپ ہوگئے اور گھبرا کر آگے بڑھے۔ جہاں احتشام کنگ کوبرا کو ہاتھوں میں لئے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ جب کہ اس کے ساتھ ہی ایک سیاہ رنگ کا موٹا سانپ بالکل مردہ اور بے جان، خون میں لت پت پڑا تھا۔ کنگ کوبرا کی کھال جگہ جگہ سے ادھڑ گئی تھی۔ اس کی ایک آنکھ بھی ضائع ہوگئی تھی۔ وہ بالکل جاں کنی کے عالم میں تھا۔

بابا نے تڑپ کر کنگ کوبرا کو چھوٹے بچے کی طرح اپنی گود میں رکھا بابا نے بچپن سے ہی اسے اپنے بچے کی طرح پالا تھا۔ اور آج وہ بچہ کنگ کوبرا بن کر، سیاہ ناگن کا خاتمہ کرکے اپنے مالک کی نظروں میں سرخرو ہو چکا تھا۔

بابا کی گود میں آتے ہی کنگ کوبرا ایک لخت بے جان سا ہوگیا۔ جیسے وہ اپنا آخری وقت بابا کی گود میں گزارنا چاہتا ہو۔

''ہمیں افسوس ہے بابا آپ کا ساتھی.....''

عدنان افسردہ سا ہوا۔

''نہیں بچہ! میرا ساتھی تو امر ہوگیا ہے، دوسروں کی مدد کرتے ہوئے جو جان دیتے ہیں وہ بلاشبہ امر ہوجاتے ہیں۔ بابا نے کہا اور کنگ کوبرا کے مردہ وجود کو سنبھالے اور ایک ہاتھ میں پٹاری پکڑے وہ ایک طرف کو چل پڑے۔ احتشام، عدنان، حسان اور صباء بھی اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے گاڑی میں بیٹھے اور نیلے پتھروں والی کوٹھی کی جانب گامزن ہوگئے۔

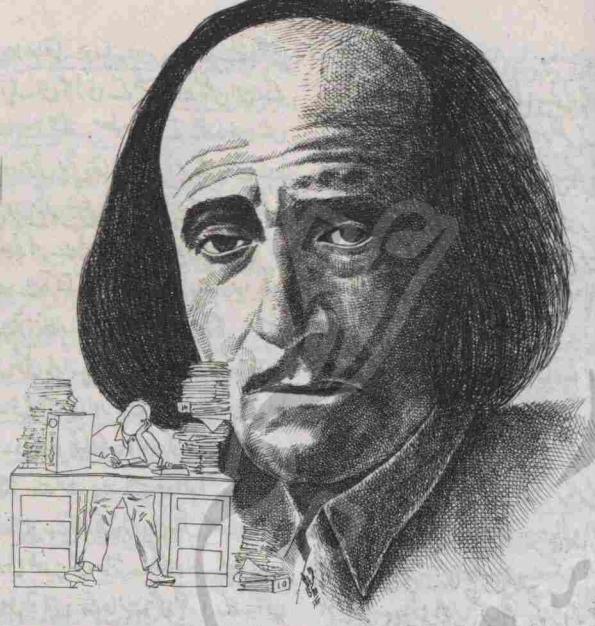

تیسری انگلی

عامر ملک-راولپنڈی

رات کی تاریکی میں اجنبی شخص کا جسم پھیلنا شروع ہوا، اجنبی کے دو دانت بڑے ہو کر باہر کو نکل آئے دوسرے ہی لمحے اجنبی بھیڑیا بن گیا۔ جسے دیکھ کر نوجوان تھرانے لگا۔

خوف و ہراس سے رگوں میں لہو منجمد کرتی ڈراؤنی.....خوفناک اور پر ہیبت کہانی

سرد اور تاریک رات آدھی گزر گئی تھی۔ ویسٹ پارک کے ایک دیہات میں چھوٹے سے ایک ویران ریلوے اسٹیشن کے اجڑے ہوئے مسافر خانے میں دو آدمی گاڑی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ گھنٹہ بھر گزر گیا تھا۔ گاڑی آنے میں ابھی بہت دیر تھی۔ جالوں نے مسافر خانے کی چھت کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ان جالوں سے لٹکتی زرد بتی کی پھیکی پھیکی سی روشنی کمرے کی ہیبت میں اضافہ کر رہی تھی۔ زرد لو، کی ایک کرن کھڑکی کے ایک ٹوٹے ہوئے کواڑ سے اندر آ رہی تھی۔ جس سے پتہ چلتا تھا کہ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بھی ایک بتی جل رہی ہے۔ پورے علاقے پر کہر اور دھند چھائی ہوئی تھی اور ماحول پر موت کا سا سکوت طاری تھا۔

آتش دان کے سامنے خستہ پرانی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ان دو آدمیوں کا تعارف روشناسی کی حد

سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ دونوں ایک ہی گاڑی کے منتظر تھے لیکن ان کے خیالات کے راستے مختلف معلوم ہوتے تھے۔ ان میں ایک نوجوان اور خوش پوش تھا اور دوسرا عمر میں اس سے بڑا اور عام کپڑوں میں ملبوس تھا۔ نوجوان گاڑی کے غیر یقینی انتظار۔ ٹھنڈ کمرے کی گھٹی گھٹی خاموشی اور اپنے ہم سفر کی اجنبیت سے اکتا گیا۔ اس نے سوچا اگر یوں ہی چپ بیٹھے رہے تو انتظار اور زیادہ تلخ ہو جائے گا..... اس نے گھنٹہ بھر میں پہلی بار اپنے ساتھی کو غور سے دیکھا۔ اس کے خدوخال۔ ڈیل ڈول اور بیٹھنے کے انداز میں انوکھا پن سا نظر آیا۔ وہ میلا کچیلا، سیاہ اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ بوٹ کیچڑ سے لت پت جیسے وہ دلدل میں سے گزر کر آیا ہو۔ چہرے کا رنگ زردی مائل بھورا، ناک پتلی اور غیر قدرتی طور پر لمبی، جبڑے تنگ اور لمبے، جب اس نے جمائی لی تو اس کے دانت بھی نظر آ گئے۔ اس کے اطراف کے دو دانت غیر معمولی لمبے اور باہر نکلے ہوئے تھے۔ آنکھیں چھوٹی اور ان کے قریب کی ہڈیاں ابھری ہوئیں وہیں سے تین چار لکیریں چل کے جبڑوں پر کہیں ختم ہو گئی تھیں۔ کان چہرے کی نسبت بہت بڑے، اوور کوٹ کے اٹھے ہوئے کالر سے بھی باہر نکل رہے تھے۔ کندھے کبڑوں کی طرح آگے کو جھکے ہوئے تھے۔ ان غیر متناسب خدوخال پر چھائے ہوئے تاثر سے پتہ چلتا تھا کہ یہ شخص باتیں کرنے پر کبھی آمادہ نہ ہوگا۔

"میرا نام پال ہے..... پال فلیئر....." نوجوان نے کہا۔

اجنبی مسکرا دیا..... پھیکی سی مسکراہٹ ..... اور اس نے پھر سر جھکا لیا..... پال نے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں لال انگارہ سرخی اور ڈراؤنی سی چمک تھی۔ پال نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں اور اجنبی "ہوں۔ ہاں" کے سوا کچھ نہ بولا۔ یا کبھی رسمی طور پر یوں مسکرا دیا جیسے اس نے مسکرانے کی سرتوڑ کوشش کی ہو۔

پال نے اس سے اس کے متعلق ہی دو چار باتیں پوچھیں۔ لیکن اجنبی نے ایک آدھ لفظ کے سوا کوئی مفصل جواب نہ دیا۔

"آپ کا شغل؟" پال نے پوچھا۔

"شکار" اجنبی نے کہا اور نظریں جھکا لیں۔ پھر اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لہجے میں بولا۔ "میں یہاں شکار کھیلنے آیا ہوں۔"

"پھر تو آپ نے لارڈ فلیئر کے شکاری کتوں کے متعلق بھی سنا ہوگا۔" پال نے کہا، "ان کے کتے دور دور تک مشہور ہیں....."

"میں جانتا ہوں۔" اجنبی نے کہا۔

"لارڈ فلیئر میرے چچا ہیں۔" پال نے فخریہ لہجے میں کہا۔

اجنبی نے پہلی بار پال کو نظر بھر کر دیکھا اور مسکرا کر سر کو عجیب سی جنبش دی..... پال اس کے بدلے ہوئے تاثر کو نہ سمجھ سکا۔ کمرے میں پھر سکوت طاری ہو گیا۔ اب پال مایوس نہیں تھا۔ کیونکہ اجنبی باتیں کرنے پر نہ سہی..... باتیں سننے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

"اپنے چچا کے متعلق آپ کو ایک کہانی سناؤں۔" پال نے کہا۔ "کہانی کوئی لمبی نہیں لیکن دلچسپ اور پراسرار ہے۔"

اجنبی نے پال کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھا۔ اور اس کی آنکھوں میں تمسخر اور شرارت کی سی چمک آ گئی..... وہ زیر لب بولا۔

"ہاں..... سناؤ"

"آپ کو یہ تو شاید معلوم ہی ہوگا کہ میرے چچا پنشن پر آ گئے ہیں اور اپنی جاگیر میں فرصت کی گھڑیاں گزار رہے ہیں۔" پال نے بات شروع کی..... اپنی جاگیر میں انہوں نے ایک قلعہ نما حویلی بنا رکھی ہے۔ وہ وہیں رہتے ہیں، شکاری کتے پالنے اور کبھی کبھی شکار کھیلنے کا انہیں شوق ہے۔ بڑی سادہ اور کسی حد تک بے کیف سی زندگی گزار رہے ہیں لوگوں سے میل ملاپ بھی کم رکھتے ہیں۔ انہوں نے شادی بھی نہیں کی۔ میں ان کے بھائی کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ لیکن چچا فلیئر نے مجھے اس امید پر پالنا پوسنا شروع کر دیا کہ میں ان کی جائیداد کا وارث بنوں گا۔ یہ میری خوش نصیبی تھی، لیکن حالات نے خلاف توقع ڈراؤنی سی کروٹ بدل لی ہے.....

تھوڑا ہی عرصہ ہوا چچا نے ناروے کی ایک مہاجر لڑکی کو گھر میں ملازم رکھ لیا تھا۔ وہ لڑکی گونگی اور بہری تھی۔ عمر پچیس سال کے لگ بھگ اور نہایت ہی بدصورت، کھاتی بہت تھی اور سوتی بھی بہت تھی۔ صرف اتوار کے روز نہایا کرتی تھی، اسے تو دوسرے ملازم بھی منہ نہ لگاتے تھے لیکن چچا فلیئر نے اسے اپنا منظور نظر بنا لیا۔ اور اسے اپنی بچیوں کی طرح لاڈ اور پیار سے پالنے لگے، حد یہ کہ چچا نے اسے قانونی طور پر متبنیٰ بنا لیا اور اسے جائیداد کا وارث بنا دیا..... چچا کا یہ اقدام سب کے لئے معمہ بنا ہوا ہے..... میں چھٹیوں میں چچا کے یہاں آیا کرتا تھا، یہاں سواری اور شکار میں خوب وقت کٹتا تھا۔ اب کے مجھے یہاں آئے تین دن ہی گزرے تھے۔ لیکن آج میں واپس جا رہا ہوں، کیونکہ حالات زیادہ بگڑ گئے ہیں.....

ہاں تو اس لڑکی کے متعلق سنیئے..... میں اب کے یہاں آیا تھا تو لڑکی میں نمایاں تبدیلیاں دیکھیں، وہ اب پختہ عورت دکھائی دیتی تھی اور قدرے صاف ستھری بھی، پہلے روز میں نے کھانے کے وقت محسوس کیا کہ چچا کچھ کھوئے کھوئے اور بے چین سے ہیں، کھانے کے بعد انہوں نے مجھے دوسرے کمرے میں بلایا۔ ان کے بلانے کے انداز میں بھی گھبراہٹ تھی۔ "پال! چچا نے دوسرے کمرے میں بٹھا کر مجھے کہا....." کل مزارع نے بتایا ہے کہ اس کی دو بھیڑیں کسی درندے نے مار دی ہیں۔

کتوں نے ماری ہوں گی۔" میں نے کہا۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ چچا کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

"نہیں....." چچا نے کہا۔ "ہم نے کتوں کی ماری ہوئی بھیڑیں اکثر دیکھی ہیں، کتے بھیڑ کو مار کر کسی کونے کھدرے میں گھسیڑ کر لے جاتے ہیں اور اس کے اعضاء کو چبانا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن ان دو بھیڑوں کو کتوں نے نہیں مارا۔ دونوں کی گردنیں بے ڈھب طریقے سے چیری پھاڑی ہوئی ہیں۔ یہ کام کسی درندے کا ہے جو کتے سے کہیں زیادہ طاقتور اور خونخوار ہے۔"

"لیکن ایسے درندے اس علاقے میں کہاں؟" میں نے کہہ تو دیا..... لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اگر دو بھیڑوں کا مارے جانا چچا کے لئے اس قدر پریشان کن مسئلہ کیوں بن گیا ہے۔

"آج صبح ایک اور بھیڑ اسی طریقے سے ماری گئی ہے۔" چچا نے کہا۔ "اس کی گردن بھی اسی طرح چیری پھاڑی ہوئی تھی۔ ہم نے قریب کے جنگل کا کونہ کونہ دیکھ ڈالا ہے لیکن سوائے چند نقوش کے کچھ نظر نہیں آیا..... یہ انسانی پاؤں کے نشانات تھے۔" چچا اور زیادہ مضطرب ہو گیا کہنے لگا۔

"میں تمہیں ان وارداتوں کے متعلق تفصیلات بتانا چاہتا ہوں۔"

پال نے اجنبی کو سنایا کہ چچا نے مجھے ایک طویل قصہ سنایا۔ جو مختصراً یوں ہے کہ پچیس سال گزرے۔ چچا نے ایک عورت کو گھر میں ملازم رکھا تھا۔ وہ تیئس برس کے لگ بھگ کی سیاہ فام عورت تھی۔ وہ دراز قد اور اچھے جسم کی مالک تھی۔ اس کے نقش ونگار میں صرف ایک چیز تھی۔ جو سب کو فوراً نظر آ جاتی تھی۔ اور وہ تھیں اس کی آنکھیں۔ اس کی آنکھیں ترچھی تھیں بلکہ ٹیڑھی کہہ لو۔ یعنی قدرتی زاویے سے ہٹی ہوئیں۔ چچا سناتے ہیں کہ اس عورت کے خلاف انہیں کوئی شکایت نہیں تھی۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ اس عورت میں کوئی مافوق الفطرت قوت تھی۔ گاہے بگاہے اس کا سراپا اور انداز جادو گرنیوں کا سا نظر آنے لگتا تھا۔ بہرحال وہ عام قسم کی عورت نہیں تھی۔

ایک روز اس عورت نے میرے چچا کو بتایا کہ اس کے پیٹ میں بچہ ہے..... چچا بھنا اٹھے وہ اپنے گھر میں کسی فاحشہ عورت کا وجود برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے اسی وقت اسے گھر سے نکال دینا چاہا لیکن پھر رحم آ گیا، سوچا کہ اس حال میں کہاں ماری ماری پھرے گی۔ چچا نے اسے کہا کہ وہ بچہ پیدا ہونے کے بعد یہاں سے چلی جائے۔ چچا تو غصے سے پاگل ہوئے جا رہے

تھے، لیکن وہ عورت یوں مطمئن بلکہ مسرور تھی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ چچا نے اس پر غصہ کیا تو وہ مذاق کے موڈ میں آ گئی۔ چچا مجھے کہتے ہیں کہ نہ جانے میرے دل پر خوف سا کیوں طاری ہو گیا.....؟ وہ اپنے اعصاب پر کسی انجانی قوت کی ناگوار سی گرفت محسوس کرنے لگے۔ انہوں نے اس سے گلوخلاصی کرنے کے لئے اسے کہہ دیا کہ وہ الگ کمرے میں رہے اور آئندہ نہ ان کے سامنے آئے نہ گھر کے کسی کام کو ہاتھ لگائے، انہوں نے اسے الگ کمرہ بھی دے دیا۔

پال اجنبی کو کہانی سنا رہا تھا..... اجنبی سر جھکائے سن رہا تھا۔ کبھی وہ کن انکھیوں سے پال کی طرف دیکھ بھی لیتا پھر اپنے کیچڑ آلود بوٹوں پر نظر دوڑا دیتا۔ ”تاریک اور یخ بستہ رات گزرتی جا رہی تھی اور گاڑی آنے میں ابھی بہت دیر تھی۔ شاید برفباری کی وجہ سے کہیں دور پیچھے رک گئی ہو گی۔ پال نے سنایا..... ”چند ماہ بعد اس عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ چچا کو اطلاع دی گئی کہ یہ بچہ ٹھیک ہے۔ لیکن عورت مر رہی ہے، شاید جلد ہی مر جائے..... چچا گھبرائے..... سوچا عورت مر گئی تو کہیں دفن کر دیں گے۔ لیکن بچے کو کس کے حوالے کریں گے، وہ بھاگتے ہوئے عورت کے کمرے میں گئے دیکھا عورت بڑبڑا رہی تھی، جیسے غشی میں بول رہی ہو، سمجھ نہ آتی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، جب چچا اس کے قریب جا کر رکے تو عورت نے آنکھیں کھول دیں اور چپ ہو گئی..... اس نے لیٹے لیٹے اپنے پہلو سے بچے کو اٹھایا اور میرے چچا سے کہنے لگی۔

”یہ بچہ تمہاری جائیداد کا وارث ہو گا۔“ اس نے چچا کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے اسے اچھی طرح ذہن نشین کر رہا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے، یہ میرا اچھا بیٹا ثابت ہو گا اور اپنا موروثی حق کبھی نہ چھوڑے گا۔“ عورت کی آواز نزع کی کیفیت میں دبنے لگی۔ لیکن آواز صاف تھی وہ کہہ رہی تھی..... ”جو کوئی اس بچے کو وراثت کے حق سے محروم کرنے کی کوشش کرے گا، وہ زندہ نہ رہے گا۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے آخری ہچکی لی اور اس کا سر ڈھلک گیا..... مرتے مرتے عورت نے سرگوشی کی۔ ”بچے کے ہاتھ دیکھو اور اسے پہچان لو۔“ اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔

میرے چچا نے بچے کی بند مٹھیوں کو کھول کر دیکھا..... بچے کے دونوں ہاتھوں کی تیسری انگلی دوسری انگلیوں سے بہت زیادہ لمبی تھی..... غیر معمولی طور پر لمبی..... اس بچے کو ایک ملازمہ اٹھا کر لے گئی۔ وہ خدا ترس عورت تھی۔ مزارعوں اور دیہات کے لوگوں نے چچا کو بتایا کہ جس انسان کی تیسری انگلی یعنی چھوٹی انگلی کے ساتھ والی اس قدر لمبی ہو..... وہ بظاہر انسان ہوتا ہے۔ لیکن اسی میں بھیڑیے کی درندگی اور بھیڑیے ہی کے اوصاف ہوتے ہیں۔ دیہاتیوں نے بتایا کہ ایسا انسان دن کے وقت انسانوں کے روپ میں رہتا ہے لیکن رات کے وقت وہ مکمل بھیڑیا بن جاتا ہے..... اسے جہاں کوئی انسان یا بھیڑ نظر آئے۔ وہ اسے دبوچ کر اس کا خون پی لیتا ہے، لیکن چچا ان توہمات کو ماننے والے نہیں تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ وہ قدرے مطمئن ہو گئے کہ بچے کو ایک ملازمہ اٹھا کر لے گئی ہے۔ اور اس کی ماں مر گئی ہے۔

”وہ ملازمہ دس سال تک اس بچے کو پالتی پوستی رہی۔ آخر ایک روز وہ بھاگ گیا اور پھر کسی کو نظر نہ آیا یہ برسوں پہلے کی بات ہے لیکن پرسوں اس کی ایک جھلک دیکھی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اب وہ دس برس کا بچہ نہیں چھبیس ستائیس برس کی عمر کا آدمی ہو گا۔ چچا نے مجھے بتایا کہ یہ بھیڑیں اسی نے ماری ہیں لیکن چچا نے یہ خدشہ بھی ظاہر کیا کہ اس کا مقصد بھیڑوں کو مارنے کا نہیں۔ بچے کی ماں نے مرتے مرتے کہا تھا کہ جو کوئی اس سے وراثت کا حق چھیننے کی کوشش کرے گا..... زندہ نہ رہ سکے گا۔

اس خطرے کے پیش نظر چچا نے اب جس مہاجر لڑکی کو منتخب بنا لیا تھا۔ اسے شام کے بعد گھر سے باہر نکلنے سے منع کر دیا اور اس کی حفاظت کا انتظام کر دیا۔ پال نے کرسی پر کروٹ بدلی اور اجنبی کو سنایا۔

”پرسوں رات کی بات ہے مجھے نیند نہیں غنودگی سی آ رہی تھی۔ میں نے باہر گھاس اور پتوں پر بھاری بھر کم قدموں کی آوازیں سنیں۔ ساتھ ہی بھیڑیے کی چیخیں بھی سنائی دیں، میں چونکا لیکن خیال آیا کہ شاید یہ خواب کی آوازیں تھیں۔ پھر میں سو گیا۔ صبح اٹھ کر باہر نکلا تو پتہ چلا کہ رات ایک اور بھیڑ ماری گئی ہے۔ اس کی گردن بھی پہلی بھیڑوں کی طرح بری طرح چیری پھاڑی ہوئی تھی چوکیدار کہتے ہیں کہ وہ رات بھر چوکنے رہے، مگر پھر بھی بھیڑ ماری گئی۔

ناشتے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ اس خونخوار درندے کا بہر حال کھوج لگایا جائے۔ چنانچہ ہم تیس آدمیوں کو کچھ گھوڑوں پر، کچھ پیادہ ساتھ لے کر جنگل میں پھیل گئے۔ کتوں نے بھی ہمارا خوب ساتھ دیا۔ لیکن ہمیں کامیابی نہ ملی۔ ہم واپس آنے لگے۔ تو چچا کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گئے، باقی آدمی دوسرے راستوں سے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے میں اور چچا ایک تنگ سے جنگلی راستے پر چل پڑے شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا، ہم اصطبل سے کوئی دو اڑھائی میٹر دور ہوں گے کہ ہمارے گھوڑے اچانک بدک کر رک گئے اور گردنیں دائیں طرف گھما کر خوف سے ہنہنانے لگے، چچا نے اس طرف دیکھا تو ان کے منہ سے خوفزدہ سی چیخ نکل گئی۔ معاً بعد بھیڑیے کی ہولناک چیخ سنائی دی۔ اس کے ساتھ انسانی قہقہے گونجے۔ اور ماحول پر شام کا سا سکوت چھا گیا۔ اس سکوت میں ہول کا عنصر نمایاں تھا۔

ہم نے اچھی طرح سنا کہ کسی انسان کے گھٹے ہوئے گلے سے خراٹے اور کربناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ گھوڑے بدک رہے تھے، چچا گھوڑے سے کود کر اس طرف بھاگے۔ میں بھی ان کے پیچھے دوڑا۔ ہم جھاڑیوں کو پھلانگتے ہوئے کھلے میدان میں پہنچ گئے۔ پھر دیکھا۔ زمین پر کوئی چیز پڑی ہوئی تھی ہم قریب گئے تو دیکھا کہ وہ چچا کی جاگیر کی وارث مہاجر لڑکی کی لاش تھی۔ اس کی گردن اس طرح بے رحمی سے ”چیری پھاڑی ہوئی تھی جس طرح بھیڑوں کی گردنیں پھاڑی گئی تھیں۔

پال نے کہانی ختم کر دی۔ اور اجنبی کو دیکھ کر مسکرایا۔ کہنے لگا.....

”یہ واردات میرے سامنے ہوئی ہے۔ پھر بھی میں اس کہانی کے اس پہلے حصے پر یقین نہیں کر سکتا جس کا میں عینی شاہد نہیں ہوں۔ شک ہوتا ہے کہ مجھے ڈرانے کے لئے یہ قصہ گھڑا گیا ہے۔ کوئی انسان بھیڑیا نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی بھیڑیا انسان کے روپ میں نہیں آ سکتا۔ چچا جان، شاید مجھے اپنا وارث نہیں بنانا چاہتے۔ ظاہر ہے کہ مہاجر لڑکی کے مرجانے کے بعد ان کی جاگیر کا وارث میں ہی ہوں۔ میں اپنا حق اب نہیں چھوڑوں گا..... جائیداد کا وارث اب میں ہی ہوں۔

اجنبی مسکرایا..... مگر اب اس کی مسکراہٹ پھیکی نہیں بلکہ زندہ اور جاندار سی تھی۔ اس کی آنکھوں کی سرخی میں نئی چمک پیدا ہو گئی..... پال نے عیاں طور پر دیکھا کہ اجنبی کا جسم پھیلنا شروع ہو گیا۔ پال کے دل پر ایک سخت خوف سا طاری ہو گیا۔ جب اجنبی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تو پال نے اپنے جسم میں سرد سی لہر سرایت کرتی محسوس کی۔ اس لہر نے اس کے جسم کو بے حس کر دیا اجنبی کی مسکراہٹ خندہ دنداں نما بل گئی۔ پال کا جسم لرزنے لگا۔ اور زبان گنگ ہو گئی۔ اجنبی کے دو دانت باہر نکل آئے۔ ہونٹ کھل گئے اور ہونٹوں کے کونوں سے رال کی دھار نکل آئی۔ دوسرے ہی لمحے اجنبی بھیڑیا بن گیا..... وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اوور کوٹ کی جیب سے ہاتھ نکال کر پال کی طرف بڑھایا۔ تو پال کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے دیکھا کہ اجنبی کے ہاتھ کی تیسری انگلی بہت لمبی تھی اور اس کی انگلیوں کے ناخن لمبے ہوتے جا رہے تھے..... گاڑی آنے میں ابھی دیر تھی۔ رات کے یخ بستہ سناٹے میں بھیڑیے کی ہولناک چیخ اور اس کے ساتھ ساتھ دبے دبے انسانی خراٹے سنائی دیئے اور رات پھر خاموش ہو گئی۔

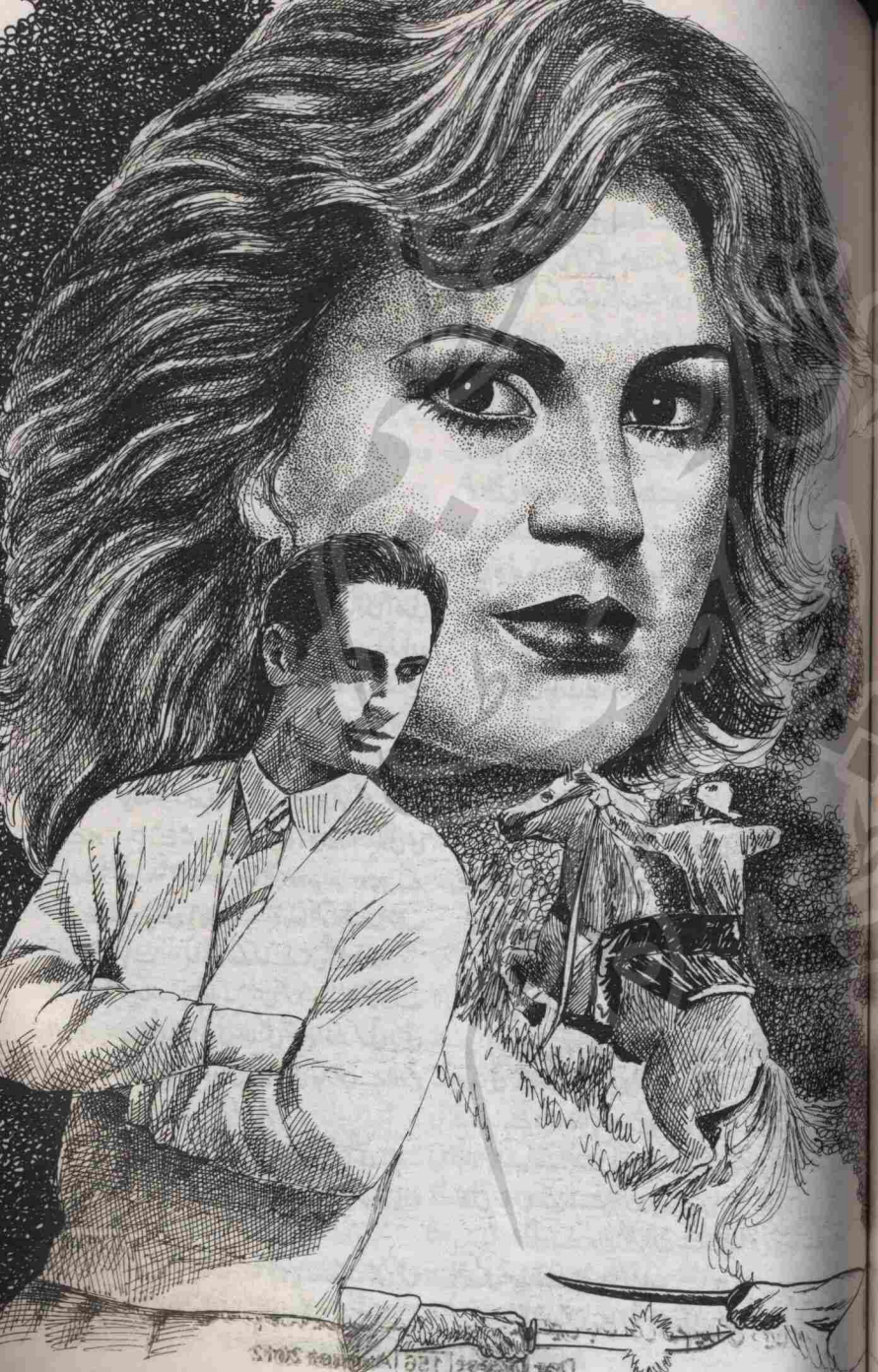

بلیک ٹائیگر

ایم الیاس | **قسط نمبر 2**

دہشت اور خوف کے افق پر جھلمل کرتی زیر زمین کے عجیب و غریب قانون کے لبادے میں لپٹی ہوئی، ناقابل یقین اور ناقابل فراموش، رگ و پے میں خون کو منجمد کرتی، لرزیدہ لرزیدہ تھرا دینے والی، خوف کا دریا بہاتی، دل میں کسک پیدا کرتی، اپنی نوعیت کی انوکھی اور شاہکار کہانی۔

تجسس اور سسپنس سے بھرپور واقعات جو پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیں گے

ٹائیگر کو جب ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہا ہے نہ ہی اس کی لاش کسی ویرانے میں جھاڑیوں یا کسی گڑھے میں پڑی ہوئی ہے۔ وہ اپنی کوٹھری میں بستر پر دراز تھا...... ایک پل کے ہزارویں حصے میں اسے جو خیال آیا وہ یہ تھا کہ اس کی مشکیں کسی ہوئی ہوں گی اور اس کے منہ پر ٹیپ چپکا ہوا ہوگا...... اسے اندازہ نہیں ہوسکا کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہا۔ اتنی دیر میں وہ پراسرار، چال باز اور عیار شخص جو اس کے لئے قطعی اجنبی تھا۔ اس کے گھر کو اور اس کی جیب صاف کر کے چلا گیا ہوگا جس میں خاصی بڑی رقم موجود تھی۔ گھر میں بھی ایک خطیر رقم جو خفیہ جگہ تھی۔ اس کی بہت بڑی رقم بینک میں بھی موجود تھی۔ لیکن گھر میں بھی بڑی رقم رکھتا تھا جانے کب، کس وقت اور کس کے کام آجائے۔ کیوں کہ ضرورت اور وقت کا کچھ پتا نہیں ہوتا تھا کوئی بھی اس خفیہ جگہ سے رقم نہیں نکال سکتا تھا۔ لیکن اسے ابھی تک ایسے کسی عیار شخص سے رابطہ نہیں پڑا تھا۔

وہ عیار شخص جو بلا کا ذہین تھا اس نے منہ پر کلورو فارم والا رومال رکھ کر بے ہوش کیا وہ اس کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بڑے اطمینان اور ٹھاٹ سے بیٹھا ہوا سگریٹ کا دھواں فضا میں اڑا رہا تھا۔ ٹائیگر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا تو وہ شخص بے اختیار مسکرا دیا۔

''ہاں بھئی...... شیر بنگال......! بادشاہ بے تاج...... اب مزاج عالی کیسے ہیں......؟ نیند کیسے آئی...... کیسے کیسے سہانے رنگین خواب دیکھے......''

''ہاشم......!'' ٹائیگر نے بگڑ کر غصے سے کہا۔

''یہ کیا حرکت ہے......؟''

ٹائیگر نے اسے پہچان لیا تھا جو بہروپ بدل کر پراسرار طور پر آیا تھا۔ اسے فوراً اس لئے پہچان لیا تھا کہ اس کے کان کا ایک حصہ تھا۔ ''یہ حرکت اس لئے ہے کہ تمہاری تربیت میں جو کسر رہ گئی ہے اسے پوری کی جائے تاکہ ہر پل، ہر لمحہ اور ہر لحظہ تم الرٹ رہو......'' ہاشم کہنے لگا۔ ''دیکھو نا...... دشمن کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا ہے......؟ وہ اچانک اور غیر متوقع ایسا حملہ اور یہ حرکت کرسکتا ہے جو میں نے کی۔ کیا میں نے غلط کیا جو تم مجھ پر بگڑ رہے ہو؟ تمہیں تو میرا شکریہ ادا کرنا چاہئے...... تمہیں کسی بڑے ہوٹل یعنی شیرٹن سنار گاؤں کھانے پر لے جانا چاہئے...... اور ہاں میرا احسان بھی ماننا چاہئے......''

''اچھا اب...... بس کرو...... مجھے شرمندہ نہ کرو...... میں تمہیں جانتا ہوں کہ تم پیدائشی ذہین اور

شاطر ہو..... میں تمہیں نہ صرف ڈنر پر لے جاؤں گا بلکہ تمہیں بڑھیا قسم کا سگریٹ کا کارٹن بطور تحفہ پیش کروں گا۔ بھابھی کو لے جا کر دوں گا کہ وہ تمہیں روزانہ ایک پیکٹ سگریٹ دے دیا کرے۔"

"شاباش ہے..... صد آفرین ہے..... اسے کہتے ہیں خون کا سفید ہو جانا..... تم میرے احسان کا یہ صلہ دے رہے ہو.....؟ وہ تو مجھے گھر سے نکال دے گی یا پھر دانہ پانی بند کر دے گی۔" وہ ایک لمبا سانس لے کر بولا۔ "وہ کہتی ہے کہ میں سوکن برداشت کر سکتی ہوں۔ سگریٹ نہیں....."

"دانہ پانی بند ہو جانا تمہارے حق میں زیادہ بہتر اور طبی لحاظ سے مفید ثابت ہوگا۔" ٹائیگر نے کہا۔

"وہ کیوں اور کیسے.....؟" ہاشم نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"اس لئے کہ تم بسیار خور ہو..... تمہاری آمدنی سے زیادہ تمہارا وزن بڑھ رہا ہے..... تم میٹھا بہت زیادہ کھاتے ہو۔ اندیشہ ہے کہ تمہیں شوگر نہ ہو جائے۔ گھر سے باہر نکالے جانے کی صورت میں تمہارا وزن کم ہو جائے گا۔"

"یار.....! میری غذا ہے کتنی جو تم مجھے نظر لگا رہے ہو..... ناشتے میں چار انڈوں کا آملیٹ..... کوئی سی سویٹ ڈش..... مکھن اور آدھا کلو دودھ..... دوپہر کے کھانے میں چاول یا بریانی..... آدھا کلو گوشت صرف چار شامی کباب..... رات کے کھانے میں مچھلی اور....."

"اچھا..... اچھا..... بس کرو....." ٹائیگر نے اس کی بات کاٹی۔ "ہماری بھابھی تمہارا ذکر کرتی رہتی ہیں۔ وہ غریب پکا پکا کر دبلی پتلی ہوتی جا رہی ہے اور تم گینڈا..... اس غریب پر رحم کرو یار!"

"یار.....! وہ سلم ہو کر کتنی پرکشش لگتی ہے۔ بڑی سویٹ بھی..... اس لئے مجھے سویٹ ڈش زیادہ پسند ہے۔"

"اب تمہارا علاج کرنا ہی پڑے گا۔ میں کل رات ہی ایک سگریٹ کارٹن پہنچاؤں گا۔" ٹائیگر بولا۔

"مگر یار! یہ جو تم نے الائچی والا پان جو دن میں دس بارہ کھاتے ہو پھر بھی سگریٹ کے تمباکو کی بو آ جاتی ہے۔"

"ہاں..... اس وقت جب دل سے دل..... اور ہونٹوں سے ہونٹ ملتے ہیں۔"

"یار..... بہت بڑے بے وقوف ہو..... جب بھابھی کہتی ہیں کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتی....." کہو کہ میں سگریٹ نہیں چھوڑ سکتا..... لہٰذا وہ تمہیں چھوڑ دے گی۔ تم دوسری شادی کر لینا..... کتنا آسان نسخہ ہے۔"

"اس کے سات بھائی ہیں..... سنا ہے کہ آٹھواں بھی آ رہا ہے..... دوسری، تیسری شادی کی خواہش اور ارمان نہیں ہوتا ہے..... اس کے ساتوں بھائی مجھ سے کہیں مسٹنڈے ہیں..... کیا تم چاہتے ہو کہ میں آٹھ ماہ اسپتال میں زیر علاج رہوں..... لیکن یار ٹائیگر.....! وہ بھی کسی شیرنی سے کم نہیں ہے..... لیکن ایک بات یہ ہے کہ اس کے ہاتھ میں جو ذائقہ ہے میں اپنی انگلیاں چاٹ لیتا ہوں....." ہاشم ہنس دیا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ ناوقت تمہارا آنا کیسے ہوا.....؟ کیا بھوک لگ رہی ہے؟" ٹائیگر نے پوچھا۔ "کیا بھابھی نے آج کھانا نہیں دیا۔"

"میں تمہارے ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔" ہاشم نے جواب دیا۔ "رشید الزماں صدیقی نے کل صبح دس بجے ایک نہایت ضروری کام سے دفتر بلایا ہے۔ بس یہی پیغام دینے آنا پڑا۔ جب میں نے موبائل پر رابطہ کیا تو تمہارا موبائل بند تھا۔"

دوسرے دن صبح ٹھیک دس بجے رشید الزماں صدیقی کے دفتر سندر بن ٹریول ایجنسی میں ٹائیگر اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ رشید الزماں صدیقی نے رسمی سلام علیک کے بعد میز کی دراز سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا۔

ٹائیگر نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو رشید نے بغیر کسی تمہید کے کہنا شروع کیا۔

"اس میں پچاس ہزار ڈالر اور پچیس ہزار

ہندوستانی کرنسی ہے۔ پچاس ہزار ڈالر تو پیشگی ہے۔ باقی پچاس ڈالر مہم کا آغاز کرنے سے پہلے ادا کئے جائیں گے..... مہم ناکام ہو یا کامیاب دونوں صورتوں میں تمہارے ایک لاکھ ڈالر پکے..... کامیابی کی صورت میں مزید پچاس ہزار ڈالر..... پچیس ہزار ہندوستانی کرنسی جیب خرچ ہے..... اس کے علاوہ ممبئی شہر کے جس ہوٹل میں قیام کرو گے وہ ہے شیرٹن اوبرائے..... طعام، قیام اور جو مشروبات بھی پینا چاہو گے اس کے بھی تمام اخراجات پارٹی کے ذمے..... راتیں کالی کرنے کے لئے جو کال گرل، اداکارہ اور ہیروئن پسند ایک فون نمبر پر رابطہ کرو گے وہ پارٹی فراہم کر دے گی۔ اس بات کی فکر نہ کرنا کہ تمہاری پسند اور خواہش وہ کیسے اور کیوں کر پوری ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ..... مزید کوئی خرچ ہو تو ایک کوڈ نمبر دے رہا ہوں صرف اتنا کہنا کہ یہ کام اسے الہ دین کا چراغ سمجھو۔ ہر قسم کی تفریح جب چاہو گے صرف ایک حکم پر پورا۔"

"مہم کیا ہے.....؟ ٹائیگر نے سوال کیا۔

"اس لفافے میں ایک ٹائپ شدہ کاغذ ہے۔" رشید نے جواب دیا۔

"کیا تمہارا کوئی کمیشن ہے.....!" ٹائیگر نے سوال کیا۔

"تم جانتے ہو کہ میں کمیشن پارٹی سے لیتا ہوں۔ وہ مجھے پیشگی دے دیا گیا ہے۔" رشید نے جواب دیا۔

رشید الزماں صدیقی کی بظاہر ٹریول ایجنسی تھی لیکن وہ یہاں زیر زمین اور مختلف بین الاقوامی تنظیموں کا ایجنٹ تھا۔ وہ تنظیمیں اس سے کام لیتی تھیں اور اس سے رابطہ قائم کرتی تھیں۔ وہ ان کے لئے بااعتماد آدمی تھا۔ اس نے ٹائیگر سے کچھ کام لیا تھا جو ٹائیگر نے بخوبی انجام دیا تھا۔ یوں بھی ٹائیگر نے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا جو قانون اور جرائم کی زد میں آتا تھا۔ اس لئے ٹائیگر کا شہرہ اور چرچا بنگلہ دیش سے باہر تمام دنیا میں ہوتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ ملک سے باہر نہ جائے۔ اس نے یہ کام اس لئے بھی لے لیا تھا کہ ممبئی جانے کی جو خواہش تھی وہ پوری ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

ممبئی کی بندرگاہ پر واقع شیرٹن ہوٹل اس شہر کا کیا بلکہ ہندوستان کے تمام ہوٹلوں میں مہنگا ترین، اعلیٰ اور ہر قسم کی جدید ترین سہولتوں سے آراستہ تھا۔ اس میں اداکارائیں، اداکار، کال گرلز کے علاوہ زیر زمین دنیا کے سرغنہ، مافیا، صنعتکار اور سرمایہ دار کے علاوہ غیر ملکی سیاح بھی ٹھہرتے تھے۔ اس میں ہر وہ شخص ٹھہر تا اور ٹھہر سکتا تھا جس کی جیب میں پیسہ ہو..... پیسہ ہر عیب چھپا لیتا ہے۔ اس ہوٹل میں اسمگلروں کی سرگرمیاں بھی جاری رہتی تھیں۔

اس نے اس ہوٹل میں کمرا لیا ہوا تھا۔ جس مہم کو وہ سر کرنے کے لئے آیا ہوا تھا، وہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ وہ نہ صرف جتنا پراسرار تھا بلکہ اس سے بھی کہیں بے حد خطرناک اور بے حد اہم تھا۔ جس پارٹی نے اسے توقع سے کہیں معاوضہ اور سہولتیں دی تھیں وہ یوں ہی نہیں دے دی تھیں..... ٹائیگر اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ جو مہم بھی ہو وہ حلوہ نہیں ہوتی ہے۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر سر کرنے کے لئے نکلنا پڑتا ہے۔ کوئی مہم آسان نہیں ہوتی ہے۔ اس میں جان جانے کا زیادہ خطرہ موجود ہوتا ہے۔

چوں کہ ابھی مہم کے آغاز میں کچھ دنوں کی دیر اس وجہ سے تھی کہ پارٹی کی جانب سے ہدایات موصول نہیں ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی آمد اور ہوٹل میں قیام کی اطلاع دے دی تھی۔ اس کے پاس وقت ہی وقت تھا۔ سب سے زیادہ مشکل اکیلے شخص کا وقت کاٹنا ہوتا ہے۔

اس نے اس بات کو محسوس کیا تھا کہ ہندوستان میں عریانی، بے حجابی اور فحاشی بہت بڑھ گئی ہے۔ اور مزید بڑھتی جا رہی ہے بلکہ عریانیت کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ لڑکیاں کیا..... شادی شدہ عورتیں مختصر سے لباس میں اس طرح نظر آتی تھیں جیسے کپڑے کانٹے کی طرح چبھتے ہیں۔ ان کی مجبوری تھی۔ ورنہ ان کا بس چلتا تو وہ ابتدائی دور کی نظر آنے لگتیں جب تہذیب نے

انسانیت کو چھوا نہیں تھا۔ وہ ایک طرح سے حیوان دکھائی دیتی تھیں.....

ہندوستانی فلمیں ٹی وی کے علاوہ بنگال کے سینما گھروں میں دکھائی جاتی تھیں۔ اس کے بولڈ مناظروں کا اثر لڑکیوں اور عورتوں پر پڑ رہا تھا۔ جب وہ ساحلوں، ہوٹلوں اور بازاروں میں انہیں دیکھتا کہ یہ ہندوستانی عورت کو کیا ہوتا جا رہا ہے..... شرم و حیا نظر نہیں آتی ہے اور روایتی صورت دکھائی نہیں دیتی ہے..... وہ کوئی پارسا، ناصح اور مبلغ نہیں تھا لیکن صرف سوچتا تھا۔ فلموں سے زیادہ تفریح مفت کی تفریح تھی۔ وہ ان سے دل بہلاتا رہتا تھا۔ فلموں کے بولڈ مناظر سے زیادہ ان سے محظوظ ہوتا تھا۔

ٹائیگر نے آج اپنے کمرے کی کھڑکی سے پیراکی کا تالاب دیکھا جہاں عورتوں کا جلوہ تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ مغربی ساحل کا نظارہ دیکھ رہا ہو۔ وہی ماحول تھا..... عورت سے کہیں حسین، دلکش اور ہیجان نظارہ دنیا میں کوئی نہیں ہے..... اس نے سوچا کہ قدرت نے بھی دنیا میں عورت کیا بنائی..... انوکھی اور بے مثال..... اس کی صناعی جتنی دی جائے کم ہے۔

ٹائیگر نہانے اور تنہائی کی بوریت دور کرنے کی غرض سے ہوٹل کے پیراکی کے تالاب کی طرف چل دیا۔ اس لئے بھی کہ تیرنے اور نہانے میں خاصا وقت صرف ہو جاتا ہے اور آسانی سے بلکہ تیزی سے کٹ جاتا ہے۔ تالاب میں اور اس کے کنارے مرد اور جل پریوں میں ہر عمر..... ہر قامت اور ہر رنگ و نسل کی تھیں۔ جو بجلی گرا رہی تھیں۔ ان پریوں کے سنسنی خیز، دلکش اور دل کو برما دینے والے فن کاروں میں وہ ایسا کھویا کہ خود کو فراموش کر بیٹھا..... اسے اس بات کا کوئی خیال..... فکر اور احساس نہیں تھا کہ کتنے ان سے محظوظ ہو رہے ہیں۔

ٹائیگر نے کسی فلسفی کے انداز سے سوچا کہ ہندوستانی معاشرہ اندھا دھند بھاگتا جا رہا ہے..... اسے نہ تو رک کر دم لینے کی ضرورت ہے اور نہ ہی پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہتا ہے..... اور اسے اس بات کا بھی احساس نہیں تیزی سے بھاگنے سے ٹھوکر بھی لگ سکتی ہے؟..... انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہیں ہے..... یہاں جو ماحول تھا جس سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ قوم کسی جنگ میں راستہ بھول کر بھٹک رہی ہے..... پہلے ستر پوشی پتوں سے ہوتی تھی اب یہاں چند گرہ سے ہو رہی تھی..... بے حجابی کے نظارے جو تھے ان سے آنکھیں چرانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ کوئی مٹی کا تودہ اور پتھر نہیں تھا جس پر اثر نہ ہو۔

لیکن اس کی نگاہ ایک ایسی ہستی پر مرکوز تھی جس کی کسی ایسے آتش فشاں کی مثال تھی جو اندر ہی اندر دہک رہا ہو..... کسی بھی لمحے یک لخت پھٹ سکتا ہو..... اس کے بدن پر بھی پیراکی کا انتہائی مختصر لباس تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ رسمی طور پر پہن رکھا ہو..... اگر اسے کھلی چھٹی دے دی جاتی تو شاید وہ اس کا تکلف ہرگز نہ کرتی۔ تالاب پر کسی امریکی نائٹ کلب کا سا سماں جیسا تھا۔

ٹائیگر نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ اس عالم میں صرف وہ ایک ہی شاداب کلی نہیں تھی..... اور بھی لڑکیاں اور جواں سال عورتیں موجود تھیں جو نہایت حسین، وضعدار اور پرکشش بھی تھیں..... لیکن اس شعلہ مجسم میں جو انفرادیت تھی وہ کسی اور میں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس نے ٹائیگر کو اپنی طرف متوجہ پا کر اندازہ کر لیا تھا کہ وہ اسے بڑی دیر سے اور بڑی محویت کے عالم میں اس طرح دیکھ رہا ہو جیسے کوئی کتاب پڑھ رہا ہو..... ایک ایک سطر اور پیراگراف..... اسے شاید ٹائیگر کی یہ حرکت معیوب اور ناگوار سی لگی تھی۔ کیوں کہ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی..... ٹائیگر نے اس کے بشرے سے بھی بھانپ لیا اور دل میں حیران ہوا کہ لڑکیاں اور عورتیں ان کی طرف متوجہ ہونے سے دل میں خوش ہو جاتی ہیں..... اسے کیوں ناگوار لگا..... ٹائیگر کی سمجھ میں نہیں آیا..... جب اس نے ٹائیگر کی طرف پیش قدمی کی اس کا انداز جارحانہ سا تھا..... ٹائیگر کو دن میں تارے نظر آنے لگے اور اب اس کے لئے فرار کی راہ بھی نہیں رہی

تھی..... اس نے گھبرا کر آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی..... آسمان پر چیلیں اور گدھ محو پرواز تھے..... یہ ایسا انتہائی مکروہ نظارہ تھا کہ اس کی طبیعت مکدر سی ہو گئی۔

جیسے جیسے وہ ٹائیگر کے قریب ہوتی جا رہی تھی ویسے ویسے وہ اپنے دل کو مضبوط اور اس کی ہر کارروائی کے لئے ذہن کو تیار کر رہا تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ پھر بھی ٹائیگر کی پیشانی عرق آلود سی ہو رہی تھی۔ وہ گیدڑ بن گیا تھا۔

''ہیلو.....'' اس نے ٹائیگر کو رسیلی آواز میں مخاطب کیا تو ٹائیگر کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ یہ کوئی طلزیا استہزا نہیں تھا۔ وہ سنجیدہ تھی۔ ''کیسے ہو بلیک ٹائیگر.....!''

ٹائیگر کی تھوڑی بہت بھی جو غلط فہمی تھی وہ دور ہو گئی..... کیوں کہ اس کا لہجہ نہ تو چبھتا ہوا تھا اور نہ ہی اس میں طنز کی آمیزش تھی جیسا کہ اس نے چند لمحے پیشتر محسوس اور اندازہ کیا تھا..... اس کا خیال تھا کہ یہ مہ پارہ اس کے رخسار کا بوسہ لے گی..... تاہم وہ ذہنی طور پر مزاحمت اور مدافعت کے لئے تیار تھا کہ نازک سی کلائی کو تھام لے۔

''ٹائیگر.....'' جواباً ہیلو کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے دل پر جبر کرنا تھا۔ وہ جس انداز سے اس کے سامنے کھڑی تھی اس کے وجود کو خاکستر کئے دے رہا تھا۔ اس قیامت نے اسے قتل کرنے کی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

پھر اس نے مصالحت کے لئے اپنا گورا گورا اور مرمریں ہاتھ بڑھایا تو ٹائیگر نے بغیر کسی تامل کے اسے تھام لیا۔ اس کے جسم میں سنسنی بجلی کی طرح دوڑ گئی۔ اس نے سوچا۔ کاش! وہ اس ہاتھ کو تھامے رکھے۔ پھر اس نے رسمی انداز سے کہا۔

''کیا آپ بیٹھنا پسند فرمائیں گی.....؟ مجھے بڑی دلی مسرت ہوگی۔''

ٹائیگر کو توقع نہیں تھی کہ وہ اس کی دعوت کو قبول کر لے گی..... کیوں کہ ایک غیر اور اجنبی مرد کے پاس اس بے حجابی کے عالم میں بیٹھنا نامناسب سا تھا..... لیکن جب وہ شکریہ کہہ کر اس کے قریب چکنے فرش پر بیٹھ گئی تو اسے یقین نہ آیا۔ اس لئے بھی کہ وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھی تھی۔ یہ تو بہ شکن انداز تھا۔ ٹائیگر نے دل تھام لیا تھا۔

یہ کوئی خواب نہ بلکہ ایک حقیقت تھی..... ٹائیگر کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے کہ وہ کوئی چاکلیٹی نوجوان نہیں تھا نہ ہی خود ایسا سمجھتا تھا۔ اس کی عمر چھتیس برس کی ہو چکی تھی۔ لیکن وہ ایک وجیہہ، دراز قد اور ایسا خوب صورت ضرور تھا کہ اسے نوجوان لڑکیاں اور عورتیں دزدیدہ نظروں سے دیکھتی اور متوجہ ہو جاتی تھیں..... ٹائیگر کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آخر اسے اس تتلی کو لفٹ دینے کی کیا ضرورت آن پڑی۔ وہ ایسی قیامت تھی کہ نوجوان اس کے ایک اشارے پر اس کے قدموں پر اپنا سر رکھ سکتے تھے۔ ٹائیگر نے اس بات کو محسوس کیا تھا کہ وہ اس کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لے رہی ہے..... کیا اس لڑکی کا اس پر مرمٹنے کا ارادہ ہے؟

ٹائیگر نے اس کے آتشی قرب اور بڑی بڑی خوب صورت سیاہ آنکھوں کی تاب نہ لاتے ہوئے رسمی انداز سے پوچھا۔

''یہاں آپ کا آنا کسی کام کے سلسلے میں ہے یا پھر تفریح مقصود ہے۔'' اس کی ضدی نگاہیں بے اختیار تتلی کی جانب اٹھ گئیں۔ ''یوں تو ارادہ ایک طرح سے تفریح کا ہے..... لیکن میں وثوق سے کہہ نہیں سکتی ہوں..... میری آمد تفریح تک ہی محدود رہے گی..... لیکن آپ یہ بتائیں کہ آپ یہاں کیسے آئے ہیں؟''

''ہوائی جہاز سے.....'' ٹائیگر نے شوخی سے کہا۔ پھر وہ سنجیدہ سا ہو گیا۔ چونک سا گیا۔ ''مجھ جیسے آوارہ گرد کے لئے یہ شہر ہر لحاظ سے تفریح کے موزوں سقو ہوا تو میں چلا آیا۔ پھر اس شہر کی سب سے بڑی خوبی یہاں رنگینی ہے۔ شو بزنس کی دنیا ہے۔ حسن و شباب کی بھرمار ہے۔ رنگین تتلیاں اور پرستان کی پریاں بھی ہیں۔''

ٹائیگر کی بات سن کر اس کی خوب صورت

آنکھوں میں گہری سوچ کے بادل چھا گئے۔ وہ سنجیدہ سی ہوگئی۔ دوسرے لمحے ٹائیگر نے سکوت کو توڑتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا آپ بھی اسی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہیں؟“

”نہیں۔“ اس نے اپنی لانبی سرگیں پلکوں کی چلمن اٹھا کر اس کی اوٹ سے ٹائیگر کو دیکھا۔ پھر اس نے اپنا خوش نما سر نفی کے انداز میں ہلا دیا۔ ”میں کسی کروڑ پتی خاندان کی تھوڑی ہوں۔ میں اس ہوٹل میں مقیم نہیں ہوں۔“

”کیا آپ کا شوہر ساتھ نہیں رہتا جو آپ یہاں روز ہی اس سے ملنے کے لئے آتی رہتی ہیں؟“ ٹائیگر نے کہا۔ ”کیا یہ ہوٹل اور تالاب بہت پسند ہے۔“

”یہ بات آپ کے علم میں کیسے آئی کہ میں اس سے ملنے یہاں روزانہ آتی ہوں؟“ وہ تعجب سے بولی۔ ”کیا کسی نے بتایا؟“

”میں دو ایک دن سے اپنے کمرے کی کھڑکی سے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔“

”یہ سچ ہے کہ میں اس سے ملنے یہاں تفریحاً روز ہی آتی ہوں..... میں صرف آج یا دو دن سے نہیں آ رہی ہوں.....“ اس نے جواب دیا۔ ”بات یہ ہے کہ وہ روز بہت مصروف رہتا ہے اور کسی وجہ سے مجھے سارا دن اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا..... اس لئے مجھے اس کے انتظار میں دن کاٹنا پڑتا ہے..... اس لئے میں اپنی بوریت دور کرنے اور خوش و خرم رہنے کے لئے یہاں اکیلی تفریح کی غرض سے آجاتی ہوں۔ یہ ہوٹل اور تالاب اول درجے کا ہے۔ ایسا تالاب کسی اور ہوٹل میں نہیں ہے اور نہ ہی نچ لوگ یہاں آتے ہیں۔“ ٹائیگر کو اس کا جواب سن کر بڑی حیرت ہوئی اور اس پر رحم بھی آیا کہ یہ رنگین تتلی کی طرح اڑتی رہتی ہے۔ وقت گزاری کے لئے اس کا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ پھر اس نے انجان بن کر کہا۔

”آپ شادی شدہ ہیں..... آپ سولہ برس کی عمر کی لگ رہی ہیں۔“

”دراصل میں اپنے جسم کا بڑا خیال رکھتی ہوں..... ورزش اور غذا سے جسمانی تناسب کا بھی بہت بڑا خیال رکھتی ہوں..... اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ جس نے نظارہ اور ہیجان خیز بنا دیا۔ پھر وہ افسردگی سے بولی۔ ”میں اس شادی کو جبر و زیادتی کا نام دیتی ہوں جو مرضی کے خلاف کی جائے..... مسٹر ٹائیگر.....! حقیقت میں اس شادی سے خوش نہیں ہیں۔“

”ٹائیگر.....؟“ وہ دل میں بڑے زور سے چونکا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کہ اس رنگین تتلی کو اس کا نام کیسے معلوم ہوا..... جب کہ تعارف نہیں ہوا.....؟ یہ اسے کیسے جانتی ہے..... جب کہ آج ہی ان دونوں کا سامنا ہوا ہے..... یہ اور بات ہے کہ وہ اسے کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہے..... اس قاتلۂ عالم نے اسے آج پہلی بار دیکھا ہے..... اگر اس نے اس لڑکی کو دس برس پہلے دیکھا ہوتا بھی تو نہیں بھول سکتا تھا..... آخر ٹائیگر نے اس پر اپنی حیرت کا اظہار کر ہی دیا۔

”کیا آپ مجھے یہ بتانے کی زحمت کریں گی کہ آپ مجھے کیسے جانتی ہیں.....؟ کیوں کہ آپ سے ایک بار بھی مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔“ اس کے رس بھرے ہونٹوں پر دل کش مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے ٹائیگر کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔

”میں نے آپ کے بارے میں جیسا سنا تھا..... آپ کو ویسا ہی پایا..... واقعی آپ بے حد دلچسپ اور زندہ دل شخص ہیں..... لیکن آپ اپنے چہرے مہرے سے رشید کی گائے دکھائی دیتے ہیں.....“ پھر توقف کر کے اپنا چہرہ ٹائیگر کے چہرے کے قریب لائی اور اس کی مہکتی سانسیں ٹائیگر کے چہرے کو معطر کرنے لگیں۔ پھر اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا آپ کو خوش فہمی ہو رہی ہے، میں آپ کے مضبوط جسم..... اور چوڑے چکلے سینے پر مرمٹی ہوں جو کشاں کشاں چلی آئی ہوں؟“

”شریمتی جی.....! یہ آپ کا اندازہ اور خیال ہے۔ میں ایک حقیقت پسند شخص ہوں۔“ ٹائیگر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں اس لئے بھی

خواب نہیں دیکھتا ہوں یہ کسی ہرجائی حسینہ کی طرح ہوتے ہیں۔“

”لیکن میں اس بات کا ضرور اقرار کروں گی کہ آپ کے جسم کی خوب صورتی نے مجھے متاثر کیا ہے..... مگر میں آپ کی وجاہت کی تعریف کرنے نہیں آئی بلکہ میں اپنی غرض سے آئی ہوں۔ میں آپ سے ایک سودا طے کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے یہ آخری جملہ سرگوشی میں بڑے پراسرار انداز سے کہا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی سی چھا گئی۔

”سودا.....؟ آپ مجھ سے کیا سودا کرنا چاہتی ہیں.....؟ میں سوداگر نہیں ہوں..... سراغ رساں ہوں..... مہم جو ہوں۔“ ٹائیگر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”آپ میرے بارے میں کھل کر بتائیں آپ مجھے کیسے جانتی ہیں.....؟ آپ کو کس نے بتایا؟“ جب تک آپ یہ نہیں بتائیں گی اس وقت تک بات آگے نہیں بڑھے گی۔“

”میں جانتی ہوں کہ آپ کیا چیز ہیں.....؟ مجھے ہر قیمت پر آپ کی خدمات درکار ہیں..... کل شام مجھے آپ کے متعلق معلوم ہوا۔ مجھے ہر قیمت پر آپ کی خدمات درکار ہیں۔ میں یہ جملہ دوبارہ اس لئے دہرا رہی ہوں کہ آپ کو اندازہ ہو کہ میں آپ کی خدمات کے لئے کتنی بے چین ہوں..... اس لئے کہ آپ کے عظیم کارناموں کے بارے میں سنا ہے..... اور پھر اخبارات میں آپ کی تصویر بھی دیکھی۔ گزشتہ مرتبہ جب آپ آئے تھے تو آپ نے ایک کارنامہ انجام دے کر پولیس کو ایک مشکل سے نکالا تھا جس کی پورے ملک میں دھوم مچ گئی تھی۔ اس وقت بھی آپ کی تصویر اخبارات میں دیکھی لیکن دل پر نقش نہ تھی..... کل آپ کی تصویر دل پر نقش ہوئی کہ..... کل شام میں آپ کو ایک ریسٹورنٹ میں دیکھا۔ اس وقت میرا پتی بھی موجود تھا۔ وہ آپ کو دیکھتے ہی بڑے زور سے چونکا اور ایسا اچھلا جیسے اسے برقی جھٹکا لگا ہو۔ اس کا چہرہ متغیر ہو گیا اور اس کے ہاتھ سے کافی کی پیالی چھوٹ کر گرتے گرتے بچی تھی..... میں اس کی اس کیفیت پر دل میں بری حیران ہوئی۔ کیوں کہ وہ شخص دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا ہے۔ اس نے خود ہی آپ کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہ شخص شیر بنگال ہے اور اسے ساری دنیا بلیک ٹائیگر کہتی ہے۔ جس کے کارناموں نے نہ صرف بنگلہ دیش بلکہ ہندوستان میں بھی اس کے نام کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ اس نے کچھ کارنامے انجام دے کر تہلکہ مچا رکھا ہے۔ اسے غیر مافیاؤں نے انٹرنیشنل بلیک ٹائیگر کا خطاب دیا ہوا ہے..... حرام زادہ جتنا ذہین اور اتنا ہی بہادر بھی..... خطرات میں آنکھیں بند کر کے کود جاتا ہے..... مگر یہ مردود یہاں کیا کر رہا ہے؟..... اس کے یہی الفاظ تھے۔ اس کی تسویش میری سمجھ سے بالاتر تھی۔“

”جرائم پیشہ افراد کے میرے بارے میں اس قسم کے ریمارکس ہوتے ہیں.....“ ٹائیگر نے بے پروائی سے کہا۔ ”میری حد سے زیادہ تعریف ہوگئی..... آپ کے پتی نے مجھے ہوا بنا دیا..... اچھا اب آپ یہ بتائیں کہ آپ میری خدمات کیوں اور کس لئے حاصل کرنا چاہتی ہیں..... بائی دے وے..... مجھے آپ کے کسی کام آ کر دلی مسرت ہوگی۔“

”میں اپنے خبیث، ذلیل اور ظالم شوہر سے سدا کے لئے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔“ اس کے حسین چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔

”اس کام کے لئے میری خدمات کی کیا ضرورت ہے..... آپ کسی دن موقع پا کر اندرون ہندوستان کے کسی بڑے شہر یا بنگال، آسام چلی جائیں۔“ ٹائیگر نے مشورہ دیا۔ ”وہ آپ کو تلاش کرنے سے رہا۔“

”مجھ میں اتنی ہمت اور جرأت نہیں ہے۔“ وہ بولی۔ ”اس لئے کہ اگر میں بدقسمتی سے دھر لی گئی تو وہ مجھے موت کے گھاٹ اتار دے گا۔“

”اس مسئلے پر بعد میں سوچا جا سکتا ہے۔“ ٹائیگر نے موضوع بدلا۔ ”آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا؟ کیا

نام ہے آپ کا.....؟ کس نام سے پکاروں..... کہیں آپ بے نام تو نہیں ہیں..... صرف پتی کہلاتی ہیں؟"

وہ ایک دم سے کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ پھر شوخ اور مترنم لہجے میں بولی۔ "نام تو ہوتا ہے..... کوئی کیا بے نام بھی ہوتا ہے..... جانوروں کے نام ہوتے ہیں..... میرا نام سروجا ہے۔"

"سنیں مسز سروجا.....! میں یہاں چھٹیاں گزارنے آیا ہوں۔ میں کسی ایسی عورت کا کیس لینے کو تیار نہیں ہوں جو پتی سے ناراض ہو۔"

"آپ اسے ناراضگی کا نام نہ دیں..... میں اس کمینے سے سخت نفرت کرتی ہوں..... میں اس سے کسی قدر بے زار اور نالاں ہوں آپ سوچ بھی نہیں سکتے..... کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اسے سوتے میں قتل کردوں..... ایسا کرسکتی ہوں لیکن اس کے آدمی میری تکا بوٹی کردیں گے۔"

"اس قدر نفرت اور حقارت کی وجہ یہ تو نہیں کہ وہ آپ کو گھناؤنے مقاصد کا آلہ کار بنا رہا ہے؟"

"وہ کمینہ..... بے غیرت..... حرام کی اولاد معلوم ہوتا ہے..... آپ نے اس جیسا بے غیرت شوہر دیکھا نہیں ہوگا..... وہ یہ چاہتا ہے کہ میں اس کے خبیث دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر ان کی بے ہودہ گفتگو سنوں اور ان کی ذلیل نظروں کو سہتی رہوں..... اور بعض اوقات ہندوستانی فلموں کے بولڈ قسم کے رقص کروں..... ایسے ملبوسات میں کہ جو مجھے عریاں کردیں..... میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ یہ میرے لئے کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے..... اس لئے میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے قریب رہ کر باڈی گارڈ کے فرائض انجام دیں۔ مجھے ہر لمحہ ایسا لگتا ہے کہ کسی دن وہ اجتماعی طور پر بے عزت نہ کردیں..... اگر ایسا کبھی ہوا تو میرا ذلیل شوہر کہہ دے گا کہ کوئی بات نہیں..... کیوں کہ وہ اپنے آدمیوں کو دل و جان سے چاہتا ہے۔ پھر میں کسی دن موضع بنگال کی طرف نکل جاؤں۔ وہاں غیر معروف آبادیاں بہت ساری ہیں۔"

"آپ وہم کا شکار ہوگئی ہیں....." ٹائیگر نے اسے دلاسا دیا۔ "آپ کو میرے تحفظ کی ضرورت نہیں..... اور پھر میں کسی قسم کا کوئی کیس لینے کو ہرگز تیار نہیں ہوں۔ اس لئے کہ میری ساری تفریح اور چھٹیاں اس کی نذر ہو کر خاک میں مل جائیں گی..... اگر آپ میری جگہ ہوتیں تو کیا اپنی تفریح کو یوں غارت کرتیں.....؟" ٹائیگر اس لئے خود غرض بن گیا تھا کہ وہ کسی اور مہم پر آیا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ متاثر ہو جائے۔

سروجا کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کا حسین چہرہ ایک دم سے فق ہوگیا۔ سروجا کی کیفیت ٹائیگر کی پشت پر ہوئی تھی۔ اس نے اس سمت دیکھتے ہوئے کہا تو اس کے لہجے میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

"ہیلو..... جگ دیپ.....! آج تم نے بہت دیر کردی۔ خیریت تو ہے؟"

ٹائیگر نے گردن گھما کر دیکھا۔ ایک خوب صورت، وجیہہ اور تنومند نوجوان مرد کھڑا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت، نفرت اور غصے کے تاثرات تھے۔ سروجا فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی تو ٹائیگر بھی کھڑا ہوگیا۔ سروجا نے تعارفی رسم ادا کی۔

"جگ دیپ..... ان سے ملو..... آپ ہیں بلیک ٹائیگر۔"

"ہیلو مسٹر جگ دیپ.....!" ٹائیگر نے دوستانہ انداز سے اس کی طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ٹائیگر جانتا تھا کہ وہ اس سے ہرگز ہاتھ نہیں ملائے گا کیوں کہ اس کی بیوی بے حجابی کی حالت میں بیٹھی اس سے باتیں کررہی تھی..... جگ دیپ کو اس لمحہ ایسا محسوس ہورہا ہوگا کہ تالاب کے کنارے نہیں بلکہ بستر پر ٹائیگر کے ساتھ ہو۔ اس لئے اس نے ٹائیگر کو نظر انداز کردیا۔

"اچھا تو تم وہی بنگالی احمق سراغ رساں ہو جو ڈھاکا میں رہتا ہے اور وہاں مکھیاں مارتا ہے۔" جگ دیپ نے اس کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔

"میں صرف ٹائیگر ہوں..... میں نے سراغ رساں کا استعمال نہیں کیا ہے۔" ٹائیگر نے یک لخت

سخت لہجے میں کہا۔ کیوں کہ جگ دیپ کا رویہ توہین آمیز تھا۔ ایک لمحے کے لئے ان کے درمیان خاموشی چھا گئی۔

جگ دیپ کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ وہ اپنی بتیسی کی استہزائی انداز سے نمائش کرنے لگا۔ ٹائیگر نے اپنا غصہ ضبط کیا۔ ورنہ وہ اس کی بتیسی نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا اور کہتا کہ لو اپنی امانت سنبھالو۔ وہ معاملہ بڑھانا اور یہاں کا ماحول خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ چوں کہ یہاں شرفا اور ان کی عورتیں تھیں۔

دوسرے لمحے جگ دیپ نے اپنا ہاتھ ٹائیگر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میری جان.....! یہ ممبئی ہے ہندوستان ہے..... یہ بنگلہ دیش نہیں ہے..... دال بھات اور ماس نہیں کھاتے ہیں..... بنگال کا شیر یہاں کی بلی سے بھی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ آؤ میرے شیر..... مجھے تم جیسے لوگوں کی تلاش رہتی ہے..... تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

ٹائیگر نے اس سے ہاتھ ملایا تو وہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے لگا۔ اس نے اپنے ہاتھ کی گرفت ٹائیگر کے ہاتھ پر مضبوط کرنے لگا تو انگلیاں چٹخنے لگیں اور ٹائیگر کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کا درد کی شدت سے برا حال ہوجاتا۔ ٹائیگر چوں کہ دنگا فساد کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس لئے اس نے کہا۔

"ہاں بھئی..... آپ بہت طاقت ور ہیں..... سالا بنگالی شیر تو گیدڑ ہے..... وہ بلی سے بھی ڈرتا ہے..... میں مانتا ہوں کہ تم ہندوستان کے شیر ہو..... میرا ہاتھ چھوڑ دو..... ورنہ ٹوٹ جائے گا۔"

ٹائیگر کی بات سن کر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر ہنسنے لگا۔ اس نے ٹائیگر کا ہاتھ چھوڑنے کے بجائے اس کی انگلیاں اور زور سے دبانے لگا..... ٹائیگر کے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ وہ بھی میدان میں اتر آئے۔ جگ دیپ نے اس کی جی بھر کے تضحیک کرلی تھی۔ ٹائیگر اب مجبور تھا کہ جگ دیپ کو ایسا سبق دے کہ وہ بھول نہ سکے..... ٹائیگر نے برق رفتار سے اس کے بغل میں اپنا سر دے کر اسے چاروں شانے چت کردیا۔ پھر اس کے ہاتھ کی کلائی پکڑ کر بل دینا شروع کردیا۔ پھر اسے کھڑا کیا تو وہ کراہ رہا تھا..... پھر ٹائیگر نے اس کی کمر پر ایک لات رسید کی تو وہ لڑکھڑاتا تیراکی کے تالاب میں جا گرا۔

تالاب پر جو لوگ موجود تھے ان لوگوں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی..... کیوں کہ وہ لوگ اپنی تفریح اور باتوں میں مشغول تھے۔ ورنہ جگ دیپ ایک تماشا بن جاتا۔ وہ ایک غوطہ کھانے کے بعد ابھر آیا تھا..... وہ ایک ہاتھ سے تیرنے کا کام لے رہا تھا..... ٹائیگر نے اس کا دوسرا ہاتھ موڑ کر اسے اس قابل رہنے نہیں دیا تھا اس سے تیرنے کا کام لے سکے۔ اس کا ہاتھ ٹھیک ہونے اور اس کام کے قابل ہونے میں کچھ دیر لگ سکتی تھی۔

جگ دیپ پانی میں سے منہ نکال کر ٹائیگر کی شان میں قصیدہ پڑھنے لگا۔ ٹائیگر سے برداشت نہ ہوسکا تو دوسرے کنارے پر جا کر ڈانٹا۔ "اگر تم نے اپنی چونچ بند نہیں کی تو میں تالاب میں اتر کر تمہارے چہرے کا جغرافیہ بدل دوں گا۔"

جگ دیپ نے ٹائیگر کی دھمکی کا کوئی اثر نہیں لیا۔ پھر ٹائیگر وہاں سے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ جگ دیپ کو تماشا بنانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے کہ یہ تفریحی جگہ تھی۔ ایک اعلیٰ ترین قسم کا ہوٹل تھا۔ اگر درمیانہ درجے کا کوئی ہوٹل ہوتا جگ دیپ کا حشر نشر ایسا کرتا کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔ جگ دیپ جیسے بدمعاش سے نمٹنا اس کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔

چند لمحوں کے بعد وہ تالاب سے نکل کر بائیں ہاتھ سے دائیں بازو کو سہلانے لگا۔ پھر وہ اپنے بازوؤں اور جیب میں کوئی چیز تلاش کرنے لگا۔ شاید وہ پستول تلاش کررہا تھا جو اس کے پاس نہیں تھا۔ پھر وہ ٹائیگر کو خون خوار نظروں سے گھورتا ایک سمت چل دیا..... بڑبڑاتا ہوا بھی جارہا تھا۔ اب اسے اندازہ ہوچکا تھا کہ

ٹائیگر سے ہاتھا پائی کرنا آسان نہیں ہے۔

جب وہ کچھ فاصلے پر جا کر رکا تو اسے اس کے ساتھیوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ جو اپنی وضع قطع اور چہرے مہروں سے ایک نمبری غنڈے لگ رہے تھے۔ وہ کسر پھسر اور اس کی طرف اشارہ کرنے لگے۔

یہ ''میرا پتی اور اس کے کمینے دوست ہیں جن کے ساتھ مجھے اٹھنا بیٹھنا پڑتا ہے۔'' سروجا افسردگی سے بولی۔ ''کاش.....! میری قسمت خراب نہ ہوتی اور میں پیدا ہی نہ ہوئی ہوتی۔''

''اب جو قسمت میں لکھا گیا ہے وہ تو خیر پورا ہو کر ہی رہے گا۔'' ٹائیگر بولا۔ ''ہر وہ شخص جو حالات کی بھینٹ چڑھتا ہے وہ یہی کہتا ہے..... دل چھوٹا نہ کرو..... تمہارے دن کبھی نہ کبھی پھر جائیں گے۔ تمہارے شوہر کا پورا نام کیا ہے؟'' ٹائیگر نے اسے ہمدردانہ نظروں سے دیکھا۔ ''مایوس اور ناامید نہ ہو۔''

''یہ وہی کمینہ جگدیپ کمار ہے کیا جسے عرف عام میں مرگ ناگہاں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔'' ٹائیگر نے اسے خاموش پا کر چونکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں..... یہ وہی کمینہ ہے..... کیا آپ اسے جانتے ہیں؟'' سروجا نے گہری سانس لی۔ حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ ''اس خبیث کے بارے میں کون نہیں جانتا ہے.....''

''میں نے صرف اس کا نام سنا تھا۔ آج اس سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوگیا..... بے حد خطرناک شخص ہے..... درندہ صفت..... اس شہر کے بڑے سے بڑے بدمعاش اس کا نام سن کر کانپتے ہیں..... اب مجھے آپ کا باڈی گارڈ بننے سے پہلے اپنے لئے فوری طور پر ایک باڈی گارڈ کا انتظام کرنا ہوگا۔''

ٹائیگر نے اس کے بارے میں جو کچھ سنا تھا..... جانتا تھا..... وہ یہ تھا کہ نوجوانی سے ہی اس کا شمار خون آشامی سے درندہ صفت شرمندہ کردینے والوں میں ہوتا تھا۔ وہ لہو آشنا تھا..... اس نے اپنی زندگی، سفاکی اور ایذا رسانی سے کتنی جانیں لیں۔ شاید ان کی تعداد اس سے بھی یاد نہیں..... اس کے علاوہ جرائم کی دنیا میں اس کے مقابلے کا کوئی نشانہ باز نہیں تھا..... ایک طرف بے حد سرد سفاک مزاج تھا..... دوسری طرف اس میں عقل کی کمی بھی تھی۔ اس کے اندر انسانی ہمدردی کی رمق بھی نہیں تھی۔ شاید اس نے کبھی بھولے سے بھی اپنے ماں باپ سے بھی محبت اور ہمدردکا برتاؤ نہیں کیا ہوگا۔ انہیں ماں باپ بھی نہیں سمجھا ہوگا۔

اس قدر خطرناک شخص سے ٹائیگر کا انجانے میں واسطہ پڑ گیا تھا..... ٹائیگر جیسے شخص کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی اور حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ وہ اس بدمعاش سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں کہ وہ تو کسی اور مہم پر آیا تھا اس نے سروجا سے کہا۔

''اچھا..... اب آپ مجھے اجازت دیں..... سخت پیاس لگ رہی ہے۔''

''مسٹر ٹائیگر.....! سروجا نے شوہر کی پروا نہ کرتے ہوئے بڑی لجاجت سے کہا۔ ''کیا اب آپ میری مدد نہیں کریں گے؟'' سروجا نے اسے عجیب الجھن اور تذبذب میں ڈال دیا تھا..... حسین عورت اس کی بہت بڑی کمزوری تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں نازک اندام حسیناؤں کی خاطر بڑے بڑے سنگینی خطرات مول لئے تھے..... اور سروجا جیسی حسینہ کی درخواست وہ کیسے رد کرے اس کی سمجھ میں نہ آیا جو لاکھوں میں ایک تھی۔

اس کے موکل کو نہ صرف سارا امریکہ بلکہ یورپ بھی جانتا تھا جس نے یہ مہم اس کے سپرد کی تھی۔ اس کا نام جوجو فرض کرلیا جائے۔ وہ متحدہ امریکہ کی لیبر پارٹی میں سے ایک تھا۔

ٹائیگر سروجا کو ہرگز ہرگز کسی بھی قیمت پر یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ اس کے پاس ایک بہت ہی اہم کیس ہے..... اس نے یہ تاثر دیا ہوا تھا کہ وہ جواہرات کی چوری کے ایک کیس کے سلسلے میں ممبئی آیا ہے.....

ٹائیگر دوسری طرف سروجا کو ناامید کرنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی اس کا دل توڑنا چاہتا تھا۔ جو شیشے کی طرح تھا۔ اس نے کہا۔

''سروجا.....! میں پوری کوشش کروں گا کہ اس بھیڑیے سے تمہیں نجات دلادوں۔ چاہے مجھے اپنی جان کیوں نہ دینا پڑے۔''

یہ فریب تھا اور نہ ہی جھوٹ اور نہ ہی اس کے حصول کا مقصد..... ریاکاری اور منافقت بھی نہ تھی۔ یہ سنتے ہی اس کا پژمردہ چہرہ ایک دم کھل اٹھا..... اگر اس کا شوہر یہاں موجود نہ ہوتا تو وہ وفور جذبات اس کے گلے میں اپنی عریاں مرمریں بانہیں حمائل کردیتی اور اس پر بڑی فیاضی سے مہربان ہوجاتی۔ وہ اپنی آزادی کی بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار تھی۔

''لیکن میں تم پر ایک بات واضح کردوں تاکہ تم مجھ پر بھروسا کر کے بیٹھ جاؤ..... میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں سائے کی طرح تمہارے ساتھ رہوں.....'' ٹائیگر نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔

''میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ جیسے ہی موقع ملے مجھے یہاں سے نکال دو۔ تمہاری جو بھی جتنی بھی فیس ہے کولکتہ سے بھیج دوں گی۔''

''میں حسیناؤں سے معاوضہ نقد نہیں بلکہ کسی اور شکل میں لیتا ہوں۔'' ٹائیگر نے اس پر ایک نگاہ ناقدانہ ڈالی۔

سروجا کا چہرہ سرخ ہوگیا جس نے اسے اور حسین بنادیا۔ اس کی آنکھوں سے خودسپردگی جھانکنے لگی۔ ٹائیگر نے فوراً ہی محسوس کرلیا کہ وہ اس کی بات کا غلط مطلب لے رہی ہے۔ پھر اس نے سروجا کی غلط فہمی دور کی۔

''تم میری اس بات اور نظروں کا کوئی غلط مطلب نہ لینا..... اس کی ادائیگی کی کئی صورتیں موجود ہیں..... اب تم ایسا کرو کہ اپنے خوب صورت ہاتھوں سے میرے سینے پر دو ہتڑ مارو..... اور مجھے تالاب میں زور سے دھکا دے دو۔''

''وہ کس لئے.....؟'' اس کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ ''میں ایسی بدتمیزی اور بے ہودہ حرکت نہیں کرسکتی۔''

ٹائیگر اس کی وجہ سروپا کو بنانا چاہتا تھا۔ معاً اس کی نگاہ جگدیپ اور اس کے ساتھیوں کی جانب اٹھ گئی۔ ان میں بہت سارے پیشہ ور بدمعاش اور قاتل بھی تھے۔ وہ ان میں سے کچھ بدمعاشوں کو جانتا بھی تھا..... ان میں ٹائیگر کو ایک ایسا شخص دکھائی دیا جس نے ٹائیگر کی رگوں میں اس کا لہو منجمد کردیا۔ یہ دیوہیکل بروجن داس تھا۔ جب کبھی بھی وہ ممبئی آتا تھا اس سے مڈبھیڑ ضرور ہوتی تھی اس نے ٹائیگر کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ ٹائیگر کے ہاتھ ہلانے پر وہ اس کی طرف تیزی سے بڑھا۔

''تم نے مجھے بتایا نہیں کہ..... میں تمہیں تالاب میں دھکا کس لئے دوں؟'' سروجا نے دریافت کیا۔

میرا ایک دیرینہ دوست مجھ سے ملنے آرہا ہے۔ پہلے اس سے بات کرلوں۔ پھر تمہیں بتاتا ہوں۔'' ٹائیگر نے جواب دیا۔

بروجن داس کا قد چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ ویسے وہ اتنا لمبا دکھائی دیتا تھا جتنا تھا۔ اس کے اعضا بہت مضبوط اور پتھر کی طرح سخت تھے۔ وہ چل رہا تھا تو زمین ہل رہی تھی جیسے زلزلہ آگیا ہو..... ٹائیگر اسے زلزلہ کہتا تھا۔ وہ اس کے مقابل آکر رک گیا۔

''ایک عرصہ کے بعد تمہیں دیکھ کر اتنی خوشی ہورہی ہے کہ بیان سے باہر ہے ٹائیگر.....!'' اس نے اپنا فولادی پنجہ ٹائیگر کی طرف بڑھایا۔ ''ہاں دیکھو دوست میرے ساتھ جگدیپ والی حرکت نہ کرنا..... کیوں کہ مجھے اپنے بازو کی ابھی ضرورت ہے۔'' اس نے توقف کر کے ایک زوردار قہقہہ فضا میں بلند کیا۔ ''اس گدھے کو علم ہوتا کہ تم جوڈو کراٹے میں جو مہارت رکھتے ہو وہ بہت کم لوگ رکھتے ہیں تو تم سے الجھتا نہیں..... وہ صرف کمزور سے بھڑتا ہے۔'' پھر اس نے سروجا کی طرف دیکھ کر ہیلو کہا۔

سروجا نے بھی اسے رسمی انداز سے ہیلو کہا۔

ٹائیگر نے بروجن داس سے کہا۔

''وہ خودبی بلاوجہ مجھ سے الجھا تھا..... مجھے بھی اس سے الجھنا پڑا جس کا مجھے افسوس ہے۔''

بروجن داس نے پھر قہقہے کا ایک بم فضا میں چھوڑ دیا۔ ”اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارا ممبئی آنا کیسے ہوا.....؟ خیریت تو ہے؟“

”خیریت ہی ہے..... میں یہاں تفریح اور تم جیسے دیرینہ اور مخلص دوستوں سے ملنے چلے آیا۔ کیوں کہ اس شہر اور تم لوگوں کی یاد بہت ستا رہی تھی۔ میں وہاں رہتے ہوئے بڑا بور ہو رہا تھا۔ دل کیا تو چلا آیا۔“ ٹائیگر نے جواب دیا۔

”جگدیپ کا کہنا بھی یہی ہے کہ وہ بھی یہاں تفریح کے لئے آیا ہوا ہے۔ شاید تمہارے علم میں ہے کہ اس کا ذریعہ معاش کیا ہے۔“

”نہیں..... شاید وہ جرائم سے اپنی گزر بسر کرتا ہے۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”میں نے اس کے متعلق یہ بھی سنا ہے کہ وہ معصوم لوگوں کا خون پانی کی طرح بہاتا ہے۔ لہو فروش ہے۔ لیکن بروجن داس.....! تم یہاں کیسے.....؟ کیا کسی مشن پر آئے ہو؟“

بروجن داس سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے قریب ہو کر سرگوشی میں آہستگی سے کہا۔ ”ٹائیگر.....! یہاں پر یہ سوال کسی سے نہیں کرنا کہ وہ ممبئی کیوں اور کس لئے آیا ہے..... یہاں سبھی تفریح کرنے آتے ہیں..... کسی کی آمد کے بارے میں سوچنے اور فکر کرنے سے صحت متاثر ہو سکتی ہے..... صحت بڑی نعمت ہوتی ہے۔“

”مجھے تمہاری بات سے اتفاق ہے بروجن!“ ٹائیگر نے اس کا شانہ تھپ تھپایا۔ ”تمہارے مخلصانہ مشورے کا شکریہ۔“

”اچھا دوست! اب اجازت دو۔“ بروجن داس نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ ”تمہیں دیکھا تو تم سے ملنے چلا آیا۔ میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں۔ تم کسی بات کی فکر نہ کرنا۔ کوئی کام ہو تو میں حاضر ہوں۔“

وہ مخالف سمت بڑھ گیا تو ٹائیگر نے سروجا کو دلاسا دیا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ میں ہر قیمت پر تمہاری مدد کروں گا۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ اس نے تمہیں کیسے پھانس لیا.....؟ جب تم ذہین اور ہوشیار معلوم ہوتی ہو۔“

سروجا نے اپنی کہانی مختصر طور پر جو سنائی..... وہ یہ تھی کہ وہ پونا کے کافی ہاؤس میں ویٹر تھی۔ اس کے حسن و شباب اور سراپا کی دلکشی سے متاثر ہو کر مرد اور منچلے اپنی آنکھیں سینکنے آتے تھے اور مالک نے اسے جو لباس دیا تھا کہ جس سے اس کی بے حجابی اور نمایاں ہو جاتی تھی۔ گاہک مرد کسی نہ کسی بہانے سے اس کے ہاتھ، بدن، کمر اور شانے کو غیر محسوس انداز سے چھو لیتے تھے۔ مالک کا حکم تھا کہ ناراض ہونے کے بجائے وہ دلکش مسکراہٹ اور میٹھی نظروں سے پیش آئے، چوں کہ ان دنوں اس کے مالی حالت اچھے نہیں تھے۔ باپ کی موت کے بعد اسے مکان ملا جو اس نے فروخت کر کے رقم ایک بینک میں فکس ڈپازٹ کر دی۔ وہ اپنے ایک دور کے چچا کے ہاں رہنے لگی۔ چچا..... چچی کی غیر موجودگی میں اسے میلی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ چوں کہ وہ اپنی بیوی سے بہت ڈرتا تھا۔ اس لئے اس نے کوئی غلط حرکت نہیں کی تھی کہ کہیں وہ شکایت نہ کر دے۔ چچی نے اس سے کئی بار کہا کہ تین لاکھ کی رقم جو بینک میں فکس ڈپازٹ ہے اسے دے دے تاکہ اس کی کسی اچھے گھرانے میں شادی کر دے۔ ان ہی دنوں جگدیپ نے اس کے حسن سے متاثر ہو کر اسے پھانسا تھا۔ وہ ان دنوں کسی کام سے پونا آیا ہوا تھا۔ اپنے آپ کو بزنس مین ثابت کیا اور سبز باغ دکھا کر شادی کر لی۔ اس کی حقیقت اس کی اصلیت اس وقت آشکارا ہوئی۔ جب دہلی سے ممبئی آئی۔ جب اس نے جگدیپ کو لعن طعن کیا کہ ایک شریف لڑکی کو کیوں پھانسا جرائم پیشہ ہوتے ہوئے، اسے طلاق دے دے۔ کیوں کہ اب ایک دن اس کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتی..... یہ سن کر جگدیپ نے اس کی ایسی زبردست ٹھکائی کی کہ وہ دو دن تک بستر سے اٹھ نہ سکی..... پھر اسے دھمکی دی گئی کہ فرار ہونے کی صورت میں اسے بے رحمی، سفاکی اور بربریت سے قتل کر دیا جائے گا۔ اس روز سے اس کی کڑی نگرانی کی جا رہی ہے کہ کہیں وہ فرار نہ ہو جائے۔

سروجا نے اس کی سرگرمیوں کے بارے میں مختصر طور پر جو بتایا تھا وہ ٹائیگر کے لئے مفید ہو سکتا تھا۔

ٹائیگر جس مجرم کے تعاقب میں یہاں آیا تھا اسے کسی نے پرتشدد انداز سے قتل کر دیا تھا۔ اس کی لاش دو دن قبل پر برآمد کی گئی تھی..... اس کے سر میں گولی ماری گئی تھی..... وہ نہ صرف اسمگلر تھا بلکہ بلیک میلر بھی تھا اور وہ اپنے حلقے میں سری ناتھ کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی اچانک اور غیر متوقع موت نے ٹائیگر کی مہم کو مشکل بنا دیا تھا۔

”سروجا.....!“ ٹائیگر نے اس سے کہا۔ ”جگدیپ تمہیں مجھ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر مشتعل ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ میں نے اس کی بے عزتی کی ہے۔ اس کی اس طرح ممکن ہے کہ میرے منہ پر ایک طمانچہ رسید کر کے تالاب میں زور سے دھکا دے دو۔“

”ٹھیک ہے..... میں تمہاری ہدایت پر عمل کروں گی۔ میں اپنی مرضی سے نہیں بلکہ تمہارے حکم پر عمل کروں گی۔“ اب ان دونوں کے درمیان آپ کے مخاطب کی دیوار گر گئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو تم سے مخاطب کرنے لگے۔

وہ کھڑی ہوئی تو اس کا گل بدن شاخ کی طرح لچک گیا، حسن کی کرشمہ سازیاں مچھلیوں کی طرح کوندنے لگیں۔ ٹائیگر نے غیر محسوس انداز سے جگدیپ کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا۔ جگدیپ اور اس کے ساتھی ان کی طرف متوجہ تھے۔

”دیکھو نیک کام میں یعنی شبھ کام میں دیر نہ کرو۔ ورنہ اسے شک ہو جائے گا۔ مجھے ایک تھپڑ رسید کر کے تالاب کی نذر کر دو۔“

”او کے سر!..... لیکن نہ جانے کیوں میرا دل تم پر ہاتھ اٹھانے کو نہیں چاہ رہا ہے..... ایسا تو غصے کی حالت میں ممکن ہے..... کوئی اور تدبیر سوچو..... سانپ بھی مر جائے.....“ سروجا نے کہا۔

اور پھر اچانک سروجا نے ٹائیگر کے گال پر زناٹے کا تھپڑ رسید کر دیا جس کی بازگشت پٹاخے کی طرح دور تک سنائی دی۔ اس کی پشت تالاب کی طرف تھی۔ ٹائیگر تالاب میں جا گرا۔ تالاب میں گرنے کے بعد ٹائیگر فوراً ہی تیزی سے تیرتا ہوا دوسری سمت بڑھ گیا۔

اس وقت فضا جگدیپ کے بدمعاشوں کے بے ہنگم قہقہوں سے گونجنے لگی۔ سروجا بھی ہنسی سے دوہری ہو رہی تھی کہ جگدیپ کے بازوؤں کے حلقے میں اس کی نازک عریاں اور تھرکتی کمر قیامت بن گئی..... سروجا کے زوردار تھپڑ نے اس کی حرکت کا کوئی اثر نہیں لیا تھا۔ اس نے ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے اچھی طرح دیکھ لیا اور اطمینان کر لیا تھا کہ اس کے تعاقب میں کوئی تو نہیں ہے..... اس نے سروجا کے ساتھ جو حرکت کی تھی شاید جگدیپ کو ٹیس آ گیا ہو۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ سروجا نے یہ کہہ کر جگدیپ اور اس کے ساتھیوں کو مطمئن کیا کہ اس نے ٹائیگر کے منہ پر جو تھپڑ مارا اس نے ٹائیگر کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا اس بات نے جگدیپ کا رواں رواں خوش کر دیا تھا۔

ممبئی کی بندرگاہ کی ایک طرف شیرٹن اوبرائے ہوٹل جتنا شان دار تھا اس سے کہیں خوب صورت ہوٹل تھا۔ جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم تھی۔ جب کبھی ٹائیگر اس شہر میں آتا تو اس ہوٹل کو ترجیح دیتا تھا۔ اس کے شاہانہ اخراجات کی فکر اس لئے نہیں ہوتی تھی کہ وہ کہیں نہ کہیں سے پورا کر لیتا تھا۔ اس کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ یہاں جب کبھی کسی کام سے آیا خالی ہاتھ نہ گیا تھا۔ اس کے فن کارانہ ہاتھوں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا کامیابی سے ہم کنار کیا..... اس ہوٹل میں ہر کوئی ٹھہر نہیں پاتا تھا..... شیرٹن اوبرائے پہاڑیوں کے بیچ ایک انتہائی پرفضا مقام پر واقع تھا۔ ہوٹل کی بڑی اور پرشکوہ عمارت کے علاوہ اس سے ملحقہ بہت ساری کوٹھیاں اور بنگلے تھے وہ فن تعمیر کا جدید اور اعلیٰ ترین نمونہ تھے..... ٹائیگر نے جو کمرا لیا وہ ایک سو تین نمبر تھا..... اس نے نہانے جاتے وقت کمرا مقفل نہیں کیا تھا۔ اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیوں کہ اس نے نقدی

ایسی جگہ رکھی تھی کہ کسی کی نظر میں نہیں آسکتی تھی۔ اس کمرے کی چابی بورڈ پر لٹک رہی تھی۔ وہ اسے لئے بغیر ہی کمرے میں آکر بستر پر دراز ہوگیا۔

ٹائیگر بڑی تیزی سے اپنے کیس کے بارے میں سوچنے لگا۔ ساری کڑیاں ایک ایک کرکے ذہن میں چلی آرہی تھیں۔ اس کے موکل نے اسے جس مہم پر بھیجا تھا اسے سر کرنے کی صورت میں ایک لاکھ ڈالر کی رقم ملنے والی تھی۔ جو ہندوستان اور بنگلہ دیش کرنسی میں بہت بڑی رقم بنتی تھی۔ اس کے علاوہ جو ہولتوں کی صورت میں جو رقم ملی تھی وہ الگ تھی۔

وہ سوچتے سوچتے گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔ سوچوں کی دنیا میں گم ہونے کے باعث وہ لباس تبدیل نہیں کرسکا۔ بیدار ہوا تو اس بات کا خیال آیا تھا۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا تو سات بج چکے تھے۔ گہری نیند دیر تک سونے کے باعث اس کی تھکن دور ہوچکی تھی۔ پھر اس نے بستر سے نکل کر کپڑے تبدیل کئے۔ اور پھر وہ بے مقصد ہی ہوٹل سے نکل آیا۔

ٹائیگر جس کمرے میں مقیم تھا اسے سری ناتھ نے بک کرایا ہوا تھا۔ لیکن اس کی موت کی خبر سننے کے بعد اس نے ڈیسک کلرک کو پانچ سو روپے رشوت دے کر اسے لے لیا تھا.....

ٹائیگر کو یہ بات لفافے میں جو کاغذ تھا اور اس پر جو ہدایات تھیں اس سے معلوم ہوئی تھی۔ سری ناتھ کے پاس ایسی اہم دستاویزات تھیں جن کی بدولت وہ ہر قسم کے مطالبات منوا سکتا تھا.....

ٹائیگر کی یہ شام بھی غارت گئی۔ رات گئے تک ایک ملاقاتی بھی سری ناتھ سے ملاقات کے لئے نہیں آیا۔ اس کی موت کی خبر ابھی کسی وجہ سے عام نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے اس کا خیال تھا کہ شاید کوئی کام سے سری ناتھ سے ملنے آئے گا۔ سری ناتھ جیسا بین الاقوامی بلیک میلر دور دراز کا سفر کرکے بے مقصد نہیں آسکتا تھا۔ وہ شب خوابی کا لباس پہن کر آرام دہ بستر پر دراز ہوا تھکن کے باعث جلد ہی سوگیا۔

صبح اس نے ڈیسک کلرک سے دریافت کیا کہ کیا کسی نے اس کے کے لئے رابطہ تو نہیں کیا.....؟ اس کا جواب نفی میں تھا۔ پھر اس نے لابی میں دو تین گھنٹے بڑی اذیت میں کاٹے۔ لیکن کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ البتہ اس نے کچھ پیشہ ور قسم کے بدمعاشوں کو دیکھا۔ ان میں رام سوامی بھی تھا۔ ٹائیگر جب پہلی بار ممبئی آیا تھا۔ اس نے رام سوامی کی سولہ برس کی بہن کو چار غنڈوں سے اپنی جان پر کھیل کر بچایا تھا جو مسلح تھے اور وہ نہتہ تھا..... چوں کہ وہ جوڈو کراٹے کا ماہر تھا۔ اس نے ان غنڈوں کی بہت درگت بنائی تھی۔ رام سوامی اس کا احسان مانتا تھا۔ لیکن ٹائیگر کہتا تھا کہ اس نے ایک فرض ادا کیا تھا..... شہر کے بڑے بڑے غنڈے بھونچکے رہ گئے تھے۔ کیوں کہ وہ چاروں غنڈے دادو کے علاقے کے چھٹے ہوئے تھے۔ وہ ٹائیگر کی بڑی قدر اور عزت کرتا تھا۔ کسی بھی افتاد پڑنے پر وہ اس کی ہر قیمت پر مدد کرسکتا تھا۔ وہ احسان فراموش نہ تھا۔ گزشتہ مرتبہ جب وہ آیا تھا تو رام سوامی اس سے بڑی محبت اور خلوص سے ملا تھا۔ رام سوامی کی نگاہ اس پر نہ پڑی اور وہ اس لئے رام سوامی سے ملنے نہیں گیا تھا۔ ابھی وہ اس سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ بے زار اور اکتا کر اپنے کمرے میں چلا آیا تھا کہ یک سوئی سے کچھ سوچ سکے۔ وہ بستر پر لیٹ کر خیالات کے گرداب میں چکرانے لگا۔ وہ گوناگوں سوچ میں غرق تھا کہ دروازہ بڑی آہستگی اور غیر محسوس انداز سے کھلا۔ دوسرے لمحے اس کی نظروں کے سامنے ہوٹل کا ایک ویٹر کھڑا تھا۔ وہ ایسا شخص تھا کہ کمزور دل کا آدمی اسے دیکھ لے تو اس کے جسم پر سنسنی دوڑ جائے۔ وہ لمبے چوڑے قد کا تھا۔ اس کے چوڑے چہرے پر بہت ساری خراشیں پڑی ہوئی تھیں جس نے اس کے چہرے کو اور بھیانک بنا دیا تھا۔ دیکھنے میں وہ گینڈے کی طرح لگ رہا تھا۔ اس کے چپٹے سر نے اسے اور بھی مضحکہ خیز بنا دیا تھا..... وہ جس پراسرار انداز سے کمرے میں داخل ہوا تھا وہ چونکا دینے اور خوف زدہ کرنے والی بات تھی۔ ٹائیگر دل میں حیران تھا کہ ہوٹل والوں نے ایسے شخص کو

دیئر رکھا ہے.....! تاہم وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ کوئی بڑا بدمعاش ہے جو ویٹر کی وردی پہن کر کسی خطرناک ارادے سے آیا ہے۔ اسے پچھتاوا سا ہوا کہ اس نے اپنا اسپیشل کولٹ ریوالور جیب میں کیوں نہیں رکھا۔ اس نے اوپر سے نیچے ٹائیگر کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم سری ناتھ ہو.....؟''

''کیا.....؟'' ٹائیگر نے انجان بن کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں تمہیں تیار ہونے کے لئے صرف پندرہ منٹ دے رہا ہوں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''لباس تبدیل کرلو۔''

''کیا مطلب.....؟'' ٹائیگر نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور تیز لہجے میں کہا۔

''اس نے ٹائیگر کی بات کا جواب دینا بھی گوارا نہیں کیا۔ کمرے میں جس طرح گھسا تھا اسی طرح واپس چلا گیا۔

ٹائیگر کو ابھی تک اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ اسے کس قسم کے حالات کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس لئے اس نے سوچا اسے اپنی حفاظت کے لئے ریوالور جیب میں رکھنا ضروری ہوگیا ہے۔ اس سے غافل رہنا نہیں چاہئے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے اپنے کمرے کے ملحقہ غسل خانے میں آہٹ سی سنائی دی۔ ٹائیگر کے جسم پر سنسنی دوڑ گئی..... کیا غسل خانہ میں کوئی مسلح بدمعاش چھپا ہوا ہے جو اسے قتل کرنے کے ارادے سے باہر آرہا ہے۔ اس نے ذہنی طور پر اس بدمعاش سے دو ہاتھ کرنے کے لئے تیار کرلیا۔ دروازہ آہستہ آہستہ پراسرار انداز سے کھل رہا تھا۔ پھر دروازے کے پیچھے سے کوئی مسلح بدمعاش کے بجائے جیسے کوئی چاند نمودار ہوا۔ وہ بھونچکا سا ہوگیا۔ اس نے سوچا کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ کیوں کہ اس کی آنکھوں میں نیند کا ہلکا سا خمار بھرا تھا۔ وہ بڑی سنسنی خیز تھی۔ اس کے جسم پر ایک ریشمی گون تھا جس پر کڑھائی کا کام کیا ہوا تھا۔ اوہ گون جس میں سے اس کا شاداب بدن جھانک رہا تھا۔ جام کی طرح چھلک رہا تھا۔

''ہیلو..... سری ناتھ!'' اس نے بصد ناز و ادا کمرے میں قدم رکھتے ہی شوخی سے کہا۔ ''تمہیں میرے آنے کی اطلاع تو مل گئی تھی نا؟'' ٹائیگر نے دانستہ تردید نہیں کی۔ ''چوں کہ سری ناتھ کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس لئے ہر شخص اسے سری ناتھ ہی سمجھ رہا تھا..... وہ خود بھی یہی چاہتا تھا۔

ٹائیگر نے اس کے داہنے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سیاہ بکس دیکھا جسے اس نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اس قسم کے بکس میں عورتیں اپنا لباس اور میک اپ کی لوازمات رکھتی ہیں۔ پھر اس نے بڑی بے تکلفی سے اس بکس کو بستر پر رکھ دیا۔ پھر اپنا گون اتار کر اس پر ڈال دیا۔

اب وہ شب خوابی کے رنگین لباس میں تھی۔ اس نے ٹائیگر کو دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے ریشمی آواز میں مخاطب کیا۔

''مجھے تورا لائی نے تمہارا ہر طرح سے دل بہلانے کے لئے بھیجا ہے..... میں کیا سیوا کرسکتی ہوں؟ کروں؟'' اس کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔

''تورالائی نے.....؟'' ٹائیگر نے چونک کر دل میں سوچا۔ پھر اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

''جی تورا لائی نے.....'' اس نے رسیلی آواز میں کہا۔ ''اس لئے کہ وہ جب تک تمہیں ملاقات کا وقت نہیں دیتا اس وقت تک میں تمہارا ہر طرح سے خیال رکھوں۔ سیوا کروں..... دل بہلاؤں..... تمہیں بور نہ ہونے دوں.....''

ٹائیگر نے اپنے ذہن پر بہت زور دیا۔ اسے بالکل بھی یاد نہ آسکا کہ زیرزمین دنیا میں اس نام کی کوئی شخصیت بھی موجود ہے۔ ایسا نام اس کے ذہن میں نہ آیا تو وہ الجھن میں پڑ گیا۔ پھر اس نے سوچنا بند کردیا پھر وہ اس کے ہیجان خیز سراپا میں کھو گیا۔

''کیا تم مجھے سزا دے رہے ہو جو بیٹھنے کے لئے نہیں کہہ رہے ہو؟'' وہ تیزی سے بولی۔

''آئی ایم ساری..... جان من!'' ٹائیگر نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''بات یہ ہے کہ اس میں میرا نہیں بلکہ تمہارا قصور ہے۔''

''میرا قصور.....؟ وہ کیسے.....؟'' اس کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ ''میں نے کیا کہا.....؟''

''وہ ایسے کہ تم بلا کی حسین ہو..... لاکھوں میں ایک..... خوابوں کی رانی..... سپنوں میں نظر آنے والی جان جاں!..... تمہارے حسن کے جادو نے مجھے خود فراموش کردیا تھا..... چلو..... اب بیٹھ جاؤ دلوں کی ملکہ.....''

وہ ٹائیگر کی زبان سے اپنی تعریف شاعرانہ انداز سے سن کر اتنی خوش ہوئی کہ..... ٹائیگر کو لگا کہ وہ جیسے کسی بھی لمحے اس کی جھولی میں کسی پکے پھل کی طرح گر نہ جائے..... اس کے بشرے سے ایسا ہی ظاہر ہو رہا تھا۔ اتنی تعریف کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ اس سے دریافت کرے کہ موصوف کون ہیں..... ان کا جغرافیہ کیا ہے.....؟ اس کا جد امجد کیا ہے.....؟ پھر اسے خیال آیا کہ وہ سری ناتھ ہے۔ پھر وہ اس کے سوال پر مشکوک ہوجائے گی۔ پھر کمرے سے نکل جائے گی۔ وہ اس بت طماز جانے دینا نہیں چاہتا تھا..... اور پھر اسے غیر محسوس انداز سے اس سے معلومات حاصل کرنا تھیں۔ اس سے جو کچھ معلوم ہوسکتا تھا کسی اور سے نہیں۔

''کیا تمہیں واقعی تورالائی نے میری ہر طرح کی سیوا کے لئے بھیجا ہے؟'' ٹائیگر نے دریافت کیا۔

''ہاں.....'' اس نے اپنا جوش نما سر ہلا دیا۔

''کیا تمہیں یقین نہیں آیا..... تم کتنے ہینڈسم ہو۔''

''اسے میرا کتنا خیال ہے.....؟ اس کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے.....'' ٹائیگر نے کہا۔ اس نے جواب نہیں دیا تو پھر ٹائیگر نے اس سے پوچھا۔ ''اے حسینہ عالم! تم نے بتایا نہیں کہ کیا پینا پسند کروگی؟''

''یہ کیا کوئی پوچھنے کی بات ہے.....؟ کیا مہمانوں سے پوچھا جاتا ہے.....؟'' وہ شوخی اور شگفتگی سے بولی۔ ''میں تو تمہاری پجارن ہوں..... باندی ہوں..... تم جو بھی پلاؤ گے پی لوں گی۔''

''اگر زہر پلاؤں.....''

''وہ بھی پی لوں گی میرے دل کے راج کمار.....'' سابقہ لہجے میں بولی۔

''کیا تم مجھے اتنا سنگ دل سمجھتی ہو..... میں تو ایک ایسی شراب پلاؤں گا جو کہ نہ صرف بے حد قیمتی ہے بلکہ بڑھیا قسم کی بھی ہے۔ کیا تم شراب سے شغف رکھتی ہو..... کیوں کہ تم دیسی ہو..... بدیسی نہیں۔'' ٹائیگر نے کہا۔

''ہاں..... میں صرف وہ شراب پیتی ہوں اور اچھی لگتی ہے جو مفت میں مل جائے۔'' یہ کہہ کر وہ بڑے زور سے ہنسی۔ ''جو تم پلاؤ گے اسے امرت سمجھ کر پی لوں گی..... ہندوستان میں شراب نوشی کتنی عام ہے اور ہوتی جارہی ہے تم جانتے ہوگے..... لڑکیاں اور عورتیں پینے میں مردوں سے کم نہیں ہیں..... ہاں تو کیا پلاؤ گے؟''

ٹائیگر کے پاس اعلیٰ درجے کی نفیس قسم کی بیئر تھی جو اس نے اس لئے خرید رکھی تھی کہ کوئی مہمان آگیا تو ہوٹل کے بار سے منگوانے کے بجائے خود ہی خاطر تواضع کرلے۔ اس نے دو گلاس تیار کرکے ایک گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ جس وقت اس نے ٹائیگر کے ہاتھ سے گلاس لیا اس وقت ٹائیگر کی نظر اس کی انگلی پر پڑی جس میں ایک بڑی سی انگوٹھی تھی جس پر ایک انگریزی لفظ E کھدا ہوا تھا۔ مسیحی لڑکیاں جو انگوٹھی پہنتی تھیں اس پر اپنے نام کا پہلا حروف کھدوا کر پہنتی تھیں۔ ٹائیگر نے انگوٹھی کو غور سے دیکھتے ہوئے اس کا نازک اور گورا اور سڈول ہاتھ تھام کر پوچھا۔

''بے بی.....! کیا تم مجھے اپنا نام بتانا پسند کرو گی؟''

''میرا نام ایویلین ہے۔'' اس نے ٹائیگر کو اپنی نظروں کی گرفت میں لے لیا۔ ''تم مجھے ایو کہہ کر بلا سکتے ہو۔''

جس وقت وہ اپنا نام بتا رہی تھی ٹائیگر نے اپنا گلاس خالی کردیا تھا۔ ایویلین کا گلاس خالی ہوگیا تو اس

سے پوچھا گیا کہ کیا اس کے لئے دوسرا گلاس تیار کردے..... اس نے منع کردیا۔

ایویلین نے آخری گھونٹ لے کر خالی گلاس میز پر رکھا اور پوچھا۔ ''کیا تم کسی تفریح کے موڈ میں ہو؟ تمہیں موسیقی سے دلچسپی تو ہوگی!''

''اس وقت صرف تم میری دلچسپی اور تفریح کا محور ہو۔ موسیقی تمہیں پسند ہے تو مجھے بھی بہت پسند ہے۔'' ٹائیگر نے جواب دیا۔

اس نے ٹائیگر سے اجازت لینے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔ اس نے ریکارڈ پلیئر کا بٹن آن کردیا۔ ٹائیگر کے لئے تو وہ خود موسیقی، نغمہ اور آہنگ تھی۔ کمرے کی خاموش فضا میں موسیقی کی لطیف دھنیں بکھرنے لگیں۔ پھر اس نے ٹائیگر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''رقص کے بارے میں کیا خیال ہے.....؟ ناچنا گانا تو آتا ہی ہوگا؟''

''اتفاق سے ہر قسم کے رقص کی مہارت رکھتا ہوں..... ویسے نیک خیال ہے۔'' ٹائیگر نے گہری نظروں سے دیکھا۔

ایویلین نے اپنے نامناسب شب خوابی کے لباس کو اور اونچا اٹھالیا۔ پھر وہ ٹائیگر کے قریب آگئی۔ پھر ہیجان خیز رقص شروع ہوگیا۔ یہ رقص کم تھا۔ وہ ٹائیگر پر نچھاور ہوئی جارہی تھی..... ٹائیگر نے دل میں تورالائی کا شکریہ ادا کیا جس نے اس کی تفریح طبع کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ بات رقص سے بھی آگے بڑھتی جارہی تھی۔ جس سے وہ ہر چیز اور مافیہا سے بے نیاز ہوتے جارہے تھے۔

پھر ایک دم سے رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔ دھڑام سے دروازہ کھلا۔ وہ خبیث بغیر دستک اور اطلاع کے دندناتا ہوا کمرے میں گھس آیا۔ ٹائیگر کے جی میں تو آیا کہ ریوالور نکال کر اس کی کھوپڑی، اڑادے، دو تین جوڈو کراٹے کے ہاتھ مار کر اس کا ہاتھ توڑ دے۔ اس کم بخت کو اسی وقت آنا تھا۔ جو ٹائیگر کو کیا ایویلین کو بھی زہر لگا۔ وہ دونوں ان جانے راستے پر بہت دور جانے والے تھے۔

اس نے ٹائیگر کو لباس تبدیل نہ کرکے تیار نہ ہوا دیکھ کر کہا۔ ''سری ناتھ! حیرت کی بات ہے۔ میرے کہنے کے باوجود تم نے لباس تبدیل نہیں کیا؟''

''ہاں..... میں نے لباس تبدیل کیا اور نہ کروں گا۔'' ٹائیگر نے بگڑتے ہوئے برہمی سے کہا۔ ''کیا میں تمہارے باپ کا نوکر ہوں..... تم سے کس نے کہا کہ کباب میں ہڈی بنو..... میں کہتا ہوں یہاں سے دفع ہوجاؤ۔'' سناتم نے.....''

''یہ تم کیا بکواس کررہے ہو؟'' اس کا چہرہ اور خوفناک اور مکروہ ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ وہ ترش روئی سے بولا۔ ''سنو..... سری ناتھ.....! میں تمہیں ایک منٹ کی مہلت دے رہا ہوں۔ اگر تم نے لباس تبدیل نہیں کیا تو پھر میں تمہیں اس حالت میں لے جاؤں گا تو کیا تورالائی کو یہ بات پسند آئے گی کہ تم اس ہیئت میں اس سے ملنے آئے ہو۔''

ویٹر کی بات سن کر ایویلین بڑے زور سے چونکی۔ پھر اس نے ٹائیگر کو سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''تمہیں فوراً ہی تیار ہوکر چل دینا چاہئے۔ تورالائی کو تم جانتے ہو کہ ہندوستان کے صدر سے کہیں مصروف آدمی ہے۔ اس کے پاس وقت بہت کم ہوتا ہے۔''

ٹائیگر غصے کی حالت میں جامے سے باہر ہوگیا تھا۔ ایویلین نے پیار بھرے انداز اور حرکات سے اس کے غصے کو سرد کیا تھا۔ ٹائیگر نے بستر سے اس کا گون اٹھایا تاکہ اسے پہننے میں مدد دے سکے۔ اس نے گون اٹھایا تو اسکا بکس جو گون کے نیچے تھا نجانے کیسے بستر سے نکل کر فرش پر گر گیا۔ ایویلین نے ہذیانی انداز سے چیختے ہوئے کہا۔ ''تم کیسے بے پروا آدمی ہو..... تم نے میرے بکس کا ستیاناس کردیا۔''

''آئی ایم ساری..... مائی سویٹ ہارٹ ایویلین!'' ٹائیگر نے خجالت سے کہا۔ ''مجھے بکس کا بالکل بھی خیال نہیں رہا۔ پلیز! جان من! تم ناراض مت ہو۔''

ایویلین کی تیوری پر بل پڑ گئے تھے۔ اسے یکایک نجانے کیا ہوا کہ اس نے ٹائیگر کے ہاتھ سے گون

لے لیا اور فرش سے بکس اٹھایا اور پھر وہ اس حالت میں کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس نے گون پہننے کی زحمت بھی نہیں کی۔ یہ بات ٹائیگر کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس ویٹر کے آنے سے پہلے وہ بہت خوش سرشار تھی۔ اس نے ٹائیگر کی جذباتی کیفیت اور من مانیوں کو بڑی خوش دلی سے قبول کیا اور خود سپردگی سے بھی پیش آئی۔ اس کا ایک دم سے اچانک بدلا ہوا رویہ معمہ بن گیا۔

ویٹر کمرے سے باہر نہیں گیا تھا۔ اس نے جیسے پھر ٹائیگر کو وارننگ دی۔ ''سری ناتھ.....! صرف دس سیکنڈ باقی ہیں۔''

ٹائیگر نے فوراً ہی انڈرویئر پر پتلون پہنی۔ بغیر جرابوں کے جوتے پہننے لگا۔ بس ویٹر نے اسے جوتے کے تسمے بھی باندھنے نہیں دیئے۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے سے باہر لے آیا اور دروازہ زور سے بند کردیا۔ پھر اس نے ٹائیگر سے کہا۔

''سری ناتھ.....! مجھے اندازہ نہ تھا کہ تم اس قدر احمق ہو..... تم نے وقت ضائع کرکے اچھا نہیں کیا۔''

ویٹر ٹائیگر کو کشاں کشاں اس سمت لے جارہا تھا۔ جہاں ہوٹل اشوکا تھا۔ یہ ہوٹل سب سے مہنگا اس لئے تھا کہ سب سے زیادہ پرتعیش مانا جاتا تھا۔ یہ ہوٹل بھی ساحل سمندر کے کنارے واقع تھا۔ ٹائیگر بھی اس میں ایک مرتبہ ٹھہرا تھا۔ ٹائیگر کی نظر سمندر میں کھڑے ایک بحری جہاز پر پڑی۔ جس پر نارچون نام لکھا ہوا تھا۔ وہ نام دور ہی سے دکھائی دیتا تھا۔ ٹائیگر کو یہ نام مانوس سا لگا۔ لیکن اس وقت اس لئے یاد نہیں آیا تھا۔ اس کیفیت میں عین وقت اس ویٹر نے بدمزگی پیدا کردی تھی۔ ایویلین نے لمحات میں جو رنگینی پیدا کی تھی وہ ویٹر کی وجہ سے ختم ہوگئی تھی۔ اس کا ذہن غصے سے کھول رہا تھا۔

ویٹر اسے ہوٹل کے اندر لے گیا اور ایک ہال کے دروازے پر جا کر رک گیا۔ پھر اس نے مخصوص انداز سے دروازے پر کوئی تین مرتبہ دستک دی۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی دروازے کو بند کرکے مقفل کردیا گیا۔ ٹائیگر نے جائزہ لیا۔ یہ ایک وسیع و عریض ہال تھا۔ اس کے اندر بہت سارے لوگ موجود تھے۔ ٹائیگر کی نگاہ سب سے پہلے اس شخص کی جانب اٹھی تھی جو کرسی صدارت پر بڑے پر وقار اور رعب کے انداز سے بیٹھا ہوا تھا۔ ٹائیگر کو اس شخص کے پہچاننے میں لحظہ بھر کی دیر بھی نہ لگی۔ یہ تورالائی تھا..... سنہرا اچھو تورالائی..... لوگ اسے غائبانہ طور پر گوریلا کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ لیکن کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے سامنے گوریلا کہہ کر مخاطب کرسکے۔

اسے دیکھ کر ٹائیگر کے دل میں غم و غصے اور نفرت کی شدید لہر اٹھی تھی۔ کیوں کہ یہ جرائم کی دنیا کا سب سے ظالم، سفاک اور اونچا بدمعاش تھا۔ سرغنہ تھا۔ بڑے بڑے خطرناک بدمعاش اس کا نام سن کر کانپ اٹھتے تھے۔ وہ اسے خواب کی سی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ ٹائیگر کو یقین نہیں آیا کہ یہ درندہ صفت اس کی نظروں کے سامنے موجود ہے کیوں کہ موجودہ حالت میں اس کی ہندوستان آنے کی توقع نہیں تھی۔ وہ امریکہ سے کب کا روپوش ہوچکا ہے۔ یہ بات ٹائیگر کے علم میں تھی اور اس کے متعلق افواہیں اڑتی رہتی تھیں..... اس کے بارے میں یہ افواہ بھی گشت کررہی تھی کہ وہ اٹلی کے کسی دور دراز علاقے میں روپوش ہے۔

ٹائیگر کو اپنی نظروں کے سامنے فرشتہ اجل کھڑا نظر آیا۔ وہ اس پر ہنس رہا تھا اور جیسے کہہ رہا تھا برے پھنسے بلیک ٹائیگر..... پھر اس کی نگاہوں نے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو سرسری انداز سے دیکھا۔ پورا ہال دنیا کے جرائم پیشہ اور اجرتی قاتلوں کی تنظیموں کے سرغنوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ جگہ کسی بھی سراغ رساں کے لئے پھانس کا گھاٹ تھی۔

اس کے ہال میں داخل ہوتے ہی ایک بھن بھناہٹ اور سنسنی سی پھیل گئی۔ یہ سارے تقریباً اسے جس طرح جانتے اور پہچانتے تھے اپنی اولاد کو بھی نہیں۔ ایک طوفان سا آگیا۔ کچھ بدمعاش اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور دو ایک بدمعاش اس کی طرف بڑھنے لگے۔

تورالائی یہ سب کچھ بڑے سکون واطمینان سے دیکھنے لگا تھا۔ اس کی نگاہیں ٹائیگر پر مرکوز تھیں۔ لیکن اس کے چہرے اور آنکھوں سے دلی تاثرات ظاہر نہ تھے۔ چند لمحوں تک شور شرابا ہوتا رہا۔ تورالائی نے جب اپنا ہاتھ فضا میں اٹھا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو شور ایک دم سے ٹوٹ گیا۔ پورے ماحول پر ایک بے کراں سکوت سا مسلط ہوگیا۔

"تم سری ناتھ تو نہیں ہو.....؟" گہری خاموشی میں اس کی پروقار آواز گونجی۔

"سری ناتھ؟" ٹائیگر نے انجان بن کر اپنی پلکیں حیرت سے جھپکائیں۔ "یہ سری ناتھ کون ہے..... اور آپ کون ہیں.....؟" اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

"سنو مسٹر.....!" تورالائی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "زیادہ ہشیاری دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم سری ناتھ کے کمرے میں کیا کر رہے تھے؟"

ٹائیگر کو اس بات کا نہ صرف احساس تھا بلکہ بخوبی اندازہ کہ وہ موت کے دہانے پر کھڑا ہے۔ اس کی بدحواسی، اور ذرا سی غفلت اور غلطی اسے موت کے منہ میں لے جاسکتی تھی۔ ایسے واقعات اور حالات اور لمحات سے اسے اکثر واسطہ پڑا تھا اور پڑتا رہتا تھا اس لئے وہ مطلق نہیں گھبرایا۔ اسے ایسے دشت کی سیاحی ہوتی رہتی تھی۔ اس نے بڑے مضبوط لہجے میں اور بے خوفی سے جواب دیا۔

"سری ناتھ کی تکرار میری سمجھ سے باہر ہے..... آپ مجھ سے ایک شخص کے بارے میں پوچھ رہے ہیں جس کا نام میں نے پہلی بار سنا ہے..... ویسے اس نام کے سینکڑوں کیا ہزاروں اس ایک شہر میں ہوں گے۔ میں نے اس سری ناتھ کی شکل تک نہیں دیکھی ہے۔"

ٹائیگر اس وقت دروازے کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ وہ اپنی بات ختم کرکے بے خوفی سے تورالائی کی طرف بڑھا اس نے حاضرین میں سے کئی ہاتھوں کو تیزی سے جیبوں میں رینگتے ہوئے محسوس کیا۔ انہوں نے دوسرے لمحے برق سرعت سے ریوالور نکال لئے تھے۔ دو ایک نے تو اس کی راہ میں حائل ہونے کی تو تورالائی نے انہیں اشارے سے روک دیا۔ اس نے قریب پہنچ کر کہا۔

"ویسے آپ کو یہ ذاتی سوال کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا ہے کہ کون سے کمرے میں اور کس لئے ٹھہرے ہو۔"

تورالائی کو اس کی بات ناگوار گزری تھی۔ اس کے چہرے پر غصہ نمودار ہوا۔ لیکن اس سے خود پر قابو پاکر ٹائیگر کی پشت پر کسی کو اشارہ کیا..... ٹائیگر نے گھوم کر فوراً ہی دیکھا تو اس کی نگاہ بروجن داس پر پڑی تو ٹائیگر نے جلدی سے اسے مخاطب کیا۔

"بروجن داس یہ کون مہاتما ہیں.....؟ یہ صاحب مجھ سے بے سروپا قسم کے سوالات کئے جارہے ہیں؟ یہ کیا تماشا ہے؟"

ٹائیگر نے پہلی بار بروجن داس کو سنجیدہ پایا تھا۔ اسے حالات کی نزاکت کا اندازہ ہوگیا۔ اس نے ٹائیگر سے بات کرنے کے بجائے تورالائی کو مخاطب کیا۔

"میں آپ کو اس شخص کے بارے میں بتاتا ہوں۔ اس کا اصل نام کچھ ہے..... یہ بلیک ٹائیگر کے نام سے مشہور ہے اکثر لوگ اسے اس نام سے واقف ہیں۔ یہ بنگلہ دیش میں رہتا ہے۔ وہاں اس کا کام سراغ رساں انسانی ذریعہ معاش ہے۔ اس سے دیرینہ دوستی ہے اور ہیں اس سے ملاقات ہوئی ہے۔ یہاں تفریح کی غرض سے آیا ہوا ہے۔ ایک عرصہ بعد آیا ہے۔" پھر اس نے توقف کرکے ٹائیگر کی طرف دیکھا اور اس سے کہا۔

"دیکھو..... مسٹر تورالائی..... جو کچھ بھی تم سے دریافت کریں اس کا صحیح صحیح جواب دینا تاکہ ان کی غلط فہمی دور ہوسکے..... مسٹر تورالائی صاف گو آدمی ہیں۔ جھوٹ بولنے والوں کو پسند نہیں کرتے ہیں۔"

بروجن داس جیسے مجرم شخص نے اس کی حمایت میں جو کچھ کہا اس بات نے ٹائیگر کا دل جیت لیا تھا۔ اس بے خوفی کی ٹائیگر کو اس سے توقع نہیں تھی۔ ٹائیگر کے دل میں اس کے لئے اور جگہ پیدا ہوگئی تھی۔

"مجھے سچ کہنے میں قطعاً کوئی عار نہیں اور نہ ہی میری عادت ہے کہ میں جھوٹ بولوں۔" ٹائیگر نے بروجن داس کو جواب دے کر تورالائی کی طرف دیکھا۔ "آپ کیا تسلی کرنا چاہتے ہیں؟"

تورالائی..... گہری خاموشی اور تنقیدی نظروں سے ٹائیگر کو دیکھے جارہا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنا سوال دہراتے نہیں ہیں۔ ٹائیگر کو اس کی شخصیت کی اس پہلو کا اندازہ ہوگیا تھا۔ اس لئے اس نے خود ہی بتانا شروع کردیا۔

"مجھ سے جس کمرے کی بابت دریافت کیا گیا ہے وہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں کل ہی اس شہر میں وارد ہوا ہوں۔ اتفاق سے ایک کمرا بھی خالی نہیں تھا۔ البتہ ایک شخص نے کمرا بک کرایا ہوا تھا اور وہ کسی وجہ سے نہیں آیا تھا۔ لہٰذا میں نے ڈیسک کلرک کو پانچ سو رشوت دے کر وہ کمرا لے لیا۔ اتنی سی بات ہے۔"

ٹائیگر کی یہ بات سنتے ہی فوراً ایک بدمعاش ہال سے نکل گیا۔ وہ شاید اس کی بات کی تصدیق کرنے گیا ہوا تھا۔ تورالائی کو اس کے بیان پر جیسے یقین آگیا تھا۔ اس لئے اس نے نرم لہجے میں ٹائیگر سے پوچھا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ ویٹر کے ہمراہ تم بحیثیت سری ناتھ یہاں کس لئے آئے ہو؟"

ٹائیگر نے جواب دینے سے قبل ویٹر کی طرف دیکھا جو ایک جانب مودب اور بھیگی بلی بنا سا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے تورالائی کو جواب دیا۔ "اس بات کا جواب تو آپ کا ویٹر ہی دے سکتا ہے..... ایک تو یہ شخص میری اجازت کے بغیر کمرے میں کسی بدمعاش کے انداز میں گھس آیا۔ مجھے لباس تبدیل کرنے کا حکم دے کر چلا گیا۔ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا مجھے کہاں لے کر جانا چاہتا ہے۔ ایک حسین وجمیل اور جوان عورت میرے کمرے میں تھی۔ مجھے دعوت گناہ دے رہی تھی..... میں اس فتنے کی قربت میں دیوانگی کی حد تک پہنچا تھا کہ ویٹر آگیا۔ پھر یہ شخص مجھے جبر وزیادتی سے لے آیا..... میری بوٹوں پر ایک نظر ڈالیں۔ اس نے مجھے تسمے باندھنے کی مہلت تک نہیں دی۔"

ٹائیگر نے توقف کرکے حاضرین کو اپنے بوٹ دکھائے۔ پھر ٹائیگر نے پوچھا۔

"میں اب تک یہ جان نہیں سکا ہوں کہ مجھ پر جرح کیوں کی جارہی ہے..... جیسے میں کوئی مجرم ہوں۔"

ٹائیگر کا بیان سننے کے بعد تورالائی نے ویٹر کو قہر آلود نظروں سے گھورا۔ پھر وہ ٹائیگر کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"مسٹر ٹائیگر.....! مجھے افسوس ہے کہ..... آپ کو محض غلط فہمی کی بنا پر تکلیف پہنچی ہے..... بات یہ ہے کہ الیکشن کے لئے ایک کنونشن بلا رہے ہیں..... ظاہر ہے کہ پارٹی سیکرٹ کو دوسروں سے ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کنونشن کی ہر کارروائی خفیہ رکھی جانا چاہئے۔"

"میں نے جو آداب محفل کا خیال نہیں رکھا اس کے لئے میں معافی کا خواستگار ہوں۔"

ٹائیگر نے اسے یہ تاثر دیا کہ اس نے تورالائی کی بات کو سچ تسلیم کرلیا ہے..... جو بدمعاش ہال سے باہر نکل گیا تھا وہ اس وقت اندر داخل ہوا۔ اس نے تورالائی کو مخصوص انداز سے اشارہ کیا تو اس کے جواب میں مخصوص انداز سے ہی سر ہلایا۔ اس بدمعاش نے ٹائیگر کی بات کی تصدیق کردی تھی۔ پھر تورالائی نے ٹائیگر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو جس تکلیف اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں..... آپ سے ایک گزارش ہے کہ جب تک ہمارا کنونشن ختم ہوجاتا آپ اپنے کمرے سے نہیں نکلیں گے۔"

"یوں بھی میرے پاس کہیں جانے کا اور نہ کسی سے ملنے کا کوئی پروگرام ہے..... میں اس وقت تو سونے اور آرام کرنے کے موڈ میں ہوں..... شاید وہ گل بدن چھم سے کسی پری کی مانند آجائے..... آجائے گی تو اس کے ساتھ ڈنر اور فلم کے لئے جاسکتا ہوں..... مجھے آپ کے کنونشن سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی میں پچھی کی

طرح کمرے میں رہ سکتا ہوں..... پھر بھی اس بات کی کوشش کروں گا کہ کمرے میں رہوں..... یوں میرے کمرے کی کھڑکی سے تالاب کا نظارہ بڑا دلکش اور ہیجان خیز ہوجاتا ہے کیوں کہ جل پریاں جو ہر عمر کی ہوتی ہیں..... ہر رنگ و نسل کی..... ایسا نظارہ اور کہاں..... وہ بھی مفت کی تفریح..... تالاب پر جا کر میں ان میں شامل ہوجاتا ہوں۔ خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتا ہوں۔"

ٹائیگر کو اس بات کا اندازہ تھا کہ اس نے لمبی چوڑی بات سے تورا لائی کو بور کردیا۔ اگر اس نے جگد یپ کو دیکھ لیا نہ ہوتا تو وہ تالاب کا ذکر نہ کرتا..... اس کا مقصد اسے جلانا بھی تھا۔ کیوں کہ اس کی بیوی سروجا جس حالت میں بڑی دیر تک ٹائیگر کو لبھاتی رہی اس نے جلتی پر تیل گرادیا تھا اور پھر تالاب پر اس نے جگد یپ کا ہاتھ بھی مروڑا تھا۔ جب وہ دروازے کے پاس پہنچا اس کی نظریں جگد یپ سے چار ہوئیں۔ وہ ٹائیگر کو غضب ناک نظروں سے گھورے جارہا تھا۔

ٹائیگر کے علم میں آئی تھی کہ ان دنوں ممبئی میں ایک کنونشن ہورہا ہے..... لیکن آج یہ عقدہ اس پر کھلا تھا کہ یہ کنونشن ہے سیاسی نوعیت اور سیاسی لیڈروں کا نہیں بلکہ بڑے بڑے جرائم پیشہ سرغنوں کا ہے..... ٹائیگر اس کانفرنس کی غرض و غایت کی تہہ میں پہنچ چکا تھا اور پھر ٹائیگر کو اپنے شبہات کی تصدیق کرنا بھی لازمی تھا..... اس نے ان جرائم پیشہ کے ہجوم میں رام سوامی کو بھی دیکھا تھا۔ جس سے اسے بڑی مدد مل سکتی تھی۔ کیوں کہ کوئی بھی جرم ہمیشہ اپنے محسن کو بھلا تا نہیں تھا اور اس احسان کا بدلہ اتارنے کے لئے بے چین رہتا تھا۔

ٹائیگر نے فوراً ہی رام سوامی کی تلاش شروع کردی۔ کوئی دس منٹ کے بعد اس نے رام سوامی کو لابی میں بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے خبیث ویٹر کو بھی دیکھ لیا تھا جو اس کی نگرانی پر مامور کردیا گیا تھا۔ اس لئے وہ اس کی موجودگی میں رام سوامی سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب رام سوامی کچھ دیر اس کے سامنے سے گزرا تو اس نے بظاہر اخبار پڑھتے ہوئے غیر محسوس انداز سے اسے مخاطب کیا۔

"درست.....! تم مجھے بار میں ملو۔"

اس برابر صوفے پر ایک تیس برس کی خوب رو عورت کسی کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ بار بار پہلو بدل رہی تھی اور اس کی نگاہ جو داخلی دروازے کی طرف جاتی اور لوٹ آرہی تھی وہ سمجھی کہ اس نے اسے دعوت دی ہے۔ وہ اس کے اور قریب آکر بولی۔

"مکیش کا میں ایک گھنٹے سے انتظار کررہی ہوں..... لگتا ہے کہ وہ نہیں آئے گا..... میں بار میں کیا..... کمرے میں بھی مل سکتی ہوں۔ ہم ساری رات جشن منائیں گے..... آپ کو میری جیسی تنہائی کی رفیقہ کبھی نہیں مل سکتی۔"

"میں اتنا خوش نصیب کہاں شریمتی جی....." ٹائیگر نے ایک لمبا سا سانس لیا۔ "آپ کتنی حسین ہیں۔"

"بدنصیبی.....؟" اس نے غیر محسوس انداز سے ساڑی کا پلو گود میں گرالیا تاکہ وہ کس قدر ہیجان نظارہ سے اندازہ کرے کہ وہ کس قدر قیامت ہے۔ واقعی وہ بجلی تھی جو ہر مرد کے دل پر گر سکتی ہے۔ اس نے پلو اٹھایا نہیں۔ "کیسی بدنصیبی۔"

"جس کمرے میں ٹھہرا ہوا ہوں اس میں میری پتنی اور سات بچے بھی ہیں۔" ٹائیگر نے جواب دیا۔ "بس وہ آنے والی ہے۔"

یہ سن کر عورت نے پلو درست کیا اور بھن بھناتی ہوئی باہر کی طرف بڑھ گئی۔ ٹائیگر ایک دم ہنس پڑا۔

جب ٹائیگر ہوٹل کے عقبی دروازے پر رک کر پلٹا تو اس کی ویٹر سے ٹکر ہوگئی۔ ٹائیگر نے زہر خند کہا۔

"تم مجھے پہلے ہی بہت پریشان اور ہراساں کرچکے ہو..... کباب میں ہڈی بنے ہو..... تمہیں میری نگرانی کرنے اور تعاقب کرنے میں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ٹنڈے ملیں گے۔ بڑی اچھی ترکاری ہوتی ہے۔"

ویٹر نے ٹائیگر کی بات کا جواب نہیں دیا۔ سپاٹ چہرہ لئے کھڑا رہا۔ ٹائیگر جب بار کی طرف بڑھا تو وہ

دیکھ کر ایک طرف کھڑا رہا۔ وہ اس کے تعاقب میں نہیں آیا۔ کیوں کہ بار میں آمد و رفت کا ایک ہی راستہ تھا۔ رام سوامی اسے بار میں مل گیا..... پہلے تو ویٹر نے اس کے بارے میں بتایا کہ اس کا نام جوکر ہے۔ وہ ایک پیشہ ور غنڈہ ہے۔ وہ سنسان راستوں پر لڑکیوں اور عورتوں کے پرس چھین لیتا ہے۔ زیور اتار لیتا ہے۔ دستی گھڑی اور موبائل فون بھی چاقو کے ہی زور پر چھین لیتا ہے۔

اس نے ٹائیگر کو وہ تمام معلومات بہم پہنچائیں جس کی اسے اشد ضرورت تھی..... جب رام سوامی نے اسے موجودہ کانفرنس کے بارے میں بتایا تو ٹائیگر اپنے اسٹول سے گرتے گرتے بچا تھا..... جب ٹائیگر نے اس کی اہمیت پر غور کیا تو حیران رہ گیا۔ متحدہ امریکہ یونین نہ صرف مزدور لیڈروں کے لئے ایک انعام کی حیثیت رکھتی تھی بلکہ یہ جرائم پیشہ سرغنوں اور اشتراکیوں کے لئے بھی اتنی ہی مفید ثابت ہوسکتی تھی۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ جو لوگ ان یونینوں کو کنٹرول کرتے ہیں وہی امریکہ کی صنعتوں کو بلکہ امریکی قوم کو بھی کنٹرول کرتے ہیں..... خود لینن نے اپنی زندگی میں یونینوں میں اثر و رسوخ کو بہت زیادہ اہمیت دی تھی..... اس کا قول تھا کہ مزدور کو قابو میں کرلو تو پورے ملک کو بھی قابو میں کیا جاسکتا ہے۔ تورا لائی..... لینن کے اس قول پر عمل کرنا چاہتا تھا۔

رام سوامی نے جو تفصیلات بتائی تھیں اب ٹائیگر کو اندازہ ہوا تھا کہ یہ کیس کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔ اسے کبھی زندگی میں ایسے کیس سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ وہ کبھی اتنے بڑے کیس میں ہاتھ نہیں ڈالا تھا..... اب اس کی کھوپڑی میں آیا تھا کہ کس لئے اسے اتنی بڑی پیشکش کی گئی۔

ٹائیگر..... رام سوامی سے رخصت ہو کر اپنے کمرے میں آگیا..... جو جو کی بلیک میل کی فائل کی بہت زیادہ اہمیت اس کے نزدیک بڑھ گئی تھی۔ اس فائل کے حصول کے لئے اس نے آگ اور خون کے سمندر میں چھلانگ لگادی تھی جو ان کے دام میں پھنس جانے سے پوری امریکی قوم کے لئے المیہ اور ناقابل تلافی نقصان تھا۔ یوں تو اسے امریکیوں سے بھی شدید نفرت تھی لیکن اسے روسیوں اور تورا لائی کے سرغنوں کی خطیموں سے اس سے کہیں شدید نفرت اور عداوت سی تھی۔ اس لئے اس نے امریکیوں کی مدد کا فیصلہ کرلیا تھا۔ دوسری مجبوری یہ تھی کہ نہ صرف زبان دے چکا تھا بلکہ موٹی رقم بھی وصول کرچکا تھا۔

وہ کیس کی مختلف کڑیوں پر غور کرتا رہا۔ وہ پہلی فرصت میں سروجا سے مل کر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کے شوہر نے اسے ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے کہ نہیں..... اگر اس نے اس بات کا تہیہ کیا ہوا ہے تو کسی غیر معروف محفوظ جگہ منتقل ہوجائے گا تاکہ آزادی سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکے۔ اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی مہم پر جگد یپ اثر انداز ہوتا رہے۔ ویسے اس نے محسوس کرلیا تھا کہ جگد یپ اس کے لئے خطرناک بن گیا ہے۔ اگر یہ مشن نہ ہوتا تو وہ جگد یپ کی عقل ایسے ٹھکانے لگاتا کہ دو ماہ تک کسی اسپتال میں زیر علاج رہتا۔

جب کمرے سے نکلا تو ٹائیگر نے جوکر کو ایک کونے میں کھڑا دیکھا۔ جب ٹائیگر نیچے جاکر بورڈ سے اپنے کمرے کی چابی نکال کر اپنے کمرے کی طرف جارہا تھا وہ اس کے پیچھے پیچھے آیا تھا۔ اس تیزی سے کہ جیسے وہ اسے دبوچ لے گا۔ ٹائیگر نے جیسے ہی کمرے میں داخل ہو کر دروازے کو بند کرنا چاہا جوکر نے اپنی ٹانگ پھنسادی..... ٹائیگر اس ایک پل میں کچھ سوچ کر اسے اندر آنے دیا۔ جیسے ہی اندر گھسا تو ٹائیگر نے اس کا بڑا پرجوش اور والہانہ استقبال اس کی کمر میں لات مار کر کیا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا کھڑکی کی طرف جاکر چوکھٹ سے ٹکرایا۔ ٹائیگر نے فوراً ہی کمرے سے نکل کر دروازہ بند اور مقفل کردیا۔

☆.....☆.....☆

ٹائیگر اپنے کرائے کی بیوک لے کر شہر کے غیر معروف علاقے میں واقع ہوٹل ڈی لیمار پہنچا۔ یہ ایک تیسرے درجے کا ہوٹل تھا۔ یہاں سیاحوں سے زیادہ مچھیروں کا بسیرا ہوتا تھا۔ ہوٹل کے عقب میں مچھیروں

کی خاصی بڑی آبادی تھی۔ ڈیسک کلرک نے ایک پرانا، بوسیدہ سا رجسٹر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس ہوٹل کی خوبی یہ تھی کہ اس کے کمرے نہ صرف صاف ستھرے بلکہ بستر بھی آرام دہ اور کئی چیزوں کی سہولتوں سے آراستہ تھا..... ایک تو اس کا یومیہ کرایہ کم تھا۔ بہترین سی فوڈ اور نہایت عمدہ شراب بھی دستیاب تھی۔ ملحق غسل خانوں میں دیواروں اور چھت پر بھی آئینے تھے۔ صرف ایک مچھلی کی بو ہوتی تھی۔ جو فریشنر سے دور کر لی جاتی تھی۔ یہ ہوٹل اس لئے بہت چلتا تھا کہ نوجوان طالب علم لڑکے اور لڑکیاں..... مرد اور عورتیں اپنے آشناؤں کے ساتھ چند گھنٹوں کے لئے آتے تھے۔ رنگ رلیاں منائی جاتی تھیں۔ لیکن کوئی جوڑا ڈائننگ ہال میں افشا راز کے خوف سے نہیں آتا تھا۔ سیاح غیر ملکی لڑکیاں اور عورتیں مقامی مرد اور لڑکوں کو مچھیروں کی طرح مچھلی پھانس کر لاتی تھیں۔

ٹائیگر نے رجسٹر میں اپنا نام ٹنڈولکر لکھا اور ایک زنگ آلود چابی لے کر کمرے میں پہنچا۔ اس ہوٹل میں صرف چار کمرے اے سی کے تھے لیکن اس میں نوجوان جوڑے اپنی ہم جماعت لڑکیوں کے ساتھ داد عیش دے رہے تھے۔ وہ کمرے میں آیا اور اس نے کھڑکی تازہ ہوا کے لئے کھول دی۔ پھر کمرا مقفل کر کے وہ ڈیسک پر آیا اور کلرک کے پاس چابی جمع کرا دی۔ کونے میں ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ اس کی طرف اس طرح لپکا جیسے وہ اس کی محبوبہ ہو۔

ٹائیگر نے دہلی کے لئے کال بک کرائی۔ موبائل پر اس لئے بات کرنے سے احتراز کیا جاتا تھا کہ اس کی گفتگو ریکارڈ ہو جاتی اور نمبر بھی ٹریس ہو جاتے تھے۔ اس نے جوجو سے رابطہ کیا جوان دنوں وہی ایک عام شخص کی طرح آیا ہوا تھا۔ پھر اس نے جوجو کو تفصیلات سے آگاہ کیا۔ جب اسے ٹائیگر نے تورالائی کی موجودگی کے بارے میں بتایا تو اس پر موت کا سناٹا طاری ہو گیا۔ پھر ٹائیگر نے اسے ان اشیاء کے بارے میں لکھوایا جس کی اسے فوری ضرورت ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ان اشیاء کا مہیا کرنا بہت مشکل کام ہے۔ ٹائیگر نے اس سے کہا کہ یہ اس کا مسئلہ ہے۔ اسے ہر قیمت پر ان اشیاء کا ملنا بہت مشکل ہے۔ اس کے آدمی ہندوستان کے ہر شہر میں موجود ہیں۔ اگر کچھ ہوا تو وہ کل اسے اس مشن کی ناکامی کا ذمہ دار نہ ٹھہرانا..... آخر میں اس میں اس نے کہا کہ اس کا پچاس ہزار ڈالر کا معاوضہ بنگلہ دیش فارن اکاؤنٹ میں اس کے نام جمع کرا دے تاکہ وہ سکون اور اطمینان سے کام کر سکے۔ ”معاوضہ تمہیں مشن کی کامیابی کی صورت میں ادا کیا جائے گا۔ یہ طے ہوا تھا۔“ جوجو نے تکرار کی۔

”رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع ہونے کی صورت میں اس مشن پر میری موت واقع ہونے پر لواحقین کو یہ رقم مل جائے..... اور پھر میں موت کے فرشتے کے سامنے بے دھڑک جاؤں گا۔ اس طرح موت کا فرشتہ میدان جنگ میں سامنے آئے گا..... اگر یہ بات منظور نہ ہو تو پھر میں کل شام ہی بنگلہ دیش جا رہا ہوں۔ تم یہ مشن کسی اور کو سونپ دو۔“

”کل صبح بینک کھلتے ہی تمہارے اکاؤنٹ میں پچاس ہزار ڈالر جمع ہو جائیں گے۔“ جوجو بولا۔ ”تم جاسوس کم کاروباری زیادہ ہو۔“ پھر ٹائیگر نے اسے وہ ہوٹل ڈی لیار میں ٹنڈولکر کے نام سے مقیم ہے۔ تمہارا ہرکارہ جب وہ اشیاء لے کر پہنچے گا تو اس سے اس کا نام پوچھے گا۔ ہم میں سے ایک کہے گا ریڈ روز..... دوسرا جواب دے گا کہ سفید گلاب..... اس طرح وہ دونوں متعارف ہوں گے۔ تمہارے ہرکارہ اور اس کے سوا کسی کو بھی ان باتوں کا علم نہیں ہونا چاہئے۔ کیوں کہ تورالائی کے آدمی اس کے پیچھے سائے کی طرح لگے ہوئے ہیں۔

☆.....☆.....☆

ٹائیگر نے اپنی گاڑی ہوٹل الکنٹا ڈو سے خاصے فاصلے پر روک دی۔ وہیں اسے پارک کیا۔ کیوں کہ یہ مناسب جگہ تھی۔ سروجا اس ہوٹل کے کاٹیج نمبر ستائیس میں ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ پیدل اس کے کاٹیج پر جا پہنچا۔ اطلاعی گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے رک گیا۔ کیوں کہ اسے فوراً ہی خیال آیا کہ جگدیپ ہونے کی صورت میں وہ اپنی آمد کی کیا غرض وغایت بیان کرے گا..... کیا وہ اس سے کہے گا تمہاری بیوی کی کشش کھینچ لائی ہے۔ وہ رات بھر اس لئے سو نہیں سکا کہ تالاب میں وہ جس حالت میں تھی اس منظر نے اسے سونے نہیں دیا۔ دل کو لحہ بھر برقرار بھی نہ رہا۔ اس کا جادو اور وہ منظر مجھے کشاں کشاں لے آیا ہے۔ لہٰذا گولی مارنے کی زحمت نہ کرنا۔ وہ شعلہ مجسم ایسی قیامت ہے کہ بھسم کر دے۔

ٹائیگر نے اس لئے ہوٹل سے سروجا کو فون نہیں کیا تھا کہ ٹیلی ٹیپ ہونے کا امکان تھا۔ یہ اس کے علم میں نہ تھا کہ سروجا کے پاس موبائل فون ہے یا نہیں..... ہونے کی صورت میں جگدیپ شاید کال اور ایس ایم ایس یقینی چیک کرتا ہوگا۔ ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس کاٹیج کی بناوٹ کچھ ایسی تھی کہ وہ سامنے والی کھڑکی تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس لئے وہ عقبی کھڑکی کی تلاش میں اس کے عقب میں آ گیا۔ وہاں ایک بنگلہ بنا ہوا تھا۔ اس کے عین اوپر ایک کھڑکی تھی۔ اس کاٹیج کے عقب میں اور نیچے کوئی دو سو گز دور ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ اس کھڑکی تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ اس نے جنگلے پر کھڑے ہو کر کھڑکی کی طرف شیر کی طرح جست لگائی اور اس کے چھجے کو تھام لیا۔

ٹائیگر نے دیکھا۔ یہ کمرا نشست گاہ تھی۔ سروجا کا سراپا ایک کوچ پر بکھرا تھا اور کسی جھرنے کی طرح بہہ رہا تھا اس کے حسن کی کرشمہ سازیاں واضح تھیں۔ وہ کھڑکی میں سے اسے یک ٹک دیکھتا رہا۔ وہ ایک انگریزی ناول پڑھنے میں غرق تھی جس کا سرورق نہایت ہی نامناسب تھا۔ وہ چند لمحوں تک اسے یک ٹک دیکھتا رہا۔ پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ سروجا اس وقت اکیلی ہے۔ چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ اس کھڑکی سے بے آواز کمرے میں اتر گیا۔ جب وہ اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تو اس نے غیر ارادی طور پر نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر وہ کتاب پڑھنے لگی..... دوسرے لمحے اس نے ٹائیگر کو جو دیکھا تو غش کھا گئی۔ پھر وہ جلد ہی ہوش میں آ گئی۔ اس کا سینہ جو دھڑک اٹھا تو اس پر قابو پانے کے لئے ہاتھ رکھ لیا۔

ٹائیگر نے سرگوشی میں اس سے سب سے پہلے جگدیپ کے بارے میں پوچھا..... سروجا نے اسے بتایا کہ اس کے شوہر کا کوئی بھروسا نہیں وہ کسی وقت بھی آ سکتا ہے..... پھر اس نے ٹائیگر کو یہ خوش خبری سنائی کہ جگدیپ نے اس سے کہا ہے کہ وہ اس سے میل جول بڑھا کر میں یہاں کس سلسلے میں آیا ہوں۔ اگر دو ایک راتیں ہوٹل میں گزارنا پڑے تو کوئی حرج نہیں..... اس لئے کہ ٹائیگر بہت خطرناک ہے۔ وہ یقیناً کسی مشن پر آیا ہے۔ بڑا گھاگ آدمی ہے۔ ایک عورت ہی اسے موم کر سکتی ہے..... تو رالائی بھی اس میں دلچسپی لینے لگا ہے..... یہ سب کچھ سن کر ٹائیگر تذبذب میں پڑ گیا..... اس لئے جگدیپ نے سروجا کو ماتا ہری کا کردار سونپ دیا تھا۔ پھر ان دونوں نے اس ہوٹل کے نائٹ کلب میں ملنے کا پروگرام بنا لیا..... سروجا نے کہا کہ..... وہ جگدیپ سے کہے گی کہ اس نے خود ٹائیگر کو ٹیلی فون پر رابطہ پروگرام طے کیا ہے۔ رخصت ہونے سے پہلے سروجا نے اس سے کہا کہ ذرا تم وہ گال پیش کرنا جس پر اس نے تھپڑ مارا تھا۔ ٹائیگر نے اپنا وہ گال بڑھایا تو اپنے ہونٹ اس پر رکھ دیئے۔ ٹائیگر چاہتا تو بات اتنی بڑھ جاتی کہ واپسی کا خیال اور جگدیپ کے آنے کا خوف نہ رہتا۔ جب کہ سروجا اس کی جھولی میں کسی پکے پھل کی طرح گر جانے کے لئے بے تاب تھی۔ ٹائیگر نے اس کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی..... وہ اس قماش کا نہ تھا۔ وہ صرف من مانی، قدرے بہکنے اور ہلکی پھلکی تفریح سے دل بہلاتا تھا۔ اس تنہائی اور سروجا کی خود سپردگی سے فائدہ نہیں اٹھایا..... اس طرح ابو یلین سے ہی..... سروجا نے اس کے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کیں تو وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا جن میں کیف و مستی بھری تھی۔ ابھی بھی روشنی گل ہی تھی۔ وہ کھڑکی کے چھجے پر چڑھ گیا اور جس طرح آیا تھا اس طرح چلا گیا۔ جگدیپ کمرے میں آ گیا۔

روشنی بھی ہوگئی تھی۔ جگدیپ نے اس سے مشکوک لہجے میں پوچھا۔ ''تم نے اندھیرا کیوں کر رکھا تھا؟''

''میں اندھیرے میں سمندر کا نظارہ کر رہی تھی جو ہلکی چاندنی میں بڑا بھلا لگ رہا تھا..... کیا میں تمہارے لئے کھانے کے لئے کچھ لے آؤں؟'' ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ یہاں سے سمندر کا نظارہ کیسا لگ رہا ہے؟'' جگدیپ نے کھڑکی کے پاس آ کر مشکوک انداز سے کھڑکی سے باہر جھانک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

جگدیپ اپنی تسلی کر کے کمرے سے نکل گیا تو سروجا نے روشنی گل کر دی۔ یہ روشنی شاید اس نے ٹائیگر کے نکل جانے کے لئے گل کی تھی۔ وہ تھوڑی دیر بعد وہ بیوک میں زندہ سلامت بیٹھا ہوا تھا۔ صرف ایک بوسہ نے ٹائیگر پر پرانی شراب کا سا اثر کر دیا تھا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ سروجا بہت دور جانا چاہتی ہے لیکن وہ انجانے راستے پر جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سروجا کو بہکنے اور غلاظت کے دلدل میں گرنے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کی پرجوش محبت بھلا دینے والی نہ تھی۔ وہ اس بات سے دل میں یہ خوشی محسوس کر رہا تھا کہ غلاظت کے دلدل میں گرنے سے بال بال بچ گیا تھا۔

اس نے تھوڑی دیر بعد بیوک اسٹارٹ کی اور شہر کی طرف چل پڑا۔ اسے خیال آیا کہ جوکر نے اس کے فرار کی اطلاع تورالائی کو دے دی ہوگی۔ تورالائی نے اس کے لئے کیا احکام صادر کئے اس کا علم ہونا مشکل تھا۔ لیکن اسے اس کی کوئی فکر اور پروانہ تھی۔ وہ اس کا نوکر تو تھا نہیں..... اس نے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔ وہ تورالائی کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ شیر بنگال ہے۔ کوئی گیدڑ نہیں..... کوئی اس کا بال بیکا تو کر کے دیکھ لے۔

اسے یاد آیا کہ سروجا نے اسے جو کچھ بتایا تھا اس سے یہ ظاہر تھا کہ وہ اس کے ذریعے پھانسنے کے لئے جال بچھا رہے ہیں۔ ٹائیگر نے ایک ٹیلی فون پر گاڑی روک کر سروجا کو فون کیا۔

''میں ٹائیگر بول رہا ہوں..... کیا مسز سروجا جگدیپ سے بات ہو سکتی ہے؟''

سروجا نے غیر محسوس انداز سے اسے اشارہ دے دیا تھا کہ فون جگدیپ بھی سن رہا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ ''مسٹر جگدیپ گھر پر نہیں ہیں۔''

''جان من! آج موسم بہت حسین ہے..... کیا تم میرے لئے وقت نکال سکتی ہو۔ میرا دل تم سے ملنے کے لئے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا ہے۔''

''میں خود بھی تم سے ملنے کے لئے تڑپ رہی ہوں۔'' اس نے جگدیپ کی ہدایت پر جواب دیا۔ اس کے لہجے میں گرم جوشی نہ تھی۔

''کیا خیال ہے..... پیرا کی کلیوں نہ کر لی جائے؟ تم شعلہ بدن ہو..... جل پری ہو..... قیامت ہو..... جان تمنا ہو۔'' ٹائیگر نے شکرانہ انداز میں کہا۔ ''اس روز جو تالاب میں تمہیں جس حالت میں دیکھا اس نے میری نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔''

''میرے خیال میں کلب دینا اس کو مناسب رہے گا۔'' سروجا نے کہا۔ ٹائیگر نے اس کی ذہانت پر عش عش کر اٹھا۔ ''جگدیپ اتنا بے شرم اور احمق بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی بیوی کو اس کے ساتھ بے حجابی سے تفریح کرتے ہوئے دیکھ سکے۔

''میں آدھے گھنٹے کے بعد تمہارا وہاں انتظار کروں گا..... کیا تم اپنے خبیث شوہر سے بہانہ کر کے آ سکو گی؟'' ٹائیگر نے خوش دلی سے کہا۔ ''تم میرے شوہر کی فکر نہ کرو..... میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہی ہوں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

ٹائیگر نے ریسیور رکھ کر سوچا۔ آدھے گھنٹے میں جگدیپ کی نیت اور ارادوں کا پتہ چل جائے گا۔ چیپ کر مہم کو سر کرنے میں بڑی دشواری معلوم ہو رہی تھی۔ ٹائیگر آج ہی اس رکاوٹ کو دور کرنا چاہتا تھا..... تخت یا دھڑن تختہ.....؟

(جلدی ہے)

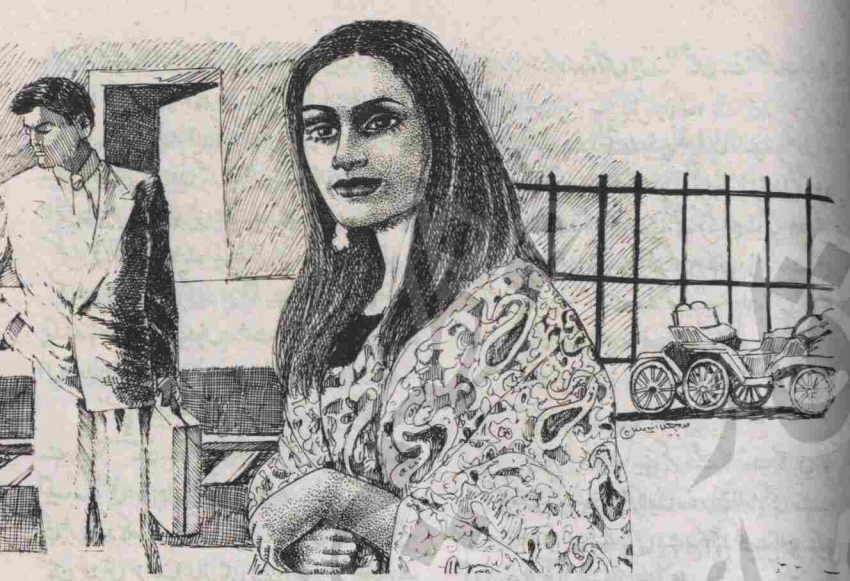

بھول بھلیاں

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے، شعلوں کو ہوا کھیت میں دھکیل رہی تھی اور شعلے تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔ شام کے سرمئی آسمان پر آگ اور دھوئیں کے بادل جمع ہو رہے تھے کہ پھر اچانک.....

ضد اور ہٹ دھرمی پر قائم رہنے والے اکثر مصیبت کھڑی کر دیتے ہیں یہ کہانی پڑھ کر دیکھئے

شین نے جھک کر ونڈ اسکرین سے باہر دور تک جھانکا، سیاہ بادل افق پر امڈے چلے آ رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف پوری طرح پکے ہوئے مکئی کے کھیت قطار در قطار سر اٹھائے کھڑے تھے۔ مکئی کے یہ بلند پودے میلوں دور تک ہر چیز کو اپنے عقب میں چھپائے ہوئے تھے۔ ان پر چھائے ہوئے سیاہ گھنے، جھکے ہوئے بادل اور سامنے دور تک جاتی ہوئی سڑک، کار تیزی سے اس سیاہ تارکول کی سڑک پر پھسلتی جا رہی تھی۔ ریاست کنساس میں ہر قدم پر یہ مناظر عام تھے۔ بالکل سیدھی سڑک دور افق کے قریب جا کر ایک نقطے کی شکل اختیار کر رہی تھی۔

شین نے اپنے پہلو میں بیٹھی دلکش و حسین جینٹ کو سر موڑ کر دیکھا، جو کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی۔ اس نے سر کے ایک ہلکے جھٹکے سے انداز دلربائی میں اپنے

بالوں کو پیچھے کیا اور انہیں گردن کے پیچھے ایک ربن سے باندھ لیا تاکہ وہ دوبارہ چہرے کے آگے آکر مطالعے میں رکاوٹ پیدا نہ کریں۔ اس کی نیلی آنکھیں ابھی بھی کتاب کے صفحات پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے حسین چہرے کے تاثرات سطر بہ سطر تبدیل ہو رہے تھے۔ کبھی وہ ہلکے سے مسکرا دیتی تو شرمیلی ہونٹ ایک خاص ادا سے کھل جاتے۔ وہ کسی اور ہی دنیا میں تھی۔ ہوسکتا ہے اس دنیا میں سورج چمک رہا ہو، ہوسکتا ہے وہاں درخت ہوں، پہاڑ ہوں، جبکہ اس دوران میں شین میدانوں اور بادلوں سے نبرد آزما تھا۔

"ریاست کنساس کا قومی درخت کون سا ہے.....؟" شین نے اس کی توجہ حاصل کرنے کے لئے ایک بے معنی سا سوال داغ دیا۔ جینٹ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، شین خود ہی مزاحیہ انداز میں بول اٹھا..... "یقیناً..... سڑک کے کنارے نصب یہ لینڈ لائن فون کے کھمبے....."

"ہا..... ہا..... ہا....." جینٹ مصنوعی انداز میں ہنسنے لگی۔ کتاب کو بند کیا اور اسے اپنی گود میں رکھ لیا۔ "یہ مذاق بہت پرانا ہوگیا ہے۔ مگر بولتے رہو....."

شین کھسیانا ہو کر خاموش رہا۔

مکئی کے کھیت ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ رفتار کا احساس بھی ختم ہوگیا تھا کیونکہ دائیں بائیں ایک جیسے مکئی کے کھیت اور سامنے تنگ افق، ماحول اور مناظر یکسانی کا شکار تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ طویل بور ڈرامے کا حصہ بن گئے ہوں۔

"میرا نہیں خیال کہ میں ان کو یاد رکھوں گا....." شین پھر بولا۔

"کن کو....." جینٹ نے پوچھا۔

"ٹیلی فون کے ان کھمبوں کو..... کیونکہ کوئی بھی کافی دیر سے نظر نہیں آیا اور نہ ہی کوئی دوسری کار یا گاڑی ہمارے قریب سے گزری ہے۔" وہ پیٹرول بتانے والے آلے پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ آلے کی سوئی آدھا سفر طے کر چکی تھی۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ ہم درست راستے پر ہیں اور راستہ بھولے نہیں ہیں۔" شین نے متفکرانہ انداز میں پوچھا۔

جینٹ نے ڈیش بورڈ پر نظر ڈالی، اپنے ہاتھوں کو گود میں رکھی کتاب پر رکھا اور اپنی انگلی میں موجود انگوٹھی کو گھورنے لگی اس کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ تھی، وہ کچھ نہ بولی۔ "مجھے اس سڑک پر کوئی گھر، مکان، یا عمارت بھی نظر نہیں آئی....." شین نے کہا۔ "..... اور اس مکئی کا کیا..... اس کو کب کاٹا اور صاف کیا جائے گا.....؟"

"مجھے کیا معلوم....." وہ بولی۔

"یہ تمہارا علاقہ ہے....."

"ہاں..... ٹھیک ہے مگر مجھے کاشت کاری کا زیادہ علم نہیں۔ قریب ہی سرکاری ریسرچ فارم بھی ہے۔ بہت سارا علاقہ ان کے پاس ہے۔ کافی کھیت ان کے بھی ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ وہی علاقہ ہو....."

"ریسرچ!.....؟..... ارے مکئی کے دانوں کو ریسرچ کی کیا ضرورت؟..... توڑو..... ابالو..... اور کھا جاؤ..... یہی فطرت کا اصول ہے۔" شین بولا۔

"کاشت اور پیداوار کو زیادہ کرنے کے لئے ریسرچ بہت ضروری ہے۔" جینٹ نے وضاحت کی۔

"ارے واہ..... میرے ٹیکس کے پیسے کنساس کے کھیتوں میں مکئی کے دانوں پر برباد کئے جا رہے ہیں....." وہ افق کو گھورتے ہوئے بولا۔ "یہاں کے لوگ اس قسم کے ماحول اور کھیتوں میں کس طرح رہتے ہیں میں تو زیادہ دن نہ رہ سکوں اور یقیناً خودکشی کرلوں۔"

"برا خیال نہیں ہے....." جینٹ نے دھیرے سے مسکرا کر کہا۔

"ہاں جی..... یہ تو ایک حسین و خوشنما باغ ہے نا..... لوگ نہ جانے یہاں کیوں چھٹیاں گزارنے نہیں آتے۔" شین نے تمسخرانہ انداز میں ہاتھوں کو ہلاتے ہوئے کہا۔ اس دوران میں اسٹیئرنگ پر کنٹرول نہ ہونے کے سبب کار ڈگمگانے لگی۔

جینٹ نے غیر ارادی طور پر لپک کر اسٹیئرنگ کو پکڑ لیا۔ "خدا کے لئے شین..... اور اس طرح کی حرکت

مت کرو....."

شین نے دوبارہ اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ سر کو ہلاتے ہوئے۔ "یہ دو دن بہت طویل ہوں گے۔ یقیناً تمہارے والد کو میں پسند آؤں گا۔"

"نہیں ایسا نہیں ہے....." جینٹ بولی۔

شین نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"..... لیکن اگر ایسا ہوا تو یہ صرف تمہاری عادتوں کی وجہ سے....." جینٹ نے وضاحت کی۔

"کیسی عادتیں....." شین نے پوچھا۔

جینٹ دھیرے سے مسکراتی ہوئی بولی۔ "تمہارا کھلنڈرا پن میرے والد کے لئے یہ قابل عمل نہیں ہے۔ وہ اسے وقت اور پیسے کا ضیاع سمجھتے ہیں۔ وہ پریشان اور فکرمند ہیں کہ تم کیسے اپنی عملی زندگی میں اپنے اور میرے اخراجات برداشت کر پاؤ گے۔"

"..... تو میں نے ٹھیک کہا نا..... میں ان کو پسند نہیں ہوں....." شین کے چہرے پر سوچ کی لکیریں گہری ہوگئیں۔

"فکر مت کرو..... وہ پسند کرلیں گے..... تمہیں میرے والد نہیں بلکہ والدہ کے متعلق سوچنا اور پریشان ہونا چاہئے۔ گھر میں آخری فیصلہ وہی کرتی ہیں۔ ان کا اعتماد جیت لو تو تم کو سب کچھ مل جائے گا۔" جینٹ نے ایک گلابی لفافہ عقبی نشست پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم نے ابھی تک ماں کے لئے کارڈ پر اپنا نام نہیں لکھا....."

"لکھ دوں گا..... ابھی مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ ساتھ جملہ کیا لکھوں....." شین نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"آگے کہیں رک کر اس پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھ دو....." جینٹ نے زور دینے والے انداز میں کہا۔

شین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جینٹ نے لفافہ ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

"تمہارا کیا اندازہ ہے وہ کب تک اس بات کو سمجھ جائیں گی....." شین نے دھیرے سے اس کے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"..... اگر تم اسی طرح اسٹیئرنگ سے ہاتھ ہٹاتے رہے تو شاید کبھی نہیں....." جینٹ نے دھیرے سے اپنا ہاتھ کھینچا اور اسے اپنی سڈول ران کے نیچے پالیا۔

شین ہنسنے لگا۔ ایک مانوس سی مہک ان کے نتھنوں سے ٹکرائی۔

"بچپن کی یاد تازہ ہوگئی۔ کیا تم بھی سونگھ رہی ہو....." شین نے پوچھا۔

"کیسی خوشبو....."

"یوں جیسے کہیں دور پارٹی ہو رہی ہو....."

"نہیں تو....."

"ذرا غور کرو....."

جینٹ غور سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ میلوں دور تک ہر چیز ساکت تھی۔ مکئی کے مکمل خشک اونچے پودے پوری طرح ہر چیز پر چھائے ہوئے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ کنساس، جنگل کی آگ کے لئے پوری طرح تیار ہے....." شین بولا۔

"کچھ گاڑیوں والے یقیناً جلتے سگریٹ باہر پھینک دیتے ہوں گے..... آگ کا خطرہ تو ہر وقت موجود رہتا ہے۔" وہ بولی۔ "..... اور براہ مہربانی ان دنوں میں بھی سگریٹ نوشی سے پرہیز ہی کرنا خصوصاً میرے والدین کے سامنے....."

"تم پہلے بھی مجھے بتا چکی ہو..... اور میں وعدہ کر چکا ہوں۔"

جینٹ واقعی پریشان تھی کہ اس کے والدین ان کے ہونے والے داماد کے متعلق نجانے کیا سوچ اور رویہ اپناتے ہیں۔ شین کو ہر صورت پیر والے دن تک یونیورسٹی پہنچنا تھا۔ اتنی جلدی وہ کیسے ان کا دل جیت پائے گا۔

شین نے سڑک کے کنارے نصب ایک اطلاعی بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "..... ارے وہ دیکھو کچھ آگے مکئی کی بھول بھلیاں ہیں..... میں نے ان

کے متعلق بہت سنا ہے..... آؤ وہاں رکتے ہیں.....''

امریکہ کی ریاست کنساس میں اس طرح کی بھول بھلیاں عام بنائی جاتی ہیں اور ان میں دعوت کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ مکئی کے قد آدم اونچے پودوں کے درمیان پر پیچ راستے بنائے جاتے ہیں۔ مہمان ان کے درمیان سے گزر کر اصل جائے دعوت تک پہنچتے ہیں۔ جہاں سارے مہمان جمع ہو جاتے ہیں پھر وہاں دعوت اڑائی جاتی ہے۔ ایسا عموماً ہیلووین کے تہوار کے موقع پر کیا جاتا ہے مگر کچھ ریسٹورنٹ سڑک کے کنارے بھی اس قسم کا موقع پیدا کر لیتے ہیں اور اپنے گاہکوں کو ان بھول بھلیوں سے گزار کر اصل جگہ تک پہنچاتے ہیں۔ عام لوگ اس سے خاصا لطف اٹھاتے ہیں، مہمانوں اور گاہکوں کو زیادہ پریشانی سے بچانے کے لئے بھول بھلیوں کے مرکزی راستے پر ایک نقشہ بھی ان کو مہیا کیا جاتا ہے تاکہ اگر وہ کھیت کے اندر بھول بھلیوں میں بھٹک جائیں تو اصل جگہ پر آسانی سے پہنچ سکیں۔

جینٹ نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا۔

''میرا خیال ہے ہم پہلے ہی کافی لیٹ ہو چکے ہیں.....''

''یقیناً تم درست کہہ رہی ہو..... مگر مجھے ڈرائیونگ کرتے گھنٹوں ہو چکے ہیں اور اب میری ٹانگوں کو تھوڑے آرام کی ضرورت ہے۔ ابھی کافی وقت ہے میرا خیال ہے مزار ہے گا۔ میں بھی کنساس کی اس روایت کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے..... لیکن زیادہ دیر نہیں، ہمیں رات کے کھانے سے پہلے ہر صورت گھر پہنچنا ہے.....'' جینٹ نے ایک گہری سانس لی۔

شین نے گاڑی کو سڑک سے نیچے کچے راستے پر اتار لیا اور نشانات کے مطابق کار آگے بڑھانے لگا۔ کار کچے راستے پر اچھلتی جا رہی تھی۔ کچھ دوران کو پارکنگ ایریا نظر آ گیا جہاں کافی کاریں ایک دائرے کی شکل میں پارک تھیں۔

''واہ..... کافی سارے لوگ ہیں یہاں.....'' شین خوشی سے چلایا۔

کار سے باہر نکلتے ہی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے ان کا استقبال کیا۔ شین نے کپکپاتے ہوئے اپنی جیکٹ کی زپ چڑھالی اور دونوں ہاتھوں کو جیبوں میں گھسالیا۔

جینٹ نے آسمان کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''لگتا ہے آج رات خوب بارش ہوگی.....''

''دیکھو..... ہمیں راستے میں ایک بھی گاڑی نظر نہیں آئی لیکن یہاں پارکنگ ایریا کاروں سے بھرا پڑا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ مکئی کی بھول بھلیوں کو کتنا پسند کرتے ہیں.....'' شین بولا جبکہ جینٹ چپ چاپ اپنے ہاتھ اپنے سینے پر باندھے کھڑی رہی۔

''چلو..... اب وقت ضائع نہ کرو.....'' شین بولا۔

ایک طرف مکئی کے پودوں کے بیچ ایک محراب دار راستہ بھول بھلیوں کے اندر جانے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ قریب ہی لکڑی کے ایک کھمبے پر ایک ڈبہ لٹک رہا تھا جس پر لفظ ''چندہ'' لکھا ہوا تھا۔ اس میں رقم اندر ڈالنے کے لئے ایک جھری بنی ہوئی تھی۔ اس ڈبے کے قریب ہی دوسرے ڈبے میں بھول بھلیوں کے نقشے کی کئی کاپیاں بھی پڑی تھیں۔

''تمہارے پاس کچھ رقم ہے.....'' جینٹ نے پوچھا۔

''ہاں ہے..... مگر وہاں باہر بورڈ پر تو لکھا ہے کہ یہ سب مفت ہے.....'' شین بولا۔

''اس کا اعتبار مت کرو..... دیکھو یہاں تو لکھا ہے نا.....'' جینٹ نے وضاحت کی۔

شین نے ایک گہری سانس لی اور اپنے بٹوے کو جیب سے نکال لیا۔ ''..... میرے پاس سب سے چھوٹا نوٹ پانچ ڈالر کا ہے..... کیا تمہارے پاس کوئی چھوٹا نوٹ ہے.....'' شین نے جینٹ سے پوچھا۔

جینٹ نے کوئی جواب دیئے بغیر نوٹ اس کے بٹوے میں سے کھینچا اور وہاں لگے ڈبے میں ڈال دیا۔

''تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا.....'' وہ ایک

نقشہ اٹھاتے ہوئے بولی۔

شین نے اس کے ہاتھ سے نقشہ پکڑنے کی کوشش کی مگر جینٹ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''..... میرا خیال ہے ہمیں اس نقشے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری مہم جوئی کا احساس کہاں گیا؟'' شین نے طنزیہ انداز میں جینٹ سے کہا۔

جینٹ اسے گھورنے لگی۔ ''کیا..... تم پہلے بھی کبھی مکئی کی بھول بھلیوں میں گئے ہو شہری بابو!..... اس نقشے کے بغیر بھٹک جاؤ گے..... سمجھے.....'' وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

وہ دونوں بھول بھلیوں میں داخل ہو گئے۔ مکئی کے پودے اتنے بلند تھے کہ اوپر جا کر ان کے سروں کے اوپر ایک دوسرے سے جڑ رہتے تھے۔ پودوں کے درمیان سے گزرنے والی ہوا سیٹیاں بجا رہی تھی اس کے علاوہ ہر طرف ایک گہری خاموشی کا راج تھا۔ تھوڑی دیر بعد کہیں کسی کوے کی کائیں کائیں کی آواز سنائی دے جاتی۔

''یہ سب کتنا ڈراؤنا اور عجیب ہے.....'' شین بولا۔

''کیا عجیب ہے.....؟'' جینٹ نے پوچھا۔

''پارکنگ میں تقریباً بیس کاریں کھڑی ہیں مگر ہمیں یہاں کسی انسان کی آواز سنائی نہیں دے رہی۔'' شین کے لہجے میں تشویش تھی۔

''یہ بہت وسیع علاقہ ہے اور پھر یہ پودے آوازوں کو جذب بھی کرتے ہیں جس کی وجہ سے زیادہ شور پیدا نہیں ہوتا۔''

''تم تو مکئی کی ماہر لگتی ہو.....'' شین بولا۔

جینٹ کچھ نہ بولی۔ وہ بس نقشے کو پڑھتی اور راستہ تلاش کرتی رہی۔ تقریباً پانچ منٹ بعد وہ لوگ ایک چوراہے پر پہنچ کر رک گئے۔ جینٹ نے مڑ کر پیچھے پھر ادھر ادھر دیکھا اور بڑبڑائی۔ ''یہ درست نہیں ہے.....''

''کیا درست نہیں ہے.....؟'' شین اس کے کندھے کے اوپر جھکا نقشے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''یہ جگہ..... جہاں اس وقت ہم کھڑے ہیں، یہ جگہ نقشے میں کہیں نہیں ہے.....'' جینٹ بولی۔

شین نے اس مقام کو غور سے دیکھا جہاں نقشے پر جینٹ نے انگلی رکھی تھی، پھر مڑ کر پیچھے راستے کو دیکھا اور بولا۔ ''میرا خیال ہے ہم غلط راستے پر مڑ گئے ہیں.....''

''نہیں..... راستہ ٹھیک ہے..... اور پھر یہ نقشہ بھی تو ہے..... میرا خیال ہے ہمیں واپس جانا ہوگا.....''

''نہیں..... اب ہم واپس نہیں جائیں گے۔ نقشہ مجھے دو، میں راستہ تلاش کرتا ہوں.....'' وہ بولا۔

جینٹ نے ناک منہ چڑھاتے ہوئے نقشہ اس کی طرف اچھال دیا۔ ''یاد رکھو..... تم میرے مہمان ہو، میں تمہاری مہمان نہیں.....''

''اے ناراض مت ہو میرا یہ مطلب نہیں تھا.....'' شین جلدی سے بولا۔

''تو کیا مطلب ہے..... کیا تم سمجھتے ہو لڑکیاں نقشہ نہیں پڑھ سکتیں.....''

''میرا یہ مطلب بھی نہیں تھا.....'' شین نے بانہیں پھیلا کر جینٹ کو سینے سے لپٹانے کی کوشش کی۔

''خبردار!.....'' جینٹ غصے سے اسے روکتے ہوئے بولی۔

شین کھسیانا ہو کر رک گیا اور نقشے کو غور سے دیکھتے ہوئے ایک طرف آگے بڑھنے لگا۔ جینٹ اس سے چند قدم پیچھے تھی۔ اس کی غصیلی نگاہیں شین کو اپنی کمر میں دھنستی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ دور کہیں پھر کوا کائیں کائیں کرنے لگا۔ جب وہ چپ ہوا تو شین کو عجیب سی بے چینی محسوس ہونے لگی۔ لوگ کہاں ہیں؟ ان کی آوازیں کیوں نہیں آ رہیں۔ بچوں کے قہقہے، عورتوں کی آوازوں کی کھنک کیوں سنائی نہیں دے رہی۔ جینٹ نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ شین اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس دوران میں وہ ایک بند راستے پر پہنچ گئے تھے۔ سامنے پودوں کی ایک قطار نے ان کا راستہ روک رکھا تھا۔

جینٹ قہقہہ لگا کر طنزیہ انداز میں پوچھنے لگی۔ ''کولمبس!..... کیا ہم انڈیا پہنچ گئے؟''

شین سر کھجاتے ہوئے پر خیال انداز میں نقشے کو

گھورتا رہا پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے..... تم ٹھیک تھیں..... میں غلط تھا، ہم پھنس گئے ہیں۔“

ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے..... واپس چلو.....“ جینٹ ایک ایک لفظ چبا کر بولی۔

”بے وقوف مت بنو..... ہمیں راستہ تلاش کرنا ہے..... ہم اس کی اہلیت رکھتے ہیں..... ہم یہ کر سکتے ہیں.....“ شین فیصلہ کن انداز میں بولا۔

پھر اس سے پہلے کہ جینٹ کوئی جواب دیتی۔ شین اپنے دونوں ہاتھوں سے مکئی کے پودوں کو توڑتا ہوا اور ان کی نشانی لگاتا ہوا آگے چل پڑا۔ ”یہ ایک اولڈ بوائے اسکاؤٹ کا طریقہ ہے۔“ اس نے وضاحت کی۔

”لیکن تم تو کبھی بھی بوائے اسکاؤنٹ نہیں رہے ہو.....“

”ہاں ٹھیک ہے..... لیکن ان کو جانتا تو ضرور ہوں نا.....“

اس دوران میں وہ ایک دفعہ پھر ایک اندھے راستے پر جا پہنچے سامنے راستہ پھر بند تھا۔

شین جھنجھلا گیا اور مکئی کے پودوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ دن کی روشنی دھیرے دھیرے مدھم ہوتی جارہی تھی۔ افق پر چھائے بادل سورج کو تیزی سے نگلتے جارہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے آج معمول سے زیادہ جلدی اندھیرا چھا جائے گا۔ جینٹ اس کے پیچھے بالکل خاموش کھڑی تھی۔ جب اس نے اپنا ہاتھ دھیرے سے شین کے کندھے پر رکھا تو وہ سمجھ گیا کہ جینٹ پریشان ہو چکی ہے۔

”اب تو واپسی کا راستہ ملنا بھی مشکل ہے۔“ وہ بولا۔

جینٹ بے دلی سے مسکرادی۔

شین نے راستہ تلاش کرنے کے لئے ذہن پر بہت زور دیا۔ کوئی نشانی تلاش کرنے کی کوشش کی، مگر جلد ہی اس کو احساس ہو گیا کہ ٹوٹے ہوئے پودوں کی نشانی بھی وہ کھو چکے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ راستہ بھی، مگر جینٹ کے سامنے اس کا اقرار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شین کو فضا میں عجیب سی بدبو کا احساس ہوا۔

”یہ کیسی بدبو ہے.....؟“ وہ بولا۔

جینٹ نے بھی اپنی ناک کو سکوڑ کر سونگھا اور بولی۔ ”یہ تو بہت شدید ہے.....“

”میں شہر میں رہتا ہوں لیکن مگر جانتا ہوں یہ کسی مری ہوئی چیز کی بدبو ہے۔“

”ممکن ہے..... یہ کوئی جانور ہو.....“

”جانور.....؟ مکئی کے کھیت میں کس قسم کے جانور رہتے ہیں۔“

”زیادہ بڑے نہیں..... چوہے..... چھوٹے ہرن..... اودھ بلاؤ وغیرہ.....“

”ہرن بھی.....؟“

”ہاں..... لوگ ان کا شکار کرتے ہیں یا پھر گیدڑ.....“

شین رک گیا..... ”گیدڑ بھی.....“

جینٹ رک گئی..... طنزیہ انداز میں بولی۔ ”کیا اسکاؤنٹ بوائے گیدڑ سے ڈر گیا۔ پریشان مت ہو..... گیدڑ، انسانوں کو کچھ نہیں کہتے۔“

شین نے پنجوں کے بل اچھل کر پودوں کے اوپر سے دوسری طرف جھانکنے کی کوشش کی۔ ”کیا حماقت ہے کوئی نشانی، کوئی کھمبا، کوئی درخت بھی نظر نہیں آرہا۔ سورج بھی غروب ہو گیا ہے۔ سمت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔“ پھر وہ گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”ہم پہلے ہی کافی دیر کر چکے ہیں۔“

جینٹ نے گھور کر اسے دیکھا۔ ”میں تمہیں بتادوں..... میرے والدین وقت کے معاملے میں زیادہ سخت ہیں۔“

”معافی چاہتا ہوں.....“ وہ آگے بڑھ کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے بولا۔

”تم فون کر کے کسی سے مدد کیوں نہیں مانگ لیتے۔“ جینٹ نے تجویز دی۔

”کس کو فون کروں.....؟“

”1122.....“

شین نے اپنی آنکھیں گھمائیں..... ”اور ان کو کیا بتاؤں کہ ہم مکئی کے کھیت میں پھنس گئے ہیں۔ مکئی کی بھول بھلیاں اور بھول بھلیاں کہاں ہیں..... اس کا تو مجھے کوئی اندازہ نہیں۔“

”ان کو بتاؤ اس کا دروازہ دل کی شکل کا ہے اور یہ ہائی وے پر 36 کلومیٹر پر ہے۔ کوئی جانتا ہوگا۔“ جینٹ نے سمجھا۔

”..... اور اگر وہ نہ پہنچے تو.....“ شین کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”..... پھر میرے گھر فون کرو..... میرے والدین کو.....“ وہ غصے سے بولی۔

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے..... میں 1122 پر فون کرتا ہوں۔“ اس نے اپنی جیب سے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر ملانے لگا۔ فوراً ہی روشن اسکرین پر ”نو سگنل“ کا پیغام ابھرنے لگا۔

”اوہ..... ہم سیل فون کے ٹاور کی رینج سے باہر ہیں۔ کیا واہیات علاقہ ہے یہاں فون سگنل کی کوریج بھی نہیں ہے..... مزید کوئی شاندار آئیڈیا.....“ شین کا لہجہ طنزیہ تھا۔ جینٹ نے مایوسی کے عالم میں بے معنی انداز میں سر ہلا دیا۔

شین نے اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر منہ پر رکھا اور زور سے چلایا۔

”..... ارے یہاں کوئی ہے، ہماری مدد کرو.....“

جواب میں مکمل خاموشی تھی۔

”..... یہاں کے لوگوں کو کیا مسئلہ ہے، کوئی جواب کیوں نہیں دیتا۔ کیا میں یہ سارے پودوں توڑ دوں۔“ شین جھنجھلا گیا۔

”میں نہیں جانتی.....“

کووں کی ایک ڈار کہیں سے اڑی.....

”دیکھو.....“ وہ بولا۔ ”پرندے جنوب کی طرف ہجرت کرتے ہیں..... ہیں نا..... ہم ان کے پیچھے چل کر ہائی وے کی طرف جاسکتے ہیں.....“ شین نے تجویز دی۔

”..... کوے ہجرت نہیں کرتے..... شین!..... اور دوسرے پرندے جو ہجرت کرتے ہیں وہ بھی ایسا کئی مہینے پہلے کر چکے ہیں۔“ جینٹ نے اسے سمجھایا۔

کووں نے آسمان پر ایک چکر لگایا اور پھر مڑ کر مکئی کے کھیت میں غائب ہو گئے۔ شین نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور لائٹر نکال لیا۔

”میرے پاس ایک آئیڈیا ہے.....“ وہ لائٹر جلاتے ہوئے بولا، اس کے چہرے پر گہری مسکراہٹ تھی۔ ”میں ان پودوں کو آگ لگادوں گا پھر ہمیں واپسی کا صاف راستہ مل جائے گا۔“

جینٹ گھبرا گئی۔ ”بے وقوف مت بنو..... یہ کھیت بالکل خشک اور پکے ہوئے ہیں۔ یہ جہنم کی آگ کی طرح بھڑک اٹھیں گے اور اپنے ساتھ ہمیں بھی بھسم کر دیں گے، اور اس کی لپیٹ میں آس پاس کے کھیت بھی آجائیں گے۔“

”..... یہ تو بس ایک آئیڈیا تھا۔“ شین نے فوراً لائٹر بجھایا اور واپس اپنی جیب میں رکھ لیا۔

جینٹ ابھی تک غصے میں دانت کچکچا رہی تھی۔ شین نے بازو سے پکڑ کر اس کو اپنے قریب گھسیٹ لیا۔ ”سوری..... لیکن ہم اس طرح تو اپنی چھٹیاں گزارنا نہیں چاہتے تھے۔“

”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے.....“ وہ بولی۔

”اوکے..... میں کچھ کرتا ہوں۔ یوں کرو یہاں سے ایک سیدھ میں پودوں کو توڑتے ہوئے آگے چلو۔ مجھے امید ہے، ہم سڑک یا پارکنگ تک پہنچ جائیں گے۔ یہ صرف مکئی کے پودے ہی تو ہیں، کوئی ٹھوس دیوار نہیں..... ٹھیک ہے.....“

”ہوں..... ٹھیک ہے..... لیکن کس سمت.....؟“ جینٹ نے پوچھا۔

”یہ کوئی مسئلہ نہیں، کسی بھی سمت چلو، ہم اس وقت تک چلتے جائیں گے جب تک باہر نہیں نکل جاتے۔“ شین نے کہا۔

”مسئلہ یہ ہے کہ یہ کھیت میلوں تک پھیلے اور ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ اگر ہم غلط سمت

چل پڑے تو پھر صرف چلتے ہی رہیں گے۔ رات کو سخت ٹھنڈ ہوگی اور پھر جنگلی جانوروں کا بھی خطرہ ہے..... بہت مشکل ہوجائے گی۔'' جینٹ کی آواز میں خوف صاف محسوس ہو رہا تھا۔

جینٹ نے اپنا چہرہ شین کے سینے میں چھپالیا۔ وہ اس کی کپکپاہٹ کو صاف محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''سنو!..... یہ پودوں کی قطاریں سڑک کے متوازی چلتی ہیں۔ جب ہم سڑک سے مڑے تھے تو میں نے یہ چیز نوٹ کی تھی۔ میں سمجھتا ہوں ہمیں قطاروں کی سیدھ میں آگے بڑھنا چاہئے۔ اگر آدھے گھنٹے تک بھی ہم سڑک پر نہ پہنچ پائے تو اس کا مطلب ہوگا کہ ہماری سمت درست نہیں ہے۔ پھر ہم اپنا رخ بدل لیں گے..... ٹھیک ہے نا۔''

جینٹ نے اپنے آنسو پونچھے اور سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ٹھیک ہے..... ایک سمت چن لو۔''

جینٹ نے آس پاس کو غور سے دیکھا پھر ایک طرف بازو پھیلا کر اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے اس طرف چلو.....''

شین مسکرایا۔ ''چلو..... آؤ پھر.....'' اس نے اپنے ہاتھوں کو لہرایا اور پودوں کی قطاروں کو روندنا شروع کردیا۔ جونہی وہ آگے بڑھا، کوئی چیز اس کے ٹخنے پر کھب گئی اور کھال کو کاٹتی چلی گئی، نیچے جھک کر دیکھا تو ایک پتلی سی سفید مگر مضبوط رسی اسی کی ٹانگ سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کو توڑنا چاہا مگر وہ تیز دھار کی طرح اس کے ہاتھ میں اتر گئی۔

''کیا بکواس ہے.....'' جھنجلا کر اس نے پورا زور لگادیا مگر رسی نہیں ٹوٹی۔ ''جینٹ میری مدد کرو اس چیز کو مجھ سے دور کرو۔''

جینٹ نیچے بیٹھ گئی اور رسی کو دیکھنے لگی جس پر کچھ چپچپا لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس پر سے ہاتھ پھسل رہا تھا۔ ''دیکھو اگر کوئی چھڑی مل جائے تو آسانی ہوجائے گی۔'' شین نے مشورہ دیا۔

وہ اٹھی اور ادھر ادھر تلاش کیا، چپ کچھ نہ ملا تو مایوسی کے عالم میں سر ہلاتے ہوئے واپس آگئی۔ گھٹنوں کے بل شین کے پاس بیٹھ گئی۔ مٹھی بھر مٹی اٹھائی اور اس رسی پر ڈال دی۔ اچھی طرح مٹی ڈالنے کے بعد جب اندازہ ہوا کہ اب ہاتھ پھسلیں گے نہیں تو اس نے اس رسی کو پکڑ کر اپنا زور لگادیا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ رسی ٹوٹ گئی۔ شین اپنے زور میں آگے جا کر گرا۔

''یہ کیا مصیبت تھی.....'' وہ جھنجھلا گیا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم یہ کیا ہے.....؟'' وہ بولی۔

شین کھڑا ہوگیا اور اپنی ٹانگ اور لباس کا معائنہ کرنے لگا۔ سارے کپڑوں کا ستیاناس ہوگیا تھا۔ اس نے ہاتھوں کی مدد سے اپنے کپڑوں پر سے مٹی کے داغ ہٹانے کی کوشش کی۔ ''آخر کھیت میں اس طرح کے پھندے لگانا کون سی شرافت ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

جینٹ کی آنکھوں میں خوف در آیا تھا۔ ''ہمیں آگے محتاط رہنا ہوگا.....'' وہ سرگوشی نما آواز میں بولی۔

شین آگے بڑھا تو اس کو اس قسم کی کئی اور رسیاں نظر آئیں۔ اس نے مکئی کے پودوں کو ان پھندہ نما رسیوں کے اوپر اس طرح جھکا دیا کہ وہ ان کے نیچے چھپ جائیں اور پودے کسی گدے کی طرح ان پر بچھ جائیں اور پھر دونوں ان کے اوپر سے گزر گئے۔ پودے ان کے قدموں تلے روندے جاتے رہے۔

''معلوم ہوتا ہے کوئی ہمارے ساتھ کھیل رہا ہے۔ پتہ نہیں اس کا کھیل کیا ہے؟ لیکن ہمیں چلتے رہنا ہے۔ خاموشی کے ساتھ۔'' شین نے مشورہ دیا۔

جینٹ سر ہلا کر رہ گئی۔

شین نے آگے کے پودوں کو توڑنے کی کوشش کی، سفید رسیاں جو پہلے ساکت تھیں، ان پر پودے گرتے ہی وہ کلبلانے لگیں۔ یہی کچھ آگے ہوا۔ شین نے اپنی جاپیوں کا گچھا نکال لیا۔ جس کے ساتھ کی رنگ کے طور پر چھوٹا سا ایک چاقو نتھی تھا۔ شین نے یہ ننھا سا چاقو کھول لیا اور اس کی مدد سے سفید رسیوں کو تیزی کے ساتھ کاٹنے لگا۔

جینٹ اس کے پیچھے ایک خوفزدہ ہرنی کی مانند

کھڑی تھی۔

''شین..... کیا تم نے یہ آواز سنی؟'' اس نے سرگوشی کی۔

''کیسی آواز.....؟''

''سنو.....'' وہ بولی۔

''مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا.....''

''خاموشی سے سنو.....''

شین نے اپنا سر ہلایا۔ ''شاید کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔''

''.....اور شین!..... وہ جلد ہی ہم تک پہنچ جائے گا۔''

شین نے جینٹ کا ہاتھ تھاما اور جلدی سے پودوں کی اگلی قطار میں گھس گیا اور ہر ممکن تیزی اور پھرتی سے سفید رسیوں کو کاٹنے لگا، پودوں کو توڑ کر گرانے لگا مگر ان کی رفتار دھیمی تھی۔ شین کو اندازہ تھا کہ وہ زیادہ دور نہیں جاسکیں گے۔ وہ جینٹ کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھنے لگا۔ جلدی جلدی اس نے کئی ایک موڑ مڑے تاکہ متعاقب کو چکما دے سکے مگر کوئی فائدہ نہیں، صرف جینٹ کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے پھسل گیا۔

شین نے مڑ کر جینٹ کی طرف دیکھا پھر آگے دیکھا سامنے پودوں کی ایک قطار نما دیوار تھی۔ ایک اور اندھا راستہ ان کا راستہ روک چکا تھا۔ وہ رک گیا۔ جینٹ خوف زدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی آگے بڑھتی جارہی تھی اس وجہ سے اس نے سامنے بند رستہ نہ دیکھا اور سیدھی پودوں کی دیوار میں گھستی چلی گئی۔ وہ ان سے ٹکرائی اور اپنی کمر کے بل پودوں کے بیچ گر گئی۔ گرتے ہی اس کی ٹانگوں میں سفید رسی کا پھندہ الجھ گیا تھا۔ جینٹ زور سے چیخی۔ اس کی چیخوں سے سارا ماحول گونج اٹھا۔ شین فوراً جھکا اور جینٹ کو پھندے سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

''جلدی کرو..... ہمارے پاس وقت نہیں ہے.....'' جینٹ سسک اٹھی۔

مکئی کے پودے ان پر جھکے پڑ رہے تھے۔ شین نے ان پودوں کو ایک ہاتھ سے پرے ہٹایا۔ سامنے ایک اور راہداری تھی۔ اس نے جینٹ کے پھندے کی رسیاں کاٹ ڈالیں..... یہ پھندے کوئی اتفاق نہیں تھے کسی کی منظم منصوبہ بندی تھی۔

جینٹ سسک رہی تھی اس کی آواز میں خوف تھا۔ وہ شین کے سینے سے لپٹ گئی۔ اس سے پہلے کہ شین کچھ ردعمل دکھاتا۔ ایک عجیب بات ہوئی اور جینٹ یوں زمین پر پھسلنے لگی جیسے کوئی اسے ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹ رہا ہو۔ شین خوفزدہ ہو کر چند قدم پیچھے ہٹا اور اس سے پہلے کہ کچھ سمجھ پاتا جینٹ پودوں کے بیچ غائب ہوگئی۔ وہ کمر کے بل اس طرح گھسٹتی جارہی تھی کہ رسیوں کا پھندا اس کے پاؤں میں تھا۔ اس کی چیخیں شین کے سینے میں ہتھوڑے کی طرح بج رہی تھیں۔ اس نے کوشش کر کے اپنی سانس کو قابو کیا۔ ''اب کیا کروں..... مدد..... ہاں اب یہی کرنا ہوگا۔ جینٹ درست کہتی ہے کہ ہم مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔'' شین کے ذہن میں ایک ساتھ کئی خیال ابھرنے لگے۔

زمین پر جینٹ کے گھسٹنے کے نشانات کے پیچھے وہ تیزی سے لپکا، نشانات دائیں طرف جارہے تھے۔ اس نے بائیں طرف دیکھا، کیا اس طرف سے مدد کی امید کی جاسکتی تھی یا پھر اس طرف بھی ایک اندھا بند راستہ تھا..... مگر ایک بات طے تھی کہ یہ راستہ اسے جینٹ سے دور لے جاتا تھا۔ کون سی سمت درست تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس فیصلہ کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے، اور وہ یہ کہ اس کو جینٹ کے گھسیٹے جانے کے نشانات کا پیچھا کرنا ہوگا۔ پھر ایک فیصلہ کر کے اس نے اپنا ننھا سا چاقو تان لیا۔ وہ قطعی طور پر اس چیز کو دیکھ نہیں پایا تھا جس نے جینٹ کو گھسیٹا تھا۔ مگر یقیناً وہ کوئی بڑی چیز تھی اور اس کی حرکت بہت تیز تھی۔ اس کا ننھا چاقو بطور ہتھیار قطعی کارآمد نہیں تھا۔

جوں جوں وہ نشانات کے تعاقب میں کھیت کے اندر جارہا تھا، موت کی خوشبو گہری ہوتی جارہی تھی۔ افق پر رات کے سائے گہرے ہوتے جارہے تھے۔ سامنے

کھیت میں ایک نسبتاً کھلی جگہ آ گئی۔ شین ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کھلی جگہ کی دوسری طرف پرندوں کو ڈرانے والے کئی پتلے کھڑے تھے، ویسے ہی جیسے کھیتوں میں کھڑے کئے جاتے ہیں اور پرندے ان سے ڈر کر کھیت سے دور بھاگ جاتے ہیں لیکن یہاں پر ان پتلوں کے کندھوں پر تو کوے بیٹھے ہوئے تھے۔ رات کے بڑھتے سایوں میں وہ پتلے سمندری قزاقوں کی مانند نظر آ رہے تھے۔ جب شین چند قدم اور آگے بڑھا تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ یہ کوئی پرندوں کو ڈرانے والے لکڑی کے ڈھانچے نہیں تھے بلکہ یہ اصل انسانی جسم تھے۔ مرد اور عورتوں کے ڈھانچے، سوکھے ہوئے جسم، منہ اور آنکھوں کی جگہ خلاء۔

ڈھانچوں کی اس فوج کے عقب میں لاشوں کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ سرتاپا عجیب قسم کے بھوسے میں لپٹی، گوشت ادھڑا ہوا، کچھ کی ہڈیاں سلامت تھیں۔ وہ ان کے بیچ جینٹ کو تلاش کرنے لگا۔

وہ سفید باریک رسیوں میں لپٹی ہوئی ایک ڈھانچے کے ساتھ اس طرح لٹک رہی تھی اس کے قدم زمین سے چند انچ اوپر تھے۔ اس کے چہرے پر بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور وہ بے حس و حرکت تھی۔ کیا وہ.....؟ شین اسے آگے سوچ نہ سکا۔

اس نے ادھر ادھر کسی چیز کی تلاش میں نظر دوڑائی جس سے جینٹ کی مدد کر سکے۔ مگر کچھ نہ ملا۔ ننھا چاقو اس کے ہاتھ میں حرکت کرنے لگا۔

"جینٹ....." اس نے سرگوشی کی مگر وہ بے حس و حرکت رہی۔ پھر اس نے قدرے بلند آواز میں اسے پکارا۔ اب جینٹ نے دھیرے سے اپنا سر اوپر اٹھایا۔

"شین..... تم آ گئے....."

"دھیمی آواز میں بولو..... وہ کیا چیز تھی جس نے تمہیں گھسیٹ کر یہاں پہنچا دیا.....؟" شین پوچھنے لگا۔

"میں دیکھ نہیں پائی..... اس کے واپس آنے سے پہلے مجھے یہاں سے اتارو....."

شین لپک کر اس کی طرف بڑھا۔ خطرے کی گھنٹی دماغ میں بجنے لگی، کوے اڑے اور شور مچانے لگے۔ وہ جینٹ کے قدموں کے قریب جھکا اور باریک رسیوں کو ننھے چاقو کی مدد سے کاٹنے لگا۔

"مجھے تمہیں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہئے تھا۔" وہ بولا تو اس کا لہجہ متاسفانہ تھا۔

"اگر تم ایسا نہ کرتے تو تم بھی میرے ساتھ یہیں لٹکے ہوتے..... مجھے جلدی نیچے اتارو....."

شین اس کی پنڈلی کے قریب سے رسی کو کاٹنے لگا۔ وہ سخت تھیں اور چاقو کا بلیڈ کام نہیں کر پا رہا تھا۔ شین نے اس کو زمین پر رگڑ کر صاف کیا اور دوبارہ کام شروع کیا۔ جینٹ چیخی۔ "تیزی سے ہاتھ چلاؤ....."

"تمہیں زخم لگ جائے گا....." شین نے خبردار کیا۔

"..... اس کی پرواہ مت کرو....." اس نے کہا۔ اس کی ٹانگ سے خون رس رہا تھا..... "اوہ..... لگتا ہے کوئی آ رہا ہے..... جلدی کرو..... یہاں سے نکلو....." وہ دوبارہ چلائی۔

شین تیزی کے ساتھ رسی کاٹنے لگا۔

جینٹ کی آنکھیں خوف کے مارے پھیل گئیں۔

"جلدی کرو..... وہ آ رہے ہیں..... اوہ..... میرے خدا..... جلدی کرو..... وہ مجھے کاٹ رہے ہیں۔"

شین نے رسی کاٹ دی۔ جینٹ اچھلنے اور لات پاؤں چلانے لگی۔ شین اس کی دسترس سے دور ہو گیا۔ اسی وقت کوئی چیز دھم سے زمین پر آ گری اور زمین پر جم گئی۔ اس کے گھٹنے کے قریب ایک عجیب الخلقت مخلوق تھی۔ ایک لمبا اور بڑا سا کیڑا، لمبی ٹانگیں مکڑی کی مانند سامنے اس کے منہ سے دو لمبے خم دار دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔ ایسا کیڑا، شین نے پہلے کبھی کہیں نہیں دیکھا تھا۔ اس نے چاقو لہرایا اور پوری قوت سے اس کیڑے کے جسم میں بھونک دیا۔ وہ کیڑا کلبلایا اور پھر حیرت انگیز قوت اور پھرتی سے پلٹا اور اپنی ایک ٹانگ شین کی کلائی پر لپیٹنے کی کوشش کی۔ شین نے اپنا ہاتھ تیزی سے جھٹکا اور چاقو لہرا دیا۔ کیڑا، چاقو کے ساتھ جو اس کے جسم میں پوری

طرح کھبا ہوا تھا زمین سے ٹکرایا اور پھر تیزی سے جینٹ کی ٹانگ پر چڑھنے لگا۔

جینٹ چلانے لگی، مگر کیڑا رسیوں کے اندر گم ہو گیا۔ وہ چیخ اور کانپ رہی تھی۔ شین چند قدم پیچھے ہٹا۔ جینٹ کی آنکھوں میں شین کے لئے التجا تھی کہ کچھ کرو۔ مگر وہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر میں کیڑوں کی ایک فوج نے پوری طرح جینٹ کا سارا جسم ڈھل لیا تھا۔ جینٹ کی کپکپاہٹ اور جسم کی لرزش آہستہ آہستہ رکنے لگی۔

کچھ کیڑے رسیوں کے نیچے سے نکلے اور بھوکوں کی طرح شین کی طرف لپکے۔ ان کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ بھاگ کھڑا ہوا اور اس وقت تک بھاگتا رہا جب تک ٹانگیں تھک نہ گئیں اور پھیپھڑے جلنے نہیں لگے۔ وہ پھر بھی بھاگتا رہا کیونکہ اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ وہ لڑکھڑاتا اور بھاگتا رہا۔ اپنی سانس قابو کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی رفتار سست پڑ رہی تھی۔ اس کا دم ٹوٹنے لگا۔

جب اس کو اپنے پیچھے حرکت سنائی دی اس کی رفتار پھر تیز ہو گئی۔ خوف اس پر پوری طرح حاوی تھا۔ وہ زیادہ تیز بھاگ نہیں پا رہا تھا۔ دم سینے سے باہر آ رہا تھا۔ قوت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔

پھر اچانک، دم توڑتی روشنی میں اس کو سامنے بیرونی محراب نظر آ گئی۔ وہ اس طرف لپکا۔ وہاں پہنچ کر اس نے پلٹ کر کھیت کی طرف دیکھا۔ جینٹ کے والدین ان کا انتظار کر رہے ہوں گے، پریشان اور ناراض۔ آنسو اس کے گالوں پر بہنے لگے۔ اس نے اپنی جیب میں گاڑی کی چابیوں کی تلاش میں ہاتھ مارا تو لائٹر ہاتھ میں آ گیا۔ محراب کے ساتھ لگے لکڑی کے کھمبے پر موجود ڈبے میں سے اس نے بھول بھلیوں کے نقشے نکالے اور ان کو پھاڑ دیا۔ وہ لائٹر جلانے لگا دوسری کوشش میں لائٹر نے شعلہ اگلا۔ شین نے نقشوں کو آگ لگا دیا اور اس کو مشعل کی طرح محراب کے ساتھ لگا دیا۔ مکئی کی محراب ایک دھماکے سے شعلہ پکڑ گئی۔ ویسے ہی جیسا کہ جینٹ نے خبردار کیا تھا۔ اس نے کئی اور جگہ پر بھی کھیت کو آگ دکھا دی۔ یہ کام وہ اس وقت تک کرتا رہا جب تک نقشوں کی مشعل اس کی انگلیوں کو جلانے نہیں لگی۔ ہوا آگ کے شعلوں کو دور کھیت کے اندر دھکیلنے لگی۔ شعلوں کی روشنی میں پارکنگ ایریا میں قرمزی سائے رقص کر رہے تھے۔ شین نے اپنی آستین کی مدد سے اپنی آنکھوں کے آنسو گالوں پر سے صاف کئے۔

شام کے سرمئی آسمان پر آگ اور دھوئیں کے بادل جمع ہو رہے تھے۔ شین بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنی کار کی طرف لپکا۔ شعلے اب پوری طرح کھیت کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ اگر کسی نے آگ اور دھوئیں کو دیکھ لیا تو وہ پولیس اور فائر بریگیڈ کو اطلاع کر دے گا۔ شین نے سڑک پر رکنے کا فیصلہ کیا تاکہ لوگوں کو جلتے کھیت تک پہنچنے سے روک سکے تاکہ شعلے اپنا کام مکمل کر سکیں۔ وہ اس کھیت کے آخری تنکے تک کو جلا دینے کا عزم رکھتا تھا۔

وہ جینٹ کے متعلق لوگوں کو کیا بتائے گا، کیا صفائی دے گا۔ وہ اس کے والدین کا سامنا کیا کر پائے گا اور دوسری لاشوں کے متعلق کیا بتائے گا جو کھیت کے اندر موجود تھیں۔ صفائی دینے کے لئے بہت کچھ موجود تھا، بہت کچھ ناقابل صفائی تھا اور بہت کچھ ناقابل یقین تھا۔ جیسے ہی اس نے کار کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھنے لگا، اس کو کوئی چیز اپنی ٹانگ پر کستی محسوس ہوئی اس نے نیچے دیکھا تو ایک سفید رسی اس کے ٹخنے پر لپٹ رہی تھی رسی نے ایک جھٹکا کھایا اور اس کی ٹانگ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ شین نے ایک گہرا سانس لے کر زور سے اپنا پاؤں زمین پر مارا اور جھٹکے سے رسی سے جان چھڑانے کی کوشش کی مگر اب تو وہ رسی دوسری ٹانگ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ شین ایک جھٹکے سے منہ کے بل نیچے گر گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا کاروں کے بیچ سے ایک بہت بڑا منہ والا کتے جیسا عفریت نمودار ہوا اور شین کی گردن کو اپنے خون آشام جبڑوں میں دبا کر تیزی سے گھسیٹتا ہوا، شعلوں میں لپٹے کھیت کے اندر گم ہو گیا۔

نحوست گزیدہ

ذوالقرنین خان۔کوئٹہ

دودھ سے بھرے پیالے میں تین مٹھی ریت ڈال دی گئی اور جب نوجوان نے اپنے دل پر جبر کر کے اسے چکھا تو دنگ رہ گیا کیونکہ اس سے زیادہ مزیدار چیز اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کھایا تھا.....

عقل کو حیران کرتا نادیدہ قوتوں کا عجیب و پراسرار شاخسانہ جو کہ ناقابل فراموش ہے

اس جہاں میں آتے ہی موت اس کے تعاقب میں لگ گئی تھی۔ مگر وہ بھی قسمت کا دھنی تھا۔ ہمیشہ موت سر پر پہنچ کر پسپا ہو جاتی۔ مگر اس کے ساتھ والے، ہمیشہ گھاٹے میں رہتے۔ اس کی پیدائش کے پہلے دن ہی گھر میں نجانے کیسے خوفناک آگ لگ گئی۔ اس کی ماں بوڑھی دادی اور باپ جل کر خاکستر ہو گئے، اور وہ کمبل میں لپٹا اپنے جھولے میں اس آگ سے محفوظ رہا۔

اس کا نام بابر رکھا گیا، اس کی خالہ جو شادی کے دس سال بعد اولاد سے محروم تھیں اسے اٹھا کر گھر لے آئیں۔ اس کی پیدائش کے ایک ماہ بعد ہلکا سا زلزلہ آیا، پورے شہر کے لئے وہ ضرور ہلکا تھا مگر جس بلڈنگ میں وہ موجود تھا وہ بلڈنگ پوری کی پوری بیٹھ گئی پچاس کے قریب لوگ مر گئے۔ ریسکیو والے ملبہ ہٹا ہٹا کر لاشیں نکال رہے تھے۔

وہ تین دن تک ملبہ ہٹاتے رہے، اور تب ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب 72 گھنٹے بعد ایک گول مٹول انتہائی خوبصورت بچہ انہوں نے ملبے سے نکال لیا جس کے ساتھ ایک دودھ بھری بوتل بھی موجود تھی۔ اس حادثے میں اس کے خالو اور خالہ دونوں راہی ملک عدم ہو گئے۔

اب کی بار اس کے ماموں اور ممانی آگے بڑھے اور اس کو اپنے سینے سے لگا لیا حالانکہ ان کے اپنے بھی دو بچے تھے۔ انہوں نے اسے اپنے بچوں سے بڑھ کر چاہا۔ بچے بھی بہت جلد اس سے مانوس ہو گئے۔ دو سال گزر گئے۔ ایک دن اس کی ممانی اس کو سینے سے لگائے ایک شادی سے واپس آ رہی تھیں۔ اس کے ماموں نے دونوں بچوں کو تھاما ہوا تھا۔ سڑک پار کرتے ہوئے اچانک ایک قریب سے گزرنے والے ٹرک کا رخ تبدیل ہو گیا اور اس کی زوردار ٹکر سے وہ سب اڑ کر دور جا گرے، وہ بھی سڑک کے درمیان میں گرا اور ایک تیز رفتار گاڑی اس کے اوپر سے گزر گئی۔ مگر اسے خراش تک نہ آئی، اس خوفناک حادثے میں بھی وہ اکیلا ہی بچ سکا، باقی جاں بحق ہو گئے۔

اس مرتبہ اس کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں تھا پے در پے حادثات نے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

پورا خاندان اسی لئے اکٹھا ہوا تھا تاکہ اس معاملے کو سلجھایا جا سکے۔ مگر پورا دن گزرنے کے باوجود وہ کسی فیصلے تک نہیں پہنچ سکے، وہ ابھی تک ہسپتال میں تھا۔ ان سب کو بحث و مباحثے میں مشغول دیکھ کر اس کی والدہ کی ایک دور کی جاننے والی ایک بوڑھی خاتون

کھڑی ہوئیں، اور اس کی ذمہ داری اٹھانے کی پیشکش کر کے سب کو حیران کر دیا۔

اصل میں ان خاتون کا کسی سے ملنا جلنا نہیں تھا لوگ انہیں خبطی اور پاگل سمجھتے تھے۔ مگر وہ کہتے ہیں نا کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، تو تمام خاندان والوں کے انکار پر ان خاتون نے حامی بھر لی۔ بابر ہسپتال سے سیدھا ان خاتون کے گھر پہنچا دیا گیا جن کا نام نصرت بیگم تھا نصرت بیگم نے ساری زندگی بیوگی میں گزاری، ان کے شوہر جوانی میں انتقال کر گئے تھے اولاد بھی ان کی کوئی نہیں تھی مگر شوہر سے انہیں ایسی محبت تھی کہ بہت سارے اچھے رشتے آئے مگر دوبارہ انہوں نے شادی نہیں کی۔ اور ساری زندگی عبادت کے لئے وقف کر دی۔ دینی اصولوں پر کچھ اس طرح کاربند ہوئیں کہ لوگ انہیں پاگل اور خبطی خیال کرنے لگے۔

بابر جب ان کے گھر آیا تو دو سال اور چند مہینوں کا تھا۔ نصرت بیگم کو سب سے زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ بابر ابھی چھوٹا تھا اور اس کی دیکھ بھال میں ان کے کپڑے ناپاک ہو سکتے تھے اور اس طرح ان کی عبادت میں فرق پڑ سکتا تھا مگر انہوں نے حیرت انگیز طور پر یہ محسوس کیا کہ بابر نے کبھی کپڑوں میں گندگی وغیرہ نہیں کی۔ جب بھی اسے حاجت ہوتی وہ زور زور سے ماں بولتا اور بیت الخلاء کی طرف اشارہ کرتا۔ اور بھی کئی عجیب و غریب باتیں نصرت بیگم نے محسوس کیں۔ بابر بہت خوش خوراک تھا۔ دودھ بہت شوق سے پیتا تھا۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ وہ فیڈر کو دو، دو گھنٹے منہ سے لگا کر دودھ پیتا رہتا اور دودھ ختم نہ ہوتا۔ اکیلے وہ بہت کھل کھلا کر ہنستا۔ اور عجیب و غریب زبان میں باتیں بھی کرتا۔

ایک مرتبہ نصرت بیگم رات کو تہجد کے لئے اٹھیں تو بابر کو اپنی جگہ سے غائب پایا۔ پورا کمرہ چھان مارا مگر وہ کہیں موجود نہیں تھا۔ کمرے کے دروازے کو کنڈی بھی لگی ہوئی تھی، انہوں نے دروازہ کھول کر صحن میں دیکھا تو بابر باہر موجود تھا۔ اور اس کے جسم پر بہت خوبصورت لباس تھا۔ ہاتھ میں مٹھائی تھامے وہ مزے لے، لے کر کھا رہا تھا۔ نصرت بیگم تو دنگ رہ گئیں۔

صبح ہوتے ہی وہ مولانا ایوب کے پاس پہنچیں۔ اور تمام واقعات ان کے گوش گزار کئے۔ مولانا نے بابر کو ایک نظر دیکھا پھر کچھ پڑھ کر اس پر پھونکا تو اس کی آنکھیں ایک دم سرخ ہو گئیں۔ مولانا کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔ بابر ان کو بہت غصے سے دیکھ رہا تھا حالانکہ وہ صرف چار سال کا تھا۔ مولانا

صاحب نے نصرت بیگم کو گھر بھجوا دیا اور ان کو مغرب کے بعد آنے کو کہا۔

سارا دن وہ اور بابر تنہا کمرے میں رہے اور باتوں کی آواز سنائی دیتی رہی، مولانا صرف ظہر اور عصر کی نماز کے لئے نکلے۔ اس دوران بابر اندر ہی رہا۔ مغرب کے بعد مولانا نے نصرت بیگم سے صرف اتنا کہا۔ ''بابر کوئی معمولی بچہ نہیں اس کے پاس کچھ ایسا ہے جس کی وجہ سے کالی قوتیں، اسے قتل کرنا چاہتی ہیں۔ جو کچھ بھی بابر کے پاس ہے بہت خاص ہے، باقی باتوں کا انہیں پتا نہیں لگ سکا۔'' اتنا انہوں نے بتا دیا قمری مہینے کی بالترتیب 16,15,14 کی رات اس کے لئے خطرناک ہے، انہوں نے کچھ تعویذ دے دیئے اور نصرت بیگم کو ان وظائف کا ورد کرنے کی تلقین کی۔

مولانا ایوب سے ملنے کے بعد عجیب وغریب واقعات کا سلسلہ رک سا گیا اور بابر جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا ویسے ویسے اس کی زندگی متوازن ہوتی چلی گئی۔ نصرت بیگم کی محبت اور خاندان والوں کے تعاون سے وہ میڈیکل کالج میں پہنچ گیا۔ نصرت بیگم نے اسے ماضی کے متعلق صرف اتنا بتایا کہ اس کے والدین فوت ہوئے تو وہ اسے اپنے ہمراہ لے آئیں۔ اور بابر نے بھی مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

ایک دن وہ کالج پہنچا، اسے عجیب سی بے چینی ہو رہی تھی اس کا سبب وہ جاننے سے قاصر رہا تھا۔ ان دنوں کالج میں کرکٹ کے میچ چل رہے تھے اس نے سوچا میچ کھیل کر دل کو بہلایا جائے اس ارادے سے وہ کھیل کے میدان میں پہنچا۔ اس نے دیکھا اس کے کلاس فیلو سہیل نے ہاتھ میں بال پکڑی ہوئی ہے۔ اس نے اشارہ سے بال مانگی جو سہیل نے اس کی طرف اچھال دی۔ بال جیسے ہی سہیل کے ہاتھ سے نکلی بال نے گولی کی رفتار اختیار کر لی اس سے پہلے کہ گیند بابر کی کھوپڑی سے ٹکراتی اسے ایک زوردار جھٹکا لگا اور بال کے راستے سے ہٹ گیا بال اس کے پیچھے کھڑے راشد کے ہاتھ پر لگی اور راشد کے ہاتھ کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔

بابر اور سہیل دونوں ہکا بکا ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے دوسری طرف راشد درد سے دوہرا ہو چکا تھا۔

راشد کو فرسٹ ایڈ دے کر انہوں نے پریکٹیکل روم کا رخ کیا۔ ''یار قسم لے لو۔ میں نے تو بہت آہستگی سے بال تمہاری طرف اچھالی تھی پتا نہیں کیسے یہ سب ہو گیا.....؟''

سہیل نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ ابھی تک سمجھ نہیں پایا تھا یہ سب کیسے ہوا.....؟''

''ہاں یار! اس بات کا گواہ تو میں خود ہوں مگر یہ بات بھی تو حقیقت ہے کہ راشد کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔'' بابر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

وہ انہی باتوں کو سوچتے ہوئے گھر جا رہا تھا، اسے مغرب کی اذان سنائی دی تو وہ قریبی مسجد میں گھس گیا۔ جب وہ نماز پڑھ کر نکلا تو اندھیرا ہو چکا تھا، وہ تیزی سے گھر کی جانب چل پڑا۔ اس دن سردی کافی تھی جب وہ اپنی کالونی میں داخل ہوا تو اکا دکا افراد کے علاوہ اسے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ وہ گھر سے کچھ ہی فاصلے پر تھا کہ اسے کچرا دان کے پاس بیٹھے آوارہ کتوں میں کچھ تبدیلی نظر آئی۔ وہ سب مسلسل اسے گھورے جا رہے تھے۔ حالانکہ وہ روزانہ اسی راستے سے گزرتا تھا اور وہ انہیں ہمیشہ یہیں پاتا۔ وہ تھوڑا سا آگے آیا تو اسے اپنے پیچھے غراہٹوں کی آواز سنائی دی۔ پیچھے جو مڑ کر دیکھا تو خوف کی ایک لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی، وہ چھ کے چھ کتے اس کی طرف بڑھ رہے تھے اور مزید خوفناک بات یہ تھی کہ ان سب کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اور تھوڑی دیر میں اسے اپنی رفتار پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ چند سیکنڈوں میں گھر کے دروازے پر موجود تھا، اس نے دروازہ کھٹکھٹانے کا تکلف کئے بغیر ایک جمپ لگائی اور اگلے لمحے وہ گھر کے اندر تھا۔ نصرت بیگم نے جو یہ صورتحال دیکھی تو گھبرا گئیں۔ بابر نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی مگر اس کی اپنی حالت اتنی خستہ تھی کہ اس

سے کوئی بات نہیں بن پڑ رہی تھی۔ وہ صحن میں چارپائی پر بیٹھ گیا اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کمرے کو تالا لگا ہوا تھا اور نصرت بیگم کے ہاتھ میں برقع تھا اس نے جب اس بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے بابر کو بتایا کہ مولانا ایوب کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ انہی کے گھر سے لوٹی ہیں۔ بابر کی حالت دیکھ کر انہوں نے کوئی بات نہیں کی اور اسے کھانا دیا۔ جب بابر نے سیر ہو کر کھانا کھا لیا تو نصرت بیگم گویا ہوئیں۔

''بیٹا! تم بہت چھوٹے تھے جب تم یہاں آئے تھے، میں نے تمہیں ماں بن کر پالا۔ تمہارے حوالے سے میرے مشاہدے میں کافی عجیب وغریب واقعات آئے۔ اب میرا خیال ہے کہ ان کے بارے میں تمہیں آگاہ کر دیا جائے۔''

اور پھر تفصیل سے نصرت بیگم نے تمام واقعات بابر کے گوش گزار کر دیئے۔ جنہیں وہ سن کر کافی حد تک خوفزدہ ہو گیا۔

بابر نے آج کے واقعات کے بارے میں جب نصرت بیگم کو بتایا تو ان کا رنگ ہلدی کی مانند زرد پڑ گیا۔ ساری بات انہیں سمجھ آ گئی۔ ان دیکھی طاقتوں کو جنہیں مولانا کے تعویذوں اور نصرت جہاں کے وظیفوں نے باندھ کر رکھا تھا وہ دوبارہ سے میدان عمل میں کود پڑی تھیں۔ سردست اس کا کوئی حل نصرت بیگم کے پاس نہیں تھا۔

صبح کے وقت پورے علاقے میں کہرام مچا ہوا تھا دس سے زیادہ لوگوں کو پاگل کتوں نے کاٹ لیا تھا۔ چار کتوں کو تو مار دیا گیا تھا، دو کتے تا حال آزاد تھے۔ گلیوں، علاقے میں لاؤڈ اسپیکر پر لوگوں کو ان کتوں سے احتیاط برتنے کا کہا جا رہا تھا۔

بابر کو ڈراؤنے خواب دکھائی دینے لگے تھے۔ اکثر اسے خواب میں ایک سیاہ رنگ کا خوفناک شیر دکھائی دیتا جس سے بچنے کے لئے وہ ایک لق ودق صحرا میں بھاگ رہا ہوتا۔ جب کبھی وہ تنہا ہوتا تو اسے ایک سایہ دکھائی دیتا جو کبھی اس کے سامنے سے تیزی سے گزرتا کبھی دائیں سے کبھی بائیں سے۔ اس کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی تھی۔ نہ رات کو چین نہ دن میں اطمینان، ہر وقت خوف کی چادر اس کے سر پر تنی رہنے لگی تھی۔

نصرت بیگم بابر کی یہ حالت دیکھ کر کڑھتی رہتیں اس کے غم میں انہوں نے کھانا پینا تک چھوڑ دیا اور بیمار پڑ گئیں۔ بابر سے ان کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ ایک تو وہ ہونے والے انہونے واقعات کی وجہ سے پریشان تھا۔ دوسرا نصرت بیگم کی بیماری نے اس کو توڑ دیا تھا۔ وہ ان سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اس نے طے کیا، اب وہ اپنی کسی پریشانی کے بارے میں نصرت بیگم کو نہیں بتائے گا۔ اور ان کے سامنے خوش رہنے کی کوشش کرے گا اور اس کی یہ کوشش بار آور ثابت ہوئی۔ نصرت بیگم ٹھیک ہونے لگیں۔ بابر نے بھی پراسرار واقعات پر دھیان دینا چھوڑ دیا ویسے بھی وہ اس حوالے سے پر اعتماد تھا۔ وہ جو بھی کوئی تھا ابھی تک اس کا کچھ نہیں بگاڑ پایا تھا۔ اس کا یہ اعتماد ریت کے گھروندے کی مانند کچھ دنوں بعد ہی زمین بوس ہو گیا۔

جب وہ ایک رات نصرت بیگم کی دوائی لانے کے لئے نکلا۔

میڈیکل اسٹور سے واپسی پر گلی میں گھپ اندھیرا تھا۔ بہت دور گلی میں ایک بلب اپنی زرد روشنی سے گلی میں اجالا کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی سوچوں میں گم گھر کی طرف جا رہا تھا جیسے ہی وہ اس جگہ کے قریب پہنچا، جہاں بلب جل رہا تھا اسے ایک سایہ اپنی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا وہ سایہ تیر کی طرح اس کی طرف آیا اور اس کے جسم سے آر پار ہو گیا۔

ایک انتہائی سرد لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی، اس کے بازو اور ٹانگیں شل ہو کر رہ گئے، وہ وہیں گر گیا۔ ہوش کی دنیا سے اس کا رابطہ منقطع ہو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں خوشگوار ٹھنڈ تھی۔ سامنے موجود گھڑی پر اس نے نظر ڈالی تو صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ اس نے

انگڑائی لینا چاہی تو اس کے ہاتھ کو ایک جھٹکا لگا، ساتھ ہی درد کی ایک ٹیس اٹھی، تب اسے معلوم ہوا کہ اسے ڈرپ لگی ہوئی ہے۔ وہ آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا اس کو اپنے جسم میں شدید نقاہت محسوس ہوئی۔ اسے اپنا معدہ بھی خالی خالی سا لگا۔ اپنے بازوؤں پر اسے عجیب وغریب نشانات نظر آئے۔ کچھ دیر وہ بیٹھا رہا مگر اب اسے تھکن محسوس ہونے لگی تھی، وہ دوبارہ لیٹ گیا۔ اور گزشتہ رات والے واقعے کے بارے میں سوچنے لگا۔

''اوہ! کتنی خوفناک ٹھنڈ اس کے جسم کے اندر داخل ہوئی تھی۔'' بے اختیار اس کے منہ سے آہ نکلی۔ آنکھیں موندے وہ انہی سوچوں میں غلطاں وپیچاں لیٹا تھا کہ اسے اپنی آنکھوں پر نمی کا احساس ہوا، اس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ ایک جوان نرس ہاتھ میں روٹی اور پانی کا کٹورا پکڑے کھڑی تھی۔ بابر کو یوں آنکھیں کھولتا دیکھ کر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں سے شدید حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کو یوں بت بنا دیکھ کر بابر نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا اور بولا.....

''کیوں؟ مس! آپ نے کبھی کسی مریض کو نیند سے بیدار ہوتے نہیں دیکھا.....؟''

بابر کی یہ بات سن کر وہ نرس جیسے ہوش کی دنیا میں آ گئی مگر اگلے ہی لمحے نرس کا جواب سن کر بابر کو ایسا لگا جیسے اس کے سر میں دھماکے ہو رہے ہیں۔ اس کا دماغ سن ہو کر رہ گیا تھا۔

نرس نے جواب میں کہا تھا۔ ''تین سال بعد کسی مریض کو یوں اچانک کومہ سے باہر آتے دیکھ کر حیران ہونا فطرتی عمل ہے۔''

بابر کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ تین سال تک سویا رہا اس رات کو بیتے تین سال ہو گئے۔ اسے فوراً ،اماں بی یعنی نصرت بیگم یاد آئیں، نجانے وہ کس حال میں ہوں گی؟ وہ تو اس کی چھوٹی سی پریشانی پر بے حال ہو جاتی تھیں۔ اور یہ تین سال انہوں نے کیسے گزارے ہوں گے.....؟ اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ نرس کب وہاں سے گئی اور کب ڈاکٹر کو لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔

ڈاکٹر پر نظر پڑتے ہی اسے جھٹکا لگا کیونکہ ''وہ سہیل تھا اس کا جگری دوست۔''

سہیل کو بابر نے پہلی نظر میں پہچان لیا۔ حالانکہ پہلے کے مقابلے میں اس کا جسم فربہ ہو چکا تھا۔ سر کے بال گر چکے تھے، آنکھوں پر عینک آموجود ہوئی تھی مگر پھر بھی بابر نے اسے فوراً شناخت کر لیا۔ سہیل جذبات میں آگے بڑھا اور بابر کے گلے لگ گیا۔ سہیل کی اس محبت نے بابر کو چند لمحوں کے لئے ششدر کر دیا۔ کافی دیر بعد وہ جذبات کی اس لہر سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔

تھوڑی دیر بعد سہیل کسی کو فون کر کے ہسپتال آنے کا کہہ رہا تھا۔ ''یار! میری ،اماں بی کا کیا حال ہے، کیسی ہیں وہ.....؟'' بابر نے بے قرار ہو کر سہیل سے پوچھا۔

''یار! وہ بالکل ٹھیک ہیں مگر تیری بیماری نے انہیں بہت کمزور کر دیا ہے، تیرا کومہ سے باہر آنے کے بارے میں انہیں ہم مرحلہ وار بتائیں گے کیونکہ کوئی بھی بہت خوشی کی خبر یا غم ان کے دل کی حرکت کو روک سکتا ہے۔'' سہیل نے بابر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپتھپایا۔

''اچھا تو یوں کر جلدی سے لیٹ جا اور یوں ظاہر کر جیسے تو سو رہا ہے، اور جب تک میں نہ کہوں آنکھیں نہ کھولنا اور نہ ہی کوئی حرکت کرنا۔'' سہیل نے جلدی سے کہا اور ساتھ ہی بابر کو چادر اوڑھا دی۔

بابر کو کچھ سمجھ نہیں آیا مگر وہ لیٹ گیا اور آنکھیں موند لیں۔ تھوڑی دیر بعد کوئی کمرے میں داخل ہوا۔ آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی لڑکی ہے۔ تھوڑی دیر سہیل اس سے باتیں کرتا رہا۔ پھر وہ دونوں بابر کی طرف آ گئے۔ ''اٹھ جا ڈرامے بازی بند کر۔'' سہیل نے گونج دار آواز میں کہا۔

اگلے ہی لمحے بابر اٹھ بیٹھا۔ اسے یوں اٹھتا دیکھ کر اس لڑکی نے چیخ ماری اور سہیل سے لپٹ گئی اور

رونے لگی۔ بابر بھی اس لڑکی کو پہچان چکا تھا وہ حنا تھی۔ کافی دیر بابر اور سہیل اس کو چپ کرواتے رہے تب جا کر وہ نارمل ہوئی۔ ''ڈاکٹر حنا صاحبہ باقی سب تو ٹھیک ہے۔ یہ سہیل صاحب سے بلا جھجک لپٹ جانا کچھ سمجھ نہیں آیا۔'' بابر نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

بابر کی بات سن کر سہیل اور حنا دونوں مسکرا دیئے۔

''محترم بابر صاحب! اب یہ ڈاکٹر حنا سہیل ہیں۔ ایک سال ہو گیا ہے ہماری شادی کو۔'' سہیل نے مسکراتے ہوئے باہر کو آگاہ کیا۔

''یا میرے خدا! اس گنجے کے علاوہ تمہیں اور کوئی نہیں ملا تھا۔ اور تمہارے اس فیصلے میں اس کی لمبی ناک بھی حائل نہ ہوئی جس پر اب عینک بھی براجمان ہو چکی ہے۔ بابر نے شرارت سے کہا تو اس کی بات سن کر حنا نے ایک زبردست قہقہہ لگایا۔ سہیل بھی ہنس پڑا۔

کافی دیر تک وہ ماضی کی باتیں کرتے رہے بلکہ وہ دونوں بابر سے ماضی کی باتیں سنتے رہے۔ کیونکہ اس سے ان کا ماضی ایک رات کے فاصلے پر تھا جبکہ وہ خود اپنے ماضی سے تین سال دور تھے۔

اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود وہ دونوں اس کے پاس آ جاتے اور وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلتا۔ دو ہفتے گزر گئے۔ بابر پہلے کی طرح تندرست ہو گیا۔ اس نے ہلکی پھلکی ورزش بھی شروع کر دی تھی مگر اماں بی تا حال اس سے ملنے نہیں آئی تھیں۔ وہ جب بھی سہیل سے کہتا تو وہ اسے اماں بی کے کمزور دل کا بتا کر خاموش کر دیتا مگر آج جب اس نے سہیل سے اسے بارے میں بات کی تو وہ تھوڑی دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا جب گویا ہوا تو اس کی آواز بابر کی سماعتوں پر بجلی بن کر گری وہ اسے بتا رہا تھا۔ ''اماں بی کو فوت ہوئے دو سال ہو چکے ہیں۔''

جب بابر کو ہسپتال لایا گیا تھا، اس کی حالت بہت نازک تھی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی اکڑ گئی تھی اور ناف سے نیچے کے تمام اعضاء نے کام چھوڑ دیا تھا۔ اس کے پورے جسم میں ایک ان دیکھی اور پراسرار ٹھنڈ نے ڈیرا جما لیا تھا۔ وہ ٹھنڈ آہستہ آہستہ تمام جسم پر مسلط ہو رہی تھی۔

اماں بی کو جب ڈاکٹروں نے بتایا کہ بابر کی بیماری انہیں سمجھ نہیں آ رہی اور وہ صرف چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ تو اماں بی کچھ کہے سنے بغیر کہیں چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد بابر کے جسم کی ٹھنڈ ختم ہونا شروع ہو گئی۔ تین دن بعد اس کا جسم نارمل ہو گیا مگر اس دوران وہ کومہ میں چلا گیا۔ اماں بی مہینے میں ایک مرتبہ اسے دیکھنے آتیں۔ وہ دن بدن کمزور ہوتی چلی گئیں۔ ایک سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

تمام بات سننے کے بعد بابر سکتے میں آ گیا۔ دنیا میں اس کا واحد سہارا بھی چھن چکا تھا۔ وہ بلک بلک کر رونا چاہتا تھا۔ آہ وگریہ کی ان انتہاؤں کو چھونا چاہتا تھا جنہیں آج تک کوئی نا چھو سکا ہو۔ آنسوؤں کا ایک سمندر آج وہ بہانا چاہتا تھا مگر اس کی آنکھیں خشک تھیں، چاہ کے بھی وہ رو نہیں پا رہا تھا۔ تھوڑی دیر وہ سکتے کی کیفیت میں رہا، پھر اس کے سر میں دھماکے شروع ہو گئے ہوش کی دنیا سے اس کا رابطہ منقطع ہوتا چلا گیا۔

سہیل اسے جھنجھوڑ رہا تھا، اسے اتنے شدید رد عمل کی توقع نہیں تھی مگر سب لاحاصل رہا۔ جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ وہ بھاگا اور ایک بہت سنیئر ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد جب اسے بتایا کہ بابر صرف بے ہوش ہے اور جلد ہوش میں آ جائے گا تو سہیل کی جان میں جان آئی۔

ایک ہفتہ بعد بابر کو ہسپتال سے جانے کی اجازت مل گئی۔ سہیل اس کو اپنے گھر لے آیا۔ بابر نے بارہا کہا کہ وہ اپنے گھر جائے گا مگر سہیل نہ مانا۔ بابر روزانہ اماں بی کی قبر پر جاتا اور گھنٹوں وہیں بیٹھا رہتا۔

ایک دن بابر گھر پہنچا تو اس نے دیکھا، سہیل کا منہ سوجھا ہوا ہے۔ کان بھی شدید زخمی تھے، اور سر پر بینڈج تھی۔ یہ کرب ناک صورتحال دیکھ کر بابر چکرا گیا۔ وہ تیزی سے سہیل کے پاس پہنچا۔

"یہ سب کیا ہے؟ کس نے کی تمہاری یہ حالت.....؟" بابر نے بے قراری سے پوچھا۔ سہیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس وہ افسردگی سے مسکرادیا۔ اپنے محسن کی یہ حالت دیکھ کر بابر کا بس نا چلتا تھا کہ کیا کر بیٹھے.....

سہیل کا جبڑا شدید زخمی تھا۔ وہ بولنے سے قاصر تھا۔ حنا بھی شدید دکھ کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ میڈیا اور دوسرے ذرائع سے اسے معلوم ہوا کہ بابر نے ہسپتال میں ایک مریض کو انجکشن لگایا تھا، اس انجکشن کے اثر کی وجہ سے مریض پر تشنج کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور کچھ دیر بعد وہ مرگیا۔

مریض کے ورثاء کو جب اس واقعے کا علم ہوا تو انہوں نے ہسپتال پر دھاوا بول دیا اور بابر کو بے تحاشا مارا پیٹا۔ مریض کے کچھ رشتہ داروں نے پارکنگ میں کھڑی بابر کی گاڑی تک رسائی حاصل کی اور اس کو آگ لگا دی۔ بڑی مشکل سے پولیس نے مداخلت کر کے اس صورتحال پر قابو پایا۔ مظاہرین اس مطالبے پر منتشر ہوئے۔ کہ متعلقہ ڈاکٹر کو معطل کر کے اس کے خلاف مقدمہ چلایا جائے۔ اس طرح سہیل کی نوکری چلی گئی۔

بابر ان کی اس مصیبت میں صرف تماشائی بنا ہوا تھا۔ ایک دن وہ گھر سے نکلا اور پھر نہیں پلٹا۔ سہیل کو اس کے یوں چلے جانے کا دکھ تو بہت ہوا مگر اس کی اپنی پریشانیاں اتنی تھیں کہ وہ جلد ہی اپنے کاموں میں لگ گیا۔

حنا نے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ سہیل کا ڈاکٹری کے شعبے سے دل ٹوٹ چکا تھا اس نے ایک کالج میں لیکچرار کی جاب کرلی اور گزر بسر ہونے لگا۔

بابر اس دن قبرستان سے واپس آرہا تھا، راستے میں اسے ایک مجذوب ملا۔ بابر نے اپنی جیب سے ریزگاری نکالی اور مجذوب کے کشکول میں ڈال دی۔ مجذوب نے سر اٹھا کر بابر کی طرف دیکھا اور غصے سے اس کی ریزگاری اس کے منہ پر دے ماری اور ساتھ ہی زور سے بولا۔

"تو دفع کیوں نہیں ہوجاتا اپنی نحوست لے کر اور کتنوں کو کھائے گا۔ جا کہیں دور چلا جا۔"

بابر کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ کچھ نہیں بولا اور خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس کے ذہن میں ایک جھماکہ سا ہوا وہ پلٹ کر بھاگا اور اس جگہ پہنچ گیا جہاں مجذوب بیٹھا تھا مگر اب دور دور اس کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ اب وہ اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ اسے چند لمحے پہلے مجذوب کی بات سمجھ کیوں نہیں آئی۔ وہ واقعی منحوس تھا بچپن سے لے کر آج اس کے چاہنے والے موت سے ہمکنار اور برباد ہوتے آئے تھے۔ سہیل کی مصیبتیں بھی اس کے مرہون منت تھیں۔

اس نے فیصلہ کیا اب وہ کبھی سہیل کی طرف نہیں جائے گا۔ وہ مرکزی شاہراہ کی طرف چل دیا۔ منزل تو اس کی کوئی تھی نہیں وہ بے سمت چلے جارہا تھا، ایک بس اس کے پاس رکی اس میں سے مسافر اتر رہے تھے۔ کنڈیکٹر نے اسے اشارہ کیا۔ بے مقصد وہ بس پر چڑھ گیا۔ "کہاں اترنا ہے بابو؟" کنڈیکٹر نے اس سے پوچھا۔

"تمہارا آخری اسٹاپ کون سا ہے؟" کنڈیکٹر کے سوال کا جواب دینے کے بجائے بابر نے سوال کیا۔ بس کے جھٹکے میں اسے سمجھ نہیں آیا کنڈیکٹر نے کیا جواب دیا اور اس نے ٹکٹ کٹوالیا۔

بس چلتی رہی، وہ کھڑکی سے سر ٹکائے ماضی کے دلخراش واقعات کو سوچتا رہا۔ اس کا مستقبل کیا تھا؟ آگے کی زندگی اس کی کیسے گزرے گی وہ انہی خیالات میں گم تھا کہ کنڈیکٹر کی آواز نے اسے چونکا دیا جو اس کو بس سے اترنے کا کہہ رہا تھا۔ بس ایک قہوہ خانے کے سامنے کھڑی تھی کچھ دور چند گھر موجود تھے باقی تاحد نظر ریت ہی ریت تھی۔ شام کا وقت تھا سورج غروب ہونے والا تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اسے بھوک محسوس ہوئی تو وہ قہوہ خانے کی طرف بڑھا مگر یہ دیکھ کر وہ مایوس ہوگیا کہ وہ قہوہ خانہ کم چوپال زیادہ تھا آٹھ دس لوگ وہاں بیٹھے تھے اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اندر ایسا کوئی انتظام نہیں تھا جس سے

ظاہر ہو رہا تھا کہ وہاں قہوہ بنتا ہے یا کھانا پکتا ہے۔ غالباً وہ لوگ کسی قریبی گھر سے قہوہ بنا کے لائے تھے جو ایک کیتلی میں ان کے سامنے موجود تھا۔ اسے اندر آتا دیکھ کر وہ سب کھڑے ہوگئے اور بہت گرم جوشی سے ملے۔ جب انہوں نے جاننا چاہا کہ وہ وہاں کس مقصد سے آیا ہے تو اس نے راستہ بھول جانے کا بہانہ کر کے انہیں مطمئن کردیا۔ انہوں نے اس کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

رات کو اس کے لئے وہیں بستر کا انتظام کردیا گیا۔ جب وہ اپنے بستر پر دراز ہوا تو آسمان دیکھ کر دنگ رہ گیا، کھلے آسمان تلے سونے کا اس کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ کروڑوں ستارے اس کے سامنے موجود تھے۔ صحرا کی ٹھنڈی ہوا نے اور جھلمل کرتے تاروں نے اسے ماضی کی یاد مستقبل کا خوف سب کچھ جلا دیا۔ اس کا دل چاہا کہ یہ وقت تھم جائے، رات کبھی ختم ہی نہ ہو۔ اتنے خوبصورت لمحات کا وہ شہری زندگی میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

آسمان کو تکتے تکتے نجانے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔

اس کی آنکھ بارش کی وجہ سے کھلی۔ جب وہ سویا تھا تو آسمان بالکل صاف تھا مگر اب ہر طرف کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بستی والے بھی بھاگ گئے تھے، وہ اپنے ڈھور ڈنگروں کو بارش سے بچانے کی تدبیریں کررہے تھے بچے آدھی رات کو بارش میں نہانا شروع ہوگئے تھے حالانکہ بابر کو کافی ٹھنڈ محسوس ہورہی تھی، وہ اٹھ کر اندر کمرے میں چلا گیا، ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ایک زوردار کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا چند لمحوں کے لئے تو بابر کے ہوش وحواس گم ہوگئے، کچھ دیر بعد وہ اٹھا تاکہ صورتحال کے بارے میں جان سکے۔ باہر نکلا تو دیکھا ہر طرف آہ وفغاں کا سماں ہے لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔

آسمانی بجلی گری تھی، بستی والوں کے سارے پالتو جانور مرگئے تھے، بارش سے محفوظ رکھنے کے لئے انہوں نے ایک جگہ باندھے تھے، ان کی جھونپڑیوں میں بھی آگ لگ چکی تھی۔

بستی کے ایک دو لوگ بابر کا حال احوال پوچھنے آگئے حالانکہ ان کے اپنے گھر جل رہے تھے۔ وہ اسے بتا رہے تھے ان کی زندگی میں بلکہ ان کے پرکھوں کی زندگی میں بھی اس طرح کا واقعہ پیش نہیں آیا۔ پتا نہیں یہ سب کیا ہوگیا تھا، وہ اسے اپنے اعمال کی سزا سمجھ رہے تھے مگر انہیں نہیں معلوم تھا کہ بابر ان میں موجود ہے۔ یہ بات بابر دھماکے کے فوراً بعد ہی سمجھ گیا تھا، وہ راتوں رات بستی سے نکلا اور صحرا کی طرف چل پڑا۔ وہ صحرا میں اتنا دور نکل جانا چاہتا تھا کہ اس کے دل میں واپسی کا خیال بھی آئے تو وہ واپس نہ آئے بلکہ سسک سسک کر وہیں مرجائے۔

دوپہر تک وہ چلتا رہا۔ سورج آگ برسا رہا تھا صحرا کی ریت انگاروں کی مانند دہکنے لگی تھی، اس سے بھی بڑی مصیبت ہوا تھی جو اس گرم ریت کو اڑا کر اس کے جسم تک پہنچا رہی تھی۔ پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے پڑگئے تھے۔ اس کی زبان بالکل خشک ہوچکی تھی۔ بالآخر ایک جگہ نڈھال ہوکر گرگیا اور موت کا انتظار کرنے لگا۔ جو اسے دبوچنے کے لئے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک اس کے کانوں میں گھونگروؤں کی گونجتی ہوئی آواز سنائی دی کوئی اس کے قریب آرہا تھا اسے خیال آیا شاید یہ موت ہے مگر پھر اسے اپنے خیال کو رد کرنا پڑا کہ موت ہمیشہ دبے پاؤں آتی ہے۔

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے اس کا سر اپنی گود میں رکھا، اس نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا، ایک بوڑھا شخص اسے نظر آیا جو اپنے ہاتھ میں پکڑی چھاگل کھول رہا تھا۔ پانی دیکھ کر اس کے حواس یکدم بیدار ہوگئے اور اس نے بے صبری سے چھاگل اس بوڑھے سے چھین لی اور چھاگل کو منہ سے لگالیا اس جلد بازی میں پانی کا کچھ حصہ سانس کی نالی میں چلا گیا۔ اور اسے شدید کھانسی کا سامنا کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد، اس کی حالت ٹھیک ہوئی

تو اسے بوڑھے کی آواز سنائی دی جس نے ہاتھ میں گھونگروؤں سے مرصع عصا پکڑا ہوا تھا۔ ”چلو یہاں بہت گرمی ہے اندر جھونپڑی میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ بوڑھے نے کہا۔

بابر گرمی سے نڈھال تھا، اس نے بوڑھے کی بات کو غنیمت جانا اور جلدی سے اٹھ کر اس کے ساتھ روانہ ہوگیا مگر اسے حیرت اس بات کی تھی جب وہ یہاں پہنچا تھا تو اسے دور دور تک سوائے ریت کے کچھ دکھائی نہیں دیا تھا پھر یہ جھونپڑی کہاں سے وجود میں آگئی تھی؟ جب وہ جھونپڑی میں داخل ہوا تو اسے لگا گویا وہ کسی اے۔سی لگے کمرے میں آگیا ہو۔ جھونپڑی میں گرمی کا ذرا بھی اثر موجود نہیں تھا بلکہ ایک خوشگوار ٹھنڈک تھی جس نے بابر کے رگ وپے میں سرور کی کیفیت طاری کردی تھی۔ بوڑھے نے اسے ایک طرف بچھی چارپائی پر بیٹھنے کو کہا جب وہ بیٹھ چکا تو بوڑھے نے ایک پیالہ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ پیالے میں دودھ تھا، وہ پیالہ منہ کے قریب لے جارہا تھا کہ بوڑھے نے اسے اشارے سے منع کیا اس سے پہلے کہ بابر کچھ سمجھتا بوڑھے نے ریت مٹھی میں بھری اور پیالے میں ڈال دی یہ عمل اس نے تین بار دہرایا۔ پھر ایک چمچ بابر کے حوالے کیا اور مسکرا کے بولا۔ ”لو کھاؤ اس دنیا کی لذیذ ترین چیز۔“ ”شکر پرس“۔

بابر ہونقوں کی طرح بوڑھے کو دیکھ رہا تھا۔ بوڑھے نے اس کو یوں اپنی طرف گھورتے دیکھا تو اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”برخوردار! تھوڑا سا چکھ تو لو۔ بہت کم لوگوں کو یہ نصیب ہوا ہے۔“

بابر منہ سے کچھ نہ بولا، اس نے بوڑھے کا دل رکھنے کے لئے پیالے کو منہ سے لگالیا۔ ایک ایسی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی جس کے سامنے دنیا کی تمام خوشبوئیں ہیچ تھیں۔ ریت اور دودھ ملے اس شے کی لذت نے تو بابر کو مدہوش کردیا۔ بابر کا دل چاہ رہا تھا، وہ پیالہ کبھی ختم نہ ہو۔ اتنی لذیذ چیز کا تصور بھی وہ نہیں کرسکتا تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ اپنے آپ کو بہت توانا اور چست محسوس کررہا تھا۔ پیالے کو انگلی سے چاٹتے ہوئے اس کی نظر بوڑھے پر پڑی جو اس کو بہت دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پیالہ ایک طرف رکھ دیا اور بولا.....

”میں اپنے محسن کا نام جان سکتا ہوں.....“

”کیوں نہیں، میں مسنام ہوں۔“ بوڑھے نے اسے اپنا نام بتایا۔

”آپ یہیں رہتے ہیں؟“ بابر نے پھر سوال کیا۔

”نہیں میں یہاں تمہاری مدد کے لئے بھیجا گیا ہوں۔“ بوڑھے نے نرمی سے جواب دیا۔

”مدد کے لئے آپ کو کس نے بھیجا ہے اور کیوں.....؟“ بابر نے حیرت سے پوچھا۔

”بس تم اتنا سمجھ لو برخوردار کہ میں روشنی کا نمائندہ ہوں اور ہم تاریکی کے خلاف لڑتے ہیں۔ اس وقت تاریکی والے تمہاری جان کے درپے ہیں۔ تمہاری حفاظت بہت ضروری ہے تمہارے پاس ایک ایسی چیز ہے جو بے شمار لوگوں کے انسانوں کو خطرے میں ڈال سکتی ہے۔“ بوڑھے نے شفقت سے کہا۔

”روشنی تاریکی مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا اور میرے پاس وہ کیا چیز ہے؟“ بابر نے کوفت بھرے لہجے میں کہا۔

بوڑھے نے بابر کی بے چینی بھانپ لی اور بولا۔ ”تو تفصیل سے سنو۔“

”روشنی! نیکی کی علامت ہے، روحانیت کا نشان ہے، جب کہ تاریکی بدی کو ظاہر کرتی ہے۔ جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ تمہارے پاس کیا ہے؟ جس سے بے شمار لوگوں کو خطرہ ہے۔ تو میں تم کو شروع سے بتاتا ہوں۔“

یہ کہہ کر بوڑھا خاموش ہوگیا۔ اور خلاء میں کسی بھی غیر ماورائی نقطے پر نظریں مرکوز کردیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ذہن میں گزشتہ واقعات کو ترتیب دے رہا ہو۔ پھر اس نے ایک لمبی سانس بھری اور گویا ہوا۔

”تم اماوس کی رات پیدا ہوئے، اس رات چاند

گرہن تھا اور عجیب بات یہ کہ وہ ایک خاص قسم کا گرہن تھا جس میں چاند کا رنگ کالے کے بجائے بھورا ہوجاتا ہے۔ تمہارے پیدا ہونے سے چند منٹ پہلے زاپالا قید سے بھاگ نکلی تھی۔ وہ اپنی دنیا کی طاقتور ترین ہستی تھی، دھوکے سے اسے قید کرلیا گیا تھا مگر اس رات اسے موقع مل گیا وہ تمہاری دنیا کی طرف نکل آئی۔ تمہارے گھر پر سے گزرتے ہوئے وہ ایک کالے جال میں پھنس گئی جو غازق سحر سے بنا گیا تھا۔ دوبارہ گرفتاری سے بچنے کے لئے زاپالا نے اپنی تمام طاقت تمہارے اندر سمودی۔

اماوس کی رات! گرہن لگے رات میں پیدا ہونے کی وجہ سے تمہارے جسم نے اس تمام طاقت کو جذب کرلیا اس وقت زاپالا کو پکڑنے کے لئے کالی طاقتیں وہاں پہنچ گئیں، اور انہوں نے بہت زوردار حملہ کیا۔ تمہارے ماں باپ تو وہیں جل کر بھسم ہوگئے مگر تم پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ اس کے بعد تم پر بے شمار حملے کئے گئے جس کا شکار دوسرے لوگ ہوتے رہے مگر ہر بار تم بچتے رہے، اور اس کی صرف ایک وجہ تھی اور وہ تھی زاپالا کی تم پر بھرپور نظر۔ زاپالا تمہیں تو بچا لیتی مگر تمہارے ساتھ جڑے لوگوں کو نہیں بچاپاتی تھی۔

آہستہ آہستہ زاپالا کمزور ہونے لگی اور پھر وہ غائب ہوگئی مگر تب تک ہم دشمن کو اور اس کے طریقہ واردات کو کافی حد تک سمجھ چکے تھے اس لئے تمہاری حفاظت کا کافی بہتر انتظام کرلیا گیا، کچھ عرصے تک تو معاملات ٹھیک رہے مگر پھر ایک بہت بڑی ہستی ہماری جماعت میں سے ابدی سفر پر روانہ ہوگئی اور بدی کی طاقتیں ہم پر حاوی ہونا شروع ہوگئیں۔

حالات اتنے سخت ہوگئے کہ ہم تمہاری حفاظت نہیں کرسکے اور تم پر حملہ ہوگیا۔“ آخری جملہ کہتے ہوئے بوڑھے کی آواز میں افسردگی در آئی اور وہ خاموش ہوگیا۔

بابر اس دوران تحمل سے انتظار کرتا رہا کہ وہ بوڑھا شخص اپنی بات دوبارہ شروع کرے۔

ایک ہنکار ابھرنے کے بعد وہ بوڑھا دوبارہ گویا ہوا۔

حضرت عمر فاروقؓ کی عید

عید کے دن لوگ کاشانہ خلافت پر حاضر ہوئے تو کیا دیکھا کہ آپ دروازہ بند کرکے رو رہے ہیں..... لوگوں نے حیران ہوکر عرض کیا..... یا امیر المومنین..... آج تو عید ہے جو خوشی منانے کا دن ہے..... خوشی کی جگہ یہ رونا کیسا..... آپ نے آنسو پونچھتے ہوئے فرمایا..... اے لوگو!..... یہ عید کا دن ہے اور وعید کا دن بھی..... آج جس کے نماز روزے قبول ہوگئے..... بلاشبہ اس کے لئے عید کا دن ہے..... آج جس کے روزے کو رد کرکے اس کے منہ پر مار دیا گیا اس کے لئے آج وعید کا دن ہے اور میں تو اس خوف سے رو رہا ہوں کہ آہ..... مجھے یہ معلوم نہیں کہ میں مقبول ہوا ہوں یا رد کردیا گیا ہوں.....

(شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈوالہ یار)

”تمہاری موت کے بعد زاپالا کو باہر آنا ہوگا اور شیطانی لشکر کے سردار کسی بھی قیمت پر زاپالا کی طاقت حاصل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ تمہیں مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ تم یہ سمجھ لو کہ اس وقت تمہارے دشمنوں کی تعداد کروڑوں میں ہے اور ان کی طاقت عروج پر ہے۔ مگر مسئلہ یہاں تک ہوتا تب بھی سوچا جاسکتا تھا۔ مگر صورتحال اس سے کہیں زیادہ بھیانک ہے۔“ بوڑھا ایک مرتبہ پھر خاموش ہوچکا تھا۔

”اس سے اور کیا بھیانک ہوسکتا ہے۔“ اس مرتبہ بابر سے صبر نہیں ہوا اور وہ بول پڑا۔

بوڑھے نے بابر کی آنکھوں میں جھانکا اور پر سوچ انداز میں بولا۔

”عنقریب یہ طاقت تم پر قبضہ پالے گی اور تم شیطانی دنیا کے طاقتور شیطان کا روپ دھار لوگے۔ چونکہ تم ایک انسانی شیطان ہوگے اس لئے تمہارے لئے انسانوں کو ہدف بنانا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ

رکاوٹیں جو ناری شیطانوں کے سامنے ہیں خاکی شیطان کے سامنے ایسا کچھ نہیں ہوگا۔"

یہ سن کر بابر کو چکر آنے لگے۔ وہ ان باتوں پر قطعاً یقین نہیں کرتا، وہ بیسویں صدی کا انسان تھا، آرام سے ان سب باتوں کو الف لیلوی داستان کہہ کر جھٹلا سکتا تھا مگر..... اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات اور پھر، اس کے سامنے موجود مسنام اس بات کا گواہ تھا کہ وہ عنقریب بہت بڑی مصیبت میں پھنسنے والا ہے۔

کافی دیر کمرے میں خاموشی رہی۔ وہ دونوں ہی اپنے اپنے خیال میں مگن تھے۔

"کیا اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے؟" بابر نے بوڑھے مسنام سے پوچھا.....

"راستہ ہے میرے بچے مگر بہت کٹھن ہے۔ میں سوچ کر ہی لرز جاتا ہوں۔ لیکن تمہارے پاس اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔" بوڑھے کی آنکھوں میں یہ کہتے ہوئے آنسو آ گئے۔

"تم بہت چھوٹے تھے، میری آنکھوں کے سامنے تم جوان ہوئے اور اب مجھے تمہارا یہ انجام دیکھنا ہوگا جس کی تاب شاید میری بوڑھی آنکھیں نہ لا سکیں۔" فرط جذبات سے بوڑھے کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

بابر بھی جذبات کی رو میں بہہ گیا اور آبدیدہ ہو گیا مگر جلد ہی سنبھل گیا اور بولا۔ "اس مشکل سے نکلنے کا کوئی تو راستہ ہوگا.....؟"

"ہاں ہے!" بوڑھے نے کہا۔ "بحرالکاہل کے وسط میں ایک پوشیدہ جزیرہ ہے جس کا نام غیبات ہے وہاں ایک زندہ آتش فشاں ہے۔ اس کے لاوے میں غسل ہی واحد راستہ ہے۔ مگر خاکی جسم سے جب تم آگ میں غسل کرو گے تو ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاؤ گے۔ لیکن یاد رکھو تمہاری یہ قربانی ہی انسانیت کو بچا سکتی ہے، اور ساتھ ہی تمہیں ایک بھیانک زندگی سے بھی کہ جس زندگی میں تم شیطانوں جیسے اعمال کرو گے۔"

لاوے میں غسل کا سن کر ہی خوف سے بابر کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

"جب تک تم انسان رہو گے تمہاری وجہ سے بے گناہ لوگ مرتے رہیں گے اور جب تم شیطان بنو گے تو معصوم لوگوں کا شکار کھیلو گے۔ اب تم نے فیصلہ کرنا ہے کہ اب تم قربانی دینے کے لئے تیار ہو یا نہیں یا پھر شیطانی راستے کو اپناؤ گے؟" بوڑھے نے اپنی بات مکمل کی اور خاموش ہو گیا۔

بابر دوراہے پر کھڑا تھا اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی مانند لپکا وہ صحرا میں مرنے ہی تو آیا تھا۔ تو اب کیوں موت سے ڈر رہا ہے۔ تمام انسانیت کی بقا کے لئے اسے اگر قربانی دینا پڑ رہی تھی تو یہ اتنا مہنگا سودا نہیں تھا۔

"مسنام بابا میں تیار ہوں۔" اس کی آواز جھونپڑی میں گونجی۔

"اوہ! میرے بچے مجھے تم سے یہی امید تھی۔" بوڑھے نے طمانیت بھرے لہجے میں کہا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے تم کتنا بڑا کام سرانجام دینے جا رہے ہو۔

"مگر ہم وہاں پہنچیں گے کیسے.....؟" بابر نے استفسار کیا۔

"اس کا بندوبست ہو جائے گا، تم بے فکر رہو۔ مگر ایک بار پھر اچھی طرح سوچ لو اگر وہاں پہنچ کر مکر گئے تو پھر اس کے بعد تم ہمیشہ کے لئے پھنس جاؤ گے۔ بوڑھے نے اسے جانچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔"

"نہیں میں اپنے فیصلے پر قائم رہوں گا۔" بابر نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"تو چلو تیار ہو جاؤ تھوڑی دیر میں ہم نے نکلنا ہے۔" بوڑھے نے اس کے سامنے سے پیالہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

بوڑھے کی یہ بات سن کر بابر کچھ دیر کے لئے سکتے میں آ گیا۔ مگر جلد ہی اس نے اپنے اوپر قابو پا لیا اور بولا۔ "میں تیار ہوں۔"

بوڑھے مسنام نے ریت سے دو بھرے تھیلے

ایک تھیلا خود پکڑا دوسرا بابر کو پکڑا دیا اور دونوں جھونپڑی سے باہر نکل آئے۔

جھونپڑی سے باہر آتے ہی بابر کو گرمی محسوس ہوئی مگر سورج ڈوبنے کی وجہ سے اس کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ وہ جھونپڑی سے کچھ دور ہی آئے تھے مسنام ٹھٹھک کر رک گیا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہونے لگیں وہ بار بار گھوم کر چاروں طرف دیکھتا ساتھ ہی وہ کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اچانک دھپ کی زوردار آواز آئی جیسے کوئی بہت وزن رکھنے والی چیز زمین پر گری ہو، اس کے ساتھ ہی مسنام ہوا میں بلند ہوا اور تڑپنے لگا جیسے اسے کسی نے گلے سے تھام لیا ہو، اس کے ہاتھ ایک دوسرے سے اس طرح جڑ گئے تھے جیسے انہیں کسی نے آپس میں باندھ دیا ہو یہی حالت اس کے پاؤں کی بھی تھی۔ زمین سے کوئی دس فٹ بلند ہوا میں اس کا جسم پھڑک رہا تھا۔

بابر اس صورتحال کا جائزہ لے رہا تھا، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کیا کرے۔ یکا یک مسنام کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ "جھونپڑی کی طرف بھاگو۔"

آواز سنتے ہی بابر بغیر کچھ سوچے سمجھے دوڑ پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ جھونپڑی میں داخل ہوتا، اس کی نظر اپنے سامنے موجود ایک نوجوان پر پڑی جس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کا رنگ گورا تھا۔ چہرے پر ایک خاص چمک تھی۔ بابر نے اتنا وجیہہ شخص اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بابر اس شخص کو دیکھنے میں محو ہو گیا۔ جیسے ہی بابر کی آنکھیں اس نوجوان کی آنکھوں سے ملیں بابر کو ایک شدید دماغی جھٹکا لگا۔ کچھ دیر کے لئے اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔

جب وہ ہوش میں آیا تو منظر یکسر مختلف تھا۔ کالے کپڑوں میں ملبوس خوبصورت نوجوان زمین پر پڑا تھا۔

اور مسنام اس کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں خاصی سرخ تھیں جیسے ان میں انگارے دہک رہے ہوں۔

"شیزاف تم نے بہت برا کیا کہ میرے راستے میں آئے، میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تم جی سکو گے اور نہ مر سکو گے۔"

مسنام نے جوان کی طرف دیکھ کر دھاڑتے ہوئے کہا۔

"مسنام شیخی بگھارنا بند کرو تم مجھے کچھ دیر سے زیادہ قابو نہیں رکھ سکتے۔ اور اگر میں بابر کا ذہن پڑھنے میں مصروف نا ہوتا تو تم مجھے قابو بھی نہیں کر سکتے تھے ویسے کمال کے اداکار ہو تم۔ اور ہاں ساتھ میں کیا کہانی تخلیق کی ہے۔" یہ کہہ کر اس نوجوان نے قہقہہ لگایا۔

مسنام، نوجوان کی یہ بات سن کر غصے سے پیچ و تاب کھانے لگا مگر کچھ بولا نہیں.....

"اور تم کاٹھ کے الوکس کی بات پر یقین کر رہے ہو، حالانکہ انسان تو اچھے خاصے ذہین ہوتے ہیں۔" اس نوجوان نے اس مرتبہ بابر کو مخاطب کر کے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" بابر نے حیرت سے پوچھا۔

"بچے اس کو دفع کرو یہ بدی کا پیروکار ہے اور یہاں تمہیں مارنے کے لئے آیا ہے، چلو جلدی کرو دیر ہو رہی ہے۔" بوڑھے مسنام نے اس کو ہاتھ سے تھامتے ہوئے کہا۔

بوڑھے کی بات سن کر نوجوان جس کا نام شیزاف تھا اس نے زوردار قہقہہ بلند کیا۔

مسنام! تم نیکی کے پیروکار ہو۔ شیزاف نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ "تو میں اس لڑکے سے کہوں کہ نیکی کے پیروکار کو نورانی آیات میں سے کچھ پڑھ کر سنائے۔ یا اس طرح مسنام کہ تم خود سنا دو۔"

نوجوان کی یہ بات سن کر مسنام بے بسی اور شدید غصے سے اس نوجوان شیزاف کو گھورنے لگا۔

"تم دونوں یہ کیا باتیں کر رہے ہو، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔" بابر نے باری باری دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم کاٹھ کے الو کو یہ باتیں سمجھ بھی نہیں آئیں

گی۔" شیزاف نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اسے اٹھتا دیکھ کر مسنام نے حرکت میں آنے کی کوشش کی مگر شیزاف نے ہاتھ اوپر کر کے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ہم دونوں ایک دوسرے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اس لئے بہتر ہوگا کہ تم اپنا اور میرا وقت برباد مت کرو۔"

اس کی آواز میں کچھ ایسا تھا کہ مسنام ڈھیلا پڑ گیا۔ پھر اس نے بابر کی طرف دیکھا اور بولا.....

"کاٹھ کے الو! فیصلہ تم نے کرنا ہے کہ تم مسنام کے ساتھ جاؤ گے یا میرے ساتھ۔ اس نے واقعات کو توڑ مروڑ کر تمہیں بتایا ہے۔ آدھا سچ اور آدھا جھوٹ، ہاں! انجام اپنی مرضی کا رکھا ہے۔" شیزاف نے مسنام کی طرف اشارہ کیا جو جبڑے بھینچے کھڑا تھا۔

"یہ بھی میری طرح شیطان ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ میں شیطانوں کی دنیا کا مجرم ہوں اور یہ معزز شیطان۔" ساتھ ہی شیزاف نے بھیانک قہقہہ لگایا۔

مسنام نے بیچ میں بولنے کی کوشش کی تو شیزاف نے اسے شعلہ بار نظروں سے گھورا، اور بولا.....

"تمہارے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا، اسے فیصلہ کرنے دو اگر یہ تمہارے ساتھ جانا چاہے تو مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ لیکن اگر یہ میرے حق میں فیصلہ دے تو تم پیچھے ہٹ جاؤ..... ورنہ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔" اس کے ساتھ ہی اس نے بابر کی طرف دیکھا۔

"تم جلدی فیصلہ کرو کہ تم لاوے میں جل کر مرنا چاہتے ہو یا میرے ساتھ آنا چاہتے ہو تا کہ ہم کوئی اور راستہ نکالیں۔ ویسے ایک آخری بات میں تمہیں بتاتا چلوں کہ تم جتنی مصیبتوں کا شکار ہوئے، ان میں مسنام کا پورا پورا قبضہ ہے اور ایک بار تو تم مرتے مرتے بچے وہ حملہ بھی اس کی کرامت تھا۔ یقین آئے تو اس کو چھو کر دیکھ لو۔ تمہیں یخ بستہ ٹھنڈ ملے گا۔" شیزاف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر بابر کو وہ لمحات یاد آ گئے۔ خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے بے اختیار مسنام کی طرف دیکھا جو بے بسی سے سر جھکائے کھڑا اس بات کی تصدیق کر رہا تھا کہ شیزاف نے جو کچھ کہا سچ کہا ہے۔

بابر کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ خاموشی کے ان لمحات میں مسنام پیچھے کی طرف ہٹا اور اچانک آندھی اور طوفان کی طرح بابر کی طرف بڑھا۔ شیزاف شاید اسی بات کا منتظر تھا وہ بجلی کی سی سرعت سے بابر اور مسنام کے بیچ آ گیا۔ آن کی آن میں مسنام زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔

اسی اثناء میں شیزاف کی آواز بابر کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ "دیکھ کیا رہے ہو آگے بڑھو اور پوری قوت سے اپنا پاؤں اس کے منہ پر مارو، صرف تم ہی اسے مار سکتے ہو۔"

بابر کو ہچکچاتے دیکھ کر شیزاف نے اس کو غصے سے گھورا اور بولا۔ "وقت کم ہے اگر آگ میں ڈوب کر مرنا نہیں چاہتے تو جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کرو میرا بنا گیا جال کمزور پڑ رہا ہے۔ اگر ایک مرتبہ یہ آزاد ہو گیا تو تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔"

یہ سن کر بابر ٹس سے مس نہیں ہوا۔

"کیا تم اپنی اماں بی کے قاتل کو معاف کر دو گے؟"

آخری حربے کے طور پر شیزاف نے چیخ کر کہا۔

یہ سنتے ہی بابر کو شدید جھٹکا لگا۔ شدید غصے سے اس کی گردن کی رگیں ابھر آئیں۔ چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ شیزاف کی تدبیر درست رہی۔ بابر نے اپنا پاؤں پوری طاقت سے مسنام کے منہ پر مارا۔ ایک دھماکہ ہوا مسنام دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

جب بابر کی حالت بہتر ہوئی تو اسے بہت افسوس ہوا کہ اس نے بغیر کسی ثبوت کے مسنام کو مار ڈالا ساتھ میں وہ شدید حیران بھی تھا اسے اتنا غصہ کیسے آ گیا۔ اسے چپ چاپ بیٹھا دیکھ کر شیزاف گویا ہوا۔

"میں نے تمہارے غصے کو بھڑکایا تھا ورنہ تم اپنے ساتھ مجھے بھی پھنسوا دیتے۔ وہ واقعی تمہاری اماں بی کا قاتل تھا۔ جب اس نے تم پر وار کیا اور تم زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ موت زندگی پر حاوی ہو رہی تھی،

تمہاری اماں نے مولانا ایوب کے بتائے ہوئے وہ وظائف پڑھنا شروع کئے۔ جن میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا بہت قوی امکان تھا مگر تمہارے لئے انہوں نے خطرات کی پرواہ نہیں کی۔ ان وظائف کے نتیجے میں مسنام یا تمہاری اماں بی میں سے کسی ایک کو مرنا تھا۔ مسنام بہت شاطر تھا اس نے تمہاری اماں بی کے گرد جال بنا اور انہیں زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ ان کی اس قربانی کی وجہ سے تم بچ گئے ویسے آج تک تم صرف ان ہی کی وجہ سے بچتے آئے ہو، شاید تم نہیں جانتے جب سے انہیں تمہارے بارے میں پتا چلا کہ تم شیطانی طاقتوں کے نرغے میں ہو۔ اپنی بقیہ تمام عمر انہوں نے رات کو جاگ کر مخصوص وظائف پڑھنے کی منت مانی۔ اس وجہ سے تم بہت عرصے تک محفوظ رہے۔"

یہ سن کر بابر ہچکیاں لے کر رونے لگا۔ اسے اماں بی بے تحاشا یاد آ رہی تھیں۔ وہ اس کی سگی ماں تو نہیں تھیں مگر سگی ماں سے بڑھ کر انہوں نے قربانی دی تھی۔ وہ نجانے کتنی دیر نصرت بیگم کو یاد کر کے روتا رہا جب اس کے کانوں سے شیزاف کی آواز ٹکرائی۔

"ویسے تم ہو بہت خوش قسمت۔ بہت سارے لوگوں نے تمہارے لئے قربانیاں دیں، مگر تم بہت بدقسمت بھی ہو تمہاری وجہ سے تمہارے چاہنے والے ہمیشہ مصیبتوں کا شکار ہوئے۔ اب بیچارے ڈاکٹر سہیل کو ہی لے لو، اس بیچارے نے تمہاری وجہ سے امریکہ میں اپنی اسکالرشپ چھوڑ دی ایک بہتر مستقبل کو تمہاری وجہ سے قربان کر دیا، تمہیں ہسپتال میں اس شرط پر داخل کیا گیا کہ سہیل کو وہاں نوکری کرنی ہوگی۔ مگر اسے کیا ملا! آج وہ ایک پرائیوٹ ادارے میں ٹیچر ہے اور اس کی بیوی نفسیاتی مریضہ بن گئی ہے۔ مسنام نے تمہارا ساتھ دینے کی پاداش میں اس کی بیوی کے ساتھ بہت برا کیا۔ ان کی زندگی تباہ ہو کر رہ گئی ہے۔" تمام حالات بتا کر شیزاف نے کن انکھیوں سے بابر کی طرف دیکھا۔ جو دکھ اور غم کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔ تمام صورتحال جان کر اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔

ایک بار پھر شیزاف کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"میں تمہیں اس مشکل سے نکلنے کا طریقہ بتا سکتا ہوں۔ اگر تم میری بات مانو گے تو، نہ صرف تم بلکہ میں بھی مصیبتوں سے چھٹکارا پا لوں گا۔ یہ بات سوچ کر شیزاف کی آنکھوں میں خوشی رقص کرنے لگی۔

"مگر کیسے.....؟" بابر نے استفسار کیا۔

"جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔ مگر اس وقت یہاں سے نکلنا ضروری ہے۔" یہ کہتے ہوئے شیزاف نے بابر کا ہاتھ تھاما، اور تھوڑی دیر بعد چھوڑ دیا۔

منظر یک لخت تبدیل ہو گیا جیسے ٹی وی پر موجود چینل تبدیل کر دیا گیا ہو۔ اب وہ سمندر کے وسط میں ایک نہایت مختصر سے جزیرے پر بنی جھونپڑی میں موجود تھے۔

"یہ لو اسے پکڑو۔" شیزاف نے پتھر کی ایک چھوٹی سی تختی بابر کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ بابر نے نہایت احتیاط سے اسے تھاما اور بولا۔ "یہ کیا ہے.....؟"

"یہ مشکل سے نکلنے کا راستہ ہے۔" شیزاف نے بابر کے سوال کا جواب دیا۔

"اس تختی کی یہ خصوصیات ہے۔ کہ یہ کسی بھی سوال کا جواب بتا سکتی ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ صرف ایک مرتبہ ہی اس سے پوچھا جا سکتا ہے۔ اور نو یا نو سے کم الفاظ میں ہی سوال پوچھا جانا چاہیے تو اب تم یہ سل لو اور آہستہ آہستہ کہو۔" مجھے اس صورتحال سے نکلنے کا طریقہ بتاؤ۔"

"یہ بالکل درست سوال ہے۔ مگر مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی تم خود بھی تو سوال کر سکتے ہو؟" بابر نے شیزاف سے کہا۔

"مگر کاٹھ کے الو! میں پہلے ہی اس سے اپنا سوال کر چکا ہوں۔" شیزاف نے خشمگیں نظروں سے بابر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب تم وقت ضائع مت کرو اور جلدی سے سوال پوچھو۔" بابر نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ کچھ دیر سر جھکا کر سوچتا رہا۔ اچانک جھٹکے سے اس نے سر اٹھایا

اور سوال پوچھ لیا۔

سوال مکمل ہوتے ہی ایسی آواز آئی جیسے کسی پرندے نے اپنے پروں کو پھڑ پھڑایا ہو۔ اور تخت پر تین لفظ نمودار ہو گئے۔

"جلدی بتاؤ کیا لکھا ہے؟" شیزاف نے بے قراری سے پوچھا۔

بابر نے جیسے ہی وہ الفاظ دہرائے۔ شیزاف نے ایک چیخ ماری اور بابر کی طرف بڑھا مگر اب وہاں صرف دھواں باقی تھا۔ شیزاف نے بھیانک آواز میں آہ وزاری شروع کر دی۔ اس کی آواز اتنی خوفناک تھی کہ پہاڑوں کے کلیجے تک دہل جاتے۔ تھوڑی دیر بعد اس کے آس پاس دس کے قریب سائے جمع ہو گئے۔ انہوں نے اسے بے دردی سے باندھا اور اسے لے کر غائب ہو گئے۔

ادھر شہر میں سہیل بائیولوجی کا پریڈ لے رہا تھا جب پرنسپل کا بلاوا آیا۔ وہ جیسے ہی پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوا۔ نک چڑھا پرنسپل اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بہت پرتپاک انداز سے اس سے ہاتھ ملایا۔ اور بولا.....

"ڈاکٹر سہیل صاحب آپ نے کبھی بتایا نہیں کہ ہیلتھ منسٹر آپ کے جاننے والے ہیں۔"

سہیل ہکا بکا اس کو دیکھ رہا تھا۔ جب سے وہ اس اسکول میں آیا تھا آج پہلی مرتبہ اس مغرور شخص نے اس سے ہاتھ ملایا تھا۔ اور پہلی مرتبہ اسے ڈاکٹر کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ پرنسپل نے اپنی بات دہرائی اور ساتھ ہی کھنکھارا۔ تب سہیل کو ہوش آیا اور وہ بولا۔

"نہیں سر کوئی ایسی بات نہیں۔ میری ان سے کوئی جان پہچان نہیں۔"

یہ سن کر پرنسپل کے چہرے کے تاثرات ایسے ہوئے جیسے اسے یقین نا آیا ہو۔

"میں نے آپ کا سیل نمبر دے دیا ہے۔ وہ خود ہی آپ سے رابطہ کر لیں گے۔" پرنسپل کے لہجے میں ناراضگی در آئی۔

سہیل کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے اس لئے اس نے اجازت طلب کی اور اٹھ کر کلاس کی طرف چل دیا۔ اسی شش و پنج میں اس سے صحیح طرح پڑھایا بھی نہیں گیا۔

چند ہفتوں بعد اس کی تمام پریشانیاں حیرت انگیز طور پر دور ہوتی چلی گئیں۔ ہیلتھ منسٹر نے اسے فون کر کے گھر مدعو کیا۔ بہت اچھے طریقے سے اس سے پیش آیا۔ ذاتی کوششوں سے اس کے کیس کو حل کیا اور اسے بحال کروا دیا۔ بحالی کے اگلے روز ملک کی ایک بہت دولت مند شخصیت نے اس سے ملاقات کی اور اسے ملک کا جدید ترین ہسپتال بنا کر دینے کی پیشکش کی۔ ساتھ ہی ایک بہت مہنگا بنگلہ اور ایک شاندار گاڑی بہت اصرار کر کے، اس کے حوالے کی۔ حنا کی حالت میں بھی ڈرامائی تبدیلی آئی، وہ بالکل ٹھیک ہو گئی۔ زندگی کا یہ رخ سہیل کو بالکل سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ اور حنا خدا کا شکر کرتے نہیں تھکتے تھے۔

ادھر شیزاف آہنی زنجیروں سے جکڑا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ایک تابوت تھا۔ جس میں اندرونی طرف نوکیلی کیلیں لگی ہوئیں تھیں۔ اس طرح اس کے ڈھکنے میں بھی کیلیں جڑی ہوئیں تھیں۔ اس تابوت میں اس کو بند کیا جانا تھا اور اس کے بعد اسے آگ کے دریا کے حوالے کر دینا تھا۔

شیزاف سر جھکائے کھڑا تھا۔ اسے رہ رہ کر بابر پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا وہ کاٹھ کا الو اتنا چالاک بھی ثابت ہو سکتا تھا کتنے آرام سے اس نے شیزاف جیسے گھاگ کو بیوقوف بنا دیا تھا منصوبے کے مطابق کام بالکل ٹھیک چل رہا تھا عین اس وقت کام بگڑ گیا جب وہ پایہ تکمیل کو پہنچنے والا تھا ساحل کے پاس آ کر اس کی کشتی ڈوبی ہوئی تھی۔ آج وہ اس انجام سے دوچار ہونے جا رہا تھا جس سے بچنے کے لئے اسے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر منصوبہ تیار کیا تھا۔ وہ انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ تین سائے آگے بڑھے اور اسے بے دردی سے اٹھا لیا تاکہ اسے تابوت میں بند کیا جا سکے۔ بالکل اسی وقت ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ کسی نے جھٹکے سے شیزاف کو اٹھایا اگلے ہی لمحے

شیزاف نے دیکھا اندھیرا چھٹ چکا تھا اور وہ اس وقت اسی جھونپڑی میں موجود تھا۔ جہاں سے اسے گرفتار کیا گیا تھا۔ خوشی کے ساتھ اسے شدید حیرت بھی تھی کہ وہ وہاں کیسے پہنچ گیا۔ اس کے جسم پر بندھی زنجیریں بھی غائب تھیں۔ اس وقت جھونپڑی کے اندر کوئی داخل ہوا جسے دیکھ کر شیزاف کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "عظیم غازاق تم....."

"ہاں میں مگر تمہیں یقین کیسے آئے تم تو مجھے کاٹھ کا الو سمجھتے تھے۔" عظیم طارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ جو دراصل بابر تھا۔

"مجھے معاف کر دو! مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم مستقبل کے غازاق ہو۔ میں تو صرف اپنی جان بچانا چاہتا تھا اس لئے تمہارے اندر کی چھپی طاقت کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔" شیزاف بابر کے پاؤں میں لوٹنے لگا ساتھ ہی وہ معافی مانگ رہا تھا۔

"آرام سے بیٹھ جاؤ مجھے سب معلوم ہے۔ بے شک تم نے مجھے مارنے کی سازش کی مگر یہ بھی سچ ہے کہ تم نے ہی میری زندگی بچائی۔" بابر نے اس کو پاؤں سے دور کرتے ہوئے کہا۔

شیزاف نے یہ سنا تو اطمینان کی سانس لی اور بولا۔ "میں سمجھا تھا کہ تم مجھے مار ڈالو گے۔"

اس کی یہ بات سن کر بابر مسکرایا اور بولا۔ مارنا ہی ہوتا تو بچاتا کیوں۔"

"عظیم غازاق ایک بات پوچھوں۔" شیزاف نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"پوچھو!" بابر نے مختصر سا جواب دیا۔

"یہ آخر صورتحال تمہارے حق میں کیسے پلٹ گئی میرے منصوبے کے مطابق تو کچھ اور نتیجہ نکلنا چاہیے تھا۔" شیزاف نے استفہامیہ نظروں سے بابر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر بابر کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آ گئی گویا وہ ان لمحات کو یاد کر رہا ہو۔ جب معاملات اس کے قابو میں آ گئے تھے۔ اسے چپ دیکھ کر شیزاف جلدی سے بولا۔ "اگر تم نہ بتانا چاہو تو کوئی بات نہیں میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ تم نے میری جان بچالی۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں دراصل جب تم نے مجھے سوال بتایا تھا تو اس وقت کچھ باتیں میرے ذہن میں پہلے سے تھیں۔ ایک بات تو یہ کہ تم ایک شیطان ہو اور مجھے کسی صورت بھی شیطان پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ دوسرا جب تم نے سوال بتایا تو میں نے اس سوال پر غور کیا۔ تو مجھے سمجھ آیا کہ صورتحال سے نکلنے کا مطلب موت کے سوا کچھ اور تم میری موت کا راز جاننا چاہ رہے تھے اس وقت میں نے فیصلہ کیا کہ سوال تبدیل کر دیا جائے۔ مگر کیسے یہ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا اگر میں کوئی اور سوال پوچھوں گا تو دو مسئلے ہو سکتے ہیں ایک تو تم ردعمل ظاہر کرو گے جو شدید بھی ہو سکتا تھا دوسرا ہو سکتا ہے وہ سوال نو الفاظ سے زیادہ ہو جائے اور میں کبھی نہ جان سکوں کہ میں کیسے اس سب سے چھٹکارا حاصل کروں۔ اس وقت میرے ذہن میں جمھا کا ہوا اور میں نے سوال میں ایک لفظ کو تبدیل کیا۔ میں نے نکلنے کو نمٹنے کے ساتھ تبدیل کر دیا۔ سوال کچھ یوں بن گیا۔

"مجھے اس صورتحال سے نمٹنے کا طریقہ بتاؤ۔"

یوں وہاں وہ الفاظ ظاہر ہو گئے جنہیں پڑھتے ہی میں نے اپنے اندر چھپی ہوئی طاقت کا راز پالیا۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ میں شیطان نہیں بنا کیونکہ میرے اندر اب بھی اپنوں کے لئے رحم ہے، محبت ہے، اور شیطان کے پاس یہ نہیں ہے۔

باقی صورتحال سے میں نمٹ رہا ہوں اپنے ساتھ احسان کرنے والوں کے ساتھ احسان کر رہا ہوں اور ظلم کرنے والوں سے حساب لے رہا ہوں۔ تم اب آزاد ہو۔ جاؤ خوش رہو، یہ کہہ کر بابر وہاں سے غائب ہو گیا۔ اور شیزاف کو اس بات کا قائل ہونا پڑا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس جیسی عقل کسی اور مخلوق کے پاس نہیں۔

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

آندھی چلی تو نقش کف پا نہیں ملا
دل جس سے مل گیا وہ دوبارہ نہیں ملا
کچے گھڑے نے جیت لی ندی چڑھی ہوئی
مضبوط کشتیوں کو کنارہ نہیں ملا
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی.....کراچی)

تمہارے بن نہیں رہنا مجھے تم سے محبت ہے
ہے تم سے بس یہی کہنا مجھے تم سے محبت ہے
زباں تو کہہ نہیں سکتی تمہیں احساس تو ہوگا
میری آنکھوں کو پڑھ لینا مجھے تم سے محبت ہے
تمہارے نام کردی ہے یہ پوری زندگی اپنی
بھلے ہی دکھ پڑے سہنا مجھے تم سے محبت ہے
(انتخاب: شفیق رضا.....میاں چنوں)

کیوں آنکھوں سے اوجھل ہوگئے ہو؟
کس کے پیار میں پھر کھو گئے ہو
کیا میرا تعلق نہیں بھاتا تم کو منیر؟
ہاں کسی اور کے تم ہوگئے ہو؟
(منیر احمد ساغر.....میاں چنوں)

عشرتوں سے دوستی کچھ ایام تک چلی
الفت کی نیا دو گام تک چلی
ساقی تیرے مے کدے کو سلام
جو بچی تھی مینا وہ شام تک چلی
(بشیر احمد پرواز.....جنڈانوالہ)

یادوں میں تیری یاد تھی
کیا یاد تھا کچھ یاد نہیں
تیری یاد میں سب بھول گئے
کیا بھول گئے کچھ یاد نہیں
(رانا ظفر اقبال.....جنڈانوالہ)

رات کو شمع کی مانند پگھل کر دیکھو
زندگی کیا ہے کسی طاق میں جل کر دیکھو
اپنے چہرے کو بدلنا تو بڑا مشکل ہے
جی بہل جائے گا آئینہ بدل کر دیکھو
(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالہ یار)

کرب کے شہر میں رہ کر نہیں دیکھا تو نے
کیا گزرتی رہی ہم پر نہیں دیکھا تو نے
اے مجھے صبر کے آداب سکھانے والے
جب وہ بچھڑا تھا وہ منظر نہیں دیکھا تو نے
(محمد عثمان علی.....میاں چنوں)

یہ بھی ممکن ہے کسی روز نہ پہچانوں اسے
وہ جو ہر بار نیا بھیس بدل لیتا ہے
بارہا مجھ سے کہا تھا میرے یاروں نے وسی
عشق دریا ہے جو بچوں کو بھی نگل لیتا ہے
(انتخاب: راجہ باسط مظہر، حامد جھنگی)

وہ کیا گیا کہ رفاقت کے سارے لطف گئے
میں کس سے روٹھ سکوں گی کسے مناؤں گی
(نسیم انجم.....گنگن پور)

جدا ہوئے بھی تو جدائی میں یہ کمال بھی تھا
کہ اس سے رابطہ ٹوٹا بھی تھا بحال بھی تھا
یہ اب جو دیکھ رہے ہو یہ کچھ نیا تو نہیں
یہ زندگی کا تماشہ گزشتہ سال بھی تھا
(عمر دراز.....کھڈیاں خاص)

تھوڑا سا مسکرا کے نگاہیں ملایئے
مجھ کو میری حیات کا مقصد بتایئے
(عثمان شوکت.....کھڈیاں خاص)

شاید کسی مقام پہ میں کام آسکوں
مجھ کو بھی ساتھ لیجئے تنہا نہ جایئے
(شیخ نوید.....کھڈیاں خاص)

زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے
وہ خود آکر کہیں ملتا تو گفتگو کرتے
عزم پرواز کی توہین سے مایوس نہ ہو
ایک بار اور سہی اور سہی اور سہی
(عامر علی.....کراچی)

خدا کے واسطے اب بے رخی سے کام نہ لے
تڑپ کے پھر کوئی دامن کو تیرے تھام نہ لے
زمانے بھر میں ہیں چرچے میری تباہی کے
میں ڈر رہی ہوں کہیں کوئی تیرا نام نہ لے
(شہریار ملک.....کھپرو)

فاصلے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا
سامنے بیٹھا تھا وہ میرے اور وہ میرا نہ تھا
وہ کہ خوشبو کی طرح پھیلا تھا میرے چار سو
میں اسے محسوس کرسکتا تھا چھو سکتا نہ تھا
رات بھر چھپلی ہر آہٹ کان میں آتی رہی
جھانک کر دیکھا گلی میں کوئی آیا نہ تھا
یہ سبھی ویرانیاں اس کے جدا ہونے سے تھیں
یہ آنکھ دھندلائی ہوئی تھیں شہر دھندلایا نہ تھا
آج اس نے درد بھی اپنے علیحدہ کرلئے
آج میں رویا تو وہ رویا نہ تھا
آج لگتا ہے تعلق مٹ گیا پوری طرح
آج اس نے دیکھ کر بھی پہچانا نہ تھا
بس تیری صورت لے کر سارے زمانے میں پھرا
ساری دنیا میں مگر کوئی تیرے جیسا نہ تھا
آج ملنے کی خوشی میں صرف جاگا نہیں
تیری آنکھوں سے لگتا ہے کہ تو بھی سویا نہیں
یاد کرکے اور بھی تکلیف ہوتی ہے واجد
بھول جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی.....کراچی)

شکستہ حال و پر بھی نہیں
مگر اذن سفر بھی نہیں
مجھے ٹھکرا نہ اے دنیا
میں اتنا بے ہنر بھی نہیں
میں جس کو یاد کرتا ہوں
اسے میری خبر بھی نہیں
عجب منزل پر آپہنچا
کہیں کوئی بشر بھی نہیں
سکوت شہر کا عالم
ہوا تک کا گزر بھی نہیں
میرے ہمراہ وہ چلتا ہے
میرا جو ہمسفر بھی نہیں
میں کس کو اپنا پہچانوں
سلامت جسم و سر بھی نہیں
عجب رنگ بہاراں ہے
ہرا کوئی شجر بھی نہیں
(حکیم خان حکیم.....ضلع اٹک)

کن یادوں میں کھویا چاند
کرنوں، کرنوں رویا چاند
جذبوں کی تھی نرم زمیں
دل آنگن میں بویا چاند
رات چکور کی نذر ہوئی
دن بھر چرخ پہ سویا چاند
نظم نئی اک سورج ہے
اور غزل ہے گویا چاند
چاندنی شب قمر آئی
اشکوں سے کیوں دھویا چاند
(چوہدری قمر جہاں علی پوری.....ملتان)

بچھڑتے وقت کا لمحہ عجیب ہوتا ہے
کہ درد دور بھی ہو کر قریب ہوتا ہے
جو اپنی ماں کی دعا سے ہمیشہ دور رہے
وہ شخص یارو بڑا بدنصیب ہوتا ہے
جو جھوٹ کہنے سے کھاتا ہے خوف دنیا میں
وہی تو دوستو سچا ادیب ہوتا ہے
کسی کو ملتی ہے منزل کسی کو رسوائی
یہ اپنا اپنا جہاں میں نصیب ہوتا ہے
وہ جس کے دوست بھی ہوتے نہیں زمانے میں
سنا ہے شخص وہ بالکل غریب ہوتا ہے
کبھی زمانے کے رانا تو ساتھ چلتا نہیں
اسی لئے تو زمانہ رقیب ہوتا ہے
(قدیر رانا.....راولپنڈی)

دوست کیا خوب چاہتوں کا صلہ دیتے ہیں
ہر ایک گام پہ پھر زخم نیا دیتے ہیں

آپ سے تو چند دنوں کی دوستی ہوئی
لوگ برسوں کی محبت کو بھلا دیتے ہیں
یہ ضروری تو نہیں دل جلے اور دھواں نہ ہو
کھا کے چوٹ تو پتھر بھی صدا دیتے ہیں
کوئی دیتا نہیں ساتھ مشکل لمحات میں کسی کا
دل اداس ہو تو پتے بھی ہوا دیتے ہیں
جن پہ تھا میرے دل کو بہت بھروسہ جاوید
وقت پڑنے پہ وہی لوگ دغا دیتے ہیں
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

آساں تسخیر کرکے دیکھنا ہے
آپ کو تقدیر کرکے دیکھنا ہے
چاند تارے سب ہمارے ہی ہیں لیکن
ان کو اب زنجیر کرکے دیکھنا ہے
رائیگاں ہوں کیوں میرے جذبات آخر
عشق پر تاثیر کرکے دیکھنا ہے
مجھ کو اب اپنے خیالوں کی چمک سے
چارہ گر تصویر کرکے دیکھنا ہے
سحر کرنا ہے نگہہ سے اس طرح اب
زہر کو اکسیر کرکے دیکھنا ہے
جس قدر بھی خواب دیکھے میں نے خانم
سب کو اب تعبیر کرکے دیکھنا ہے
(فریدہ خانم.....لاہور)

اجاڑا اسی نے جسے دل میں بسایا تھا
میری محبت کی کیا یہی سزا تھی
وہ جو اک پل کے لئے ملا پھر بچھڑ گیا
میری ساری ریاضتوں کی کیا یہی جزا تھی
تجھے دیکھنا میری زندگی تجھے سوچنا میری بندگی
میری ساری آرزوؤں کی بس یہی وجہ تھی
یہ بے چینیوں کے لمحے ہر دم ستاتے ہیں
ساری زندگی کی مسافت میرے پیروں میں آگئی تھی
جو تیرے ساتھ گزرے وہ پل تھے سارے معتبر
جو تیرے بنا گزری وہ ساری عمر گناہ تھی
اب تو آ بھی جاؤ کہ کٹتے نہیں یہ دن
یہ رات بھی کربناک اب تیرے بنا تھی
(ساجدہ راجہ.....ہندواں سرگودھا)

میرے ساتھ بیتے ہوئے پل نہ بھلا پاؤ گے
جب کبھی تنہا جو بیٹھو گے تو یاد آؤں گا
اس جھیل کے کنارے جہاں ہم ملے تھے
سوکھے پل جو دیکھو گے تو یاد آؤں گا
تتلیوں کا اڑنا پرندوں کا چہچہانا
کوئل کو جو سنو گے تو یاد آؤں گا
سچ ہے کوئی نہیں مرتا کسی کے جانے کے بعد
کسی کو جان سے زیادہ چاہو گے تو یاد آؤں گا
(رانا حبیب الرحمٰن.....گوجرا)

ہر ایک سے ہم ہاتھ ملایا نہیں کرتے
ہر روز کسی کے گھر ہم جایا نہیں کرتے
مستی میں پڑے رہتے ہیں کوچے میں کسی کے
ہم پیار کے مارے ہیں ستایا نہیں کرتے
بیگم کے رویے کی شکایت بھی بجا ہے
جب سر پر چڑھایا گرایا نہیں کرتے
وہ دور سے کرتے ہیں اشارے بھی غضب کے
ان سے یہ شکایت ہے کہ بلایا نہیں کرتے
جو باندھ کر لاتے ہیں تحائف کا پلندہ
ہم ایسے عزیزوں کو بھلایا نہیں کرتے
رہتے ہیں خیالوں سے کبھی خواب میں انور
بس دور ہی رہتے ہیں وہ آیا نہیں کرتے
(عاصمہ نور.....کھڈیاں خاص)

کاش تو کبھی پلکوں پر سجائے مجھے
میں روٹھوں تو تم کبھی مناؤ مجھے
میں تیرا نام ہتھیلی پر لکھوں اکثر
مزہ تو تب ہے جب تو ہتھیلی پر سجائے مجھے
میری چاہت میں کھوٹ تو نہیں شامل
پھر کیوں تو بار بار آزمائے مجھے
دل تیری یاد سے اک پل بھی نہیں غافل نوری
پھر کیسے ممکن ہے کہ بھول جائے مجھے
(غلام نبی نوری.....کھڈیاں خاص)

ساتھ تو ایک پل کا تھا پھر کیوں مجھے یاد آتے ہو تم
عکس کی طرح میرے دل پہ کیوں چھا جاتے ہو تم
دلبر بھی نہیں ہو میرے ہمدم بھی نہیں ہو
یہ راستے پیار کے مجھے پھر کیوں دکھا جاتے ہو تم
ہم کبھی ملے تھے تو ایک اجنبی کی طرح
میری راتوں کی نیند پھر کیوں اڑا جاتے ہو تم
ہواؤں سے ہم تمہارا پتہ پوچھتے رہے
کچھ اس طرح سے اپنا دیوانہ بنا جاتے ہو تم
ساتھ تو ایک پل کا تھا پھر کیوں مجھے یاد آتے ہو تم
(انتخاب: شفیق رضا.....میاں چنوں)

آنکھ سے لہو نہ بہایا کر
اے دل اسے کبھی تو بھول جایا کر
دیکھنا وہ اک دن چھوڑ جائے گا
نہ اس کو اتنا ستایا کر
اتنا اعتبار بھی اچھا نہیں ہوتا
اسے ہر اک بات نہ بتایا کر
شدت غم سے منہ پھٹ جائے گا
آنکھ سے بھی کچھ آنسو بہایا کر
اس جیسا تجھے کہیں نہیں مل سکتا
وہ ہزار بار روٹھے تو ہزار بار منایا کر
یہاں بڑی مدت کے بعد سکوں ملتا ہے فاریہ
ہاتھ آئی خوشی نہ گنوایا کر
(فاریہ تبسم.....قصور ٹھینگ موڑ)

ستم تو یہ کہ اس نے بھی ساتھ چھوڑ دیا
غموں کی بھیڑ میں میرا ہاتھ چھوڑ دیا
دکھا کے اپنی طلب کے خواب آنکھوں کو
اس نے چپکے سے آنکھوں کو میری پھوڑ دیا
کشکول غم کا دیا اس نے میرے ہاتھوں میں
پھر مانگنے کے لئے اپنی گلی کا موڑ دیا
جس کے واسطے کیں لاکھوں دعائیں دل نے
اسی نے شیشے کی طرح دل کو میرے توڑ دیا
(منیر احمد ساغر.....میاں چنوں)

یہ پہلے ہجر کا کیسا ہے؟
وہ آج کے دن کی بات نہیں
کچھ عمر بھی تھی دیوانوں سی
کچھ چال بھی تھی مستانوں سی
ہاتھوں میں پھول سجاتے تھے
سج دھج کر کالج جاتے تھے
کب اتنے سیدھے سادھے تھے
اس وقت تو ہم شہزادے تھے
پھر اک چہرہ بھا سا گیا.....
نزدیک وہ دل کے آسا گیا
پھر وہ تھا اور تنہائیاں تھیں
غم ہی غم کی گہرائیاں تھیں
ہر شام اسی کی شام رہی
یہ پہلے ہجر کا کیسا ہے؟
جو آج بھی ہم پہ طاری ہے
یہ ہجر ابھی جاری ہے
(انتخاب: ایم ایس نہال.....میاں چنوں)

تو چھا گیا ہے صنم مجھ پہ یوں بادل بن کر
آنکھ میں رہتا ہے ہر لمحہ کاجل بن کر
اک نشے کی طرح چھایا ہے حواسوں پہ میرے
میری سانس کو تو مہکاتا ہے صندل بن کر
وہ اجنبی جو میری جان ہے جانے ہے کدھر
ڈھونڈتی ہیں آنکھیں جسے پاگل بن کر
اک پل کے لئے تنہائی نہیں رہنے دیتی
رہتی ہیں ساتھ یادیں تیری یوں آنچل بن کر
دل تھا اس کے ہی دم سے آباد رابعہ
وہ گیا دل بھی میرا رہ گیا جنگل بن کر
(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالہ یار)

بارہا تجھ سے کہا تھا مجھے اپنا نہ بنا
اب مجھے چھوڑ کے دنیا میں تماشہ نہ بنا
اک یہی دکھ مرے مرنے کے لئے کافی ہے
جیسا تو چاہتا تھا مجھ کو میں ویسا نہ بنا
ایک بات اور پتے کی میں بتاؤں تجھ کو

آخرت بنتی چلی جائے گی دنیا نہ بنا
جان سے جائیں گے ہم دونوں ہی، تو بھی میں بھی
میں تو کہتا تھا میری جاں مجھے اپنا نہ بنا
یہ خدا بن کے رعایت نہیں کرتے ہیں وصی
حسن والوں کو کبھی قبلہ و کعبہ نہ بنا
(انتخاب: راجہ باسط مظہر، حامد جھنگی.....گوجرخان)

آج پھر اس کی یاد آئی ابھی ابھی
دل پھر بے قرار ہوا ابھی ابھی
اپنا تو سب کچھ لٹا چکے تھے ہم
لٹے وہ بھی سرِ بازار ابھی ابھی
جنون عشق کی بات نہ کرے کوئی
حسن بیکا سرکار ابھی ابھی
وہ جو ہمیں زخم دے چکے تھے
ہو کے کامل آئے ہیں ابھی ابھی
یادوں کے پھول سوکھ چکے تھے انجم
اشکوں سے آب کئے ابھی ابھی
(محمد اسحاق انجم.....کنگن پور)

کہاں گئی وفا تیری وہ شوق دل کدھر گیا
مروتا میں چپ رہا تو بات سے مکر گیا
بجا کہ تجھ کو میری جاں وفا سے جاں عزیز تھی
مگر جو شخص بے سبب گلی گلی بکھر گیا
بس اس قدر ہی فرق ہے یہ تیرے میرے درمیاں
میں اس جگہ ٹھہر گیا تو جس جگہ سے گھر گیا
جو کٹ گئے ہیں رات دن تمہیں وہ میں بتاؤں کیا
کبھی کبھی میں جی اٹھا کبھی میں پھر سے مرگیا
وہ شام بھی اداس تھی یہ شام بھی اداس ہے
تمہاری راہ دیکھتے یہ سال بھی گزر گیا
(نوید آکاش.....میاں چنوں)

نئی سوچ ابھرے گی نئے شعور جاگیں گے
اب میرے وطن کے سب مزدور جاگیں گے
لے کر اٹھیں گے مشعلیں تاریکیوں میں
اندھیروں کو مٹانے ضرور جاگیں گے
بلند کریں گے بغاوت کے علم ہر سو
اب ایوانوں میں بھی نئے دستور جاگیں گے
سیاست کو سیاہی سے بچانے کے واسطے
نئی نسل سے نئے منشور جاگیں گے
پرواز ناامید نہ ہو پادر ملت سے
یہ شاہین سوئے ہوئے اب ضرور جاگیں گے
(محمد بشیر احمد پرواز.....جنڈانوالہ)

آجائے کسی دن تو ایسا بھی نہیں لگتا
لیکن وہ تیرا وعدہ جھوٹا بھی نہیں لگتا
دیکھا ہے تجھے جب سے بے چین بہت دل ہے
کہنے کو کوئی تجھ سے رشتہ بھی نہیں لگتا
ملتا ہے سکوں دل کو اس یار کے کوچے میں
ہر وقت مگر جانا اچھا بھی نہیں لگتا
کیا فیصلہ اب کیجئے بارے میں قتیل اس کے
وہ غیر نہیں لیکن اپنا بھی نہیں لگتا
(انتخاب: عبدالحمید ساگر.....کندیاں)

وہاں کی روشنیوں نے بھی ظلم ڈھائے بہت
میں اس گلی میں اکیلا تھا اور سائے بہت
کسی کے سر پہ کبھی ٹوٹ کے گرا بھی نہیں
اس آسماں نے ہوا میں قدم جمائے بہت
نجانے رت کا تصرف تھا یا نظر کا فریب
گلی وہی تھی مگر رنگ جھلملائے بہت
ہوا کا رخ ہی اچانک بدل گیا ورنہ
مہک کے قافلے صحرا کی سمت آئے بہت
یہ کائنات ہے میری ہی ذات کا زرہ
میں اپنے دشت سے گزرا تو بھید پائے بہت
جو موتیوں کی طلب نے بہت اداس کیا
تو ہم بھی راہ سے کنکر سمیٹ لائے بہت
بس ایک رات ٹھہرنا ہے کیا گلہ کیجئے
مسافروں کو غنیمت ہے یہ سرائے بہت
جمی رہے گی نگاہوں پہ تیرگی دن بھر
کہ رات خواب میں تارے اڑ کے آئے بہت
(محمد آصف شہزاد.....الہ آباد ڈھینگ موڑ)

☆☆

برائے نام رہنے دو
ہمیں گمنام رہنے دو
چلے آؤ وہ میخانے
نہ جاؤ چھوڑ کے تنہا
سرور شام رہنے دو
نہ تم ساز جنوں چھیڑو
ابھی یہ کام رہنے دو
کہا کس نے کہ آنکھوں کو
دامن پھیلا کر
یوں بے آرام رہنے
آنسو بہا کر
بڑے دھوکے ہیں راہوں میں
تمہیں کیا خبر ہے
خلوص عام رہنے دو
میں اپنے خدا سے کیا
بجھادوں بتیاں گھر کی
مانگتا ہوں؟
چراغ بام رہنے دو
تم تو کہو گی
نہ اب اوصاف گنواؤ
کسی دلربا کی
ہمیں بدنام رہنے دو
کسی دلنشین کی
(رانا حنیف عاطر.....جھڈو)
وفا مانگتا ہوں

خزاں کے خشک موسم میں
یہ بھی غلط ہے
مجھے تم یاد آتے ہو
وہ بھی غلط ہے
مجھے یقین ہے ساجن
میں اپنے خدا سے صرف
کہ تم سے زندگی بھر
تم کو خوش دیکھنے کی
نہ مل پائیں گے کبھی
دعا مانگتا ہوں
وہ حسرتوں کے پھول
(آذان عزیز.....ٹنڈو آدم)
جو مرجھا چکے ہیں اب
نہ کھل پائیں گے کبھی

تمہیں کچھ خبر نہیں ساجن
سلگتی نظروں سے دیکھے
انا کی اس جنگ میں اکثر
وہ شخص.....میرا صنم
بہت کچھ ٹوٹ جاتا ہے
جو میری جان تھا
بہت کچھ چھوٹ جاتا ہے
میری روح تھا
اگر سمجھو مناسب تو
دنیا تھا، جہاں تھا، سبھی تھا
وہ جلتا گھر نہیں
دیر مت کرنا
بس پھٹا ہے اک آتش فشاں
کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے
جہاں آگ کے بجائے نکلتا ہے دھواں
وفا کے موسم نہ رہیں
اے عثمان کون بتائے انہیں؟
کہ جب تم لوٹ کر آؤ
تنگ ہوا ہے ہم پہ یہ جہاں طویل ہے
تو وہاں ہم نہ رہیں
سفر زندگی
(شائستہ سحر.....راولپنڈی)
پھٹے کیوں نہ یہاں آتش الاؤ

راتوں کو اٹھ کر
خیالوں سے ہو کر
یادوں میں کھو کر
تمہیں کیا خبر ہے
میں اپنے خدا سے
کیا مانگتا ہوں
ویرانوں میں جا کر
دامن پھیلا کر
آنسو بہا کر
تمہیں کیا خبر ہے
میں اپنے خدا سے کیا
مانگتا ہوں؟
تم تو کہو گی
کسی دلربا کی
کسی دلنشین کی
وفا مانگتا ہوں
یہ بھی غلط ہے
وہ بھی غلط ہے
میں اپنے خدا سے صرف
تم کو خوش دیکھنے کی
دعا مانگتا ہوں
(آذان عزیز.....ٹنڈو آدم)

سلگتی نظروں سے دیکھے
وہ شخص.....میرا صنم
جو میری جان تھا
میری روح تھا
دنیا تھا، جہاں تھا، سبھی تھا
وہ جلتا گھر نہیں
بس پھٹا ہے اک آتش فشاں
جہاں آگ کے بجائے نکلتا ہے دھواں
اے عثمان کون بتائے انہیں؟
تنگ ہوا ہے ہم پہ یہ جہاں طویل ہے
سفر زندگی
پھٹے کیوں نہ یہاں آتش الاؤ
بنی ہے اک جوالا مکھی نگلنے کو زندگی
(محمد عثمان علی.....میاں چنوں)

کوئی اور میری خطا نہیں
یہاں چاہتوں کا صلہ نہیں
یہاں دوستی کا مزہ نہیں
یہاں کیسی ہوا بھی
رہی دوستی میں وفا نہیں
یہاں جل گیا میرا آشیاں
ابھی بادلوں کو پتہ نہیں
تیرے در پہ دستک دے سکوں
یہ حق تو تم نے دیا نہیں
میں راہی ہوں راہ اسیر کا
مجھے منزلوں کا پتہ نہیں
میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا
کیا میرا کوئی خدا نہیں
میری مفلسی میرا جرم ہے
کوئی اور میری خطا نہیں
(ڈاکٹر محمد ریاض قریشی.....میاں چنوں)

اتنے منظر دیکھے ہم نے
دل کے اندر دیکھے ہم نے
اڑتی خاک زمیں پر دیکھی
رنگ فلک پر دیکھے ہم نے
تم نے صرف کنارے دیکھے
سات سمندر دیکھے ہم نے
اب تک جتنے چہرے دیکھے
تم سے کمتر دیکھے ہم نے
در پر آنکھیں، آنکھ میں پانی
پانی میں گھر دیکھے ہم نے
دل کے سونے دشت کے اندر
اجڑے منظر دیکھے ہم نے
تم نے دیکھے واجد خواب خوشی کے
غم کے سینے میں اپنے نشتر دیکھے ہم نے
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی.....کراچی)

☆☆

پیشگوئی

عابد علی-لاہور

اسے ماضی حال اور مستقبل پر عبور حاصل تھا، لوگوں کو آنے اور جانے والا حالات سے روشناس کراتا تھا اور پھر ایک دن ایسا ہوا کہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ کچھ بتانے سے قاصر رہا اور پھر ایک خوفناک واقعہ.....

کیا یہ حقیقت ہے کہ انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے، جس کا ثبوت کہانی میں موجود ہے

نہیں جناب! اب یہاں وزن کرنے اور مستقبل کی باتیں بتانے والی مشین نہیں ہے۔ یہاں جوا بھی نہیں ہوتا، شراب نوشی بھی ختم کی جا چکی ہے۔ اب اس چھوٹے سے ہوٹل کو میں چلاتا ہوں۔ آپ کا دل چاہے تو چائے پیجئے، دل چاہے تو کھانا کھایئے، قیام کرنا چاہیں تو اچھے اور صاف ستھرے، کمروں کا بھی یہاں انتظام ہے لیکن اگر آپ کچھ اور چاہتے ہیں تو معاف کیجئے، وہ دن ہوا ہوئے۔

میں جوا کھلوانے والا دلال نہیں، اس ہوٹل کا منیجر ہوں۔ منیجر بھی اور مالک بھی۔ منظور صاحب رخصت ہو چکے ہیں۔ پردھان سنگھ بھی جا چکا ہے اور وہ بڑی بڑی سرمئی آنکھوں والی لڑکی بھی!

تعجب ہے آپ نے اخبارات نہیں پڑھے۔ میرا خیال تھا کہ پورے ملک کو حقیقت معلوم ہو چکی ہوگی مگر آپ جیسے حضرات ابھی تک جوا کھیلنے، شراب پینے اور بدمعاشی کے دیگر کام انجام دینے کی خاطر مسلسل چلے آرہے ہیں۔ یہ ہوٹل خریدے ہوئے مجھے ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اس مختصر سے عرصے میں یہاں کوئی گندا کام نہیں ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہوگا۔ کم از کم اس وقت تک تو یہ ہوٹل ہر قسم کی گندگی سے پاک رہے گا جب تک میں زندہ ہوں۔ تصدیق کے لئے پورے ہوٹل کا جائزہ لے لیجئے، نہ تاش نہ شراب!

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ آپ اچھے آدمی نہیں ہیں۔ میری اتنی جرات ہی نہیں ہے کہ کسی کو برا سمجھوں۔ آپ یقیناً اچھے آدمی ہوں گے۔ نیکی اور شرافت کے آثار آپ کے چہرے سے عیاں ہیں۔ کچھ دنوں قبل، اگر آپ یہاں آئے ہوتے تو بلاشبہ دنیا کی سب سے گندی جگہ دیکھ کر آپ کی طبیعت مالش کرنے لگتی۔ یہ جگہ ہی گندی نہیں تھی، یہاں کا مالک بھی انتہائی گھناؤنے کردار کا مالک تھا۔ مجھ سمیت ہر شخص اس چھ فٹے، ڈیڑھ من وزنی بدمعاش کو منظور صاحب کہا کرتا تھا۔ وہ بدمعاش تو ضرور تھا لیکن ذہانت میں بھی اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ پورے ملک میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ بڑے سے بڑا غنڈا اسے اپنا استاد سمجھتا تھا۔ ناممکن تھا کہ وہ ملک کے کسی حصے میں رہنے والے بدمعاش سے کسی کام کے لئے کہے اور بدمعاش حکم عدولی کی جسارت کر سکے۔ جی ہاں! منظور" ایسا ہی دبنگ قسم کا غنڈا تھا۔

تقریباً چار، ساڑھے چار سال قبل منظور اس مختصر سی آبادی میں آیا تھا۔ یہ ہوٹل اس وقت بھی تھا۔

چھوٹا موٹا جوا اس زمانے میں بھی یہاں کھیلا جاتا تھا لیکن منظور نے کمال ہی کر دیا۔ اس نے نہ صرف اس ہوٹل کو خرید ا بلکہ اسے آوارگی، بدمعاشی اور عیاشی کا ایک ایسا عظیم الشان اڈا بنا دیا کہ دور دور سے شائقین، یہاں آنے لگے۔ منظور نے اسمگلرز کے لئے بھی خصوصی انتظامات کئے۔ اس نے ہوٹل کے نیچے تہ خانے تعمیر کرائے تاکہ وہ لوگ اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنا کام انجام دے سکیں۔

فربہ ہونے کے باوجود منظور کو موٹا بننے کا شوق تھا، چنانچہ وہ ایسا لباس پہنتا کہ زیادہ زیادہ موٹا نظر آئے۔ اور ایسا چہرہ بناتا تاکہ ہر ناواقف شخص اسے اول درجے کا احمق سمجھے۔ وہ بیوقوف بھی نہیں تھا لیکن لوگوں کے سامنے کچھ نہ کچھ ضرور کترتا رہتا تھا جس کی وجہ سے اس کا ہاضمہ خراب ہو گیا تھا۔ مگر اس نے ہمیشہ تنہائی میں، خاص خاص افراد ہی کے سامنے ہاضمے کی خرابی کا ذکر کیا۔

اس ہوٹل میں وزن کرنے والی مشین شاید اسی لئے لگائی گئی تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنا وزن دیکھتا رہے۔ ہوٹل میں آنے والے دوسرے بدمعاش بھی اس مشین پر اپنا وزن دیکھا کرتے تھے لیکن وہ ایک عام قسم کی معمولی سی مشین تھی۔ آپ نے ایسے بہت سے لوگوں کو فٹ پاتھ پر اس جیسی مشینیں لئے ہوئے بیٹھے دیکھا ہوگا جو دس روپے میں آپ کو وزن کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔

اور تب پردھان سنگھ آیا۔

میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ منظور کی شہرت عالمگیر حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ پردھان سنگھ اس کی شہرت سن کر ہی آیا تھا۔ وہ تبت کے کسی علاقے کا باشندہ تھا اور بھارت سے ہو کر یہاں پہنچا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ملک میں وہ غیر قانونی طور پر داخل ہوا تھا۔ اس کے بال سفید تھے، آنکھیں قدرے بھوری تھیں، پیٹ آگے کو نکلا ہوا تھا اور قد بہت ہی چھوٹا تھا۔

میں نے اسے پہلے ہی دن دیکھ لیا تھا۔ اس زمانے میں میری حیثیت منظور کے ایک ایسے ملازم جیسی تھی، جس کا کام جوئے کے پانسے پلٹنا یا تاش کے پتوں میں گڑبڑ کرنا تھا۔ میں باہر کھڑا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ دھندلکا شروع ہونے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ معاً پیچھے سے کسی نے میری پشت کو تھپتھپایا۔ ”معاف کرنا“ کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ ہوٹل کس کا ہے؟“

میں نے پلٹ کر گہری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے کندھے سے ایک بڑی سی گٹھری لٹکی ہوئی تھی اور جسم سے ڈی ڈی ٹی جیسی بدبو آ رہی تھی۔

”کیا یہ ہوٹل منظور کا ہے؟“ اس نے دوبارہ پوچھا۔

”اندر چلے جاؤ“ میں نے کہا۔

”کیا کروں؟“

”منظور اندر ہیں، وہیں چلے جاؤ۔“ میں نے سمجھایا۔ ”اچھا ٹھہرو، میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

”شکریہ!“ وہ پیلے پیلے دانت نکال کر ہنسا اور گٹھری کو ایک کندھے سے اتار کر دوسرے کندھے پر رکھ لیا۔

مجھے علم نہیں تھا کہ وہ منظور سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔ مجھے اس بات سے کوئی غرض بھی نہیں تھی، میں محض اپنے کام سے کام رکھنے کا قائل تھا۔ چنانچہ میں نے اسے اندر پہنچا دیا اور کاؤنٹر کے قریب بیٹھے ہوئے منظور کی سمت اشارہ کر کے باہر آ گیا۔

تاہم باہر آ جانے کے باوجود میرے کانوں میں ان دونوں کی آوازیں پڑتی رہیں۔ منظور کی آواز گرجدار تھی۔ اس نے سرگوشیوں میں باتیں کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے مقابلے میں پردھان سنگھ کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی بھیڑ ممنا رہی ہو۔

”آخر تم آ ہی گئے، بھوپت نے تمہیں پہنچا ہی دیا!“

”دیوی دیوتاؤں کی کرپا ہے مہاراج!“

”سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے؟ رقم کہاں ہے؟“

”میں آپ کی سیوا کروں گا مہاراج! آپ کی ایک ایک پائی ادا کروں گا۔“

”ہاں، بھوپت نے مجھے یہی بتایا تھا کہ تم کام کے آدمی ہو۔ بڑی بڑی عمارتوں پر چھپکلی کی طرح دیوار سے چمٹ کر چڑھ جاتے ہو۔ تم نے شاید کوئی قتل بھی کیا ہے؟“

”میں نے آج تک کوئی قتل نہیں کیا ہے مہاراج! یہ مجھ پر الزام لگایا گیا ہے۔ اگر میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں نہ بھاگ آتا وہ لوگ مجھے پھانسی پر چڑھا دیتے مہاراج!“

”خیر! اگر تم نے قتل کیا ہے تو بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اب تم اپنے ملک کی پولیس کی پہنچ سے بہت دور ہو، یہاں ہر طرح محفوظ رہو گے۔ مجھے اپنا ہی سمجھو اور جب تک چاہو یہیں قیام کرو۔“

”شکریہ مہاراج! بہت بہت شکریہ مہاراج!“

”اپنا سامان بھی لے آئے ہو، یہ تم نے بہت ہی اچھا کیا۔ چلو، میں تمہیں تہ خانے میں بنا ہوا ایک کمرہ دکھا دوں تم وہیں ٹھہرو گے پردھان سنگھ! لوگوں کی نظروں سے دور رہنے کی کوشش کرنا۔ یہاں تمہیں کوئی جانتا تو نہیں ہے لیکن اچھا یہی ہے کہ تم کسی کی نظر میں نہ آنے پاؤ۔ احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے۔“

اور اس طرح جو کچھ مجھے معلوم نہ ہونا چاہیے تھا، از خود معلوم ہو گیا۔ پردھان سنگھ کو غیر قانونی طور پر منظور کے دوست بھوپت نے ہمارے ملک میں منتقل کیا تھا۔ بھوپت اپنے ملک کا مانا ہوا اسمگلر تھا اور جب بھی اس پر کوئی وقت پڑتا تھا، وہ سرحد پار کر کے منظور کے پاس چلا آتا تھا۔

منظور اس سے کس قسم کا کام لینا چاہتا تھا، اس کا مجھے دو روز بعد علم ہوا۔ پردھان سنگھ نے بڑی کامیابی سے جوئے کے پانسے پلٹ دیئے تھے، پچیسی کی بساط منظور کی مرضی کے مطابق اس طرح لگائی تھی کہ ایک مخصوص طریقے کے سوا پانسا کسی طرح سے کیوں نہ پھینکا جائے کبھی درست نہیں پڑ سکتا تھا اس نے تاش اتنی مہارت سے ترتیب دیئے تھے کہ انہیں کتنا ہی کیوں نہ پھینٹا جائے، اپنوں کے سوا کسی کو غلط پتے ملتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس کے فن کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکا۔ فریب اور دھوکے بازی کے میدان میں پردھان سنگھ کا یقیناً ایک اہم اور منفرد مقام تھا۔ میں خاموشی سے پردھان سنگھ کے پاس پہنچا۔ وہ اس وقت بڑے غور سے اپنی تازہ ترین کوششوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بڑبڑا رہا ہے اور خود کلامی میں مصروف ہے۔

اس نے میری طرف کوئی توجہ نہیں دی، بڑبڑاتا رہا، اور کام کا جائزہ لیتا رہا۔ دو مرتبہ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی تکلیف دہ مسکراہٹ بھی پھیل گئی۔ میں اس کے قریب ہی کھڑا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ وہ پانسا کس طرح پھینکتا ہے یا تاش کیسے بانٹتا ہے۔ اچانک پشت سے کسی نے میری گردن کو دبا لیا۔

”یہاں کیا کر رہے ہو بدمعاش؟“ میرے کان میں منظور کی آواز آئی۔ ”چلتے پھرتے نظر آؤ ورنہ میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔“

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ غوطہ لگا کر میں نے اپنی گردن اس کے آہنی شکنجے سے آزاد کرائی اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

ایک ہفتے کے اندر اندر ہوٹل کی کایا پلٹ گئی۔ بڑے بڑے نامی گرامی جواری وہاں آتے اور جیبیں خالی کر کے چلے جاتے۔ پردھان سنگھ عموماً اپنے تہ خانے والے کمرے ہی میں پڑا رہتا۔ وہ دن میں بہت کم، چند لمحوں کے لئے باہر آتا۔ مجھے اندازہ تھا کہ منظور کسی سے اس کا ملنا جلنا پسند نہیں کرتا ہے اس لئے میں اس سے دور ہی رہتا۔ مجھے اپنی گردن بہت زیادہ عزیز تھی۔

لیکن دس بارہ روز بعد، جب منظور شہر گیا ہوا تھا، میرا اور پردھان سنگھ کا آمنا سامنا ہو گیا۔ اس وقت ہوٹل میں صفائی ہو رہی تھی اور میں کرسیاں ادھر ادھر کر رہا تھا کہ وہ ٹہلتا ہوا میرے پاس آ گیا۔

”معاف کر دینا شریمان جی! مجھے معاف کر دینا.....“ اس نے کہا۔

”کیا ہوا؟“ میں نے پلٹ کر حیرت سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" وہ بولا۔ "میں تو اس روز کی معافی مانگ رہا ہوں شریمان جی! جب میری وجہ سے منظور تم پر ناراض ہوئے تھے۔"

"منظور تمہاری وجہ سے ناراض ہوئے تھے؟ کب کی بات کر رہے ہو؟"

"انہوں نے تمہاری گردن پکڑی تھی اور تمہیں بدمعاش کہا تھا۔"

"ارے! اس دن والی بات؟ تم اس کی معافی مانگ رہے ہو؟ حالانکہ تمہارا کوئی قصور نہیں۔ میں منظور کی گالیوں کا عادی ہو چکا ہوں۔ ویسے بھی غلطی میری تھی، ان کے کاروبار سے میرا کیا تعلق؟"

"بڑا گندا کاروبار ہے، بہت ہی گندا!"

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مذاق نہیں کر رہا تھا۔ بالکل سنجیدہ تھا۔

"بہت ہی گھناؤنا۔" اس نے اضافہ کیا۔ "اگر میں مجبور نہ ہوتا تو منظور کا یہ کام ہرگز نہیں کرتا۔ شیروں کا کام دھوکے بازی نہیں ہے۔ ہمت ہے تو جو کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو، سامنے آ کر، چھین جھپٹ کر حاصل کر لو مگر افسوس کہ مجھے، پردھان سنگھ کو وہ کام کرنا پڑا ہے جو گیدڑوں کا کام ہے۔"

"افسوس مت کرو، پردھان سنگھ!" میں نے کہا۔ "زندہ رہنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"یہ بھی کوئی زندگی ہے شریمان جی!" اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ "میں تمہارے ملک میں اچھی زندگی گزارنے آیا تھا۔ بھوپت نے مجھ سے کہا تھا۔ "میں یہاں نیک اور شریف بن کر رہ سکوں گا لیکن یہاں آ کر..... تم تو دیکھ ہی رہے ہو۔ اب میں ہر وہ کام کر رہا ہوں جو منظور چاہتے ہیں۔ انہیں میرے متعلق سب کچھ معلوم ہے۔"

"تم یہاں سے بھاگ کیوں نہیں جاتے؟ مجھے ایسی بات کہنا تو نہیں چاہیے مگر تمہاری حالت دیکھتے ہوئے کہتا ہوں کہ اچھا یہی کہ آج ہی کھسک جاؤ۔ اس سے پہلے کہ منظور واپس آئیں اور پولیس کو بلانے کی دھمکی دیں، تمہیں کراچی چلا جانا چاہیے۔ ملک میں بہت سے لوگ غیر قانونی طور پر آئے ہیں۔ کسی کو تمہارے بارے میں پتا بھی نہیں چل سکے گا۔ میں تمہیں بھڑکا نہیں رہا، یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم یہاں سے جاؤ لیکن اگر حقیقت میں تمہیں یہاں کی جعلسازی کا کام پسند نہیں ہے تو تمہارے حق میں فرار ہی بہتر ہے۔ کیا خیال ہے؟"

پردھان سنگھ نے مسکرا کر بڑے پیار سے میرا بازو دبایا۔ "تم بہت اچھے آدمی ہو! بڑے ایماندار!"

جب کسی اچھے اور ایماندار آدمی کے سامنے اس کی تعریف کی جاتی ہے تو وہ محض مسکرا کر رہ جاتا ہے۔ میں بھی مسکرانے لگا۔

"آؤ۔" اس نے کہا۔ "میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میرے لئے یہاں ٹھہرنا کیوں ضروری ہے؟"

وہ مجھے تہ خانے والے کمرے میں لے گیا۔ وہ بہت ہی معمولی سا، چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں چند کپڑے پھیلے ہوئے تھے اور کونے میں ایک بستر لگا ہوا تھا۔ تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر اس نے ایک لفافہ نکالا، اسے کھولا اور ایک چھوٹی سی تصویر نکالی۔

"دیکھو!" اس نے کہا اور میں نے تصویر کی طرف دیکھا۔

کاش! میں نے اسے نہ دیکھا ہوتا۔ اس تصویر کو دکھانے کے بجائے پردھان سنگھ نے میری آنکھیں نکال لی ہوتیں۔

"روپا۔" وہ بولا۔ "میری بیٹی! اس کی عمر سترہ سال ہے۔ اچھی ہے نا؟"

اچھی نہیں، بہت اچھی تھی اور میں نے یہی بات پردھان سنگھ کو بتا دی۔ کاش وہ اتنی اچھی نہ ہوتی۔ میری نظر اس پر جمی رہ گئی تھی۔ میں تصویر کو مبہوت بنا ہوا دیکھتا رہا اور پردھان سنگھ ہنستا رہا۔ پھر اس نے مجھے اصل بات بتائی۔

مجھے کم و بیش ایک ایک لفظ یاد ہے۔ اس سہ پہر کے بعد ہونے والے سارے واقعات میرے ذہن میں اس طرح محفوظ ہیں جیسے انہیں پتھر پر کندہ کر دیا گیا ہو۔

میں چاہتا ہوں کہ بے کم و کاست انہیں اگل ڈالوں۔ جناب! بہت صبر کر چکا، اب کسی کو بتانے کے لئے انتہائی بے چین ہوں۔

پردھان سنگھ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ بہت بڑا ٹن کار تھا۔ رسی پھینکنے اور اس کے سہارے بلند و بالا، عمارتوں پر چھپکلی کی طرح چڑھ جانے میں اسے ایسا کمال حاصل تھا کہ دور دور تک کوئی اس کا مدمقابل نہیں تھا۔ بیٹی کی پیدائش اور بیوی کی موت کے بعد اس نے سچے دل سے توبہ کر لی اور پہاڑوں سے اتر کر بھارت آ گیا۔ بھارت میں اس نے خود محنت مزدوری کی اور بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ روپا انٹر میں تھی کہ پردھان سنگھ کو کسی سیٹھ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے مقتول سیٹھ کی صورت تک نہیں دیکھی تھی البتہ اتنا گناہ گار ضرور تھا کہ جس روز سیٹھ مارا گیا، وہ اس کی دیوار سے ٹیک لگا کر چند گھڑیوں ستانے کے لئے بیٹھ گیا۔ حوالات میں اس سے بھوپت ملا۔ بھوپت اور اس کی وہ پہلی ملاقات تھی۔ بھوپت نے سرگوشیوں میں پردھان سنگھ کو بتایا کہ وہ بہت ہی واجبی سے معاوضے پر بے گناہ اور بے قصور لوگوں کو سرحد پار کرا دیا کرتا ہے۔ دوسرے ملک میں پہنچ کر وہ لوگ نئے سرے باعزت اور باوقار زندگی گزارنا شروع کر دیتے ہیں۔ بھوپت کی بات میں وزن تھا۔ پردھان سنگھ نے اس کی بات مان لی۔ پردھان سنگھ نے ساری جمع پونجی اس کے حوالے کر دی اور راتوں رات اسے حوالات سے نکال کر سرحد پار پہنچا دیا گیا۔ منظور کا پتا بھوپت ہی نے اسے بتایا تھا۔

"جب میں یہاں پہنچا تو شریمان جی! میرے پاس ایک پیسا بھی نہیں تھا۔" اس نے کہا۔

اعتبار نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ منظور کے دوست کو بھی منظور ہی کی طرح منحوس ہونا چاہیے تھا، انسان کو لیموں کی طرح نچوڑ لینے والا منحوس!

"اب میں منظور کے لئے کام کرتا ہوں، ایسے کام جو وہ کرانا چاہتے ہیں۔ میں یہ کام اس لئے کرتا ہوں کہ تھوڑے سے پیسے جمع کر سکوں اور پیسے اس لئے جمع کرنا چاہتا ہوں کہ روپا کو بھارت سے بلا سکوں۔"

یہ تھی اصل بات۔ منظور جیسے کمینہ خصلت انسان نے پردھان سنگھ سے معاہدہ کیا ہوگا کہ وہ اتنی رقم اس کے ہاتھ پر رکھے تو وہ روپا کو بلا دے گا۔

"منظور تمہیں کتنا معاوضہ دیتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"دس روپے روزانہ۔"

غضب خدا کا! پردھان سنگھ کو اس کام کے دس روپے مل رہے تھے جس کی وجہ سے منظور لاکھوں میں کھیل رہا تھا۔ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو دو تین سو روپے روزانہ سے کم پر ہرگز راضی نہ ہوتا۔ پردھان سنگھ تمام زندگی رقم جمع کرتا رہے لیکن وہ اس قابل نہیں ہو سکے گا کہ روپا کو اپنے پاس بلا سکے۔

میں نے روپا کی تصویر پر ایک نظر اور ڈالی۔ بڑی نامناسب بات تھی کہ پردھان سنگھ کو اتنے طویل عرصے تک روپا کا انتظار کرایا جائے۔ حقیقت یہ ہے جناب کہ میں بھی روپا کا اتنا طویل انتظار نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن میرے حق میں یہ بھی بہتر نہیں تھا کہ میں پردھان سنگھ کو منظور کے ظالمانہ منصوبے سے آگاہ کرتا۔ میں بھلا اپنی گردن تڑوانے کا خطرہ مول لئے بغیر کس طرح بتا سکتا تھا کہ منظور اس سے بالکل اسی طرح کھیل رہا ہے جس طرح ایک بلی قابو میں آئے ہوئے چوہے سے کھیلتی ہے۔

روپا کی تصویر ایک طرف رکھتے ہوئے میں نے کہا۔ "میں سوچوں گا، بہت جلد یہ سوچوں گا کہ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ شریمان جی!" اس نے جواب دیا۔ "آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔"

اس نے ناحق ہی شکریہ ادا کیا کیونکہ میں نے جو کچھ کہا تھا، وہ روپا کی تصویر سے کہا تھا۔

اگلے چند روز تک مجھے تصویر سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ جب سے منظور شہر سے واپس آیا تھا، اس کا جوئے کا کاروبار اچانک آسمان سے باتیں کرنے لگا

تھا۔ شہر میں نہ جانے وہ کس کس سے ملا تھا اور کانوں ہی کانوں میں نہ جانے کیا سن آیا تھا کہ خلقت امنڈ پڑی تھی۔ چوبیس گھنٹوں میں مشکل سے چار چھ گھنٹے ایسے بچتے تھے جن میں جو انہیں ہوتا تھا۔ رات دن مجھے جواریوں کی خدمت کرنا پڑ رہی تھی، کسی کے لئے سگریٹ لے کر جانا، کسی کے لئے چائے، کوئی شراب منگواتا، کوئی کباب!

منظور بھی جس کی بیہودگیوں کو دیکھتے ہوئے اسے صرف منظور کہنے کو دل چاہتا ہے۔ مصروف تھا۔ وہ اپنے آفس میں بیٹھا رہتا اور آمدنی کا حساب لگاتا رہتا۔ پردھان سنگھ کے فن نے اس پر مال و دولت کی موسلا دھار بارش کر دی تھی۔

تیسرے دن کی بات ہے، نہیں تیسرے دن کی نہیں، چوتھے دن کی بات ہے، میں کسی کام کے سلسلے میں منظور کے دفتر کی طرف سے گزر رہا تھا کہ میں نے اندر پردھان سنگھ کی آواز سنی۔ میرے قدم خود بخود رک گئے۔ پردھان سنگھ پہلی بار زور زور سے بول رہا تھا۔

"لیکن تم نے وعدہ کیا تھا مہاراج؟" وہ کہہ رہا تھا۔ "روپا بالکل اکیلی ہے۔ کسی جوان لڑکی کے لئے اکیلی رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اسے میرے پاس آ جانا چاہیے۔"

"وہ اکیلی ہے تو میں کیا کروں؟ تمہارے سر درد سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ یہاں سے بھاگ جاؤ۔ مجھے دوسرے کام کرنا ہیں۔"

"نوٹ گننے والے کام!" پردھان سنگھ کی آواز میں گہرا طنز تھا۔ "تم کسی چھاپے خانے کی طرح نوٹ بنانے میں مصروف حالانکہ سارے تاش، سارے پانسے، ساری بساطیں میری ہی بنائی ہوئی ہیں۔"

"میں کہتا ہوں، بھاگ جاؤ یہاں سے! ایسا نہ ہو کہ مجھے غصہ آ جائے۔"

"میری وجہ سے لاکھوں کما رہے ہو۔ چاہو تو روپا کو بڑی آسانی سے بلا سکتے ہو۔ میں تمہارا ایک ایک پیسا ادا کر دوں گا مہاراج! ہمیشہ تمہارا احسان مند رہوں گا۔"

"بھاگ جاؤ۔"

"کچھ کرو مہاراج!" پردھان سنگھ تقریباً رو پڑا۔ "اگر تم نے کچھ نہیں کیا تو میں لوگوں کو جعلسازی کی ساری باتیں بتا دوں گا۔"

"دیکھو پردھان!" منظور بولا۔ "اگر تم نے کسی سے اس معاملے میں بات کی تو میں بھی پولیس کو اس شخص کے بارے میں بتائے بغیر نہیں مانوں گا جو پاسپورٹ کے بغیر ہمارے ملک میں آ گیا ہے۔"

"تم ایسا نہیں کر سکتے مہاراج!"

"کیوں نہیں کر سکتا؟ میں ہر کام کر سکتا ہوں۔"

چند لمحوں کے لئے دونوں کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ یوں لگا منظور، پردھان سنگھ کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس کے لئے پردھان سنگھ سونے کا انڈا دینے والی مرغی تھا تو دوسری پردھان سنگھ کے لئے منظور کی حیثیت ایک محافظ جیسی دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا تاوقتیکہ پانی سر سے اونچا نہ ہو جائے۔

"ایک بات اور ہے مہاراج!" پردھان سنگھ کی آواز آئی۔

"بھاگ جاؤ۔"

"نہیں! میری بات سنو۔ میں تمہارے لئے بہت ہی خاص قسم کی ایک چیز تیار کر سکتا ہوں۔"

"کیسی چیز؟"

"بالکل انوکھی، بہت ہی عجیب! اب میں تمہیں کیسے بتاؤں مہاراج! دنیا میں کسی کے پاس وہ چیز نہیں ہے۔"

"جوئے سے متعلق کوئی چیز ہے؟"

"یونہی سمجھ لو لیکن جوئے سے اعلیٰ۔"

"اس کی تیاری پر لاگت کیا آئے گی؟"

"بس یہی تین چار سو روپے۔"

"نئی چیز ہو گی؟"

"نئی اور ایک دم خاص؟"

"لوگ دلچسپی لیں گے؟"

"سب سے زیادہ اسی میں دلچسپی لیں گے، اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔"

"ٹھیک ہے، تم اس خاص چیز کی تیاری شروع کر دو، دس بیس روپے کم پڑیں تو مجھ سے ادھار لے لینا۔ حساب کتاب بعد میں ہوتا رہے گا۔"

"نہیں مہاراج! میں نے جو روپے جمع کئے۔ انہی میں کام بن جائے گا لیکن تمہیں بھی ایک وعدہ کرنا ہو گا کہ اگر وہ چیز تمہیں پسند آئی تو تم روپا کو میرے پاس بلوا دو گے؟"

"دیکھا جائے گا۔"

منظور نے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ ویسے وہ ایسا شخص تھا جو وعدہ کر کے بھی مکر سکتا تھا۔ اس کے قول و فعل پر اعتبار کرنا حماقت تھی مگر بیٹی کی محبت میں پردھان سنگھ اتنا دیوانہ ہو رہا تھا کہ اس نے منظور کے "دیکھا جائے گا" جیسے ٹالنے والے جملے کو ہی بہت غنیمت سمجھا۔ شاید وہ اپنی چیز کے بارے میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خود اعتماد تھا۔

"شکریہ مہاراج، بہت بہت شکریہ!"

میں نے پردھان سنگھ کے قدموں کی چاپ سنی تو فوراً وہاں سے نکل گیا۔

اگلے ہفتے جمعہ کا دن تھا۔ جمعے کو ہمارے ہوٹل میں کچھ ہی مجمع ہوا کرتا تھا۔ اس روز بھی صبح ہی صبح جوق در جوق لوگوں نے آنا شروع کر دیا تھا۔ منظور اپنے دو بدمعاش دوستوں سمیت ہنس ہنس کر آنے والوں کا خیر مقدم کر رہا تھا۔

میں ہوٹل کے بیرے برکت کے پاس کچن کے باہر بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا۔ ہم دونوں وہاں کی حالت پر افسوس کر رہے تھے۔ ہمیں یہاں کا ماحول سخت ناپسند تھا۔ جب بھی موقع ملتا تھا، ہم چپکے چپکے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے رہتے تھے۔

اس روز بھی برکت کہہ رہا تھا۔ "آخر آسمان اس بیہودہ ہوٹل پر کیوں نہیں گرتا؟"

اور میں اسے سمجھا رہا تھا کہ قدرت کا کوئی کام بھی مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ آسمان نہ گرنے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہو گی۔ مثلاً یہی کہ ہم دو شرفاء وہاں کام کرتے ہیں۔

عین اسی وقت سامنے سے آتے ہوئے منی ٹرک پر برکت کی نظر پڑی۔

"لو بھئی آ گئی مصیبت۔" اس نے کہا۔ "مجھے تو چائے پینے تک کے لئے دو منٹ خالی نہیں ملتے۔"

"مصیبت نہیں، اپنا پردھان سنگھ آ رہا ہے۔" میں نے ٹرک کی سمت بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"حیرت ہے کہ یہ بیوقوف اس وقت کہاں سے آ رہا ہے اور کیا لے کر آ رہا ہے؟"

ہم دونوں چائے کی پیالیاں خالی کر کے کھڑے ہو گئے، پردھان سنگھ اس اثناء میں ٹرک سے اتر آیا تھا اور ہاتھ ہلا ہلا کر ڈرائیور سے کچھ کہہ رہا تھا۔ پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ڈرائیور اور پردھان سنگھ نے مل کر ٹرک سے ایک وزن کرنے والی بڑی سی مشین اتاری، وہ دونوں اسے لے کر ہوٹل کے اندر آئے اور ٹھیک اس جگہ پر، جہاں سے وزن کرنے والی ایک چھوٹی مشین رکھی تھی، نئی مشین کو بھی رکھ دیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے بھائی؟" برکت نے با آواز بلند پوچھا۔

"کام ہو رہا ہے۔" پردھان سنگھ نے بڑبڑا کر جواب دیا اور ڈرائیور کے ہاتھ میں کرائے کے چند نوٹ رکھ دیئے۔

"کیا لائے ہو بھائی؟" برکت نے دوبارہ پوچھا۔

"وہاں کھڑے کھڑے کیوں چیخ رہے ہو؟ مشین لایا ہوں، وزن کرنے والی مشین! روزانہ تمہارا وزن کیا جائے گا کہ ہوٹل کا کتنا مال کھا جاتے ہو۔" پردھان سنگھ نے دانت نکال دیئے۔ اپنی دانست میں اس نے بڑا مزیدار مذاق کیا تھا۔

برکت آہستہ آہستہ چلتا ہوا مشین کے پاس پہنچ گیا۔ "مشین لانے کا آرڈر کس نے دیا تھا؟"

"میں نے آرڈر دیا تھا۔"

"پہلی مشین میں کیا خرابی تھی؟"

"کوئی خرابی نہیں تھی۔"

"پھر یہ مشین کیوں آئی؟"

"کیونکہ یہ ایک خاص چیز ہے، بہت ہی خاص چیز! اور میں نے منظور کے لئے خاص چیز لانے کا وعدہ کیا تھا۔"

برکت کے پیچھے میں بھی ٹہلتا ہوا ادھر ہی جا نکلا تھا۔ "مجھے تو اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اسٹیشنوں اور سینما ہالوں کے باہر ایسی کئی مشینیں لگی ہیں۔"

حقیقت بھی یہی تھی۔ پردھان سنگھ کی لائی ہوئی مشین ہمارے ہوٹل میں پہلے سے لگی ہوئی مشین سے مختلف ضرور تھی لیکن اسے بہت ہی خاص چیز کہنا کسی طور پر موزوں نہیں تھا۔ پچھلی مشین کرایہ بھاڑا لئے بغیر وزن بتاتی تھی جبکہ نئی مشین سے وزن معلوم کرنے کے لئے پانچ روپیہ کا سکہ ڈالنا ضروری ہوگا اور وزن ایک کارڈ پر لکھا ہوگا۔

میں نے مشین پر بھرپور نظر ڈالے بغیر پلک جھپکتے میں اندازہ لگا لیا تھا کہ پردھان سنگھ کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ بعد میں جب اچھی طرح مشین کو دیکھنے کا موقع ملا تو تب بھی مجھے اپنے سابقہ اندازے میں تبدیلی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ شہروں میں جگہ جگہ پائے جانے والی عام سی مشین کو پاگل افراد ہی بہت خاص چیز کہہ سکتے تھے۔ پردھان سنگھ اسے دو سو روپے ماہانہ پر عرشی اینڈ فرشی ہارڈ ویئر اسٹور سے لے کر آیا تھا۔

البتہ ایمان کی ایک بات ضرور ہے۔ ہماری پچھلی بھدی اور بدنما مشین کے مقابلے میں نئی مشین خوبصورت اور خوشنما تھی، تقریباً قد آدم تک اونچی، چکنی ایسی کہ نظریں تک پھسلیں۔ اوپر کے حصے میں صاف ستھرا چمک دار شیشہ لگا تھا جس سے وزن بتانے والی سوئیاں نظر آتی تھیں۔ سکہ ڈالنے اور وزن کا کارڈ نکلنے کے لئے دو خانے بنے تھے اور شیشے کے اوپر، چوڑے فریم پر جلی حروف میں تحریر تھا۔ "وزن اور مستقبل معلوم کیجئے۔"

آپ تو جانتے ہی ہوں گے جناب! ایسی مشینیں کس قسم کا مستقبل بتاتی ہیں؟ مشین پر اس خیال سے کھڑے ہوجائیں کہ پڑوس کی چنی بیگم سے آپ کی شادی ہوگی یا نہیں؟ پھر سکہ ڈالیں اور گھر رگھر رکی آواز سنیں۔ چند لمحوں بعد ٹرین کے ٹکٹ کے برابر کارڈ نکلے گا جو آپ کو بتائے گا۔ "وزن ایک سو چالیس پونڈ۔" اس کے نیچے خوش خبری، درج ہوگی۔ "بدنصیبی کے دن دور ہوئے۔ تجارت کرو گے تو فائدہ ہوگا۔ نوکری کرو گے تو ترقی ہوگی۔" دیکھا جناب! آپ کا سوال تھا چنی بیگم، جواب ملا چنا میاں! مارا گھٹنا، پھوٹی آنکھ! پردھان سنگھ کی لائی ہوئی مشین بھی بس ایسا ہی مستقبل بتانے والی مشین تھی۔

"شریمان جی! پردھان سنگھ نے مجھ سے پوچھا۔ "تمہیں پسند آئی یہ مشین؟"

میرے بجائے برکت نے جواب دیا۔ "بکواس ہے بالکل! ہوٹل میں روزانہ ہزاروں لاکھوں کا الٹ پھیر ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں پانچ روپے کی آمدنی کی حیثیت ہی کیا رکھتی ہے۔ دس بیس روپے روزانہ سے زیادہ یہ مشین کبھی نہیں دے سکے گی۔ ماہانہ کرایہ تک وصول نہیں ہوگا۔ اسے لانے سے تو اچھا تھا کہ تم آلو چھولے یا انڈے مرغی بیچنے کا کاروبار کر لیتے۔"

میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کام منظور سے پوچھ کر کیا ہے؟"

"نہیں! لیکن اسے بہت جلدی معلوم ہوجائے گا۔"

"اور اس وقت، اس کا غصہ بھی قابل دید ہوگا۔"

"ارے نہیں شریمان جی۔" اس نے کہا۔ "منظور کبھی ناراض نہیں ہوگا۔ وہ بہت خوش ہوگا اور فوراً روپا کو بلوا دے گا۔ تم دیکھ لینا۔"

میں نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ "ہم سب دیکھ لیں گے۔ مشین پر نظر پڑتے ہی وہ ایک دم آپے سے باہر ہوجائے گا۔ اتنے زور زور سے چیخے گا کہ کراچی اور

لاہور تک اس کی آواز پہنچے گی۔ تم نے اس سے بہت ہی خاص چیز لانے کا وعدہ کیا تھا اور جو کچھ تم لے کر آئے ہو، وہ بہت ہی عام چیز ہے۔"

"یہ عام چیز نہیں ہے، شریمان جی! بالکل خاص چیز ہے۔ یہ قسمت کا حال بھی بتائے گی۔"

"اس سے اچھا قسمت کا حال میں بتا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تمہارے ملک میں اسے خاص چیز سمجھا جاتا ہوگا۔"

"نہیں، یہ ادھر بھی خاص ہے۔ دو دن انتظار کرو، میں اسے ٹھیک سے فٹ کردوں۔ دنیا دوڑ پڑے گی۔ پانچ روپے ڈالنے کے لئے لوگ ہزار ہزار رشوت دیں گے۔ اس کا کمال دیکھ کر کبھی حیرت کیا کریں گے۔"

"میں پھر بھی حیرت نہیں کروں گا۔"

پردھان سنگھ نے اس طرح فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ جیسے مجھے بیوقوف سمجھ رہے ہو، پھر اسی طرح ہنستا ہوا تہ خانے کی سمت اپنے کمرے میں جانے کے لئے بڑھ گیا۔

میں اور برکت ہوٹل میں آنے والوں کو چائے پانی پلانے میں مصروف ہوگئے۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد پردھان سنگھ نیچے سے برآمد ہوا۔ اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی طاری تھی۔ مشین کے قریب جا کر اس نے دیوار پر ایک لمبی سی ڈوری لٹکائی اور دوسرا سرا، دوسری دیوار تک لے گیا۔

برکت نے بڑھ کر پوچھا۔ "اب کیا کر رہے ہو؟"

"سوال جواب اور تاک جھانک کی ضرورت نہیں شریمان جی! اس نے کہا۔ "میں مشین فٹ کر رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ کوئی شخص مجھے مشین فٹ کرتے ہوئے دیکھ نہ پائے۔"

"ڈوری پر، پردہ لٹکاؤ گے؟"

"ہاں! پردہ لٹکانا بہت ضروری ہے۔"

"بالکل ہی پاگل ہوگئے ہو۔" برکت نے کہا۔ "اچھی بھلی دیواروں پر پردہ لٹکا کر چھوٹے سے ہوٹل کو مزید چھوٹا بنائے دے رہے ہو۔ ایک منٹ ٹھہرو۔ میں ابھی منظور کو بلا کر لاتا ہوں۔"

میں نے لپک کر برکت کا ہاتھ پکڑ لیا اور سرگوشی کرتے ہوئے سمجھایا۔ "غصہ ٹھیک نہیں ہے یار! اٹھنگنا جو کچھ کر رہا ہے، کرنے دو، منظور کو بلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ساری دردسری اسی بدمعاش کے لئے کی جارہی ہے۔ تم تو ٹھنگنے کو پتے اور پانسے بناتے دیکھ چکے ہو۔ ہوسکتا ہے کہ مشین کو بھی کسی ایسے ہی مقصد کے لئے استعمال کیا جائے۔" پھر میں نے ذرا زور سے کہا۔ "پردھان سنگھ یاروں کا یار ہے۔"

"مگر پردے....."

"راز کی بات ہے۔" پردھان سنگھ نے آنکھیں نکالیں۔ "راز کی بات پردے کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ دو دن میں میرا کام ختم ہوجائے گا اور تیسرے دن تم انہونی کو ہونی اور ناممکن کو ممکن بنتے دیکھو گے۔"

اگر ہم دونوں نے تیسرے دن سے دو دن پہلے ہی انہونی چیزیں دیکھنا شروع کردیں۔ سب سے مکمل دوپہر کو برکت نے دبے پاؤں جا کر پردے کے پیچھے جھانکا، اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور اندر جھانکنے کو کہا۔

اندر مشین کے سامنے نہ جانے کون کون سی الا بلا سلگ رہی تھی۔ پردھان سنگھ آنکھیں بند کئے مشین کے سامنے ہاتھ جوڑے چارزانو بیٹھا تھا اور بالکل برہنہ تھا۔

"یہ احمق کیا کر رہا ہے؟" برکت نے مدھم آواز میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ "زمانہ تیزی سے ترقی کر گیا ہے۔ ممکن ہے دیوی دیوتاؤں کو بے اثر پا کر کچھ لوگوں نے مشینوں کی پرستش شروع کردی ہو۔ مشینوں کی قوت وطاقت سے بہرحال انکار نہیں کیا جاسکتا۔"

اسی رات میں نے پردھان سنگھ کو ہوٹل کے سب سے اوپر والے حصے کی طرف رسی اچھالتے دیکھا۔ پھر وہ رسی کی مدد سے چڑھتا چلا گیا۔ میں نے زینے کی سیڑھیوں پر چڑھ کر ایسی جگہ منتخب کی جہاں سے پردھان

سنگھ کو با آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔

اوپر کھلے ہوئے حصے میں پہنچ کر، آسمان تلے اس نے چند چیزیں سلگائیں، فرش پر حلقہ بنایا اور حلقے میں جا کر اوپر منہ کر کے عجیب سی زبان میں، جس سے میرے کان پہلی بار آشنا ہوئے تھے۔ نہ جانے کب بڑبڑانے لگا۔ اس کے لہجے سے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ روٹھے محبوب کو منانے کی کوشش کر رہا ہو۔ معاً وہ نیچے کی سمت اشارہ کرتا بڑی پھرتی سے لٹکائی ہوئی رسی کو پکڑ کر پھسلتا ہوا اتر گیا۔ میں زینے پر بھاگ کر دوسری طرف ہو گیا۔ پردھان سنگھ مشین کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا جیسے کسی نظر نہ آنے والی شخصیت سے کہہ رہا ہو کہ یہی ہے وہ چیز۔ اچانک وہ زمین بوس ہوا اور فوراً ہی کھڑا ہو کر دوبارہ رسی کی مدد سے چھت پر چڑھ گیا۔ چھت پر پہنچ کر وہ حلقے میں آ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹنے لگا۔

میں اس وقت تک اس کی جنونیوں جیسی حرکات وسکنات کا جائزہ لیتا رہا جب تک کپڑے بدل کر وہ نیچے نہیں آ گیا۔ مشین کو سلام کر کے پردھان سنگھ اپنے تہ خانے والے کمرے کی طرف چلا گیا۔

علی الصبح جب میں نے برکت سے اس کا ذکر کیا تو اسے میری بات کا یقین نہیں آیا۔ وہ کہنے لگا۔ ”تم نے خواب دیکھا ہوگا۔ مشینوں کو چھتوں پر چڑھ کر، ہاتھ جوڑ کر اور سر پیٹ کر فٹ نہیں کیا جا سکتا۔“

میں نے خواب نہیں دیکھا تھا جناب! لیکن جو کچھ دیکھا تھا، اس کا اعتبار کرنے کو میرا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ جواب بیٹی کی جدائی کے غم میں پردھان سنگھ درحقیقت ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گیا ہو، کیونکہ جس قسم کی وہ حرکات کر رہا تھا، ان کی کسی عاقل وبالغ انسان سے توقع نہیں کی جا سکتی۔

اگلی رات اس نے پھر وہی حرکت کی۔ اس مرتبہ اس نے چھت پر چڑھنے کے لئے رسی کا سہارا بھی نہیں لیا۔ وہ دیوار پر چاروں ہاتھ پیروں کی مدد سے یوں چڑھ گیا جیسے کوئی چھپکلی دوڑ رہی ہو یا مچھلی پانی میں تیر رہی ہو۔ کچھ دیر بعد نیچے آ کر وہ قدآدم مشین سے چمٹ کر کھڑا ہو گیا، گویا وہ مشین نہیں، برسوں کی بچھڑی ہوئی محبوبہ تھی۔ کم وبیش ایک گھنٹے تک میں اسے مشین سے چمٹا اور رازونیاز کی باتیں کرتا ہوا دیکھتا رہا۔ جب مجھے جمائیاں اور نیند کی جھپکیاں آنے لگیں تو پردھان سنگھ اور مشین کو اسی حالت میں چھوڑ کر کچن میں سونے چلا گیا۔

صبح ہوئی تو پردے ہٹائے جا چکے تھے۔ مشین چمک رہی تھی۔ پردھان سنگھ مشین فٹ کرنے والے سامان کا تھیلا لٹکائے تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی سمت جا رہا تھا۔ میں نے بے خبر سوئے ہوئے برکت کو جھنجھوڑ کر اٹھایا اور ہم دونوں مشین کو دیکھنے دوڑ پڑے۔

مشین میں دو معمولی تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ اتنی معمولی کہ جناب آپ پہلی نظر میں ان کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ پہلی تبدیلی تو یہ ہوئی تھی کہ مشین کا سفید شیشہ جس سے سوئیاں نظر آتی تھیں، بالکل سیاہ کر دیا گیا تھا اور عجیب وغریب قسم کا ایک ایسا آئینہ معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ لوگوں کو گھور رہا ہو۔ دوسری تبدیلی شیشے کے اوپر لگے ہوئے الفاظ کو کھرچ کر کی گئی تھی اور اب وہاں صرف اتنا لکھا گیا تھا۔ مستقبل معلوم کیجئے۔

”یہ کیا مذاق ہو رہا ہے۔؟“ برکت نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا، ڈھونڈ ڈھانڈ کر سکہ نکالا اور مشین پر چڑھنے کے ارادے سے بڑھا۔ یقین کیجئے جناب! مشین پر چڑھتے ہوئے مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ ایسا لگا جیسے میں نے برف جیسی ٹھنڈی لاش پر قدم رکھ دیئے ہوں اور اچانک ہی اس لاش میں زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے ہوں۔ کچھ دیر کے لئے خوف وحیرت کے باعث میں بھول گیا کہ مجھے مشین میں سکہ ڈالنا ہے۔

سکہ میرے ہاتھ میں تھا۔ چند لمحوں بعد جب دل کی دھڑکنوں میں قدرے کمی آئی تو میں نے سکہ والا ہاتھ بلند کیا، تاکہ سکہ کو مشین میں ڈالوں۔ ٹھیک اسی وقت منظور کے قدموں اور گالیوں کی آواز آئی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اور پردھان سنگھ کی ماں بہن کی شان کی

گستاخیاں کرتا ہوا ادھر ہی آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ہانپتا کانپتا پردھان سنگھ تھا اور پردھان سنگھ کے پیچھے ممبئی کا ایک غنڈا جس کا نام تو خدا جانے کیا تھا لیکن عام طور پر اسے کالا ناگ کہا جاتا تھا۔ کالا ناگ، منظور کا سب سے قریبی دوست تھا اور مہینے میں کم سے کم دو بار اس سے ملنے کے لئے ہوٹل آیا کرتا تھا۔

”یہ..... یہ.....؟“ منظور مشین کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ میں کود کر مشین سے اتر گیا۔ میں نے پھرتی نہ دکھائی ہوتی تو میری گردن منظور کے ہاتھ میں ہوتی۔

”جی..... جی.....جی!“ پردھان سنگھ نے جواب دیا۔

منظور نے گالی بکی، مشین کا آگے پیچھے سے جائزہ لیا، پھر دوسری گالی بکی اور بولا۔ ”نکالو یہاں سے اس بیہودہ مشین کو اچھے بھلے ہوٹل کو تم نے کباڑ خانہ بنا دیا ہے۔“

”میری بات سنو مہاراج! میری بات تو سنو!“ پردھان سنگھ گڑگڑایا۔ ”میں نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا، سو اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔“

”اسے وعدہ پورا کرنا کہتے ہیں!“ منظور شیر کی طرح دھاڑا۔ ”مجھے وزن بتانے والی مشین کی ضرورت ہے؟“

”دھیرج مہاراج! یہ مشین بھوتیہ کی میرا مطلب ہے، مستقبل کی باتیں بتاتی ہے۔“

”مستقبل کی باتیں؟ ابے گدھی کی اولاد؟ تم یہ سمجھتے ہو کہ مستقبل کی جھوٹی باتیں بتا کر مجھے خوش اور مطمئن کر سکو گے؟“

”یہ جھوٹی باتیں نہیں مہاراج! یہ بڑی عجیب مشین ہے۔ مستقبل کے بارے میں جو کچھ بتاتی ہے، وہ بالکل درست ہوتا ہے، بالکل سچ ہوتا ہے۔“

”یہ دوسرا جھوٹ ہے جو تم بول رہے ہو۔“

”مہاراج! میں ایک دم سچ بول رہا ہوں۔“ پردھان سنگھ نے گھگھیائی ہوئی آواز میں ہنس کر جواب دیا۔ ”مشین پر کھڑے ہو جاؤ اور سکہ ڈالو۔ قسمت کا کاغذ باہر آ جائے گا اور اس پر جو کچھ لکھا ہوگا، ویسا ہی ہوگا، بالکل ویسا ہی ہوگا!“

”میں پاگل نہیں ہوں۔“

معاً کالا ناگ نے زور زور سے قہقہے لگانا شروع کر دیئے۔

اس کی ہنسی میں منظور بھی شامل ہو گیا۔ منظور، کو دیکھ کر، میں اور برکت بھی ہنسنے لگے۔ پردھان سنگھ، خاموش کھڑا انگلیاں چٹخاتا اور برے برے منہ بناتا رہا۔

”ہٹاؤ اس حرام زادی کو!“ منظور ہنستے ہوئے بھی حکم دینا نہیں بھولا۔

کالا ناگ نے پردھان سنگھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یار! تم بھی کیسے کیسے جانور پال لیتے ہو؟“

”مصیبت تو یہی ہے کہ میں رحم دل واقع ہوا ہوں، جسے موقع ملتا ہے، میری کمزوری سے فائدہ اٹھانے لگتا ہے۔“ وہ بولا، پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تم نے سنا نہیں، میں کہہ رہا ہوں اس مشین کو اٹھا کر باہر پھینک دو۔“

”ٹھہرو!“ پردھان سنگھ نے چیخ کر کہا۔ ”میں نے اس مشین پر محنت کی ہے۔ اسے آزمائے بغیر ضائع نہیں کیا جا سکتا۔“

کالا ناگ نے بڑھ کر پردھان سنگھ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”بیوقوف انسان! آخر تم منظور جیسے مہربان اور مصروف آدمی کو کیوں پریشان کر رہے ہو؟ تم چاہتے کیا ہو؟“

منظور غرایا۔ ”ہاں! میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تمہاری مشین کو آزمانے بیٹھوں اور یہ دیکھوں کہ مستقبل کے بارے میں سائنس کیا بتاتی ہے؟“

”یہ سائنس نہیں ہے مہاراج؟“ پردھان سنگھ نے بات کاٹی۔

”سائنس نہیں تو پھر کیا ہے؟“

”دیکھو مہاراج! میں روپا کو یہاں بلانے کے

لئے خطرناک سے خطرناک کام کرسکتا ہوں۔ پس میں نے یہ کام کیا ہے۔ اسے سائنس مت کہو۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ یہ وہ معاہدہ ہے جو میں نے تم سے کیا ہے۔"

"کیا بک رہے ہو؟"

"میں بک نہیں رہا ہوں۔ دھیرج سے کام لو۔ میں نے روپا کی خاطر یہ مشین بنائی ہے۔ میں نے اپنا خون پلایا ہے۔ یہ سائنس نہیں جادو ہے۔"

"جادو کا بچہ!" منظور دوبارہ چیخنے لگا۔

"بے شک جادو ہے، کالا جادو!" پردھان سنگھ بولا۔ "تم اسے آزماتے کیوں نہیں۔ سکہ ڈالو اور مشین تمہیں بتا دے گی۔ یہ مشین ہر شخص کے مستقبل کے بارے میں جانتی ہے۔ اس کے ذریعے تم لاکھوں کروڑوں روپے کما سکتے ہو۔ میں تم سے ایک پیسا بھی نہیں لوں گا۔ مجھے صرف روپا چاہیے۔"

"ہاں ہاں، تجھے روپا ضرور ملے گی۔" منظور بولا۔ "اگر یہ مشن اتنی ہی سچی ہے تو یہ تجھے روپا کے متعلق کیوں نہیں بتاتی، اسی سے پھر! یہ بتا سکے گی تیری روپا آرہی ہے یا نہیں۔"

منظور اس کا مذاق اڑا رہا تھا مگر پردھان سنگھ نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ سر جھکا کر بولا۔ "نہیں مہاراج! میں لاکھ روپے کے بدلے بھی اس مشین سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر لگتا ہے! یہ کیوں نہیں کہتا کہ تجھے اس پر یقین نہیں ہے۔"

"مجھے اس پر یقین ہے، پورا پورا یقین ہے۔"

"تو پھر ڈرتا کیوں ہے؟" منظور نے پوچھا۔

"بیکار باتوں میں وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ!" کالا ناگ نے بھنویں سکیڑ کر پر حقارت لہجے میں کہا۔ "میں دیکھتا ہوں یہ مشین میرے مستقبل کے بارے میں کیا بتاتی ہے؟"

میرے ہاتھ میں سکہ چمک رہا تھا۔ کالا ناگ نے بڑھ کر وہ سکہ مجھ سے لے لیا، مشین پر چڑھا، سکہ ڈالا اور کارڈ نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔

مشین سے گڑگڑاہٹ کی آواز آئی لیکن کئی لمحوں تک کارڈ باہر نہیں آیا۔

"کیوں بیٹا؟" کالا ناگ نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔ "تمہاری اماں جان میرا مستقبل کیوں نہیں بتاتیں؟"

ٹھیک اسی وقت کلک کی آواز ہوئی اور مشین سے ایک کارڈ نکل آیا۔ کالا ناگ کارڈ پڑھ کر ہنسا اور مشین سے اتر کر منظور کے ہاتھ میں وہ کارڈ دے دیا۔ میں نے اور برکت نے ایک ساتھ منظور کے کندھے کے پیچھے سے اچک کر پڑھا لکھا تھا۔ "جب کالی بلی تیرا راستہ کاٹے گی، وہ تیری زندگی کا آخری لمحہ ہوگا۔"

"فضول توہم پرستی!" کالا ناگ بولا۔

"بس بس بہت ہو چکا۔" منظور نے کہا۔ "ہمیں اس قسم کی پیشگوئیوں سے دھوکا نہیں دیا جاسکتا۔ دوپہر سے پہلے پہلے یہ مشین یہاں سے ہٹ جانا چاہیے، اگر نہیں ہٹی تو میں مشین کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی یہاں سے باہر پھینک دوں گا۔"

میں نے پردھان سنگھ کی طرف دیکھا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا اور میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کی یہ حالت غم کے باعث ہوئی ہے یا غصے کے باعث۔

"ٹھیک ہے مہاراج! تم مجھے اچھا نہیں سمجھتے۔ نہ سمجھو۔ سچ بولنے والی مشین کو جھوٹا سمجھ رہے ہو تو سمجھتے رہو مگر شریمان....." اس نے گھوم کر کالا ناگ کو مخاطب کیا۔ "تمہارے لئے میرا اب بھی یہی مشورہ ہے کہ کالی بلی سے دور ہی رہنا۔ کہیں کالی بلی نظر آئے گی تو آگے جانے کے بجائے رک جانا بلکہ لوٹ آنا۔ میری بات نہیں مانو گے تو نقصان اٹھاؤ گے اور اس نقصان کی کبھی تلافی نہیں ہو سکے گی۔"

"اور ایک مشورہ میرا بھی ہے۔" کالا ناگ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم اپنے دماغ کا علاج کراؤ۔ مزید کچھ دنوں یہی حالت رہی تو تمہارا مرض ناقابل علاج ہو جائے گا۔"

پردھان سنگھ نے اس طرح اثبات میں سر ہلایا

جیسے اس نے کالا ناگ کا مشورہ قبول کرلیا ہو۔ یہ تو کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ وہ طنزیہ انداز میں سر ہلا رہا ہے تھا۔

"اچھا یار! اب مجھے اجازت دو۔" کالا ناگ نے منظور کو مخاطب کیا۔ "مجھے دوپہر سے پہلے ممبئی پہنچنا ضروری ہے۔ ایک حسین لڑکی میری منتظر ہوگی۔"

"تم ہمیشہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر آتے ہو۔" منظور نے شکایت کی۔ "اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی حسین لڑکی تمہاری منتظر رہتی ہے۔"

"اب کی مرتبہ آؤں گا تو کم از کم پورا دن ضرور تمہارے ساتھ گزاروں گا۔" اس نے کہا اور منظور سے ہاتھ ملا کر دروازے کی طرف بڑھا۔

منظور نے ہاتھ لہرا کر اسے الوداع کہا۔ ہم سب وہیں کھڑے اسے جاتا دیکھتے رہے۔ وہ باہر چلا گیا، پھر اپنی کار پر سوار ہوا اور ہاتھ ہلایا۔ اس کے بعد مسکرایا اور کار اسٹارٹ کردی۔

نہ جانے کیوں منظور سمیت ہم سب کو شبہ ہو گیا تھا کہ کالا ناگ جیتی جاگتی صورت دوبارہ کبھی دیکھنا نصیب نہیں ہوگی۔ ہماری نظریں کار پر لگی تھیں اور کار درمیانی رفتار سے دوڑتی چلی جارہی تھی۔ کار میں کالا ناگ جو اپنی کسی نئی محبوبہ سے ملنے ممبئی جارہا تھا۔

پھر اچانک وہی ہوا جس کا ہمیں شعوری طور پر بے چینی سے انتظار تھا۔ سڑک کے موڑ سے پہلے کسی نامعلوم سمت سے ایک کالی بلی بھاگتی ہوئی نکلی اور کار کے سامنے سے سڑک پار کر گئی۔ کالا ناگ نے اسے کچلنے سے بچانے کے لئے کار کو موڑا مگر کار پر قابو نہ رکھ سکا۔ دوڑتی ہوئی کار سڑک کے کنارے لگے ہوئے درخت کے تنے سے جا ٹکرائی۔ ایک زوردار دھماکا ہوا، ایک بھیانک چیخ سنائی دی اور کار سے شعلے بلند ہونے لگے۔

ہم سب کار کی طرف دوڑے اور یہ جانتے ہوئے دوڑے کہ کالا ناگ کی کوئی مدد نہیں کرسکیں گے۔ کار سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ کالا ناگ جل بھن کر کوئلہ ہو چکا تھا اور اس کا راستہ کاٹنے والی بلی کا دور دور تک کوئی پتا نہیں تھا۔

انہونی، ہونی کا روپ اختیار کر گئی تھی۔

اس حادثے کے بعد منظور پر سکتہ طاری ہو گیا، چپ سی لگ گئی۔ اس نے دوبارہ کبھی مشین کو وہاں سے نکالنے کی بات نہیں کی۔ مشین پر چادر ڈال دی گئی اور چادر پر گتے کا ایک بڑا ٹکڑا پن کردیا گیا۔ گتے کے ٹکڑے پر برکت کے ہاتھ کی بدخط تحریر تھی۔ "مشین خراب ہوگئی ہے۔"

سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ چوتھے روز ہی روپا بھارت سے آگئی۔ منظور کا دوست بھوپت اسے غیر قانونی طور پر سرحد پار لے آیا تھا اور روپا کی اہمیت کے پیش نظر خود ہی اسے ہوٹل میں لے کر پہنچا تھا۔ میں نے بھوپت کو ایک منٹ کے لئے بھی نہیں دیکھا۔ میری نظر روپا پر جمی ہوئی تھی۔ سیاہ طویل بالوں، پھول جیسی سفید رنگت اور لال انگارا ہونٹوں والی روپا حسن و شباب کا ایک ایسا مکمل ترین نمونہ تھی جو شاعروں کے تصورات ہی میں پایا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے باپ کے سینے سے چمٹ گئی تھی اور اس کے کھردرے چہرے کو چوم رہی تھی۔ بے انتہا مسرت کے باعث اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

کچھ دیر بعد، جب باپ بیٹی کسی قدر ہوش میں آئے تو پردھان سنگھ نے ہم لوگوں کو اس سے متعارف کرایا۔ مجھ سے تعارف ہوتے وقت اگرچہ روپا نے ایک اچٹتی ہوئی نظر کے سوا مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی، پھر بھی میں نے اپنے آپ کو دنیا کا بڑا خوش قسمت انسان سمجھا۔ اسے مسکراتے ہنستے، بولتے اور خاموش دیکھ کر دل کے اندر ایک انوکھی سی سنسنی خیز خوشی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ برکت بیرے کا حال بھی مجھ سے کچھ زیادہ ہی مختلف نہیں تھا۔ میری طرح اس کی باچھیں بھی کھلی ہوئی تھیں مگر منظور کی حالت واضح طور پر بالکل مختلف تھی۔ نظر تو اس کی بھی روپا کے سراپا پر گڑی تھی اور دانت اس کے بھی باہر آئے جارہے تھے۔ شاید اندر ہی اندر وہ کچھ اور بھی سوچ رہا تھا۔ میں اس کا مزاج شناس تھا۔ اچھی

طرح جانتا تھا کہ اس کے دل میں کس قسم کا مدوجزر آیا ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں کی چمک کسی گوشت خور وحشی درندے جیسی تھی جو شکار کو سامنے دیکھ کر اسے دبوچ لینا اور چیر پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا ہو۔

"مجھے خوشی ہے کہ میری دن رات کی کوششیں بار آور ہوئیں اور بچھڑے باپ بیٹی ایک دوسرے کو مل گئے۔" منظور بندر کی طرح کھوکھیا کر بولا۔

"میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھول سکوں گی۔" روپا نے جواب دیا۔ وہ بڑی صاف ستھری، شگفتہ اور بے عیب اردو بول رہی تھی۔ "میں اور میرے ابو ہمیشہ آپ کی عنایت کے احسان مند رہیں گے۔ آپ نے ہم پر جو کرم کیا ہے، شاید اس کا بدلہ ہم کبھی نہ چکا سکیں۔"

"اس سلسلے میں پھر گفتگو ہوگی۔" منظور نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ تیزی سے ہاتھوں کی مٹھیاں کبھی بھینچ رہا تھا اور کبھی کھول رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اپنے آپ کو بے قابو ہونے سے بچانے کے لئے اسے بڑی محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ اس وقت تم تھکی ہوئی ہو۔ اندر جا کر آرام کرو۔ باتوں کے لئے پوری زندگی پڑی ہے۔"

پردھان سنگھ بیٹی کو لے کر تہ خانے کے کمرے میں چلا گیا۔ برکت نے فوراً ہی ایک ٹرے میں کھانے پینے کا سامان بھرا اور پردھان سنگھ کے کمرے میں لے گیا۔

منظور نے اپنے آفس کا رخ کیا۔ بھوپت نے ایک میز پر بیٹھ کر آواز لگائی۔ "ناشتہ لاؤ!"

میں نے بڑھ کر پوچھا۔ "کیا کھائیں گے؟"

وہ بولا۔ "ہوٹل میں موجود ہر وہ چیز جو کھائی جاتی ہو اور ہر وہ چیز جو پی جاتی ہو، میرے لئے لے آؤ۔"

بعد میں جب بھوپت ہوٹل کا تقریباً ایک چوتھائی مال پیٹ میں اتار کر ڈکاریں لیتا ہوا منظور کے آفس میں گیا تو عادت سے مجبور ہو کر میں بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچ گیا اور آڑ میں کھڑا ہو کر ان کی گفتگو سننے لگا۔

"لڑکی کو یہاں لانے کا معاوضہ کب دے رہے ہو؟" بھوپت نے منظور سے کہا۔

منظور بولا۔ "لڑکی اور اس کا باپ، دونوں بہت غریب ہیں۔ تم نے ثواب کا کام کیا ہے۔ میں تمہیں اپنے پاس سے پانچ سو روپے دیئے دیتا ہوں۔"

"پانچ ہزار روپے سے ایک پیسا بھی کم نہیں لوں گا۔" بھوپت نے بگڑ کر کہا۔ "گھوڑا گھاس سے یاری کرے گا تو بھوکوں مرے گا۔ میں کہتا ہوں سیدھے سبھاؤ پانچ ہزار روپے میرے حوالے کر دو ورنہ میں لڑکی کو واپس لے جاؤں گا۔"

"آج کل میرا کاروبار گھاٹے میں جا رہا ہے۔" منظور نے جھوٹ بولا۔ "آئندہ کوئی شخص غیر قانونی طور پر سرحد سے آنا یا جانا چاہے گا تو میں تمہاری اگلی پچھلی ساری رقم ادا کر دوں گا۔"

"میں نقد کا سودا کرتا ہوں منظور بھائی! تمہارا کاروبار گھاٹے میں جا رہا ہو فائدے میں مجھے کوئی غرض نہیں۔ پانچ ہزار روپے دو یا لڑکی کو واپس کرو۔ کوئی تیسری بات نہیں ہوگی۔"

پانچ ہزار روپے کی رقم اتنی بڑی تھی جو منظور کسی طرح بھی خرچ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے تو اسی وقت حیرت ہوئی تھی جب اس نے پانچ سو کی پیش کش کی تھی۔ وہ دو پیسے اس وقت خرچ کرتا تھا، جب اسے چار پیسے ملنے کی امید ہوتی تھی۔

بھوپت غصے میں پیر پٹخ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں جا رہا ہوں منظور بھائی۔"

"ٹھہرو!"

منظور کی آواز سنتے ہی میرے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ میں نے ایک قدم بڑھ کر آفس میں لٹکا ہوا پردہ تھوڑا سا ہٹایا اور ایک آنکھ سے اندر جھانکا۔ منظور میز کی دراز سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر بھوپت کے سامنے میز پر پھینک رہا تھا۔ "تین ہزار، چار ہزار، اور یہ پانچ ہزار۔"

کوئی دوسرا شخص مجھ سے منظور کی دریا دلی کا ذکر کرتا تو مجھے ہرگز یقین نہیں آتا مگر اپنے کانوں سنی اور

آنکھوں دیکھی بات کو کس طرح جھٹلاتا۔ منظور نے حاتم کی قبر پر لات ماردی تھی اور پانچ ہزار روپے بھوپت کے حوالے کر دیئے تھے۔ اس کی سخاوت اور دریا دلی قابل تعریف تھی۔

میں جانتا تھا کہ وہ اپنی سخاوت اور دریا دلی کی قیمت وصول کئے بغیر باز نہیں آئے گا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ قیمت کیا ہے۔ وہ قیمت تھی روپا! پانچ ہزار روپے، روپا سے کمتر درجے کی کسی ہستی کے لئے خرچ نہیں کئے جا سکتے تھے۔ مجھے اس بھیڑیئے کے پنجوں میں جلد یا بدیر جانے والی روپا پر اتنا ترس آیا کہ وہاں ٹھہرنا میرے لئے دوبھر ہو گیا۔ اپنی خشک آنکھوں میں آنسو لانے کی کوشش کرتا ہوا، میں وہاں سے پلٹ آیا اور کچن میں جا کر گرم چائے کی مدد سے غم غلط کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد منظور، بھوپت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہنستا ہوا اوپر ہوٹل میں آیا۔ میں کندھے پر رومال ڈال کر فوراً کھڑا ہو گیا۔ بھوپت شاید ہوٹل کا معائنہ کر رہا تھا۔ منظور اس کے پیچھے ماتحتوں کی طرح چلتا ہوا ہر چیز کی وضاحت کر رہا تھا۔ معاً بھوپت کی نگاہ وزن کی مشین پر پڑی وہ چلتے چلتے رک گیا۔

"ارے! منظور بھائی! یہ کیا ہے؟" اس نے مشین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

بدحواسی میں میرے کندھے کا رومال نیچے گر گیا۔ میں انتظار کرنے لگا کہ دیکھو۔ منظور کیا کہتا ہے۔ کالے ناگ کے حادثے کے بعد سے مشین پر کپڑا پڑا تھا اور کپڑے پر "مشین خراب ہو گئی ہے۔" کا گتا تھا۔ اس احتیاط کے باوجود منظور نے اپنے سبھی ملازمین کو ہدایت کر دی تھی کہ کوئی شخص مشین پر چڑھ کر اپنا مستقبل معلوم نہ کر پائے۔ ہمیں آپس میں مشین کے بارے میں گفتگو کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں اور برکت کبھی کبھی سرگوشیوں میں حیرت کیا کرتے تھے کہ منظور مشین کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ آیا وہ اسے ہوٹل سے نکلوا پھینکے گا یا پھر خاص خاص موقعوں پر ذاتی استعمال میں لائے گا؟

منظور، بھوپت کو شاید اپنا بھائی بند ہی سمجھتا تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ دونوں درحقیقت ایک ہی خاندان کے فرد تھے چنانچہ منظور نے یہ خیال کئے بغیر کہ ہم لوگ بھی اس کی گفتگو سن رہے ہیں، بھوپت کو مشین کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

"بھگوان قسم، کیسی حماقت کی بات کر رہے ہو منظور بھائی!" بھوپت نے کہا۔ "یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک بیوقوف سی مشین، محض پانچ روپے میں مستقبل کی بات بتا دے؟"

منظور بولا۔ "کالے ناگ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔"

"وہ اتفاق تھا۔ کالا ناگ اس لئے نہیں مرا کہ مشین نے اسے کالی بلی کے بارے میں پہلے سے بتا دیا تھا۔ اس کی موت کا سبب کار کی خرابی یا اس کی اپنی بے پروائی رہی ہوگی۔ میں اسے جانتا ہوں۔ وہ سدا کا بے پروا تھا۔ بہانہ کالی بلی کا بن گئی۔"

"شاید تمہارا خیال درست ہو۔" منظور نے کہا۔ "پھر بھی اگر تم مجھے ایک لاکھ روپے تک دینے کا وعدہ کرو تو میں اس بیہودہ مشین پر نہیں چڑھ سکتا۔"

"بڑے ڈرپوک اور وہمی شخص ہو، منظور بھائی!"

"میں ڈرپوک اور وہمی نہیں ہوں۔ کالے ناگ کا حشر اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ چکا ہوتا تو دن میں کم سے کم چار بار مستقبل کی باتیں معلوم کیا کرتا۔"

"ڈرپوک اور وہمی لوگوں کی یہی پہچان ہے۔" بھوپت ہنسا۔ "مجھے دیکھو، دنیا کی کوئی مشین چاہے اس سے کتنی ہی خونی داستانیں کیوں نہ وابستہ ہوں، مجھے خوفزدہ نہیں کر سکتی۔"

وہ مشین کی طرف بڑھا اور اس پر پڑی ہوئی چادر اتار پھینکی۔

منظور چلایا۔ "نہیں بھوپت، نہیں!"

مگر بھوپت واقعی بہادر آدمی تھا۔ وہ کب کسی کی سن سکتا تھا۔ اس نے مشین پر پیر رکھا۔ خوب اکڑ کر کھڑا ہوا اور جیب سے سکہ نکال کر مشین میں ڈال دیا۔

مشین میں پہلے کی طرح گڑگڑاہٹ ہوئی، پہلے کی طرح کارڈ نکلنے میں کچھ دیر لگی۔ پھر جب کلک کی آواز کے ساتھ کارڈ نکلا۔ تو بھوپت نے اسے پڑھ کر قہقہہ لگایا۔

میری نظر میں کالا ناگ گھوم گیا۔ وہ بھی کارڈ دیکھ کر ہنس پڑا تھا۔ میں سرتاپاؤں لرزنے لگا۔ کہیں کالی بلی اس کے لئے بھی پروانہ اجل نہ بن جائے۔

مگر بھوپت اور کالے ناگ کی ہنسی میں تھوڑا سا فرق تھا۔ اس کا اندازہ مجھے بھوپت کا کارڈ پڑھ کر ہوا۔ کالا ناگ ہنس تو رہا تھا لیکن مصنوعی ہنسی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ بھوپت کا قہقہہ جاندار تھا۔ اس کے ہونٹوں، آنکھوں اور جسم کے دوسرے حصوں سے ہنسی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ بھوپت نے منظور کو کارڈ تھمایا تو میں نے پنجوں کے بل اچک کر اسے دیکھا۔ کارڈ پر تحریر تھا۔ ”آج کی رات تیری جیت کی رات ہے۔ تو جو بازی لگائے گا جیت کی بازی ہوگی۔“

”بڑے چالاک ہو سالے منظور بھائی!“ بھوپت نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”مشین کے ذریعے جیتنے کا فریب دے کر چاہتے ہو کہ میں تمہارے جوئے خانہ میں بازی لگاؤں اور تم سے لئے ہوئے روپے یہیں ہار جاؤں۔“

منظور نے پہلے گھور کر بھوپت کی طرف دیکھا، پھر مشین کی طرف، میری طرح اسے بھی توقع تھی کہ مشین بھوپت کی موت کا مژدہ سنائے گی۔

”تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔“ بھوپت مسلسل ہنس رہا تھا۔ ”تمہارے تاش کتنی ہی چالبازی سے کیوں نہ لگائے گئے ہوں اور تمہارے پانسے کتنی ہی مہارت سے کیوں نہ پلٹ دیئے گئے ہوں مگر منظور بھائی، میرا نام بھوپت ہے اور بھوپت کو فریب دینا آسان نہیں۔ میں دو چار بازیاں ضرور کھیلوں گا اور ثابت کردوں گا کہ میری جیب سے رقم نہیں نکالی جاسکتی۔“

بھوپت نے جو کچھ کہا تھا سچ کر دکھایا۔ اتنا فرق ضرور ہوا کہ دو بار بازیوں کے بجائے اس نے کم وبیش چالیس پچاس بازیاں کھیلیں۔ پردھان سنگھ جب سے ہوٹل میں آیا تھا، ایک شخص بھی جیت کر نہیں گیا تھا مگر بھوپت جیت رہا تھا اور جیتے ہی جارہا تھا۔ اس کی میز پر چھوٹے بڑے نوٹوں کا ایک فٹ اونچا مینار بن چکا تھا۔

گھبرایا ہوا منظور تھوڑی تھوڑی دیر بعد بنے ہوئے تاشوں کی نئی نئی گڈیاں نکال رہا تھا۔

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مشین سچی تھی یا بھوپت تاش کھیلنے کا ماہر تھا۔ صبح تک بلا مبالغہ اس نے ہزاروں روپے جیت لئے اور پچیسی کی بساط تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

علی الصبح جب وہ سرحد پار اپنے وطن جانے کے لئے تیار ہوا تو مجھے اور برکت کو بھی دس دس کا ایک ایک نوٹ دیا۔ قابل دید حالت منظور کی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا ایک ایک جوڑ اکھڑ گیا ہو۔

”اچھا یار منظور بھائی! اب اجازت دو۔“ بھوپت نے بریف کیس کو جھلاتے ہوئے کہا۔ ”زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔ اب کی مرتبہ آؤں گا تو دس بازیاں پچیسی کی بھی کھیل کر جاؤں گا۔“

منظور نے مصافحے کے لئے اس کی طرف اپنا مردہ ہاتھ بڑھا کر جو الوداعی جملہ کہا، وہ کچھ یوں تھا، آہ! فش.....فشنگ! پھس.....پھف.....بف.....اف!“

بھوپت نے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا، معنی خیز انداز میں ہمیں آنکھ ماری اور جھومتا جھامتا ہوا ہوٹل سے نکل گیا۔

اگلے روز سے اگلے روز تک منظور کا موڈ درست نہیں ہوا تھا۔

جھلاہٹ کے باعث وہ بولائے ہوئے کتے کی طرح ہر ایک کو کاٹنے دوڑ رہا تھا۔ اس سے بات کرنا شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے سے کم نہیں تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب لاعلمی کے باعث پردھان سنگھ سے زندگی کی سب سے بڑی غلطی سرزد ہوئی۔

منظور نے اپنے دفتر میں نیم بے ہوش سا بیٹھا تھا کہ پردھان سنگھ، روپا کے ہمراہ اس کے پاس

پہنچا۔ ”مہاراج منظور!“ اس نے منظور کو مخاطب کیا۔

منظور نے نظر اٹھائی اور سامنے روپا اور پردھان سنگھ کو کھڑے دیکھا، پھر آہستہ سے بولا۔ ”کیا بات ہے؟“ اگر بھڑکدار ریشمی ساڑھی میں ملبوس روپا وہاں نہ ہوتی تو منظور، پردھان سنگھ کو کتے کی طرح بھونک کر جواب دیتا۔

”میں آپ سے اجازت لینے آیا ہوں مہاراج!“ پردھان سنگھ نے کہا۔ ”ہم نے آپ کو بہت تکلیف دی، اب چاہتے ہیں یہاں سے چلے جائیں۔“

”جانا چاہتے ہو؟ کہاں“

”یہاں سے دور، شہر میں، کراچی میں! وہاں روپا کو اچھی سی نوکری مل جائے گی اور شام کے کسی کالج میں تعلیم بھی حاصل کرسکے گی۔“

”پردھان سنگھ!“ منظور نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ”تم دونوں کہیں نہیں جاؤ گے!“

”میں آپ کی ہر خواہش پوری کرچکا ہوں۔ میں نے آپ کے لئے تاش بنائے، پانسے، مستقبل کی باتیں بتانے والی ایسی مشین بنائی جو آپ کے لئے خوش قسمتی.....“

”خوش قسمتی؟“ کیسی روپا اور کہاں کی روپا، پردھان سنگھ نے اس کے زخموں پر نمک چھڑک دیا تھا۔ ناممکن تھا کہ منظور کی آواز بلند ہو نہ ہو۔ اسے تم خوش قسمتی کی مشین کہتے ہو! اس نالائق مشین کو جس نے ایک ہفتے کے اندر اندر مجھ سے میرا بہترین دوست چھین لیا اور جوئے میں مجھے پورے ستر ہزار کا نقصان پہنچایا۔ نہیں پردھان سنگھ! تمہیں یہیں رہنا پڑے گا۔ میں تمہیں اس وقت تک جانے کی اجازت نہیں دوں گا جب تک میرا نقصان پورا نہیں ہوجائے گا۔“

”آپ کی مرضی مہاراج! آپ کہتے ہیں تو نہیں جاؤں گا مگر روپا کو جانے کی اجازت دے دیں۔“

”کبھی نہیں!“ منظور گرجا۔ ”میں روپا جیسی حسین وجمیل، کم عمر اور ناتجربے کار لڑکی کو کراچی جیسے خطرناک شہر میں تنہا نہیں جانے دوں گا۔“

”ایسا نہ کہیے۔ مجھے سب سے زیادہ پریشانی روپا کی ہے۔“

”روپا کے لئے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ منظور کا لہجہ نرم ہوگیا۔ ”میں نے اس کے بارے میں کئی بہترین منصوبے بنائے ہیں، متعدد تجاویز ہیں میرے پاس! روپا ساری زندگی عیش کرے گی۔ بہت جلدی تمہیں ساری باتیں بتاؤں گا۔ بس اب تم دونوں جاؤ اور مجھے کچھ دیر کے لئے اکیلا چھوڑ دو۔“

روپا اور پردھان سنگھ آفس سے باہر آگئے۔ دیوار کی آڑ سے نکل کر میں بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں روپا کو نظر سے اوجھل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خبیث منظور کی خباثت مجھ پر اچھی طرح عیاں ہوچکی تھی۔

”باپو!“ روپا نے پردھان سنگھ کو اس وقت مخاطب کیا جب ہم تینوں کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ ”منظور کن چیزوں کا ذکر کررہا تھا؟“

پردھان سنگھ نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔ ”بتا دو! بیٹی سے کچھ چھپانا ٹھیک نہیں۔“

پردھان سنگھ نے مختصر الفاظ میں تاش کے پتے بنانے اور پچیسی کے حسب منشا پانسے پلٹنے کے متعلق اسے بتایا۔

”اور وہ مستقبل کی باتیں بتانے والی مشین؟ اس کے بارے میں بھی روپا کو بتاؤ۔“

پردھان سنگھ مجھے گھورنے لگا۔

روپا نے پوچھا۔ ”مستقبل بتانے والی مشین؟ وہ کیسی ہوتی ہے؟“

پردھان سنگھ کو اس کے بارے میں بھی وضاحت کرنا پڑی۔ جو کچھ اس نے روپا کو بتایا، اس کا بیشتر حصہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اردو، انگریزی اور ہندی کی متعدد اصطلاحات استعمال کی گئیں، فوٹو الیکٹرک، خلیے، آئینے، آکاش، مرغ کا خون، تعویذ، جنتر منتر، نیند، بیداری،

بھوشیہ اور نہ جانے کون کون سی الٹی سیدھی اصطلاحیں! پھر اس سودے بازی کا ذکر آیا جو سادھنا دیوی سے کی گئی تھی اور غالباً کالے جادو کا سب سے اہم حصہ یہی سودے بازی تھی۔

غالباً کا لفظ میں نے غلط استعمال کیا ہے۔ وہ سودے بازی کالے جادو کا یقیناً سب سے اہم جزو تھی کیونکہ اس کا ذکر آتے ہی سرخ وسفید روپا ہلدی کی طرح پیلی پڑ گئی، آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ وہ کپکپاتی ہوئی کھڑی ہوگئی اور باپ کا کندھا پکڑ کر نحیف آواز میں بولی۔ ”نہیں باپو! نہیں! تم ایسا کام کبھی نہیں کر سکتے۔ یہ تو ایک شیطانی کام ہے جس کے معاوضے میں روح کر گروی رکھنا پڑتا ہے۔“

”روپا، روپا، میری بیٹی، میری بچی! تمہیں بلانے کے لئے میں یہی کر سکتا تھا۔ تمہاری خاطر سب کچھ کیا جاسکتا ہے۔ تمہارے سامنے بڑے سے بڑا معاوضہ بھی میرے لئے بے حیثیت ہے۔“

”تم نے شیطانی کام کیا ہے۔ تم نے سادھنا دیوی کے پاس اپنی روح کو گروی رکھ دیا ہے۔ آہ! یہ سننے سے پہلے میں مر کیوں نہیں گئی؟“

”میں تم سے دور نہیں رہ سکتا روپا!“

”مگر اب تو میں تمہارے پاس آ گئی ہوں۔ اس جادو کی کیا ضرورت ہے؟ اب اسے ٹوٹ جانا چاہیے۔ اگر تم نے خود نہیں توڑا تو میں خود سارا جادو توڑ دوں گی۔“

”کیوں نہیں کر سکوں گی؟“ وہ چیخی۔ غصے نے اس کے حسن کو نکھار دیا تھا۔ ”وہ بدمعاش خود کہہ رہا تھا کہ مشین نے اسے نقصان پہنچایا ہے۔ اسے پتا بھی نہیں چلے گا اور میں مشین کو بدل دوں گی۔ اس کو ہٹا کر عام سی مشین لگا دوں گی تاکہ جادو ٹوٹ جائے۔ تاکہ تمہارا اور سادھنا کا معاہدہ ختم ہو جائے۔“

”روپا!“ میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”مشین کو چھوڑو، اپنے باپو کے ساتھ جتنی جلد ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔ منظور بڑا خطرناک آدمی ہے۔ میں جانتا ہوں تمہارے متعلق وہ کتنی گندی باتیں سوچ رہا ہے۔ ہو سکے تو تم آج ہی کراچی چلی جاؤ۔ میں بھی دو چار دن میں اس کمینے کی نوکری چھوڑ کر تم سے آملوں گا۔ میری بات مان لو روپا! میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں تمہیں یہاں سے چلا جانے کا مشورہ دے رہا ہوں۔“

وہ مسکرائی۔ اس نے پیار بھری آنکھیں، میری آنکھوں میں ڈال دیں۔ پھر وہ میرے اتنے قریب آ کھڑی ہوئی کہ اس کے پسینے کی بھینی مہک سے میرا دماغ معطر ہو گیا اور سڈول بدن کی حرارت سے میرا سارا جسم دہک اٹھا۔

”تم بہت اچھے شخص ہو۔“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں دل سے تمہاری تجویز کی قدر کرتی ہوں مگر میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جاسکتی جب تک اس مشین کو ضائع نہ کر دوں۔ وہ شیطانی مشین ساری دنیا کو تباہی سے ہمکنار کر سکتی ہے۔ میرے باپو نے تاریکی کو اپنے خون سے سینچ کر وجود بخشنے کا مہاپاپ کیا ہے اور اپنی روح کو سادھنا دیوی کے ظالم ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ اگر باپو میری خاطر مہاپاپ کر سکتے ہیں تو بیٹی کی حیثیت سے میرا بھی فرض ہے کہ ان کی مکتی اور نجات کے لئے کوشش کروں۔ باپو کی مکتی اور نجات اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ مشین کا جادو توڑ دیا جائے۔“

”کس طرح؟“

”میں آج رات مشین کو ضائع کر دوں گی۔“ وہ بولی۔ ”اور کل تمہیں یا باپو کو بھیج کر نئی مشین منگا لوں گی۔“

”پردھان سنگھ!“ میں نے روپا کے باپ کو مخاطب کیا۔ ”روپا کا طریقہ خطرے سے خالی نہیں ہے۔ منظور بظاہر مشین کو برا کہتا ہے مگر دل سے اسے نوٹ چھاپنے کی مشین سمجھتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس مشین کو ضائع کر کے اور نئی مشین لگانے کا خطرہ مول لینے کے بجائے تم اس مشین میں پرانے پرزے لگا دو؟ اس طرح مشین سابقہ حالت میں آجائے گی۔

اور کسی کو کانوں کان پتا بھی نہیں چلے گا۔ کئی روز بعد جب اصلی بات معلوم ہوگی، ہم سب کراچی منتقل ہو چکے ہوں گے۔“

”ہاں، کہتے تو ٹھیک ہو۔“ پردھان سنگھ نے کہا۔ ”جس دن بھی موقع ملا میں مشین کو پچھلی حالت پر کر دوں گا۔“

”آج رات!“ روپا نے پرعزم لہجے میں کہا۔ ”انتظار نہیں کیا جائے گا۔ سادھنا دیوی کے چنگل سے آج ہی چھٹکارا حاصل کر لیا جائے گا۔ آج کے بعد اب وہ مشین کسی کو اس کے مستقبل سے آگاہ نہیں کر سکے گی۔“

لیکن یہ روپا کی خوش فہمی تھی۔

اسی روز سہ پہر کو منظور نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا۔ اس کی میز کے نیچے شراب کی دو خالی بوتلیں پڑی تھیں، چہرے سے وحشت اور پریشانی عیاں تھی۔ بھوپت کی جیت کو وہ ابھی تک نہیں بھلا سکا تھا۔

”ستر ہزار کی حقیقت ہی کیا ہے۔ میں اس سے زیادہ کما لوں گا۔“ اس نے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

بڑے رازدارانہ طریقے پر اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس سونے کی ایک بڑی کان ہے مگر ابھی کسی کو میرے اور تمہارے سوا اس کان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔“ پھر وہ ایک عجیب سی آواز میں ہنس پڑا۔ ”پردھان سنگھ کو پتا چل جائے کہ اس نے مجھے کتنا بڑا تحفہ دیا ہے تو خوشی سے اس کی حرکت قلب تک بند ہو سکتی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”آپ اس مشین کے بارے میں کچھ ارشاد فرما رہے ہیں جو مستقبل کی باتیں بتاتی ہے۔“

”بے شک۔“ وہ آنکھیں نچاتا ہوا بولا۔ ”ہمارے ہوٹل میں بڑے بڑے شہروں سے بڑے بڑے امیر لوگ آتے ہیں، جوئے کے شوقین، شراب و کباب کے رسیا اور اول درجے کے وہمی! دولت کی ایک بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ انسان کو انتہائی وہمی بنا دیتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر نجومیوں، دست شناسوں اور قسمت کا حال بتانے والوں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ ہم چاہیں تو ان لوگوں سے دل کھول کر رقم بٹور سکتے ہیں۔ مشین جو کچھ بتائے گی وہ صداقت پر مبنی ہوگا۔ جیسے جیسے پیشگوئیاں درست ثابت ہوں گی، ہماری شہرت اور اس کی مناسبت سے فیس میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، یہاں تک کہ ایک وقت وہ بھی آسکتا ہے کہ جب ہم مشین پر ایک بار کھڑے ہونے کی فیس پانچ چھ ہزار روپے تک طلب کر سکتے ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں بہت غور کیا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ کل سے یہاں ایک نیا کمرہ تعمیر کرانا شروع کر دوں۔ کمرے کی تعمیر کے بعد مشین کو وہاں منتقل کر دیا جائے گا اور دروازے پر تالے ڈال دیئے جائیں گے جنہیں صرف خاص خاص موقعوں ہی پر کھولا جاسکے گا۔“

میں منظور کی بہکی بہکی باتیں سنتا رہا، اثبات میں سر ہلاتا رہا اور دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ اب ایسا کوئی کل نہیں آسکے گا جو اس کی خواہشات پوری کر سکے۔ بات صرف آج رات کی ہے۔ رات کی رات میں کچھ کا کچھ ہو جائے گا۔

باتیں کرتے کرتے اچانک منظور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اس ہوٹل میں مجھے سب سے زیادہ تم عزیز ہو۔“ اس نے کہا۔ ”جانتے ہو کیوں؟“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”تمہاری صورت، تمہاری آواز، تمہاری چال، ڈھال میرے مرحوم بھائی سے بہت ملتی جلتی ہے۔“

”نوازش ہے آپ کی۔“ میں نے جواب دیا اور دل ہی دل میں موٹی سی گالی بک کر کہا۔ جھوٹا پرلے درجے کا۔

”چلو، تھوڑی دیر باہر گھوم پھر آئیں۔“ وہ بولا۔ ”تم کار تو ڈرائیو کر ہی لیتے ہو؟“

میں نے عرض کیا۔ ”میں آپ کی ہر خدمت کے لئے تیار ہوں لیکن یہ سمجھ لیجئے سورج غروب ہوتے ہی

ہوٹل کی گہما گہمی بڑھ جاتی ہے۔ برکت بے چارہ کس کس آرڈر کی بجا آوری کر سکے گا۔"

"ہم لوگ سورج غروب ہونے سے پہلے واپس آجائیں گے۔"

میں نے دل میں کہا۔ اللہ نے چاہا تو ہم آدھی رات سے پہلے ہرگز واپس نہیں آئیں گے۔

دراصل قدرت نے مجھے بڑا اچھا موقع فراہم کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ مشین کے کل پرزے بدلنے کا کام منظور کی غیر موجودگی میں کیا جائے اور اب وہ خود ہی مجھے ہوٹل سے باہر چلنے کی دعوت دے رہا تھا۔

میں نے اپنا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ ایک سنسان جگہ پر جو عام رہگزر نہیں تھی، ایکا ایکی کار خراب ہوگئی۔ میں موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے تیز شراب کی بوتل رکھ لایا تھا۔ پس میں نے بوتل اسے تھمائی اور خود کار ٹھیک کرنے میں مصروف ہوگیا۔

تقریباً ایک بجے رات کار ٹھیک ہوئی۔ اس اثناء میں منظور شراب پیتا رہا اور کار کو گالیاں سناتا رہا۔ مجھے گالیاں دیتے ہوئے وہ اجتناب برت رہا تھا اور یقیناً اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔

کار ٹھیک ہوگئی تو وہ پچھلی سیٹ سے اٹھا اور میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ میں نے کار اسٹارٹ کی اور اسے بہت ہی سست رفتاری سے اس طرح چلاتا ہوا جیسے وہ پیدل چل رہی ہو، ہوٹل کی جانب روانہ ہوا۔

"احتیاط کا تقاضا یہی ہے۔" میں نے منظور کو بتایا۔ "اگر کار دوبارہ خراب ہوگئی تو صبح نہیں ہوجائے گی۔"

اس نے کچھ سوچتے ہوئے پر خیال انداز میں کہا۔ "دس لاکھ نہیں تو کم سے کم دو تین لاکھ روپے ماہانہ ہم اس مشین سے کما سکیں گے۔ مجھے ایک ایسے شخص کی تلاش ہے جو پردھان سنگھ کو ٹھکانے لگا سکے۔ میرا خیال ہے کہ تم یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "آپ نے غلط شخص کا انتخاب کیا ہے۔ میں تو بہت ہی بزدل انسان ہوں۔"

"پردھان سنگھ غیر قانونی طور پر ہمارے ملک میں داخل ہوا ہے۔ اس کی موت کے بعد کوئی اس کی تلاش میں نہیں نکلے گا۔ کسی کو پتا بھی نہیں چل سکے گا کہ کون مارا گیا ہے۔ دس ہزار روپوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اتنی بڑی رقم تو اچھے اچھے بزدلوں کو دلیر بنا دیتی ہے۔"

"میں کسی کو قتل کرنے کا کام انجام نہیں دے سکوں گا۔"

"میں تمہیں بیس ہزار نہیں پورے پچیس ہزار روپے دوں گا۔"

سچی بات یہ ہے کہ پچیس ہزار کا نام سن کر میرے منہ میں پانی آگیا۔ میں کبھی اتنی بڑی رقم کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ مجھے پہلی بار اپنی شرافت اور ایمانداری پر غصہ آنے لگا۔ کیا رکھا تھا اس شرافت اور ایمانداری میں!

"روپا کا کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"روپا میرے پاس رہے گی۔ لڑکیوں کو باپ کی نہیں، عاشق کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کی یہ ضرورت میں پوری کروں گا۔"

اگر کار آہستہ آہستہ نہ رینگ رہی ہوتی یقیناً اسٹیرنگ پر میرا توازن بگڑ جانے کے باعث کسی کھمبے سے ٹکرا کر چکنا چور ہوجاتی ہیں میں نے جلدی سے اسے فٹ پاتھ پر چڑھنے سے روکا۔

چند لمحوں بعد منظور نے پوچھا۔ "کہو پردھان سنگھ کو کب تک ختم کر رہے ہو؟"

میں یہی سوچ رہا تھا۔ طے ہو چکا تھا کہ مشین کے پرزے تبدیل کرتے ہی پردھان سنگھ اور وہ وہاں سے فرار ہوجائیں گے، مجھے قتل کرنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔

"آپ یہ بتائیں کہ پچیس ہزار روپے کب تک دے رہے ہیں؟"

"ابھی!" اس نے کہا۔ "اسی وقت! میں رقم کا انتظام کر کے آیا ہوں۔"

جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں، انہیں شمار کیا اور میری جیب میں ٹھونستا ہوا بولا۔ "میں جانتا ہوں قتل کرنے والا پیشگی رقم کا مطالبہ کرتا ہے۔ کب تک امید کی جائے؟"

میں نے چند لمحوں تک کچھ سوچا۔ "اب جبکہ آپ نے رقم دے ہی دی ہے، میں اپنے آپ کو دنیا کو سب سے دلیر شخص سمجھنے لگا ہوں۔ آپ خود ہی ایک دن مقرر کر دیجئے۔ میں اسی دن پردھان سنگھ کو ختم کر دوں گا۔"

"ایک ہفتے کے اندر اندر اسے ختم ہوجانا چاہیے۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" میں نے کہا اور دل ہی دل میں قہقہہ لگایا۔ ایک ہفتہ تو عرصہ دراز تھا، پردھان سنگھ اور روپا تو چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر غائب ہونے والے تھے۔

پونے تین بجے رات کو جب ہم ہوٹل پہنچے تو پورے ہوٹل میں اندھیرا اور سناٹا طاری تھا۔ میں سمجھ گیا کہ روپا اور پردھان سنگھ بہ حسن خوبی مشین کے پرزے بدلنے کا کام انجام دے کر سونے کے لئے جا چکے ہیں۔

کار سے اتر کر ہم دونوں اندر پہنچے۔ ہم نے چند ہی قدم بڑھائے ہوں گے کہ اس کونے سے جہاں مشین نصب تھی کسی چیز کے گرنے کا کھٹکا ہوا۔

منظور زور سے چلایا۔ "کون ہے؟" اور اس کے ساتھ ہی اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکال لی۔ جو چیز نکلی وہ ایک ریوالور تھا۔ ریوالور میں گولیاں بھری تھیں اور گولیوں کا نشانہ مشین کے سامنے موجود تھا۔

منظور نے فوراً گولی چلا دی۔ چیخ کی اور گرنے کی آواز گونجی۔ میں نے دوڑ کر بجلی کا بٹن دبا دیا۔

اور تب میں نے دیکھا کہ پردھان سنگھ مشین کے برابر کھڑا تھا۔ بہت سے پرزے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے لیکن ان سب سے اہم اور سب سے خطرناک منظر کچھ اور ہی تھا۔

روپا فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کی سرمگیں آنکھیں کھلی تھیں لیکن وہ کچھ دیکھ نہیں سکتی تھی کیونکہ منظور کی گولی اس کی آنکھوں کے درمیان لگی تھی۔ اس کا بھیجا نکل پڑا تھا۔

پردھان سنگھ جو اس عرصے میں روپا کی نبض دیکھنے کے لئے اس کے قریب بیٹھ گیا تھا، کھڑا ہوگیا اور سسکیاں بھرتا ہوا بولا۔ "تم نے اسے مار ڈالا مہاراج!"

منظور نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ "میری کوئی غلطی نہیں ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ کوئی شخص مشین کو چرانے آگیا ہے۔ آخر تم لوگ اتنی رات کو یہاں کیا کرنے آئے تھے؟"

"تم نے روپا کو قتل کر دیا ہے مہاراج!" پردھان سنگھ نے دوبارہ کہا۔ غم اور غصے کے باعث اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔

منظور کی نظر مشین اور اس کے بکھرے ہوئے سامان پر گڑی تھی۔ "اچھا تو یہ بات ہے!" وہ زور سے بولا۔ "تم مشین کو نا کارہ بنا رہے تھے؟"

پردھان سنگھ نے گھور کر منظور کو دیکھا، پھر بے حس و حرکت پڑی ہوئی روپا پر ایک نظر ڈالی۔ "میں نے مشین کو نا کارہ بنا دیا ہے اور اب تمہیں حق پہنچتا ہے کہ روپا کی طرح مجھے بھی ختم کر دو۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

منظور کے ریوالور کا رخ پردھان سنگھ کے سینے کی طرف ہوگیا۔ "خیریت چاہتے ہو تو مشین کو فوراً ٹھیک کر دو۔"

پردھان سنگھ فرش پر پڑے ہوئے ایک چھوٹے سے چمک دار ڈبے کی طرف بڑھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ڈبا اٹھا لیا۔ "اس میں سائنس بھی بھری ہے اور کالا جادو بھی۔ اس میں میری روح ہے، دیوی کا آشیر واد ہے۔ یہ ڈبا خفیہ اور پراسرار رازوں سے بھرا پڑا ہے۔"

"اسے دوبارہ مشین میں جوڑ دو شگنم کی اولاد!" منظور نے چیخ کر کہا۔

پردھان سنگھ نے آہستہ آہستہ بڑے اطمینان سے اپنے ہاتھ بلند کئے اور معاً ڈبے کو چھوڑ دیا۔

ڈبا کسی بم کے دھماکے کی طرح پھٹا۔ اس سے بیک وقت رونے اور ہنسنے کی آوازیں بلند ہوئیں، روشنی اور تاریکی نکلتی ہوئی دکھائی دی۔

"اب تو مجھے بھی مار ڈالو مہاراج!" پردھان سنگھ نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ "روپا مرگئی اور مستقبل کی بات بتانے والی مشین بھی ختم ہوگئی۔ اب میں زندہ رہ کر کیا کروں گا؟ میری زندگی کا ایک حصہ روپا تھی اور دوسرا حصہ یہ مشین!"

"مشین!" حیرت کے باعث میرے منہ سے سیٹی جیسی آواز نکلی۔

"ہاں مشین!" پردھان سنگھ بولا۔ "تاریکی کو زندہ کرنے کے لئے میں نے دیوی کی سیوا میں اپنی روح کا ایک حصہ پیش کیا تھا۔"

ریوالور پر منظور کی گرفت سخت ہوگئی۔ "چوہے کی اولاد! مرنے کے لئے تیار ہوجاؤ۔"

"میں نہیں، چوہے کی اولاد تم ہو مہاراج!" پردھان سنگھ سامنے کرتا ہوا بولا۔ "مجھے مارنے سے پہلے اپنے مستقبل کے بارے میں میری پیش گوئی سن لو۔ تم زندہ نہیں بچو گے مہاراج! تمہیں بھی مرنا پڑے گا اور جلدی ہی مرنا پڑے گا۔ مشین میں تمہارا بھی حصہ ہے اور یہ مشین کسی کو معاف نہیں کرتی۔"

بجلی جیسی تیزی سے فرش پر جھک کر پردھان سنگھ نے فولاد کا ریچ اٹھایا اور منظور کی طرف دوڑا۔

منظور کے ریوالور نے کئی شعلے اگل دیئے۔

پردھان سنگھ چیخ مار کر روپا کے قریب گر گیا اور لمبی سی ہچکی لے کر خاموش ہوگیا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اچانک یہ سب کچھ کیا ہوگیا ہے، میرا دماغ چکرانے لگا تھا۔ قریب تھا کہ میں گر کر بے ہوش ہوجاتا، اسی وقت منظور میری طرف گھوما۔ "دیکھ کیا رہے ہو بدمعاش!" اس نے مجھ سے کہا۔ "لاشیں اٹھانے اور اس جگہ کو صاف کرانے میں میری مدد کرو۔ صبح ہونے میں چند گھنٹے رہ گئے ہیں۔ اگر ہم نے کوتاہی سے کام لیا تو ہم دونوں اپنے آپ کو قتل کے الزام سے نہیں بچا سکیں گے۔"

قتل کے نام پر میں اچھل پڑا۔ منظور درست کہہ رہا تھا۔ اپنے آپ کو قتل کے الزام سے بچانے کے لئے ضروری تھا کہ میں وہاں کی صفائی کرانے میں اس کی مدد کرتا۔

پس میں نے اس کی پوری تندہی سے مدد کی، لاشیں اٹھا کر کار میں لادیں، فرش دھویا اور فرش پر پڑا ہوا سامان اٹھا کر اسٹور میں ڈالا، تہ خانے میں جا کر روپا اور پردھان سنگھ کا سارا سامان نکالا اور منظور کے حکم پر اسے بھی لاشوں کے قریب ڈال دیا۔

منظور نے مجھے ساتھ نہیں لیا۔ مجھے وہیں چھوڑ کر لاشیں اور سامان ضائع کرنے کے لئے روانہ ہوگیا۔

اور اس طرح مجھے پولیس کو بتانے کا موقع مل گیا۔ میں نے پولیس افسر کو کم وبیش ساری داستان سنا دی۔ پھر جیسے ہی منظور سامان اور لاشوں کو ضائع کر کے واپس آیا، پولیس والوں نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور گالیاں دیتے ہوئے اسے ہوٹل میں گھسیٹ لائے۔

مگر منظور کچی گولیاں کھیلا ہوا نہیں تھا۔ وہ بڑا چار سو بیس، بڑا چالاک شخص تھا۔ اس نے ہر بات سے صاف انکار کردیا۔ اس نے کہا کہ میں نے جھوٹی کہانی سنائی ہے اور اس نے کوئی قتل نہیں کیا۔ اس کے ہوٹل میں کبھی جوا نہیں ہوا، کبھی شراب نہیں پی گئی۔

"ایک نظر اس دروغ گو افسانہ گو پر ڈالئے۔" منظور نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پولیس آفیسر سے کہا۔ "یہ کس طرح کانپ رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے، اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ ہوٹل میں آنے والا ہر شخص گواہی دے گا کہ یہ کئی روز سے بڑی اکھڑی اکھڑی احمقانہ باتیں کررہا تھا، آج کچھ زیادہ ہی بہک گیا ہے۔ آپ ہی بتایئے، کیا واقعی وزن کرنے والی کوئی ایسی جادوئی مشین ہوتی ہے جو مستقبل کے بارے میں ہر بات صحیح بتاتی ہو؟ میں یہاں کئی سال سے مقیم ہوں، کبھی آپ نے کسی سے میری شکایت نہیں سنی؟ غضب خدا کا، میں اور دو قتل؟ میں تو حضور والا!

مکھی تک نہیں مار سکتا۔"

پولیس والے کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورنے لگے۔

"یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی شخص غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے یہاں آئے اور آپ جیسے شریف اور فرض شناس لوگوں کی نظروں سے بچ جائے۔" منظور کی بات جاری رہی۔ "کیا نام بتایا تھا اس نے، پردھان سنگھ! مجھ سے قسم لے لیجئے جو آج سے پہلے میں نے اس کا نام بھی سنا ہو۔ کہتا ہے اس کی بیٹی تھی۔ واہ واہ، کتنی مزیدار کہانی سنائی ہے اس نے۔ اسے حاتم جی پرائز ملنا چاہیے۔"

پولیس والے ہنس پڑے۔

"رہی یہ مشین....." منظور نے کہا۔ "خود ملاحظہ فرمالیجئے۔ یہ بالکل عام مشین ہے۔ سکہ ڈالئے، آپ کو اپنا وزن اور غلط سلط مستقبل معلوم ہوجائے گا۔ ٹھہرئے۔ میں ابھی آپ کو دکھاتا ہوں۔"

وہ مشین پر چڑھ گیا۔ اور سکہ نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

میری حالت ایک ایسے شخص جیسی تھی جو نیم بے ہوش ہوچکا ہو۔ میرے پاس ثابت کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ منظور کے پاس ہر ثبوت موجود تھا۔ مشین کے پرزے بدلے جاچکے تھے اور میں جانتا تھا کہ اب وہ واقعی ایک عام سی مشین بن چکی ہے۔

لاشیں غائب کی جاچکی تھیں اور نیچے کا سامان ہٹ چکا تھا۔ کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو میری بات کا اعتبار کرتا۔ میری باتیں محض بکواس تھیں، ان کی نظر میں!

میں نے مشین میں سکہ ڈالنے کی آواز سنی، سفید شیشے کی سوئی گھوم کر دو سو نوے پونڈ کے نشان پر گئی۔ فوراً ہی مشین سے ایک کارڈ برآمد ہوا۔ منظور نے کارڈ نکالا اور مسکرا کر پولیس والوں کی طرف دیکھا۔

مشین ٹھیک طرح سے نصب نہیں کی جاسکی تھی۔ اس کے نچلے پیچ ڈھیلے تھے۔ بھاری بھرکم منظور کے وزن سے اچانک مشین الٹ گئی۔ مشین کے ساتھ ہی منظور بھی نیچے گرا۔

مشین نیچے تھی، منظور اوپر۔ ہم سب دوڑ کر اس کے قریب گئے۔ مشین کا سفید شیشہ ٹوٹ چکا تھا اور ٹوٹے ہوئے شیشے کا ایک بڑا دھاردار ٹکڑا منظور کے گلے کے آر پار ہوگیا تھا۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے منظور نے ذبح ہوتے بھینسے کی طرح ڈکرانے کی آواز نکالی، زور سے ہاتھ پاؤں ادھر ادھر چلائے اور خون بھری کلی کر کے دم توڑ دیا۔

مجھے اس کی موت کا غم نہیں تھا۔ روپا کی موت نے مجھے بالکل بے حس بنا دیا تھا۔ نہ مجھے پردھان سنگھ کا غم ہوا اور نہ منظور کی موت کا۔ ہم سب ایک نہ ایک دن یہاں مرنے ہی کے لئے آئے ہیں مگر بے حسی کے باوجود مرے ہوئے منظور کے ہاتھ میں مشین سے نکلا ہوا کارڈ دیکھ کر میرا جذبہ تجسس بیدار ہوگیا۔ دل چاہنے لگا کہ میں اس کارڈ کو پڑھوں۔

بس جناب! میں نے بڑھ کر مردہ ہاتھ میں دبا ہوا کارڈ نکال لیا۔

کوئی شک نہیں جناب! مشین کو ناکارہ کیا جاچکا تھا۔ وہ ایک عام سی مشین بن گئی تھی۔ ویسی ہی جو ہم اسٹیشنوں، سنیما ہالوں اور بڑے اسٹوروں پر دیکھتے آئے ہیں جس سے آپ شادی کا سوال کرتے ہیں تو معمے میں تیسرا انعام جیتنے کی خوش خبری سنائی جاتی ہے اور معمے کے بارے میں پوچھتے ہیں تو کسی آہو چشم حسینہ کے فریب سے بچنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ جی ہاں، وہ بالکل ویسی ہی عام مشین تھی لیکن اس عام مشین نے منظور کے بارے میں پیشگوئی کی تھی وہ حرف بہ حرف درست معلوم ہورہی تھی۔ منظور کے مردہ ہاتھ سے نکالے ہوئے کارڈ پر اس کا وزن تحریر تھا اور وزن کے نیچے واضح الفاظ میں بڑی اچھی اور سچی پیشگوئی درج تھی۔ "نیا سفر مبارک! مگر خیال رہے کہ تجھے اس سفر میں آگ سے خطرہ ہے۔"

ساحر

ذیشان اقبال عظمی۔کراچی

اسٹیج پر موجود نوجوان نے کہا میں اپنے آپ کو دوسرے سیارے میں منتقل کررہا ہوں، وہ لڑکھڑایا اور نیچے گر پڑا، لوگ بھاگم بھاگ اس کے قریب پہنچے مگر اس جگہ نوجوان کے کپڑوں کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

عقل کو دنگ کرتی انسانی سوچ کے افق پر جھلمل کرتی منفرد، لاجواب اور شاہکار کہانی

"تم جس جادوئی انگوٹھی کی تلاش میں ہو، وہ یہاں نہیں بلکہ یہاں سے لاکھوں کروڑوں میل دور خلا میں ایک ایسے سیارے پر موجود ہے جس پر جگہ جگہ آگ کے دریا موجود ہیں۔ اگر تم اڑ کر بھی جاؤ تو تمہیں واپس آنے میں ایک عرصہ لگ جائے گا جبکہ جادوئی انگوٹھی اگر کل تک نہ ملی تو ساری محنت بے کار ہوجائے گی۔" بوڑھے کاہن نے زاراش جادوگر سے کہا۔

"اگر میں بجلی کی رفتار سے اڑتا ہوا جاؤں تو کیا جلدی نہیں پہنچ سکتا؟" زاراش نے پوچھا۔

"بہت مشکل ہے۔" بوڑھے کاہن نے مایوسی سے کہا۔

"تو پھر اس کا کوئی تو حل ہوگا؟" زاراش نے جھنجھلا کر پوچھا۔ بوڑھا کاہن سوچ میں ڈوب گیا۔

"ایک شخص ہے جو یہ کام کرسکتا ہے۔" بوڑھے کاہن نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"کون ہے وہ؟" زاراش نے چونک کر پوچھا۔

"ناگامی۔ وہ کوئی جادوگر نہیں لیکن اس کے پاس یہ طاقت موجود ہے کہ وہ غائب ہوکر پلک جھپکتے میں کسی بھی دور دراز کی جگہ پر پہنچ سکتا ہے۔ وہ پچھلے سو سال سے ہمالیہ کی ترائی میں ایک جاپ کرنے میں مصروف ہے۔ اگر تم اسے راضی کرلو تو جادوئی انگوٹھی پل بھر میں تمہارے پاس ہوگی۔" بوڑھے کاہن نے بتایا۔

"میں ابھی اڑ کر اس کے پاس جاؤں گا اور اسے ہر حال میں انگوٹھی لانے پر راضی کروں گا۔" زاراش نے پرعزم لہجے میں کہا اور اسی وقت اڑتا ہوا ہمالیہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

"بس کرو بیٹا! بہت رات ہوگئی ہے۔ کل صبح وقت پر آنکھ نہیں کھلی تو اسکول سے دیر ہوجائے گی۔" اس کی امی نے کمرے کے دروازے پر آکر کہا۔

"امی! بس تھوڑی سی کہانی رہ گئی ہے۔" اس نے مچل کر کہا۔

"نہیں بیٹا! اب باقی کہانی کل پڑھ لینا۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر کمرے کی لائٹ بجھا دی۔ اس نے گہری سانس لے کر کہانی کی کتاب بند کرکے تکیے کے نیچے رکھ دی۔ لیکن اس کا دماغ اب بھی کہانی کے کردار و واقعات میں کھویا ہوا تھا۔ کہانی کے اگلے حصے کے بارے میں اندازے لگاتا وہ نہ جانے کب نیند کی وادیوں میں پہنچ گیا۔

ساحر کو اپنے نام کے معنی نہیں معلوم تھے لیکن اسے جادوئی اور الف لیلوی کہانیاں پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اسے جادوئی کہانیوں کے وہ کردار بہت متاثر کرتے تھے جن کے پاس ماورائی طاقتیں ہوتی تھیں۔ ہوا میں اڑ جانا، غائب ہوجانا، طرح طرح کے روپ دھار لینا ہاتھ کے اشارے سے چیزوں کو حرکت میں لے آنا۔ ایسی کہانیاں پڑھ کر وہ خود بھی اپنے آپ کو کسی کہانی کا کردار محسوس کرتا۔ آہستہ آہستہ بچپن گزرتا گیا اور ساحر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ کر کالج میں پہنچ گیا۔

اب اسے بچوں کی کہانیاں پڑھنے کا شوق تو نہیں رہا

تھا لیکن ذہن کے کسی گوشے میں اب بھی جنوں بھوتوں اور جادوگروں کے کردار بسے ہوئے تھے۔ دیومالائی کرداروں پر بننے والی فلمیں وہ اب بھی بہت شوق سے دیکھا کرتا تھا۔ کبھی سرکس اور دیگر تقریبات میں آنے والے شعبدہ باز ہمیشہ اس کی توجہ کا مرکز رہتے تھے۔ اسی دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ اس نے بھی شعبدہ بازوں کے اسٹالوں پر جاجا کر دو تین شعبدے سیکھ لئے تھے۔ بند مٹھی سے سکہ غائب کرنا، رومال سے چھڑی بنانا اور تاش کے پتوں کو سادہ کردینا۔

کالج میں جب وہ اپنے دوستوں کے سامنے ایسے چھوٹے موٹے جادوئی کرتب دکھاتا تھا تو اس کے دوست بہت حیران ہوتے تھے۔ جب وہ سیکنڈ ائیر میں پہنچا تو اس کی دوستی ندیم سے ہوئی۔ ندیم فیصل آباد سے ٹرانسفر ہوکر یہاں آیا تھا۔ ندیم کو ساحر سے متعارف کروانے والا ان کا مشترکہ دوست جمشید تھا۔ ندیم کو ساحر سے متعارف کرواتے وقت اس نے ساحر کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"یہ ہے اپنا جگری دوست ساحر۔ سالا نام بھی ساحر اور ہے بھی جادوگر۔ ابھی چٹکی بجا کر تیرے سر کے بال غائب کردے گا۔" اس کی بات پر سبھی ہنس پڑے تھے اور اسی روز سے ندیم اور ساحر کی دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ ساحر نے ندیم کو بھی اپنے "جادوئی کمالات" سے متاثر کرنے کی کوشش کی لیکن ندیم ہر بار صرف مسکرا دیتا۔ حیرت اور تعجب کے آثار تک اس کے چہرے پر نظر نہ آتے ایک روز تنگ آکر ساحر نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"یار! سارے لوگ میرے جادو کے کمالات سے حیرت زدہ ہوجاتے ہیں لیکن میں نے تمہیں کبھی حیران ہوتے نہیں دیکھا؟" اس کی بات سن کر ندیم ہنس پڑا۔

"اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے؟ جو تم کرتے ہو، وہ تو جگہ جگہ سڑکوں، بازاروں اور محلوں میں دیکھنے کو مل جاتا ہے اور یہ بات ہم سبھی جانتے ہیں کہ یہ جادو یا کوئی مخفی طاقت نہیں بلکہ صرف شعبدہ بازی ہے۔ مزہ تو تب آئے جب تم کچھ ایسا کرکے دکھاؤ جسے کوئی جھٹلا نہ سکے اور نہ اس سے پہلے کسی نے ایسا کیا ہو۔" ندیم تو بات کرکے چل دیا لیکن ساحر کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی۔

شب و روز گزرتے رہے اور بالآخر کالج کا سنہرا دور بھی ختم ہوگیا۔ ساحر نے کوئی ملازمت یا کاروبار کرنے کے بجائے پی۔ایچ۔ڈی میں داخلہ لے لیا۔ وجہ اس کا پسندیدہ مضمون مابعد الطبیعات تھا۔ ساحر کے دماغ پر اب تک کچھ انوکھا کر دکھانے کا خبط سوار تھا۔ گھر والوں سے ضد کرکے اس نے اوپری منزل کے کمرے میں اپنا سامان منتقل کرلیا تھا۔ یونیورسٹی سے واپس آنے کے بعد وہ کمرے میں بند ہوجاتا اور رات گئے تک مختلف مضامین اور نظریات پر تحقیق کرتا رہتا۔ اس کے کمرے میں کتابوں، اور مسودوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔ وقت کے ساتھ اس کا پی۔ایچ۔ڈی بھی مکمل ہوگیا لیکن اس کے معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اب گھر والوں کو اس کی شادی کی فکر ستانے لگی تھی لیکن ساحر کا مکمل دھیان صرف اپنی ریسرچ پر تھا۔ اس کی قابلیت کی بناء پر اسے اپنی ہی یونیورسٹی میں لیکچرار شپ کی ملازمت کی پیشکش ہوئی جو اس نے قبول کرلی۔ اس طرح آمدنی کا ذریعہ بھی ہوجاتا اور اسے اپنی ریسرچ کے لئے مواد بھی ملتا رہتا۔ وہ اپنے لیکچر میں بھی کشش ثقل پر قابو پانے، جسم کو توانائی میں منتقل کرنے اور دوسرے سیاروں پر زندگی اور نامعلوم جہانوں کی کھوج کے بارے میں بات کرتا تھا۔ کچھ ہی سالوں میں وہ خبطی پروفیسر کے نام سے مشہور ہوگیا۔ لوگ پس پردہ اس کا مذاق اڑاتے تھے لیکن منہ پر اسے جھٹلانے یا بحث کرنے کی ہمت کسی کو نہیں تھی۔ آئن اسٹائن کا نظریہ زمان و مکان اس کا پسندیدہ موضوع تھا۔ ساحر اپنی تحقیق میں مصروف رہا اور اس کے والدین ایک کے بعد ایک اس کی شادی اور پوتے پوتیوں کی آرزو دل میں لئے چل بسے۔ اب ساحر کا اس دنیا میں صرف ایک بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ بہنیں تو شادی ہوکر پیا دیس سدھار چکی تھیں۔ بھائی اپنی بیوی، بچوں کے ساتھ نچلی منزل پر قیام پذیر تھا۔ اس کی بدولت ساحر کو کھانا وغیرہ مل جایا کرتا تھا۔ ساحر کا زیادہ تر وقت اب بھی اپنے ریسرچ روم میں گزرتا تھا۔ کچھ سال بعد اسے یونیورسٹی میں پروفیسر کے درجے پر ترقی دے دی گئی۔ علمی حلقوں میں پروفیسر ساحر کا نام

عزت سے لیا جاتا تھا۔ اب لوگ اس کے خبط کو بھی احترام دیتے تھے۔ زیادہ پڑھ لکھ جانے کے بعد کچھ لوگوں میں تو خبط آ ہی جاتا ہے۔ ساحر مختلف سیمیناروں اور تقریبات میں مدعو کیا جاتا۔ اس کے مقالے، مختلف رسائل میں چھپتے لیکن اس کے دل کی خلش اپنی جگہ برقرار تھی۔

ساحر اب اٹھتے بیٹھتے بڑبڑانے لگا تھا۔ کبھی وہ راہ چلتے کھلے آسمان کی طرف اشارے کر کے کوئی خط کھینچتا، کبھی یونیورسٹی کی دیواروں کو ہاتھ کی بالشت سے ناپتا اور کبھی کلاس میں لیکچر دیتے دیتے اچانک کسی ناقابل فہم زبان میں بولنا شروع کر دیتا۔ اس سے وابستہ سبھی لوگوں کو محسوس ہونے لگا تھا کہ اب شاید ساحر کو دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کرانے کا وقت قریب آ گیا ہے۔

یونیورسٹی کی سالانہ تقریب اسناد میں بھی ساحر کی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور اسے اظہار خیال کے لئے اسٹیج پر مدعو کیا گیا۔

''مجھے آپ سب کو یہ بتاتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ آج میں اپنا مقصد پانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ ایک عرصے سے میرے ذہن میں یہ خیال موجود تھا جیسے سائنس کا کوئی کلیہ کسی طرح حل نہیں کر سکتا تھا۔ بہت سے لوگ یہ مانتے ہیں کہ اس کرہ ارض کے علاوہ کائنات میں اور بھی دنیائیں ہیں جہاں زندگی موجود ہے اور ہماری طرح کوئی اور مخلوق بھی وہاں آباد ہے۔ اس کا کوئی واضح ثبوت موجود نہیں ہے کیونکہ دوسرے نظام شمسی ہم سے لاکھوں کروڑوں نوری سال کی دوری پر موجود ہیں اور ہم اتنی رفتار اور فاصلے کو عبور کرنے سے، قاصر ہیں۔ لیکن میں نے ایک ایسی دنیا دریافت کر لی ہے جہاں ہماری طرح کے انسان آباد ہیں۔ انہیں اپنے سیارے پر آباد ہوئے ابھی صرف ہزار برس ہی گزرے ہیں۔ وہاں نہ آلودگی ہے، نہ بے ایمانی اور قتل و غارت اور نہ ہی حرص و طمع۔ سب ایک دوسرے کے ساتھ ایک فلاحی معاشرے میں خوشحالی کے ساتھ آباد ہیں۔ یہ سیارہ ہمارے کرہ ارض سے سات لاکھ نوری سالوں کی دوری پر ایک چھوٹے سے نظام شمسی میں موجود ہے جس میں صرف پانچ سیارے ہیں۔ اس سیارے پر جھلیں، دریا اور پہاڑ موجود ہیں۔ اس کے سورج کا حجم بے حد مختصر ہے اس لئے سیارے کا درجہ حرارت بے حد مناسب ہے۔ نہ ہی وہاں گرمی ہے اور نہ ہی سردی۔ اب آپ لوگ کہیں گے کہ میں مکمل طور پر پاگل ہو چکا ہوں جو کسی ایسے نامعلوم سیارے کے بارے میں باتیں کر رہا ہوں جو ہم سے لاکھوں نوری سالوں کی دوری پر ہے۔ تو پھر مجھے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟'' ساحر ایک لمحے کے لئے سانس لینے کو رکا۔ آڈیٹوریم میں خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر شخص دم بخود ساحر کو دیکھ رہا تھا۔

''کالج کے زمانے میں میرے ایک دوست نے مجھے چیلنج دیا تھا کہ کچھ ایسا کر کے دکھاؤ جو نہ کبھی کسی نے دیکھا ہو اور نہ ہی اس کی کوئی توضیح پیش کی جا سکے۔ تو حاضرین! آج میں آپ سب کے سامنے اپنے وجود کو اس سیارے پر منتقل کر رہا ہوں جس کا ذکر میں نے آپ سے کیا ہے۔ اس سیارے تک پہنچنے میں مجھے صرف چند سیکنڈ لگیں گے۔ آنے والے وقتوں میں اگر کوئی نہ کوئی طریقہ کار دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا تو میں آپ لوگوں کو اسی سیارے پر ملوں گا۔'' اتنا کہہ کر ساحر لڑکھڑایا اور وہیں اسٹیج پر گر گیا۔ اس کے گرتے ہی ہال میں شور مچ گیا۔ یونیورسٹی کے منتظمین اور دوسرے پروفیسر بھاگم بھاگ ساحر کے پاس پہنچے لیکن یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کے قریب ہو گئیں کہ وہاں صرف ساحر کے کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ ساحر کا وجود غائب تھا۔ کپڑے اسی ترتیب میں گرے ہوئے تھے جیسے کسی نے انہیں پہن رکھا ہو لیکن پھر ان کپڑوں میں سے وجود غائب ہو گیا ہو۔ یہ واقعہ ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ ہزاروں لوگوں کے سامنے اس طرح غائب ہو جانا ایک انوکھا معاملہ تھا۔ لیکن ساحر نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ اب نہ جانے ساحر اس وسیع و عریض کائنات میں پھیلے ان گنت سیاروں میں سے کس پر موجود تھا۔ اس کا علم تو خدا کو تھا یا پھر خود ساحر کو۔

میرے مرشد سرکار!

پیر شاہ محمد قادری سرکار

جو میں نے دیکھا

مشاہدات و تحریر: نثار احمد قادری

آستانہ عالیہ

اسماء الحسنیٰ فاؤنڈیشن (ٹرسٹ) B-359 فیصل ٹاؤن، لاہور، پاکستان

042-35167842-35168036

قبلہ پیر قادری سرکار کی خدمت عالیہ میں گذشتہ 20 سال سے زائد عرصے سے ہوں اس دوران میں نے یہاں ایسے ایسے معاملات دیکھے ہیں جو کہ بے حد حیرت انگیز ہیں، لوگ روتے ہوئے آتے ہیں ہنستے ہوئے جاتے ہیں، بیمار، لاچار، مایوس، دنیاوی جھمیلوں میں گرفتار افراد جن میں سیاستدان، بیوروکریٹس، سرکاری و نجی ملازمین، شوبز، علم و ادب کے وہ کون سے ستارے ہیں جو پیر صاحب سے ملنے نہیں آ چکے، لیکن پیر صاحب نے کبھی کسی کو یہ نہیں کہا کہ ہمارا یہ کام کر دیں، جب اسماء الحسنیٰ فاؤنڈیشن قادری سرکار کے مریدوں کے مشوروں پر قائم کی گئی تو اس کی فنڈنگ کا سوال ہوا، طرح طرح کی رائے اور مشورے سامنے آتے رہے، قبلہ قادری سرکار سب سنتے رہے پھر فرمایا'' آپ لوگ پریشان نہ ہوں اللہ تعالیٰ کرم فرمائیں گے، آج کے بعد سے ہماری کتب، پروگرامز، کالمز سے ہونے والی تمام آمدنی اسماء الحسنیٰ ٹرسٹ کے لئے وقف کی جاتی ہے، یوں اسماء الحسنیٰ فاؤنڈیشن اللہ تعالیٰ

کے نامِ مبارک پر بننے والی دنیا کی پہلی NGO کے حوالے سے رجسٹرڈ کرائی گئی۔

پیر صاحب کو میں نے بہت کم غصہ ہوتے دیکھا گو طبیعت میں جلال کا عنصر تو ہے لیکن اس کا ظہور بہت کم ہوتا ہے، میں نے اب تک پیر صاحب کو بڑے سے بڑے نقصان پر افسردہ یا پریشان ہوتے نہیں دیکھا، کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، بڑی سے بڑی زیادتی کو معاف کر دیا، پیر صاحب ہمیشہ دعا کرنے پر زور دیتے ہیں تمام مریدوں عقیدت مندوں کو ایک دوسرے کا خیال رکھنے کو کہتے ہیں، اسماء الحسنیٰ فاؤنڈیشن کے سینکڑوں ممبرز ہیں ہر سال یکم جنوری تا 31 جنوری ممبر سازی ہوتی ہے دنیا بھر کے لوگ جوق در جوق ممبر سازی کے لئے سفارشیں کرواتے ہیں۔ایک مرتبہ ایک خاتون کینسر کے مرض میں مبتلا تھی ہاسپٹل کی تمام رپورٹس نے تصدیق کر دی تھی کہ شاید خاتون 6 ماہ سے زیادہ عرصہ زندہ نہ رہے وہ پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی، پیر صاحب نے اس کی ساری باتیں سنیں پھر فرمانے لگے مرنے کی باتیں بعد میں کرنا پہلے اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی کا بندوبست کرو، وہ عورت بولی سرکار وہ تو ابھی دس برس کی ہے مجھے تو ڈاکٹروں نے 6 ماہ کی مہلت دی ہے'' غصے سے فرمایا ''ڈاکٹر خدا تو نہیں جا! بیٹی کی شادی سے پہلے نہیں مرے گی'' وہ خاتون اس واقعے کے بعد 12 سال زندہ رہی اپنی بیٹی کی شادی کی نواسہ گود میں کھلایا، پھر فوت ہوئی۔ایسے ہی بے شمار مثالیں ہیں کہ دنیا بھر سے مایوس اور نامراد لوگ آتے ہیں اور صحت اور امید یقین کی دولت پا کے جاتے ہیں، پیر سرکار کے عقیدت مندوں میں شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث، ہندو، سکھ، عیسائی غرض سب شامل ہیں، پیر صاحب سب کو یکساں پیار کرتے ہیں، ابھی تھوڑے دنوں قبل جب داتا سرکار کے دربار پر خودکش حملہ ہوا تو بہت روئے اور بہت دکھی ہوئے فرمایا، کیا ہو گیا ہے لوگوں کو ؟امن اور محبت کو تباہ کرتے ہیں، 6 ستمبر کے دن ہم سب کو ساتھ لیا اور میجر شبیر شہید کے مزار پر تشریف لے گئے وہاں جا کر شہید کے لئے دعائے مغفرت کی اور ہم لوگوں سے فرمایا، ''یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے شہادت کی آرزو کی، شہادت کی نعمت پائی، وطن کے لئے شہید ہوئے، یہی اصل شہادت اور اصل جہاد ہے''۔

حضور قبلہ قادری سرکار کو اللہ تعالیٰ نے خوابوں کی تعبیر کا علم عطا فرمایا، اکثر نمازِ فجر کے بعد جو مختلف فون آنا شروع ہوتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا جہاں کے ہر شخص کو اپنے خوابوں کی تعبیر کی فکر پڑی ہوئی ہے، حضور کی کئی پیش گوئیاں ثابت ہو چکی ہیں، مگر آپ اس طرف توجہ کم ہی دیتے ہیں، فرماتے ہیں کہ اللہ اچھا کرے گا، پاکستان کا مستقبل روشن اور درخشاں ہے، دیکھنا چند سالوں میں ہمارا ملک دنیا کا مرکز بنے گا۔

ہم تمام مریدوں اور عقیدت مندوں کو اللہ کی ذات سے سو فیصد امید ہے، قبلہ قادری سرکار کی یہ پیش گوئی سو فیصد پوری ہوگی، حضور قادری سرکار کے اردگرد عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا ہے، دنیا بھر سے لوگ آتے ہیں، خط و کتابت سے لوگوں کی رہنمائی ہو رہی ہے، اب تک پچاس ہزار سے زائد خطوط کا جواب دے چکے ہیں، آج بھی جو خط آتا ہے اس کا جواب ضرور دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ پتا نہیں کس پریشانی کے عالم میں لکھا ہے جواب ضرور دوں گا، غرض یہ کہ محبت، پیار، خلوص، نور رحمت کی برسات ہے پیر صاحب کی ذات، ہمارے پاس اللہ تعالیٰ قبلہ قادری سرکار کو عمر خضر عطا فرمائے، ہم نکموں کی عمر بھی ان کو لگ جائے ان کی خدمت اور عوام الناس کی محبت کا یہ مشن جاری و ساری رہے۔(آمین)

نثار احمد قادری

0332-4253995

شادی کر لو سب بدل جائے گا:

ہمارے ہاں ایک ڈاکٹر صاحب آتے تھے کبھی کبھار، وہ ایک لڑکی کو پسند کرتے تھے۔لڑکی بھی ان کو پسند کرتی تھی۔مگر وہ شادی سے گریزاں تھے۔ وجہ اقتصادی تھی۔ابھی کچھ نہیں ہے۔کیسے گزارا ہوگا؟ حضرت ہمیشہ مسکرا کر کہتے شادی کر لو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

مگر وہ ہمیشہ ٹال جاتے ایک بار وہ کافی عرصے بعد آئے بہت پریشان، دونوں ساتھ تھے۔حضور کے پاس حاضر ہوئے۔ حضور نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا ''شادی کیوں نہیں کرتے ؟جاؤ شادی کر کے آنا'' اس کے بعد سرکار کسی دوسرے کام میں مشغول ہو گئے اور ان کی طرف کوئی توجہ ہی نہ دی۔وہ تھوڑی دیر تک بیٹھے رہے پھر چلے گئے۔وہ لوگ دو، چار ماہ کے بعد آئے تو مٹھائی ہمراہ تھی معلوم ہوا کہ ان دونوں کی شادی ہو گئی ہے اور شادی ہوتے ہی دونوں کو بڑی اچھی جاب بھی مل گئی ہے۔اب دونوں بڑے خوش ہیں۔حضرت نے فرمایا ''معاش کے ڈر سے اولاد پر پابندی نہ لگانا ورنہ پچھتاؤ گے۔'' وہ دونوں چلے گئے سال بھر کے بعد دونوں پھر بڑے پریشان حاضر ہوئے ۔معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے دل کا والو بند ہے جس کا آپریشن ہونا ہے وہ بنگلہ دیش، جرمنی یا بھارت میں سے کسی ایک جگہ ہوگا۔حضور قبلہ قادری سرکار سے دعا کے خواہش مند تھے۔

حضور قبلہ قادری سرکار اطمینان سے تمام باتیں، تمام روئیداد سنتے رہے۔پھر پوچھا ''کتنا خرچ ہوگا؟'' کہنے لگے'' 18 سے 20 لاکھ کا خرچہ ہے۔''

قبلہ قادری سرکار نے فرمایا ''تم لوگوں سے کہا تھا کہ معاش کے ڈر سے اولاد پر پابندی نہ لگانا۔اب بچہ پیدا کرتے تو پچاس ہزار آپریشن کا خرچہ سال بھر وہ کھاتا پیتا دس ہزار کا خرچہ کہنے کو دودھ، دوا کا خرچ۔سال بھر بس کل ایک لاکھ ستر ہزار۔اب خرچ کرو 18 لاکھ تمہاری معاش زیادہ طاقتور ہے یا اللہ سریع الحساب کی گنتی۔'' دونوں میاں بیوی دم بخود رہ گئے۔واقعتاً انہوں نے بچے کی احتیاط اسی حساب کتاب کے ڈر سے کی تھی۔بڑے معافی کے خواستگار ہوئے۔توبہ کی ،معافی مانگی۔قبلہ نے مجھ سے فرمایا ''ان کو صحت کے لئے شفاء اور تعویز دے دیئے جائیں۔''

وہ سلام کر کے رخصت ہونے لگے تو سرکار نے شفقت سے فرمایا ''اچھا اب اگلے سال محمد علی کے ساتھ آنا'' وہ رخصت ہو گئے۔گیارہ ماہ کے بعد وہ جوڑا دوبارہ آیا۔ان کی گود میں بیٹا تھا بچہ انہوں نے قبلہ قادری سرکار کی گود میں ڈال دیا اور کہنے لگے کہ حضور آپ کا مرید محمد علی آ گیا۔آپ نے مرید سے خوش ہو کر بچے کو گود میں اٹھایا، پیار کیا، پاس رکھا شہد چٹایا۔اس کی عمر میں برکت کی دعا کی۔فرمایا ''کیا برکت والا بچہ ہے ۔باپ کو صحت یاب کرے گا۔اپنی باتوں سے دل بہلائے گا ماشاء اللہ، ماشاء اللہ۔دونوں نے بتایا کہ جوں جوں اللہ تعالیٰ نے بچے کے دن چڑھائے اس کے باپ کے دل کے معاملات ٹھیک ہوتے گئے اور بچے کی پیدائش تک مکمل صحت یاب ہو گئے۔سبحان اللہ اللہ تعالیٰ نے بزرگوں کی زبان میں کیا تاثیر عطا فرمائی ہے۔وہ بڑے نام والا ہے۔

خوابوں کی تعبیر کا علم:

قبلہ قادری سرکار کو اللہ تعالیٰ نے خوابوں کی تعبیر پر جو دسترس عطا فرمائی ہے وہ میں نے اپنی زندگی میں کہیں نہیں دیکھی۔دنیا دار، تاجر، سیاستدان، اہل قلم، اداکار، صنعتکار، تو ایک طرف میں نے بعض مشائخ عظام، پیران باصفاء کو اپنے خوابوں کی تعبیر معلوم کرنے کیلئے قبلہ قادری سرکار سے رجوع کرتے ہوئے دیکھا ہے۔حضرت صاحب نے رنگ ٹی وی سے خوابوں کی تعبیر پر مسلسل آٹھ ماہ پروگرامز فرمائے ہیں اور ہر خواب کی برجستہ تعبیر سے کر اہل علم کو اپنا اسیر

بنایا ہے۔کتاب خواب اور تعبیر کو آپ نے جب مرتب فرمایا تو میں نے اس حوالے سے ایک دن پوچھا ''حضور دن رات دیکھتا ہوں کہ آپ سے لوگ خوابوں کی تعبیر کے حوالے سے معلوم کرتے ہیں اور آپ کتاب نہیں دیکھتے فی البدیہہ ارشاد فرما دیتے ہیں ۔اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو فقیر خادم کو اس سلسلے میں کچھ آگاہی عطا فرمائیے۔فرمایا ''خوابوں کی تعبیر ایک لطیف علم ہے اور جب خواب سنتے ہیں۔تو اس کے ساتھ آپ کے اندر وجدانی کیفیت کا ہونا بے حد ضروری ہے۔سچا خواب لوحِ محفوظ کا امر ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دل پر القا فرماتے ہیں۔اس کے ساتھ تعبیر ہوتی ہے۔اب یہ سمجھنے والے پر ہے کہ وہ کیا تعبیر سمجھتا ہے۔'' میں نے عرض کی ''حضور یہ تو علمی باتیں ہیں کیا خوابوں کی تعبیر کا علم اکتسابی ہوتا ہے یا یہ علمِ لدنی کا کوئی حصہ ہے؟'' آپ مسکرائے اور فرمایا ''علم تعبیر، علم لدنی کا ہی ایک حصہ ہے۔جن دنوں میں یہ کتاب مرتب کر رہا تھا کتابوں کی چھان پھٹک کر رہا تھا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بہت بڑی دیوار کے ساتھ کتابوں کی الماریاں ہی الماریاں ہیں۔اور میں ایک سیڑھی پر چڑھ کر کتابیں ڈھونڈھ رہا ہوں کہ پیچھے سے آواز آتی ہے۔''کیا ڈھونڈ رہے ہو؟''

میں نے مڑ کر دیکھا ایک بزرگ صورت میرے پیچھے کھڑے مجھے بڑی شفقت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں، میں نیچے اترا، ان بزرگ کا ہاتھ تھام کر بوسہ دیا اور پوچھا ''حضرت آپ کون ہیں؟'' انہوں نے پوچھا ''کیا ڈھونڈھ رہے ہو؟'' میں نے عرض کی ''حضرت میں خوابوں کے حوالے سے کچھ کتب ڈھونڈھ رہا ہوں'' آپ نے مجھے دیکھا، مسکرائے اور فرمایا ''طالب علم ہو؟'' میں نے عرض کیا ''جی ہاں'' آپ نے مجھے بانہیں پھیلا کر اپنے سینے سے لگایا ان کی چوڑی چھاتی اور حرارت بھرے بدن کے لمس کو میں آج بھی محسوس کر سکتا ہوں اس کے بعد انہوں نے فرمایا ''خوب اب سب کے خوابوں کی تعبیر بتانا'' میں نے ان کی عبا کا دامن تھام کر کہا ''حضرت خدا کے لئے اپنا نام تو بتا دیجئے۔'' فرمایا ''مجھے سیرین کہتے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی وہ بزرگ غائب ہو گئے۔وہ دن ہے آج کا دن مجھے خوابوں کی تعبیر کے حوالے سے کبھی کوئی پریشانی نہ ہوئی۔''سبحان اللہ'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔بے شک بزرگوں کے کرم سے اللہ تعالیٰ کی عنایات کہاں کہاں ملتی ہیں۔سچ ہے کہ جس قدر اس کی بارگاہ میں عجز و انکساری سے پیش آئیں گے اسی قدر معاملات آسان ہوں گے۔

انہی خوابوں کے حوالے سے واقعہ یاد آتا ہے۔ایک دن ایک خاتون نے پوچھا ''حضور میں خواب میں دیکھتی ہوں کہ میں محلے کے بچوں کو اپنا دودھ پلا رہی ہوں۔'' آپ نے برجستہ فرمایا ''شوہر کا مال غیروں پہ خرچ نہ کیا کر۔'' ایک بہت بڑے صاحب نے اپنا خواب آپ سے بیان کیا ''حضور میں دیکھ رہا ہوں کہ میں ایک بہت بڑے غبارے میں اُڑ رہا ہوں اور پاکستان سے باہر سمندر پہ ہوں آپ نے چند لمحے سوچا اور فرمایا ''آپ ایک بے اصل معاملے میں ترکِ وطن سے دوچار ہوں گے اور ریتیلے علاقے میں کافی وقت گزاریں گے'' اُن کا یہ خواب بھی سچا ہوا اور حضور کی تعبیر بھی ٹھیک ثابت ہوئی۔قبلہ قادری سرکار عموماً سیاسی خوابوں کی تعبیر نہیں دیتے ہیں بعض خوابوں کے حوالے سے آپ کو کافی پریشانیوں سے گزرنا پڑا تھا آپ فرماتے ہیں بڑے پیڑوں کا ظرف بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ایک بچی جو کالج میں پڑھ رہی تھی اس نے خواب سنایا ''حضرت میں دیکھا کہ آسمان سے تارہ ٹوٹا اور میری گود میں آ گیا اور پھر وہ تاریک ہو گیا اس کے بعد دوسرا حصہ جو پہلے سے بھی زیادہ روشن اور چمک دار تھا وہ میری گود میں چمکتا رہا۔''

آپ نے فرمایا ''تمہاری دو شادیاں ہوں گی لیکن ایک شادی ناکام ہو گی اور دوسری شادی ہو گی جو پہلی سے زیادہ بہتر ثابت ہو گی۔'' واقعی ایسا ہی ہوا اس کی شادی ایک بہت بڑی فیملی میں ہوئی اور چند ماہ بعد ہی اس کے شوہر کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ انتقال کر گیا۔ڈیڑھ سال کے بعد اس کی شادی اس سے اچھی اور بڑی فیملی میں ہوئی۔اسی طرح کراچی سے ایک سیٹھ صاحب تشریف لائے کہنے لگے حضرت صاحب سے ملنا ہے۔میں نے انہیں چائے پلائی۔حضور قبلہ کے آنے میں ابھی دیر تھی۔گھر سے تو آپ روانہ ہو چکے تھے مگر راستے میں ایک عزیز کے ہاں ملاقات کیلئے جانا تھا۔لہٰذا دیر ہو رہی تھی سیٹھ صاحب کہنے لگے اب اللہ والے بھی انتظار کروانے لگے ہیں ان کا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ مجھے بے حد برا لگا وہ شاید میرے چہرے سے سمجھ گئے کہ مجھے برا لگا تھا۔جلدی سے صفائی پیش کرنے لگے ''وہ دراصل میری آج شام کی فلائٹ ہے اسی لئے میں پریشان ہوں'' میں چپ ہی رہا۔یہاں بھانت بھانت کے لوگ دن رات آتے رہتے ہیں ہر ایک کی اپنی دنیا، اپنے معاملات، اپنے مسائل ہیں۔تھوڑی دیر بعد سرکار تشریف لے آئے، کافی لوگ آ چکے تھے ۔کئی لوگ تو سیٹھ صاحب سے پہلے کے بیٹھے ہوئے تھے ہمارا دستور یہی ہے کہ جو پہلے آئے گا وہی پہلے ملے گا۔سیٹھ صاحب پہلو بدلتے رہے مگر میں نے ان کو باری آنے پر ہی بھیجا۔خیر وہ گئے معلوم ہوا کہ وہ کئی ہفتوں سے مسلسل ایک ہی خواب دیکھ رہے ہیں کہ وہ سفر کر رہے ہیں مگر راستہ نظر نہیں آتا اور اچانک بہت زور دار ٹکر کی آواز آتی ہے تو انہیں احساس ہوتا ہے کہ ٹرین میں سوار ہیں اور ٹرین اُلٹ گئی ہے حالانکہ وہ ٹرین میں سفر ہی نہیں کرتے ہیں کئی لوگوں سے انہوں نے اس کی تعبیر معلوم کرنا چاہی مگر ان کی تسلی نہ ہوئی ۔اب وہ قبلہ قادری سرکار کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں حضرت نے انہیں غور سے دیکھا اور پوچھا ''آپ کی عمر کیا ہے؟'' انہوں نے بتایا ''55 سال۔''

حضرت فرمانے لگے ''زندگی ایک ٹرین کی طرح وقت کی پٹڑی پر بھاگی جا رہی ہے سال اس کے ڈبے ہیں آپ کی زندگی میں اور جسمانی معاملات میں ،اعتدال کی کمی ہے۔اللہ تعالیٰ سے توبہ کیجئے اور اس سے پہلے کہ اور اس سے پہلے کے آپ کے معاملات اختتام پزیر ہو جائیں اور توبہ کی مہلت نہ ملے تو پھر کچھ نہیں بچے گا'' سیٹھ صاحب آنکھیں پھاڑے یہ تعبیر سنتے رہے۔پھر اچانک اٹھے اور قبلہ قادری سرکار کے قدموں میں بیٹھ گئے اور کہنے لگے ''حضور اس سے پہلے ایسی سچی تعبیر کسی نے نہیں دی میں آج ہی ابھی سے اپنے تمام برے اعمال سے توبہ کرتا ہوں شراب نوشی ترک کرتا ہوں عورت بازی ترک کرتا ہوں جواء ترک کرتا ہوں اور آپ کے دستِ حق پہ بیعت کرتا ہوں۔''

اس کے بعد انہوں نے مرید ہونے کی خوشی میں مٹھائی منگوائی سب کو تقسیم کی اور یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ آپ سب کتنے خوش قسمت ہیں کہ ولیٔ دوراں کے ساتھ ہیں ان کی خدمت پر مامور ہیں غرض یہ کہ یہاں کے بے شمار، بلکہ ہزار ہا واقعات کیا کیا سنائیں۔

سارے سنسار کا پانی پی لوں گا:

ہمارے ہاں کبھی کبھار ایک بزرگ تشریف لایا کرتے تھے، کسی زمانے میں انہیں عملیات کا شوق رہا تھا بعض حیلہ ساز، زمانہ سازوں نے انہیں الٹے سیدھے گورکھ دھندوں میں الجھا دیا تھا، خللِ دماغ کا شکار ہو گئے تھے، ان کے بیٹے بغرض علاج حضور قبلہ قادری سرکار کے ہاں لے آئے، قبلہ قادری سرکار کے پاس جادو اور الٹے سیدھے عملیات کے نقصان زدہ لوگ بہت آتے ہیں، قبلہ قادری سرکار بڑی محبت سے انہیں اپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں، جب وہ شروع شروع میں آئے تو بے پناہ پیاس کی شکایت کرتے تھے، ان کے گھر

والے بتاتے تھے گلاسوں بلکہ جگوں پانی پی جاتے تھے، مگر مجال ہے جو پیاس بجھے یا پیٹ پھولے، یہاں آئے تو وہی پانی کی طلب، قبلہ قادری سرکار کے حکم کے مطابق انہیں تعویز پانی میں دینے کے لئے دیئے گئے، وہ لوگ رخصت ہوگئے۔ دو دن کے بعد وہ بڑے گھبرائے ہوئے آئے، کہنے لگے حضور ان کی پیاس تو کئی گنا بڑھ گئی ہے، اس وقت بھی وہ بڑے میاں بار بار پانی مانگ رہے تھے، حضور قبلہ قادری سرکار اس وقت پانی نوش فرما رہے تھے، بڑے میاں کی طرف دیکھ کر پوچھا "پانی پیو گے" انہوں نے بڑے جلالی انداز میں کہا "سارا جگ پی جاؤں گا، سنسار خالی کر دوں گا، کتنا پانی پلا سکتا ہے؟" حضور قبلہ قادری سرکار نے انہیں اپنے گلاس کا دو گھونٹ پانی دکھا کر کہا "سنسار کا پانی پی لو گے پہلے یہ چھوٹا سا گلاس تو خالی کر کے دکھاؤ؟ اس نے بڑی ہی سرخ انگارہ جیسی آنکھوں سے گلاس کو دیکھا اور حقارت سے کہا یہ دو قطرے کیا پیاس بجھائیں گے لا پی لیتا ہوں۔ قبلہ قادری سرکار کے اشارے پر میں نے گلاس اٹھا کر اس کو دیا، اس کے بیٹوں نے پانی کے گلاس کو لیکر اس کو پلا دیا، جونہی پانی اس کے حلق سے اترا اس کے اندر سے آگ کے غبار جیسی کوئی چیز نکلی ہم سب کو یوں لگا کہ جیسے شدید ترین لو کا تھپیڑا ہمارے جسموں کو جھلسا تا ہوا گزر گیا ہو، وہ بزرگ چند ہی لمحوں میں گر کے بیہوش ہوگئے، قبلہ قادری سرکار نے ان کے بچوں سے کہا کہ وہ انہیں لے جائیں اور جب تک یہ خود ہوش میں نہیں آئیں ان کو اٹھانے کی کوشش نہ کی جائے، اس دوران ان کو تعویز والا پانی ہی پلایا جائے، دو راتوں کے بعد انہیں ہوش آیا اور وہ بار بار قبلہ قادری سرکار کے پاس جانے کے لئے کہنے لگے اور ان کے بچے انہیں حضور قادری سرکار کے پاس لے آئے، بزرگ ان کو دیکھتے ہی قدموں میں گر پڑے،

قبلہ قادری سرکار نے پوچھا "ہاں بھئی اور پانی پینا ہے؟" رو رو کے کہنے لگے "حضور آپ کا جھوٹا پانی جونہی زبان سے لگایوں لگا کہ جیسے شدید ترین برف میرے بدن سے بھرنا شروع ہوگئی ہے معدے تک پہنچتے پہنچتے میں تو سارا برف کا بن گیا تھا میرا بدن جو ہر وقت تپتا رہتا تھا اس پر یہ پانی یوں پڑا کہ جیسے جلتے ہوئے توے پر پانی ڈالو تو اس میں شوں شوں کر کے بھاپ اڑتی ہے اس کے ساتھ ہی میرے ہوش وحواس رخصت ہوگئے اور مجھے بڑی گہری نیند آگئی، نیند میں بھی میں بار بار آپ کو ہی دیکھتا رہا، آپ مجھے اپنے قدموں سے جدا نہ کیجئے گا۔" حضور قبلہ قادری سرکار کی محبت نے انہیں اپنے سائے میں لے لیا۔ ایسے بے شمار مرید اور عقیدت مند ہیں جن کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ حضور قبلہ قادری سرکار کی بچی ہوئی روٹی، سالن، پانی، کوئی بھی چیز جو وہ چھولیں اس کو حاصل کر لیں، اس ضمن میں بھی بعض بڑی بڑی کرامتیں نظروں سے گزری ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ محبت اور عقیدت جس درجے شدید ہوگی فوائد اور برکات اسی قدر زیادہ ہونگے۔

ضد نہ کرو اللہ پر بھروسہ رکھو:

بعض لوگ قبلہ قادری سرکار کے حضور آتے ہیں، پریشان حال ہوتے ہیں، زمانے کے ظلم وستم کے ستائے ہوئے ہوتے ہیں، اپنے مسائل سے تنگ آئے ہوئے ہوتے ہیں، حضور قبلہ قادری سرکار سے دعا کے خواہش مند ہوتے ہیں، بعض مریدین اور سائلین کا تو اصرار یہی ہوتا ہے کہ ان کے حصول مراد کے لئے دعا، تعویز، لوح عطا ہو جائے، قبلہ قادری سرکار ہمیشہ ہی یہ فرماتے ہیں کہ ضد نہ کرو اللہ پر بھروسہ کرو ضد نہ لگاؤ، مگر نہیں مانتے۔ ایسی ہی ایک فیملی ماموں کانجن سے آئی تھی، ان کی بڑی بیٹی کی شادی کا مسئلہ تھا، ان اتفاق سے ایک رشتہ پسند آگیا، انہوں نے قبلہ قادری سرکار سے عرض کی، حضور نے استخارہ فرمایا اور کہا کہ انتظار کرو اللہ بہتر کرے گا، مگر ان سب کا اصرار تھا کہ نہیں جی رشتہ اچھا ہے اس لئے یہاں ہو جائے، خیر حضور قبلہ پیر قادری سرکار نے فرمایا کہ جیسے تمہاری مرضی، شادی ہوگئی، چند ہی دنوں بعد معلوم ہوا کہ لڑکا شوگر کا مریض ہے اور سسرال والے نہایت لڑاکا اور تنگ نظر ہیں، پھر وہ فیملی دوڑی دوڑی سرکار کی خدمت میں حاضر ہوئی، شکوے شکایت کا انبار لے کر، حضور نے فرمایا "منع تو کیا تھا۔" لڑکی کی ماں کہنے لگی "حضور آپ تو آنکھوں والے ہیں" ہم اندھے، اب لڑکی کو کہاں تک گھر بٹھاتے ہماری تو آرزو ہے کہ کوئی اولاد ہو جائے تو شوہر کے حالات ٹھیک ہو جائیں گے، گھر والے بھی یہ دیکھ کر نرم پڑ جائیں گے" حضور مسکرائے اور فرمایا "خود ہی سوچ رہی ہو اور خود ہی نتیجہ اخذ کر رہی ہو"۔ جھٹ بولی حضور کی دعاؤں کے طفیل پھولتی ہوں۔" غرض منت سماجت کر کے اولاد کے لئے دعا بھی کروائی اور نقش بھی زبردستی لے گئی، اللہ تعالیٰ نے سال بھر میں ہی لڑکی کی گود ہری کر دی۔ اس دوران لڑکا شدید بیمار ہوگیا، لڑائیاں چھڑ گئیں، لڑکے نے بیوی کو بچی سمیت گھر سے نکال دیا، ماں اپنی لڑکی اور نواسی کو لیکر پھر آگئی اور لگی رونے پیٹنے، کہ وہ احسان فراموش لوگ ہیں ہماری پھول سی بچی کو ذلیل کر کے رکھ دیا، مار پیٹ، گالم گلوچ، غرض وہ کون سی چیز ہے جو وہ نہیں کرتے، بس جی ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم علیحدگی لے لیں گے۔ حضور قبلہ پیر قادری سرکار نے بہت سمجھایا کہ صبر کرو اللہ بہتر کرے گا، مگر وہ نہ مانیں اور طلاق لے لی، اب مسئلہ یہ ہوگیا کہ نہ تو اس لڑکے کی کہیں اور شادی ہوتی ہے اور نہ اس لڑکی کی، بچی کی عمر بھی اس وقت 6 برس ہو چکی ہے۔ ایک دن میں نے حضور قبلہ پیر قادری سرکار سے پوچھا کہ "حضور ان کا مسئلہ کیا ہے؟" فرمایا "قضا اور قدر کے فیصلے جب نافذ ہوتے ہیں تو انسان کے ارادے ان کو منفی اور مثبت کر دیتے ہیں، جب ہم اپنی ہی عقل سے فیصلہ لینے لگتے ہیں تو پھر نفع اور نقصان اس حساب سے ہوتا ہے، یہ خاتون ہمیشہ جلد بازی میں کام بگاڑتی ہے اور جلد بازی، عجلت، کار شیطان ہے۔" حضور قبلہ پیر قادری سرکار کی روحانی توجیہات مختصر اور دل میں گھر کر جانے والی ہوتی ہے، گیارہویں شریف، اجتماعی دعا کے لئے حضور قبلہ قادری سرکار ہمیشہ سے بہت سرگرم رہتے ہیں کئی بار تو ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ غیر ممالک میں ہونے کے باوجود اجتماعی دعا اور گیارہویں شریف کے لئے واپس تشریف لے آئے ہیں آپ ہمیشہ لوگوں سے محبت سے پیش آتے ہیں لوگوں کے کھانے پینے کا خیال رکھتے ہیں اپنے مریدین، عقیدت مندوں کی مزاج پرسی فرماتے ہیں عیادت کیلئے تشریف لے جاتے ہیں کوئی غریب، حاجت مند، عقیدت مند کی دعوت ہو تو خوشحال امیر عقیدت مندوں اور مریدوں کے برعکس اس کے ہاں تشریف لے جانا پسند فرماتے ہیں۔ یونہی تو لوگ میرے مرشد پر نہیں مرتے، یہی وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے دلوں میں تا ابد زندہ و جاوید رہتے ہیں اللہ تعالیٰ ہمارے پیر و مرشد کو سلامت تا قیامت رکھے اور ان کا فیض یونہی جاری وساری رہے آمین۔ ثم آمین

بات ایک چڑیل کی:

یہ ان دنوں کی بات ہے جب قبلہ قادری سرکار اپنے ایک بہت اچھے دوست اور عقیدت مند کی دعوت پر جرمنی تشریف لے گئے تھے۔ وہاں جو جو کچھ ہوا وہ آپ نے آکر ہمیں نہیں بتایا مگر جب ریاض بھائی جرمنی سے پاکستان ذاتی طور پر تشریف لائے تو انہوں نے ہمیں بتایا ہم نے قبلہ قادری سرکار سے پوچھا "حضور ہمیں آپ نے یہ واقعہ کیوں نہیں بتایا؟" قبلہ قادری سرکار نے جو کہا۔ یہ وہی فرما سکتے ہیں، فرماتے ہیں "مریض کا

علاج مریض اور طبیب کے درمیان ایک راز ہے۔ اسی طرح روحانی علاج جس کا بھی کیا جائے وہ بھی امانت کی طرح محفوظ رکھنا چاہئے اب ہم اپنے ہی دوست اور عقیدت مند کے اندرون خانہ کا حال کیسے بتا سکتے ہیں؟ بغیر کسی مریض کی اجازت کے اس کا حال بیان کرنا امانت میں خیانت ہے۔'' سبحان اللہ اسی طرح اللہ والے اپنے معاملات کو نہ صرف پوشیدہ رکھتے ہیں بلکہ دلوں میں ان کے رازوں کو چھپا کے بھی رکھتے ہیں قبلہ قادری سرکار کا شفیق سینہ ایسے ہی ہزاروں رازوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہم سب عزیزوں اور عقیدت مندوں نے ریاض بھائی سے درخواست کی کہ وہ ہمیں یہ قصہ سنائیں۔ ریاض بھائی نے نہایت محبت اور عقیدت سے حضور قبلہ قادری سرکار کی طرف دیکھتے ہوئے قصہ بیان کرنا شروع کیا ''میری بیگم کو کبھی کبھی پیٹ میں درد کی شکایت ہو جاتی تھی۔ میری بیگم جرمن ہیں اور خود بھی نہایت اچھی ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے دعاؤں سے عاجز آ کر ایک روحانی علاج کرنے والی خاتون سے بھی علاج کروایا مگر وہ مکمل تندرست نہ ہو سکیں۔ جب قبلہ قادری سرکار جرمنی تشریف لائے تو میری بیگم نے دعا کی درخواست کی، قبلہ قادری سرکار نے جونہی دم کیا وہ ایک دم کھڑے قد سے گر کر بے ہوش ہو گئیں اور ہم سب پریشان ہو گئے، مگر قبلہ قادری سرکار نے ہمیں تسلی دی اور پانی پڑھ کر ان پر دم کیا اور چھڑکا بھی، چند ہی لمحوں میں وہ ہوش میں آ گئیں، قادری سرکار نے پانی دم کر کے دیا اور پانچ دن مسلسل پینے کی ہدایت کی، وہ تندرست ہو گئیں۔ قبلہ قادری سرکار اپنے مریدین کی درخواست پر اسپین تشریف لے گئے، چند یوم کے بعد جب تشریف لائے تو میں نے عرض کیا ''بیگم کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے اور انہیں بار بار معدے میں درد اٹھ رہا ہے کسی دوا سے عارضی آرام بھی نہیں آ رہا۔'' قبلہ قادری سرکار نے فرمایا ''اچھا تو پھر نہیں مانتی تو منوا لیتے ہیں'' یہ کہہ کر آپ نے اسٹیل کی چھری منگوائی اور چھری پر کچھ پڑھ کر دم کیا پھر پانی پر دم کیا بیگم کو کاؤچ پر لیٹنے کا حکم دیا۔ میرا بیٹا جو اس وقت 12 سال کا ہے اس کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا اور اس کے بعد دھیرے دھیرے کچھ پڑھنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ پانی کے چھینٹے بھی مارنا شروع کئے۔ چند ہی لمحوں بعد میری بیگم نے چیخنا شروع کر دیا، آہستہ آہستہ بیگم کے خوبصورت چہرے کے خدوخال بگڑنا شروع ہو گئے، تھوڑی ہی دیر میں کمرہ بیگم کی بلند چیخوں سے گونج رہا تھا اور چہرہ اپنی مکمل شکل بدل کر ایک چڑیل کے مکروہ چہرے میں بدل چکا تھا۔ ہم سب کے لئے یہ انتہائی حیرت انگیز اور خوفناک منظر تھا۔ اس کے ساتھ ہی بیگم نے کاؤچ پر اچھلنا شروع کر دیا، وہ کئی کئی بار کاؤچ سے فٹ فٹ بھر اچھل جاتی تھیں، بالکل ڈراؤنی فلموں کا سین تھا، ہم نے بہت مضبوطی سے بیگم کو پکڑا ہوا بلکہ جکڑا ہوا تھا اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کسی بھی صورت قبلہ کو دبوچ لیں مگر قبلہ قادری سرکار مسلسل بغیر کسی خوف کے اپنا روحانی عمل پڑھتے رہے، آخر اس چڑیل نے ہار مان لی اور ہمیشہ کے لئے چلے جانے کا وعدہ کر کے اپنی جان بخشی کروائی۔ اس کے بعد میری بیگم نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئیں، قبلہ قادری سرکار نے اس کے گرد روحانی عمل کا حصار باندھا دم کیا اور ایک مالا ان کے گلے میں پہنانے کے لئے مجھے دی، اس کے بعد اطمینان سے بیٹھ گئے، اور فرمایا ان شاء اللہ کلام الٰہی کی برکت سے اب کچھ نہیں ہو گا۔'' میرے استفسار پر قبلہ قادری سرکار نے فرمایا کہ ''میری بیگم بہت طویل عرصے سے ایک چڑیل کی گرفت میں تھیں اور اس کا ٹھکانا ان کا معدہ تھا، روحانی عمل نے اس کو باہر آنے پر مجبور کر دیا اگر وہ چند لمحے بھی بدن کو نہ چھوڑتی تو روحانی عمل کی تاثیر سے ہمیشہ کے لئے جل جاتی، اس لئے وہ

اپنی جان بچا کر بھاگ گئی۔'' ہم سب نے نہایت عقیدت سے پیر و مرشد قادری سرکار کی طرف دیکھا تو وہاں پر ہمیشہ کی طرح ایک متانت آمیز تبسم تھا ہم کو اپنی طرف جو متوجہ دیکھا تو فرمایا ''چھوڑو جی کن باتوں میں الجھ گئے، ریاض بھائی کو کھانا کھلاؤ۔''

حسد نہ کر۔۔۔ دعا کیا کر:

آپ لوگوں نے یہ فقرہ اکثر ویگنوں یا بسوں اور ٹرکوں کے پیچھے لکھا ہوا دیکھا ہو گا، جس کا مطلب سیدھا سیدھا یہی ہوتا ہے کہ میری ترقی کو دیکھ کر جلا کڑھا نہ کر۔ اپنے لئے دعا کر میرے لئے بھی دعا کرتا کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ایسا ہی کر دے اس فقرے کی عملی کیفیت ہم نے قادری سرکار کے ایک ہاں ایک آنے والے کی دیکھی وہ اپنے آپ کو قادری سرکار کا عقیدت مند کہتے تھے بعض اوقات بھری محفلوں میں انہوں نے بار بار اصرار کیا کہ قادری سرکار انہیں باضابطہ مرید کر لیں مگر حضرت سرکار ہمیشہ مسکرا کر ٹال جاتے ایک مرتبہ تو انہوں نے انتہا ہی کر دی، مٹھائی، جوڑا، ہار، پھول لیکر آ گئے کہ حضرت آج تو مرید ہو کر ہی جاؤں ورنہ ساری عمر اس در پر ہی پڑا رہوں گا۔ قادری سرکار ان کی بے چینی دیکھ کر ہنسنے لگے ''یہ کیا تماشہ اٹھا لائے؟'' ''حضور سرکار میرے خلوص کو تماشا نہ فرمائیں بخدا جان دیدوں گا'' انہوں نے انتہائی فدا ہو جانے والے لہجے میں کہا ''آج تو مجھے اپنی غلامی میں لے ہی لیں'' ''ابھی آپ کا اشارہ نہیں آیا'' قادری سرکار نے فرمایا ''جیسے ہی اشارہ آ جائے گا آپ مرید ہو جائیں گے۔'' ''کہاں سے اشارہ آئے گا۔'' وہ بڑے اشتیاق سے بولے ''اوپر سے وہی ہر دل میں خیال ڈالتا ہے'' قادری سرکار نے اطمینان سے کہا۔ وہ کہنے لگے۔ ''اس کو کہتے مرشد جو مرید کی حیثیت سمجھ کر مرید کرتے ہیں ارے ہمارا بھی اوپر رجسٹروں میں نام لکھا ہے۔'' ان کا لہجہ بڑا پر تفاخر اور عامیانہ انداز کا تھا۔ قادری سرکار نے توجہ نہ دی بات آئی گئی ہو گئی وہ بھی اپنا سامان سمیٹ کر رخصت ہو گئے۔ تقریباً اٹھارہ، بیس دن کے بعد ایک سولہ برس کا لڑکا بڑی پریشانی کے عالم میں آیا اور مجھ سے تعارف کروا کے کہنے لگا میں ان ہی صاحب کا بڑا لڑکا ہوں ابو کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ بابا شاہجمال کی درگاہ پر پڑے ہوئے ہیں کبھی چیختے چلاتے ہیں کبھی دیواروں سے ٹکریں مارتے ہیں لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے وہاں کسی فقیر کو کچھ کہہ دیا تھا وہ فقیر ناراض ہو گیا اور جب سے وہ ناراض ہوا ہے ابو پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگے ہیں۔ ہم سب بہت پریشان ہیں۔ خدا کیلئے کچھ کیجئے۔ قبلہ قادری سرکار سے جا کر میں نے سارا ماجرا عرض کیا اور پوچھا ''لڑکے کو کیا جواب دیا جائے؟'' آپ نے بلا تردد جواب دیا ''لڑکے سے کہیں تھوڑی دیر انتظار کرے پھر ہم چلتے ہیں'' وہ لڑکا جس کا نام سلیم تھا بڑا شکر گزار ہوا اور مارے تشکر کے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ضروری کاموں ملاقاتوں اور مغرب کی نماز کے بعد ہم لوگ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر شاہ جمال دربار کی طرف چل پڑے۔ دربار شریف پہنچ کر قبلہ قادری سرکار نے سب سے پہلے مزار شریف پر حاضری دی، سلام پیش کیا، فاتحہ خوانی کی، اس کے بعد لڑکے کے ہمراہ وہاں پہنچے جہاں وہ صاحب موجود تھے ان کا حلیہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا انتہائی گندے کپڑے، سر بال ہاتھ مٹی سے اٹے ہوئے تھے اور سارے بدن سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگے۔ آؤ دیوانوں آؤ تمہارا علاج کر دوں۔۔۔ بار بار وہ یہی فقرا دھراتے۔ قادری سرکار کچھ دیر تک تو انہیں دیکھتے رہے پھر ان کی نظریں ایک ملنگ پر جا ٹکیں جو بڑے تمسخرانہ انداز میں ان کی طرف دیکھ رہا تھا جب وہ ان کی طرف دیکھتا تو ان کی وحشت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ قبلہ قادری سرکار اس ملنگ کی طرف بڑھنے لگے

اور اس کے سامنے بڑے اطمینان سے بیٹھ گئے اور ملنگ کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے ''حضرت اب معاف کر دیجئے'' وہ ملنگ قبلہ قادری سرکار کو گھورنے لگا ۔پھر ہنسنے لگا۔قادری سرکار خاموش اس کی طرف دیکھتے رہے جب وہ خاموش ہوا تو پھر فرمایا ''حضرت اب معاف کر دیجئے معافی تو سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کی سنت ہے۔'' ملنگ بولا ''تمہارا کیا رشتہ ہے؟'' ''بھائی ہے ہمارا'' وہ خشونت بھرے انداز میں بولا۔ ''جھوٹ بولتے ہو'' ''دینی رشتہ سب سے مضبوط رشتہ ہوتا ہے'' قادری سرکار نے فرمایا۔وہ ملنگ پھر ہنسنے لگا ۔پھر بولا ''سفارش کے فن سے خوب آشنا ہو!'' قادری سرکار نے فرمایا! ''حضرت آپ تو بڑے ظرف والے ہیں پھر معمولی سی ٹھیس سے کیوں چھلک پڑے؟'' ملنگ کہنے لگا ''کتابی باتیں کرتے ہو، ارے یہ بڑا حاسد ہے دو چار روحانیت کے شعبدے سیکھ کر اپنے آپ کو قطب واوتاد سمجھنے لگا۔ مجھے کہہ رہا تھا اے تو ہے کیا ایک لمحے سب کچھ بھلا دوں گا۔ میں نے اس پر تھوک دیا آپ ہی سب کچھ بھول گیا'' ملنگ دفعتاً غصے میں آ گیا۔ ''حضرت معافی بڑی چیز ہے سرکار جی صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کی سنت ہے جی ۔اس کو آپ بھی معاف کر دیجئے'' وہ ملنگ پھر ہنسنے لگا۔ ''کیا سارے امتحانات رٹا لگا کے ہی پاس کئے ہیں یا پڑھائی بھی ہے؟'' وہ قادری سرکار کی ضد سے زچ ہونے لگا۔قبلہ قادری سرکار نے فرمایا ''حضرت جو بڑے سبق دیدیں اسے رٹے بغیر چارہ کہاں یہاں تو سر تسلیم خم ہی خم ہے'' وہ ملنگ پھر ہنسنے لگا۔لگتا تھا اسے ہر بات پر ہنسنے کی عادت ہے۔وہ اٹھ کھڑا ہوا اور قادری سرکار کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا ''اچھا یار پھر لے جا'' پھر ان کی طرف دیکھ کر زور سے زمین پر تھوک دیا۔ وہ صاحب جو مسلسل اچھل کود کر رہے تھے ملنگ کے تھوکتے ہی یوں سہم کر خاموش ہو کر گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئے جیسے اچانک انہیں کسی نے خوف زدہ کر دیا ہو اتنے میں ان کا لڑکا سلیم ابو، ابو، کہتے ہوئے اٹھانے لگا چند ہی لمحوں میں وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور چاروں طرف یوں دیکھنے لگے جیسے یہاں پر سب اجنبی ہوں۔قبلہ قادری سرکار نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مزار شریف کے احاطے سے باہر نکل آئے۔ میں حیرت زدہ سا ان کے ساتھ باہر نکل آیا گاڑی میں بیٹھ کر میں پوچھا ''حضرت خدا کی قسم بالکل سمجھ میں نہیں آیا یہ کیا ماجرا تھا؟'' قادری سرکار نے فرمایا ''سلیم کے والد نے چند وظائف سیکھ کر ان پر اترانا شروع کر دیا تھا۔ فی زمانہ ویسے بھی ڈبہ پیروں کی اکثریت ہے۔ وہ کئی کو بری طرح ذلیل کر چکا تھا مگر اس کا مقصد کسی کی اصلاح کی بجائے اس کو ذلیل و بدنام کرنا اور اُس کے وسائل پر قبضہ کرنا زیادہ ہوتا تھا اتفاقاً اس کی مڈھ بھیڑ اس ملنگ سے ہو گئی ملنگ بہت پہنچا ہوا فرد ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو بڑا مقام عطاء فرمایا ہے۔اس کو بھی سلیم کے ابا نے دنیادار سمجھا مگر ملنگ نے اس کے وظائف کی تمام قوت بھی سلب کر لی اور اس کو اچھی خاصی سزا بھی دے دی۔ وہ تو شکر ہے اللہ کا کہ ملنگ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اللہ والوں کو ستانا نہیں چاہئے کون جانے کون کس بھیس میں ہو۔'' ''مگر آپ سلیم اور اس کے والد سے کیوں نہیں ملے؟'' بھئی ہم کسی پر احسان کرنے تھوڑی آئے تھے۔عیادت کرنی تھی سو کر لی ویسے بھی سنت پوری کرنے میں تو ثواب ہی ثواب ہے۔سبحان اللہ۔! میرے منہ سے نے ساختہ نکلا۔قبلہ قادری سرکار اپنی تسبیح میں گم ہو چکے تھے۔

خواب دیکھ کر آئے ہیں۔استخارہ کر کے آئے ہیں:

ہمارے قبلہ قادری سرکار کے بے شمار عقیدت مند، اور مرید ایسے بھی ہیں جو کہ اپنے کاموں، پریشانیوں اور مسائل کے لئے حاضر ہوئے تو انہوں نے بتایا ہم لوگ پہلے ہی نام نہاد پیروں، عالموں، نجومیوں کے ڈسے ہوئے ہیں تو اول تو ہم نے اپنے مسائل اور مصیبتوں پر صبر ہی کر لیا تھا کہ شاید ہماری قسمت میں تبدیلی اور سکھ موجود ہی نہیں ہے لیکن انسان کا دل مانتا کہاں ہے؟ قادری سرکار کی شہرت سنتے ہی ہمارا بھی دل چاہتا تھا کہ ہم بھی حاضر ہوں مگر دل ڈرتا تھا جانے کیا ہو؟ پھر ہم نے ان کے متعلق استخارہ کیا تو پھر حاضر ہوئے۔ کسی نے بتایا انہوں نے خواب میں قادری سرکار کو دیکھا تھا اس لئے حاضر ہوئے ہیں عرض یہ ہے کہ ایسے بے شمار واقعات موجود ہیں کہ کیا، کیا لکھوں؟ مگر یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقی ہے کہ انسان کے اندر اپنے مقاصد کے لئے جس قدر سچی لگن ہوگی، دل جس شدت سے طلب کرے گا اللہ تعالیٰ اسے ضرور بالضرور عطا فرمائے گا۔ بعض مرید ایسے بھی ہیں کہ جو کہتے ہیں ہم نے تو بس عادت بنالی ہے حاضری چاہے کچھ ملے نہ ملے۔ ہم تو حاضر ہوتے رہیں گے۔ جب کئی مرتبہ ایسی باتیں ہوئیں تو قادری سرکار نے فرمایا ''جب طلب عادت بن جائے تو شوق ختم ہو جاتا ہے، جب شوق ختم ہو جائے تو جستجو مر جاتی ہے جب جستجو مر جائے تو پھر طلب بھیک کے سوا کچھ نہیں رہتی تو بھیک اپنے ظرف کے مطابق حاصل ہوتی ہے اس میں نہ مقامات ملتے ہیں نہ سفر طے ہوتا ہے فقط وقت کا زیاں ہوتا ہے۔'' ''سبحان اللہ! طلب کے لئے، مقامات کے لئے اور سب سے بڑھ کر مرشد کی توجہ کے لئے مسلسل شوق مسلسل جستجو چاہئے! ایک دن حضور سرکار سے پوچھا گیا ''حضور شوق کی انتہا کیا ہے؟'' فرمایا: ''عشق!'' پوچھا گیا: عشق کی انتہا کیا ہے؟ فرمایا: ''حیرت ہے'' پھر حیرت کی تشریح فرماتے ہوئے مزید ارشاد کیا ''حیرت وہ مقام ہے جہاں ایسا تحیر ہے کہ سوائے باری تعالیٰ کے کسی وجود کو ثبات نہیں ہے حیرت ہر شے کو فنا کر دیتی ہے اور فقط ذاتِ باری تعالیٰ کا ادراک رہ جاتا ہے اور ذاتِ باری تعالیٰ ہی حیرت کی انتہا ہے۔'' اللہ، اللہ یہ اللہ والے بھی سادے سادے لفظوں میں کیسے کیسے نکات کی آسان ترین تشریح کر دیتے ہیں کہ تصوف کی روشنیاں ذات کے اندھیروں کو اجال دیتی ہیں۔

لڑکا نہیں مانتا ہے:

ایک مرتبہ ہمارے ہاں ایک خاتون تشریف لائیں بڑے اچھے خاندان کی، وہ چاہتی تھیں کہ ان کی لڑکی کی شادی ان کے بھائی کے بیٹے سے ہو جائے۔ سب آپس میں قریب ترین رشتہ دار تھے۔ سب مانتے تھے لیکن لڑکا نہیں مانتا تھا بھائی نے کہا ''بہن اب تم ہی بتاؤ ؟ جب لڑکا ہی نہیں مانتا تو پھر اس زبردستی کی شادی کا کیا فائدہ؟'' وہ قبلہ قادری سرکار کے ہاں حاضر ہو گئیں اور اپنی آرزو بیان کی۔حضور قبلہ قادری سرکار نے فرمایا ''بہن جب لڑکا ہی نہیں مانتا تو پھر زبردستی کا کیا فائدہ؟ کیوں اپنی بچی کی زندگی برباد کرنے پہ تلی ہوئی ہو؟'' وہ کہنے لگیں ''سرکار عجیب سی بات ہے کہ سارے لوگ میری بچی کو پسند کر لیتے ہیں مگر ہمیشہ لڑکا ہی انکار کر دیتا ہے اور یہ آج کا واقعہ نہیں ہے کئی رشتوں میں ایسا ہی ہو چکا ہے مجھے تو اس انکار کا کوئی اور ہی سبب لگتا ہے۔قبلہ قادری سرکار نے ان کی پریشانی کے پیشِ نظر فرمایا ''اچھا جاؤ دو، چار دن بعد آنا، استخارہ کر کے دیکھتے ہیں۔'' وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئیں۔چوتھے دن پھر حاضر ہوئیں تو قبلہ قادری سرکار نے ارشاد فرمایا ''جب تمہاری بیٹی سترہ برس کی تھی تو ایک رشتہ آیا تھا جس کو تم نے انکار کر دیا تھا اور انکار بھی بہت دل آزاری کے ساتھ کیا تھا اس بات کو انہوں نے دل میں بٹھا لیا اور کسی کالے علم کرنے والے سے تمہاری بیٹی کی بندش کروادی تا کہ ہمیشہ انکار ہوتا رہے۔'' انہوں نے دعا کی درخواست کی، قبلہ قادری سرکار نے دعا دی نقش عطا فرمایا۔وہ خاتون شکریہ ادا کرتے ہوئے چلی گئیں چند ہی ہفتوں بعد

بچی کی دھوم دھام سے شادی ہوگئی پورا خاندان قبلہ قادری سرکار کیلئے نذرانے لیکر حاضر ہوا بے حد دعاؤں کا خواستگار رہا۔ قبلہ قادری سرکار نے ارشاد فرمایا ''ہمیشہ دل آزاری سے بچو یہ بہت بڑا گناہ ہے جو کہ دوسروں کو بھی گناہوں پر مجبور کر دیتا ہے اور وہ انتقاماً غلط طریقوں کو اختیار کر لیتا ہے اور اس کا عذاب بھی ہمارے ہی سر ہوتا ہے کیونکہ اس کا اصل سبب ہم ہی ہوتے ہیں۔'' سبحان اللہ۔۔۔۔۔ آج تک دل آزاری کے اس پہلو پر کسی کی توجہ نہیں گئی تھی، حضرت نے کتنے سادہ طریقے سے اس گناہ اور پھر گناہ در گناہ کا سلسلہ ہمارے سامنے ظاہر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دل آزاری کے گناہ اور اس کے وبالِ گناہ سے بچائے۔ آمین ثم آمین۔

وظیفہ گلے میں باندھ کر فیض لے لیا:

بے شمار واقعات ہیں، کیا کیا لکھوں؟ ایک مرتبہ کراچی میں حضور قبلہ قادری سرکار سے ایک شخص ملنے آیا بہت پریشان اور قرض دار ہو گیا تھا، کہنے لگا حضور پائی ٹکا پاس نہیں کچھ پڑھنے کو بتا دیں مہربانی ہوگی۔ حضور قبلہ قادری سرکار نے اسے ''یا واسع یا رزاق'' کا وظیفہ لکھ دیا اور بڑی شفقت سے تسلی دیکر چائے پلا کر رخصت کر دیا۔ کافی عرصے کے بعد وہ صاحب آئے تو پہچانے نہیں جا رہے تھے، بہترین کپڑے زیب تن کئے ہوئے تھے، اچھی قیمتی گھڑی باندھی ہوئی تھی، باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں، مٹھائی کا بڑا سا ڈبہ وقبلہ قادری سرکار کے لئے ایک قیمتی سوٹ ساتھ لائے تھے، مجھے ملکر بڑے پرتپاک انداز سے بولے ''مجھے پہچانا؟'' سچی بات تو یہ تھی کہ میں انہیں بالکل بھی نہ پہچان سکا تھا، میں نے انکار میں گردن ہلائی تو وہ بڑے خوش مزاجی سے بولے ''آپ کہاں پہچانیں گے یہاں تو سینکڑوں ضرورت مند آتے ہیں، میں وہ ہی الیکٹریشن ہوں جس کو کئی ماہ پہلے آپ نے قادری سرکار سے تعویز دلوایا تھا۔ مجھے فوراً ہی یاد آ گیا، وہ بتانے لگے، میں تو جاہل بے نمازی، میں نے تو نہ وظیفہ پڑھا نہ ہی کچھ اور کیا سرکار کے ہاتھوں سے لکھا ہوا وظیفہ اللہ والے کا تبرک سمجھ کر گلے میں ڈال لیا اور یہ کہا ''اے اللہ تیرے نیک بندے نے مجھے یہ وظیفہ دیا ہے تیرے نام کا پٹا گلے میں ڈال لیا ہے، اب اپنے نام کی برکت دکھا۔ چند ہی دنوں میں مجھے میرے ایک رشتے دار نے مڈل ایسٹ بلوا لیا، میں جاہل اور نکما حضور قبلہ قادری سرکار کے تعویز فیض سے باہر چلا گیا، وہاں چار ہزار تنخواہ ہے اوور ٹائم علیحدہ، کھانا، پینا اور رہائش کمپنی کی ہے، چھ ماہ کے بعد چھٹی ملی ہے تو آیا ہوں۔'' اس کے بعد وہ بہت محبت اور عقیدت سے قبلہ قادری سرکار سے ملے، مٹھائی، سوٹ اور نقد نذرانہ بھی پیش کیا اور بہت ساری دعائیں لے کر رخصت ہوئے۔

بیوی کے رشتے دار بُرے نہیں ہوتے:

ایسے بے شمار واقعات ہیں جو یاد آ رہے ہیں، بلکہ اب بھی آنکھوں کے سامنے ہو رہے ہیں، حضور قبلہ قادری سرکار کے مریدین، عقیدت مند امریکا، برطانیہ، جرمنی، ناروے، اسپین، مڈل ایسٹ نہ جانے کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں، آئے دن نا صرف ملک بھر سے، بلکہ بیرونِ ملک کے لوگوں کی طرف سے دعوتیں آتی رہتی ہیں، ٹکٹ رہائش، سفر خرچ غرض ہر چیز کی کھلی دعوت ہوتی ہے، مگر قادری سرکار کی مصروفیات اس قدر زیادہ ہوتی ہیں کہ انہیں جانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ امریکا اور فرانس کے مریدین اور عقیدت مند بے حد مشتاق رہتے ہیں کہ قبلہ ان کے ہاں تشریف لے آئیں مگر زیادہ تر ایسا ہی ہوا ہے کہ وہ انتظار کر کے خود ہی قدم بوسی کے لئے حاضر ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک مرید امریکا سے تشریف لائے، وہ قبلہ قادری سرکار کے کالمز پڑھ کر بہت متاثر ہوئے تھے، پھر فون پر اکثر گفتگو ہوتی رہی، ذاتی طور پر پہلی مرتبہ آئے تو ظاہر نہیں کیا کہ کہاں سے تشریف لائے ہیں، کہنے لگے ''لاہور سے آیا ہوں فلاں مشکل میں گرفتار ہوں، دعا کیجئے کہ اللہ بہتری فرما دے۔'' قبلہ قادری سرکار کے پاس اس وقت کافی لوگ موجود تھے، عام طور پر سائلین باری باری اور تنہا ملتے ہیں، حضور کسی کا مسئلہ سب کے سامنے سننا پسند نہیں فرماتے، کیونکہ اس سے سائل کے مسائل طشت از بام ہو جاتے ہیں اور وہ دیگر لوگوں کے سامنے خفت اور خجالت کا شکار ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا ''اللہ بہتر کرے گا!'' وہ صاحب چلے گئے، دو چار دن کے بعد دوبارہ آئے اس مرتبہ بولے ''سرکار بہت دور سے آیا ہوں'' آپ اس وقت پانی پی رہے تھے، ہنس پڑے ''فرمایا سمندر پار سے آئے ہو'' وہ صاحب ایک ٹک انہیں دیکھنے لگے۔ آپ نے فرمایا ''آپ چند دن پہلے بھی آئے تھے، تب کوئی مشکل نہ تھی، اب آئے ہیں تو مشکل ساتھ لائے ہیں، حضرت یہ بہروپ کس لئے؟'' ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، کہنے لگے ''غلطی ہوگئی''۔ قبلہ قادری سرکار نے فرمایا ''آپ سے اتنی مرتبہ بات ہوئی ہے تو آپ کی آواز کیسے بھول سکتے ہیں، بدگمانی اچھی چیز نہیں، سرکار مدینہ ﷺ غیبت اور بدگمانی سے بچنے کا حکم فرماتے ہیں۔'' وہ بولے ''حضرت باتوں میں آ گیا تھا، یہاں لوگوں نے کہا کہ اگر پتہ چل جائے کہ سائل بیرونِ ملک سے آیا ہے تو نذرانے آسمان پر پہنچ جاتے ہیں، فرمائش بڑھ جاتی ہے معاف کر دیجئے گا۔'' قبلہ قادری سرکار مسکرائے اور فرمایا ''ایک جیسی دنیا نہیں ہوتی۔'' اس کے بعد ان کی خوب خاطر تواضع کی گئی۔ مجھ سے انہوں نے پوچھا ''میری خاطر تواضع اتنی ہو رہی ہے کہ جیسے میں کوئی بہت اہم مہمان ہوں۔'' میں نے کہا ''یہاں پر آنے والا اللہ کا ہر بندہ ہمارا مہمان ہے اور صرف آپ ہی نہیں جو بھی جس وقت آتا ہے حسبِ توفیق اس کی خدمت کی جاتی ہے۔'' وہ بے حد متاثر ہوئے اور بے تحاشا تعریف کرنے لگے جب جانے لگے تو حضور قادری سرکار کی الوداعی قدم بوسی کے لئے گئے تو حضرت نے مسکرا کر فرمایا ''بیوی کے رشتے دار برے نہیں ہوتے!'' وہ چند لمحے دیکھتے رہے اور پھر سر جھکائے چلے گئے۔ چند دنوں کے بعد آئے تو ہاتھ میں بیٹی کی شادی کا کارڈ تھا کہنے لگے ''حضور کا اشارہ سمجھ گیا تھا'' وہی اُلجھن تھی بیٹی خالہ زاد کو پسند کرتی تھی جب کہ بھائی اپنے بیٹے کے لئے زبردستی کر رہا تھا۔ پیر شاہ محمد قادری سرکار کا ارشاد میرے لئے تائید غیبی تھا، اب آپ ہی نکاح میں تشریف لائیں گے تو نکاح ہوگا۔'' قبلہ مسکرائے اور حامی بھر لی۔ وہ لوگ بڑے اہتمام سے قبلہ قادری سرکار کو لے کر گئے نکاح آپ نے پڑھایا، خیر و برکت کے لئے دعا فرمائی۔

پردہ دار بیوی بہت اچھی ہے:

ایک اور یادگار واقعہ ہے کہ ہمارے ہاں منڈی بہاؤالدین سے ایک فیملی آئی تھی ان کے گھر اولاد نہیں ہوتی تھی، وہ جب بھی آتیں اولاد کے لئے خصوصی طور پر دعا کروائیں، حضور قادری سرکار ان کے لئے ہمیشہ دعا فرماتے اور کہتے کہ تسلی رکھو، اللہ تعالیٰ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں، مگر اولاد کی تڑپ ہی ایسی ہوتی ہے کہ انسان بے صبرا ہوا جاتا ہے، ایک دن وہ خاتون کہنے لگیں، ''حضور ایک بار تو فرما دیجئے کہ ہماری قسمت میں اولاد ہے بھی یا نہیں؟'' ''آپ نے فرمایا'' قسمت تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے ہمیں تو اس کی رضا میں راضی رہنا چاہیے، اور ہمیشہ اس سے اچھی امید رکھنی چاہیے، اللہ پر بھروسہ رکھو وہ ضرور مرادوں کا پورا کرنے والا ہے''۔ وہ خاتون کہنے لگیں ''حضور آپ تو تسلی دے رہے ہیں واضح ارشاد نہیں فرما رہے کہ قسمت میں اولاد ہے بھی یا نہیں؟'' آپ نے نرمی سے فرمایا ''بہن تمہاری بہو بہت اچھی ہے، نیک ہے، سلیقہ مند ہے، پردہ دار خاتون ہے پردہ رکھتی ہے اللہ پر بھروسہ رکھو وہ

سب اچھا کرے گا''۔وہ خاتون شاید بہت زیادہ دل برداشتہ تھیں، اونچی اونچی بولنا شروع ہوگئیں،ان کی بہو، بیٹا اور شوہر انہیں سمجھانے لگے مگر وہ بار بار یہ ہی کہتی تھیں کہ قادری سرکار نے مجھے مایوس کردیا، میں تو بڑی آس لے کر آئی تھی، مگر یہاں کچھ نہیں رکھا۔ وہ لوگ بڑی مشکل سے انہیں لے گئے۔اس تمام صورت حال میں قبلہ قادری سرکار نے ایک لفظ نہیں فرمایا اور چپ چاپ ساری باتیں سنتے رہے۔ دوسرے دن ان خاتون کا بیٹا اور شوہر دونوں ہی آئے اور بہت معافی کے خواہست گار ہوئے، بیٹا کہنے لگا ''سرکار امی کو معاف کردیجئے گا انہیں کچھ بھی معلوم نہیں ،دراصل خرابی بیگم میں نہیں مجھ میں ہے، میری بیگم نے میرا پردہ رکھا ہوا ہے'' یہ کہ کر وہ نوجوان بری طرح رونے لگا ،اس کے والد نے اسے تسلی دی۔ معلوم ہوا دونوں کی پسند کی شادی ہے، شادی کے چند ہی دنوں کے بعد جب انہوں نے اپنا میڈیکل ٹیسٹ کروایا تو معلوم ہوا کہ شوہر میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت نہ ہونے کے برابر ہے، اس پر وفادار بیوی نے کہا کہ کچھ بھی ہوجائے وہ نہ تو اپنے شوہر کو چھوڑے گی اور نہ ہی اس بات کا ذکر کسی سے کرے گی، ساری ذمے داری اپنے اوپر لے لے گی، وفادار بیوی، ساس کے ساتھ طرح طرح کے ڈاکٹروں، حکیموں، نام نہاد مسیحاؤں کے پھیرے لگاتی رہیں مگر اللہ کی بندی نے منہ سے بھاپ تک نہ نکالی، دوائیں، ٹونے، ٹوٹکے سب کرتی رہی۔قبلہ قادری سرکار نے بہت تسلی اور تشفی دی، اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کی ہدایت کی، اور مجھے حکم دیا کہ میاں بیوی کے لئے علاج درعقیم کی تیاری کروں ۔چند دنوں کے بعد وہ آکر علاج درعقیم لے گئے۔ پھر وہ کئی ماہ گزرنے کے بعد آئے تو ان کی گود میں ہنستا کھلتا گل گوتھنا سا ایک بچہ تھا جو خوب قلقاریاں مار رہا تھا، مزے سے انگوٹھا چوستا، کبھی اپنے اردگرد دیکھتا۔

انہوں نے آتے ہی بچہ قبلہ قادری سرکار کی گود میں ڈال دیا اور کہا ''حضرت یہ آپ کا مرید آگیا ہے، آج سوا مہینے کا ہوگیا ہے اور آپ ہی اس کا نام تجویز فرمایئے۔'' قبلہ قادری سرکار نے اس کو بڑے پیار سے دیکھا، ماتھے پر پیار کیا، محمد ابراہیم نام رکھا اور برکت کے لئے دعائیں کی۔ان خاتون نے کہا ''سرکار میں جانتی تھی کہ آپ کی ہی دعاؤں سے میری بہو کی گود ہری ہو گی، میرا دل غلط نہیں کہتا تھا'' آپ چپ رہے اور مسکرا دیئے اور ہمیں ان کی خاطر تواضع کا حکم دیا۔آج تک وہ لوگ آتے ہیں اور حضور قبلہ قادری سرکار سے بے حد محبت اور عقیدت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ایسے بے شمار مریض اور بے اولاد جوڑے تھے جو حضور قبلہ قادری سرکار کی دعاؤں کی بدولت اور آپ کے استخراج کردہ روحانی علاج ''علاج درعقیم'' سے صاحب اولاد ہوئے ہیں اور قبلہ قادری سرکار کی جان و مال، روحانی درجات میں اضافے کے لئے دن رات دعائیں کرتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امتی آیا ہے:

قبلہ قادری سرکار کے ہاں تقریب تھی ،بڑے صاحبزادے شاہ محمد مہد قادری نے قرآن مجید کا ناظرہ مکمل کرلیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و برکت سے کنبے میں اضافہ فرمایا اور چوتھی اولاد نرینہ شاہ محمد موحد قادری تشریف لائے ان کا عقیقہ تھا۔بے شمار مریدین، عقیدت مندان تشریف لائے، آپ نے ختم قرآن مجید اور عقیقے کی تقریب کو ایک بہت بڑی محفل نعت میں بدل دیا، اس موقع پر آپ نے بہت مختصر خطاب میں ایسی باتیں کیں جو آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں اور سب لوگوں بے حد مسرت اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کا تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔آپ نے فرمایا! '' جب اللہ تعالیٰ ہمیں اولاد کی نعمت عطا فرمائے، بیٹی یا بیٹا عطا کرے تو آپ نہ سوچئے کہ میں باپ بن گیا یہ تو ہے ہی اپنی جگہ ایک حقیقت ، لیکن اس کو دین اور معرفت سے جوڑ دیجئے اور یوں کہیں کہ الحمد اللہ ہمارے گھر رسول پاک ﷺ کا ایک امتی تشریف لایا ہے، سرکار مدینہ آقائے دو جہاں ﷺ کا امتی جہاں بھی جائے گا رحمت و برکت ساتھ لے کر جائے گا، خوشحالی، رحمتیں، برکتیں سب اسی سرکار کی بدولت ملتی ہیں جو وجہ تشکیل کائنات ہیں۔سبحان اللہ! کس قدر دلنشیں، دل آویز انداز ہے قبلہ قادری سرکار کا، سچ تو یہ ہے کہ جب تک محبتوں کا تعلق آپ ﷺ سے جوڑا نہ جائے، آپ کی لائی ہوئی شریعت کا کامل اتباع نہ کیا جائے نجات حاصل نہیں ہوسکتی! اللہ۔اللہ..... اللہ والے کتنی محبتوں سے اللہ کی طرف، اس کے رسول ﷺ کی طرف لے آتے ہیں۔سبحان اللہ

اللہ کے ہاں بڑے مرتبہ والے سرکاری افسر:

ایک مرتبہ ایک بہت بڑے سرکاری افسر قبلہ قادری سرکار سے ملنے آئے حسب معمول قبلہ قادری سرکار سائلین سے ملنے میں مصروف تھے وہ آتے مجھے کہنے لگے ''مجھے قادری سرکار سے فوراً ہی ملنا ہے'' ہم نے انہیں بتایا کہ کافی رش ہے سب اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں آپ انتظار کرلیجئے۔وہ بولے ''مجھے بہت ایمرجنسی ہے۔'' اتنی دیر میں قادری سرکار نے انٹرکام پہ مجھے کہا کہ انہیں آنے دیا جائے۔وہ تیزی سے اندر داخل ہوگئے۔ چند منٹ قادری سرکار سے سر جھکائے آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے پھر مسکراتے ہوئے چلے گئے۔میں بہت حیران ہوا جس قدر ملنے کے لئے بے تاب تھے صرف دو چار منٹ کی ملاقات بعد ہی تسلی ہوگئی ان کی پھر میں سر جھٹک کے اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔شام کو بعد نماز مغرب مجھے خیال آیا تو میں نے پوچھا ''قادری سرکار وہ سرکاری آفسر جو آئے تھے ان کا کیا مسئلہ تھا؟'' قادری سرکار نے فرمایا ''ان کی ڈیوٹی لگ گئی ہے اللہ نے ان کو بڑے مرتبے سے نوازا ہے!'' ''وہ سرکاری افسر؟'' میں نے بہت حیرت سے پوچھا۔قادری سرکار نے فرمایا ''جو لوگ ایمانداری سے خلق خدا کی خدمت کرتے ہوں، رزق حلال کماتے اور کھاتے ہوں بظاہر کتنے ہی کماؤ محکمے میں نہ ہوں وہ راتوں کو اٹھ کر جب اللہ کے حضور حاضر ہوتے ہیں تو پھر ان کے مقامات بھی بلند ہوتے ہیں جو شخص رشوت کے بازار میں بیٹھ کر اپنا دامن صاف رکھے۔جو شخص بُرائی کے دلدل میں خود کو بُرائی کے کیچڑ سے محفوظ رکھے وہی آج کل عابد ہے، متقی ہے۔ان جیسے ہی سرکاری آفسروں سے دیگر معاملات چلتے ہیں۔'' سبحان اللہ لوگ کیسے کیسے روپ میں اپنی ڈیوٹیاں دے رہے ہوتے ہیں یہ تو اللہ والے ہی جانتے ہیں۔

تاش کے کھلاڑی اناڑی بن گئے!:

ایک مرتبہ ایک صاحب تشریف لائے، بڑی عمدہ، لچھے دار، گفتگو کرتے تھے۔نماز، روزے، صدقے خیرات کے پابند، بارباش آدمی اُن کے آنے سے خاصی رونق ہوجاتی تھی کبھی بھی خالی ہاتھ نہ آئے ہمیشہ کچھ نہ کچھ لے کر ہی آتے قبلہ قادری سرکار کی جو بات محسوس کی ہے، دیکھی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کبھی کسی کے فعل کی وجہ سے فرد سے نفرت یا بیزاری کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ فرد کو پیار کرو، محبت کرو، جب روح سیراب ہوجائے گی بدن خود بخود مصفا ہوجائے گا۔ایک دن وہ کہنے لگے ''حضور سچ بات تو یہ ہے کہ ہزار کوشش کے باوجود تاش کی عادت نہیں چھوٹتی پوری پوری رات گزر جاتی ہے مگر دل نہیں بھرتا۔مگر۔۔۔'' وہ کہتے کہتے چپ ہوگئے۔قادری سرکار نے پوچھا ''مگر کیا؟'' کہنے لگے ''جیتنا چاہتا ہوں'' قادری سرکار نے پوچھا ''کیا جیتنا چاہتے ہیں دنیا یا آخرت؟'' کہنے لگے ''سب کچھ'' قادری سرکار نے فرمایا ''جواری تو داؤ لگاتا ہے، داؤ لگاؤ بڑی چیز کیلئے'' پتا نہیں وہ سمجھے یا نہیں سمجھے بے ساختہ بولے ''آپ مجھے جیتنے کا گُر بتا

دیجئے؟'' آپ نے مسکرا کے فرمایا ''یالطیفُ بکثرت پڑھا کرو'' وہ خوشی خوشی چلے گئے مانو وہ یہی معلوم کرنے آتے رہے تھے۔ کافی دنوں کے بعد آئے تو اُن کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ چہرہ بہت مطمئن چال ڈھال، بول چال، میں عجیب سا ٹھہراؤ متانت تھی، چُپ چاپ بیٹھ گئے۔ قادری سرکار نے دیکھا مگر چُپ رہے وہ بھی چپ چاپ ہی بیٹھے رہے، نہ شوخ و چنچل گفتگو، نہ ہنسی، نہ مذاق عجیب ہی کایا پلٹ ہوگئی تھی اُن کی۔ جب سائلین کا رش ختم ہوگیا تو قادری سرکار کے پاس گئے اور صرف اتنا کہا ''یہ آپ نے کیا کیا؟'' قادری سرکار نے پوچھا ''کیا کیا؟'' آپ نے کونسا اسم بتایا ''یالطیفُ'' نے تو میری دنیا ہی بدل دی۔ میں تو اتنا شاندار کھیلتا تھا کہ کبھی خال خال بھی ہارا نہیں تھا۔ مگر اکے بادشاہ، جوکر، کوئین، ہر جگہ یالطیفُ ہی نظر آتا تھا۔ کبھی کبھی پتے بالکل سادہ ہوجاتے، کبھی سوتے جاگتے یالطیفُ کا اسم ہی چاروں طرف نظر آتا۔ اس سے خود بخود نفرت ہوگئی ہے وہ آب دیدہ ہوگئے آنسو آنکھوں سے بہنے لگے۔ قادری سرکار نے فرمایا ''خود ہی تو داؤ لگایا۔ جواری نے بڑی چیز لے لی، آخرت کی دنیا لے لی اب اور کیا جیتنا چاہتے ہو؟'' وہ کہنے لگے ''مجھے باضابطہ اپنی مریدی میں لے لیجئے۔ میں خود کو اب صرف دین کے لئے وقف کرتا ہوں۔'' وہ کہہ رہے تھے۔ آنسو رخساروں سے بہہ رہے تھے ہم سب انہیں دیکھ رہے تھے مجلس پر ایک عجیب سی فضاء چھائی ہوئی تھی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ توبہ دل سے کی جائے فوراً ہی قبول ہوجاتی ہے۔ اور گناہوں کی کالک کو بارانِ رحمت کے چھینٹے چند لمحوں میں ہی دھو دیتے ہیں۔ اس سے ایسا ہی ہو رہا تھا۔ قادری سرکار نے انہیں اپنے سینے سے لگایا۔ مرید کیا، دعائیں دیں اور اسم لطیف کا ورد باقاعدگی سے کرنے کی تلقین کی۔ وہ چلے گئے۔ میں نے قادری سرکار سے پوچھا ''سرکار اسم یالطیفُ صرف انہی کے لئے تھا یا اس کو کوئی بھی اپنی بری عادات سے نجات کے لئے پڑھ سکتا ہے؟ آپ قادری سرکار نے فرمایا ''جو شخص بھی اسم مبارک یالطیفُ کو بصد خلوص برائے اصلاح کردار، دروح کے لئے پڑھے گا اس کی اصلاح ہوجائے گی کیونکہ یہ اسم مبارک لطیف ہے اور اپنی لطافت و نظافت سے قلب کی سیاہی کو دھوتا ہے۔ قلب میں جلاء پیدا کرتا ہے بے چینی کو سکون میں بدلتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ دریائے کرم جوش میں ہے تو اس سے فوراً ہی فائدہ اٹھایا جائے کہا ''حضرت پھر تو تمام مریدوں اور ضرورت مندوں کو اس کی اجازت عطا فرما دیجئے۔'' مسکرائے اور فرمایا ''میرے اللہ جل جلالہ کا یہ اسم مبارک سب کے لئے عام ہے جو چاہے پڑھے مراد پائے گا انشاء اللہ'' اللہ۔۔۔ اللہ۔ کوئی نخرہ، کوئی تمنا، کوئی طمع نہیں کہ اجازت کے لئے آؤ۔ حلوے، مٹھائیاں، نذرانے لاؤ، مرید ہی بنو گے تو اجازتیں ملیں گی۔ یہاں تو بس محبتیں ہیں پیار ہے۔ اٹھائیں جو فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اللہ۔ اللہ لطیف جل جلالہ کا دربارِ فیض کھلا ہے۔ جو میرے رب کو پکارے گا۔ اس کی دادرسی ہوگی مگر میرے پیر و مرشد قادری سرکار کے لئے ہمیشہ دعا گو رہے۔ یہ شرط حضور قادری سرکار کی نہیں مجھ عاجز کی ہے۔ رہے نام اللہ کا۔ ☆☆☆

پیر شاہ محمد قادری سرکار کی مشہور کار آمد کتابیں
جن کا ہر گھر میں ہونا ضروری ہے

☆ اسماء الحسنٰی کامیابی کا راستہ۔ (اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں پر پُر اثر تحریر) ☆ عملیات اسماء الحسنٰی۔ (اللہ تعالیٰ کے ناموں کے وظائف) ☆ جادو اور جنات۔ (جن، بھوت، آسیب سے محفوظ رہنے کے شرعی طریقے) ☆ راہِ تصوف۔ (مریدین کے لئے تصوف کی حقیقت کا آسان بیان) ☆ ہاتھوں میں تقدیر۔ (ہاتھوں کی لکیروں کے متعلق ایک شاندار تحقیق) ☆ خواب اور تعبیر۔ (اپنے خوابوں کی تعبیر خود جانیے) ☆ خوبصورت نام۔ (بچوں کے خوبصورت پُر اثر نام خود رکھئے) ☆ سید ناغوث الاعظم۔ (دنیائے تصوف کے سب سے بڑے ولی کا تذکرہ) ☆ دعائیں۔ (ہر موقع، ہر دن، ہر تہوار کے متعلق جامع دعائیں) ☆ جو میں نے دیکھا۔ (قادری سرکار کے مرید خاص کے تجربات اور مشاہدات) ☆ میری کہانی۔ عملیات سے تصوف تک۔ (معروف صحافی ظفر سجاد کے قلم سے سرکار کا ایک طویل انٹرویو)

کتب کیلئے اس نمبر پر رابطہ کیجئے۔ 042-37232336